URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے
لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں
صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب
ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن
حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے
۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox
کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے
Pause کردیں ۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause
ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

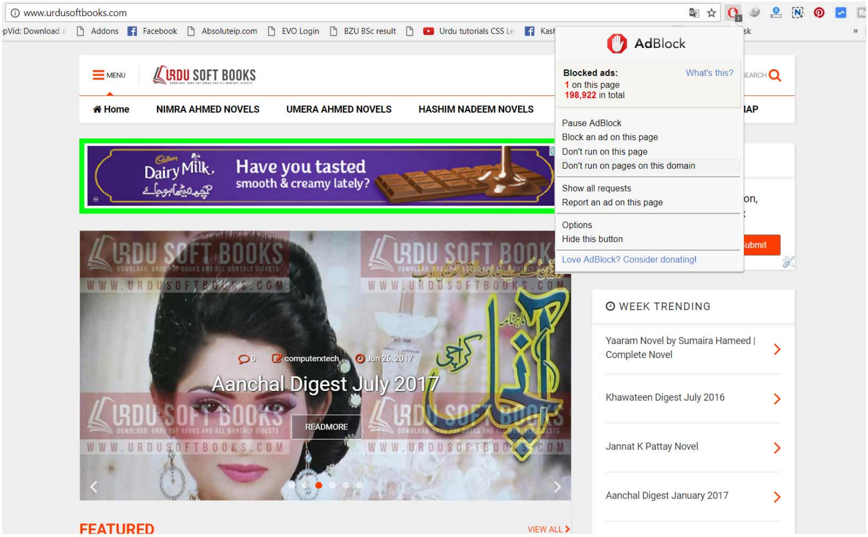

Click Here to Visit
UrduSoftBooks.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — امجد ریاض

مدیر اعزازی — امتہ الصبور

فلم، ٹیلی ویژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سر کی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، امجد اسلام امجد 11
نعت، امجد اسلام امجد 11
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

عہدِ یوسفی، نعیمہ ناز 17
دستک، شاہین رشید 24
بندھن، زارالو عباس 20
جب تجھ سے ناتا، نورین حفیظ 28
شعاع کے ساتھ، ادارہ 279

ناول

شہرزاد، صائمہ اکرم 34
خواب شیشے کا، عفت سحر طاہر 240

مکمل ناول

بن پاکھی، فرح بخاری 106
ایک نگاہ کے اسیر، نادیہ احمد 146
خواہشوں کے دیار میں، حمیرا نوشین 194

ناولٹ

نہ جانے ماذن، ام طیفور 78

افسانے

یارِ دل دار، افشین نعیم 63
دعا، انیلا طالب 58
چھوٹی، حمیرا عروش 71
الٹا چکر، فاطمہ زیدی 102
اپنے ہی رنگ میں، نیّر فہیم خان 135

نظمیں غزلیں

غزل، صابر ظفر 260
نظم، قتیل شفائی 260
غزل، نازیہ ادا 261
غزل، جمیل الدین عالی 261

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)------700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	268
مسکراہٹیں	ادارہ	262
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	282
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	264
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	267
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	285
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	288
خوبصورت بنیے	ادارہ	290

جولائی 2018
جلد 32 شمارہ 11
قیمت 70 روپے

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپواکر شائع کیا - [redacted]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

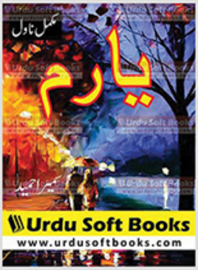

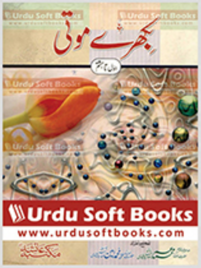

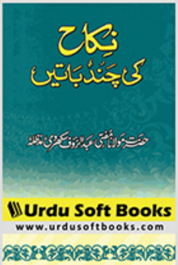

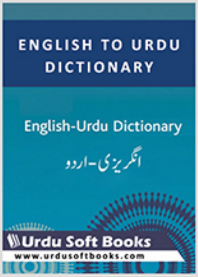

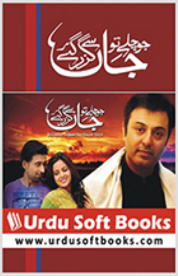

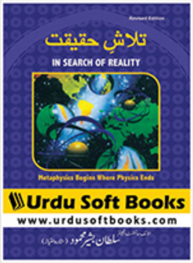

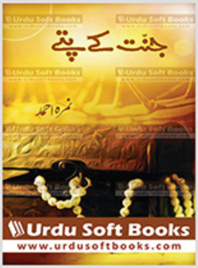

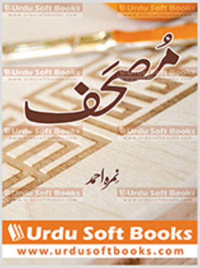

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

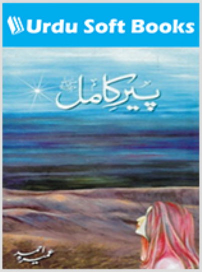

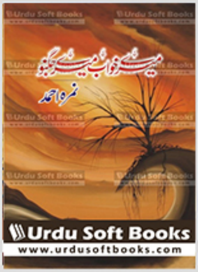

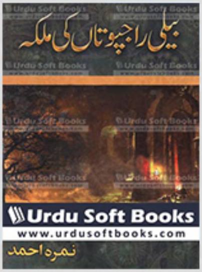

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

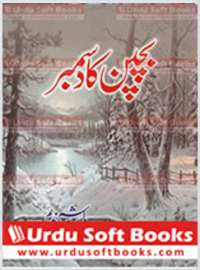

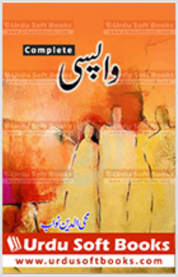

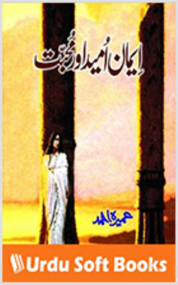

پہلی شعاع

شعاع کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اس دنیا کی ساری خوبصورتی، دلکشی اور رنگا رنگی انسانی ذہن کی ہی مرہون منت ہے۔ آج کی جدید دنیا میں ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں جو بے پناہ ترقی نظر آتی ہے، جو آسائشیں اور آسانیاں میسر ہیں، یہ سب انسانی ذہن کا کرشمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف ذہن عطا کیا ہے۔ اس کا سوچنے کا انداز، اس کی فکر اور زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ بھی مختلف ہے۔ کسی ایک معاملے میں مختلف لوگوں کی رائے مختلف ہو سکتی ہے۔ اختلاف رائے کا یہ عمل زندگی کو متنوع اور دلچسپ بناتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں اپنی رائے رکھنا اور اس کا اظہار کرنا انسان کا بنیادی حق ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کی رائے کا بھی احترام کیا جائے اور اعتدال کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔ کسی بھی معاملے میں انتہاپسندی ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ انتہائی نفرت اور انتہائی عقیدت دونوں ہی جذبے تباہ کن ہیں۔ ہر انسان میں خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ تحمل اور سنجیدگی سے دوسروں کی بات سنیے۔ ان کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اور دلیل سے اپنی بات منوائیں۔ مہذب معاشروں میں جہاں اظہار رائے کی آزادی ہے، وہاں دوسروں کی رائے کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ آج کل کے حالات کے تناظر میں ہمارے ہاں اختلاف رائے کو دشمنی میں بدل دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا میڈیا اس رجحان کو مزید ہوا دے رہا ہے۔ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کا کردار انتہائی مایوس کن ہے۔ وہ باقاعدہ تماشا لگاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ تصادم اور ٹکراؤ کی صورت پیدا کی جائے۔ کبھی کبھی تو گالیوں اور تو تکار تک کی نوبت آجاتی ہے۔ انتہاپسندی کا یہ رویہ آگے بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔

سالگرہ نمبر۔ سروے

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ آپ شعاع کب سے پڑھ رہی ہیں؟ کیا گھر والے شعاع پڑھنے پر روک ٹوک کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں کوئی واقعہ؟

2۔ شعاع کی وہ کہانی جس نے دنوں اپنے سحر میں مبتلا رکھا؟

3۔ کسی کہانی کا وہ کردار جسے پڑھ کر آپ نے سوچا کاش آپ ایسی ہوتیں؟

4۔ کبھی ایسا ہوا کہ شعاع کی کوئی کہانی پڑھتے ہوئے اتنی محو ہوئیں کہ سالن جل گیا۔ روٹی پکانا بھول گئیں یا نمک دوبار ڈال دیا تو گھر میں خوب ڈانٹ پڑی۔ کہانی کا نام بھی لکھیں۔

ان سوالات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ 20 جولائی تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں

- فرح بخاری کا مکمل ناول ۔ بن پاکھی، ، نادیہ احمد کا مکمل ناول ۔ تیری ایک نگاہ کے اسیر ہیں،
- حمیرا نوشین کا مکمل ناول ۔ خواہشوں کے دیار میں، ، ام طیفور کا ناولٹ ۔
- صائمہ اکرم چوہدری اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- افشین نعیم، نیر فہیم خان، انیلا طالب، عمیرا فردوس اور ناظمہ زیدی کے افسانے،
- بندھن ۔ معروف فنکارہ زارا نور عباس، ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے ۔
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع پڑھ کر ہمیں خط ضرور لکھیں۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

چاروں طرف رواں دواں اس کی عطا کا سلسلہ
دُنیا کے ہر بشر سے ہے جاری خدا کا سلسلہ

کوئی بھی نسل و رنگ ہو، کوئی زبان و قوم ہو
قائم ہے سب سے ایک سا جود و سخا کا سلسلہ

ایسا ہے بے نیاز وہ، کُھلتا نہیں کسی پہ بھی
اس کی سزا کا سلسلہ، اس کی جزا کا سلسلہ

مولا مرے وطن پہ کیوں شامِ فرات رُک گئی
ختم بھی ہو کہیں یہ اب کرب و بلا کا سلسلہ

شامِ خزاں کے صحن میں صبحِ بہار کھل اُٹھی
بابِ قبول سے ہے کیا، حرفِ دُعا کا سلسلہ

اُس کی کتاب سے بھی جو اُس کے وجود سے بھی جو
منکر ہیں ان سے بھی نہیں ٹوٹا خدا کا سلسلہ

دُنیا میں کس طرح سے ہو امجد عمل کا احتساب
رکھا اسی لیے تو ہے روزِ جزا کا سلسلہ

امجد اسلام امجد

رہتے تھے اُنؐ کی بزم میں یوں باادب چراغ
جیسے ہوں اعتکاف کی حالت میں سب چراغ

جتنے ضیا کے روپ ہیں، سارے ہیں مستعار
اپنے ہنر سے جلتے ہیں دُنیا میں کب چراغ

گزری جہاں جہاں سے سواری حضورؐ کی
حیران تھیں کہکشائیں تو ششدر تھے سب چراغ

رب سے دُعا وہؐ کرتے تھے اُمت کے واسطے
راتوں کو بجھنے لگتے تھے گلیوں کے جب چراغ

ہر ہر قدم رفیق ہے سنت کی روشنی
جینے کا یوں سکھاتے ہیں دُنیا کو ڈھب چراغ

دیکھو تو اُن میں نورِ ازل کی ہیں جھلکیاں
یہ جو دکھائی دیتے ہیں رستوں میں اب چراغ

امجد مرے حضورؐ مجسم تھے روشنی
چہرہ تھا آفتاب تو لگتے تھے لب چراغ

امجد اسلام امجد

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

افضل انسان

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا:

''کون سا انسان افضل ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنے والا۔''

اس نے کہا: ''اس کے بعد کون سا (افضل ہے)'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''وہ آدمی جو کسی گھاٹی میں اللہ کی عبادت کرتا ہے، لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھتا ہے۔''

اجتماعی نظم وضبط

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کچھ لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو (جہنم کی طرف) بلائیں گے۔ جو شخص ان کی بات مانے گا وہ اسے جہنم میں پھینک دیں گے۔''

میں نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! ہمیں ان کے اوصاف (اور علامات) بتا دیجیے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ہم ہی میں سے کچھ افراد ہوں گے اور ہماری زبانوں ہی میں بات کریں گے۔''

میں نے کہا: ''اگر مجھے (ان کا) یہ زمانہ ملے تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمانوں کی اجتماعیت اور ان کے امام کے ساتھ پیوستہ رہنا۔ اگر ان کی اجتماعیت نہ ہو اور نہ کوئی (متفقہ) امام ہو تو ان سب فرقوں سے الگ رہنا اگرچہ تجھے کسی درخت کی جڑ چبانی پڑے حتیٰ کہ تجھے اسی حال میں موت آ جائے۔''

فوائد ومسائل:

1- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جو باطل کی طرف دعوت دینے والے تھے اور عام لوگ ان کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر ان کی بات مان لیتے تھے

2- اختلاف کے اس دور میں صحیح راستہ وہی تھا جس پر صحابہ کرام اور تابعین قائم تھے، بعد میں پیدا ہونے والے اختلافات میں بھی صحابہ وتابعین کا طرز عمل ہی قابل اتباع ہے۔

3- مسلمانوں کے امام سے مراد وہ حکمران اور خلیفہ ہے جو اسلامی شریعت کی روشنی میں ان کے معاملات کا انتظام کرتا اور دوسرے فرائض انجام دیتا ہے۔

4- فتنوں کے زمانے میں کسی پارٹی کے ساتھ مل کر دوسرے مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان پہنچانا جائز نہیں، البتہ خلیفۃ المسلمین کی ساتھ مل کر باغیوں کے خلاف جنگ کرنا اسلامی سلطنت کے دفاع اور قوت کے لیے ضروری ہے۔

فتنوں کا مقابلہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قریب ہے کہ مسلمان کے لیے بہترین مال

بکریاں ہوں جن کو پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کی جگہوں میں (جہاں گھاس چارہ مل سکتا ہے) لیے پھرتا رہے۔ اور (اس طرح) اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے (فتنوں سے دور) بھاگتا پھرے۔"

فوائد ومسائل:

1- جب عام لوگوں کے ساتھ رہنے میں ایمان کو خطرہ ہو تو گوشہ نشینی اختیار کرنا جائز ہے۔

2- جو شخص فتنوں میں غلط کار لوگوں کی غلطیاں واضح کرنے کے لیے اپنی زبان اور علم کو استعمال کر سکتا ہو، اس کے لیے وعظ و نصیحت اور بحث و مناظرہ کے لیے آبادی میں رہنا اور یہ خدمت سرانجام دینا افضل ہے۔

غلطی دہرانے سے اجتناب کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔"

فوائد ومسائل:

1- مومن سے بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے لیکن غلطی واضح ہونے پر اس سے رجوع کر لینا چاہیے۔

2- جو شخص ایک بار ناقابل اعتماد ثابت ہو جائے دوبارہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لینا درست نہیں۔

مشتبہ کام کرنے سے رک جانا

امام شعبی رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:

میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو منبر پر اپنے کانوں کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے یہ فرماتے سنا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔

آپ ﷺ فرما رہے تھے: "حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ شبہ والی چیزیں ہیں، جن سے اکثر لوگ واقف نہیں۔ تو جس نے شبہ والی چیزوں سے اجتناب کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا اور جو کوئی شبہ والی چیزوں میں مبتلا ہو گیا، وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا، جیسے ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد بکریاں چرانے والا، ہو سکتا ہے کہ (نادانستہ طور پر) اس کے اندر (جانور) چرانے (اور اس طرح مجرم قرار پا جائے۔)

خبردار! ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے (جس میں عام لوگوں کے جانوروں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔) خبردار! اللہ کی ممنوعہ چراگاہ سے مراد اللہ کی حرام کردہ چیزیں (اور کام) ہیں۔

سن لو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو تو سارا جسم صحیح ہوتا ہے، اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے۔"

فوائد ومسائل:

1- کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا روزمرہ کے اعمال، ان میں کچھ واضح طور پر حلال ہیں جن میں کوئی شک نہیں، مثلاً: روٹی، شہد، اللہ کا نام لے کر ذبح کیے ہوئے حلال جانور کا گوشت، جائز ضرورت کے لیے کہیں آنا جانا اور کسی سے بات چیت کرنا وغیرہ۔

کچھ چیزیں اور کام واضح طور پر حرام ہیں، مثلاً: خنزیر کا گوشت، شراب، مردار، جھوٹ بولنا، چوری کرنا اور زنا کرنا وغیرہ۔

بعض چیزیں اور کام ایسے ہیں جن کا حلال یا

حرام ہونا واضح نہیں۔ عام لوگ ان مسائل سے واقف نہیں ہوتے۔علماء ان کا حکم قرآن وحدیث کے الفاظ کے اشارات واقتضاء سے یا قیاس وغیرہ سے معلوم کرتے ہیں۔

2- جس چیز کے بارے میں معلوم نہ ہو، مسئلہ پوچھنے سے پہلے بھی اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے کیونکہ ہوسکتا ہے معاملے کی ایک صورت جائز اور ایک ناجائز ہو۔ مسئلہ معلوم ہو جانے کے بعد صحیح اور راجح موقف کے مطابق عمل کیا جائے۔

3- انسان کو بلاوجہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے وہ بدنام ہو جائے۔

4- جس کام سے ممنوع کام تک نوبت پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے، جیسے غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں ملنا، اگرچہ پردہ کی پابندی کے ساتھ ہو، اس سے خطرہ ہے کہ شیطان گناہ کی خواہش پیدا کر دے اور دونوں افراد کبیرہ گناہ میں ملوث ہو جائیں۔

5- دل کی اصلاح بہت ضروری ہے تاکہ اخلاص، یقین اور اللہ کی محبت وغیرہ جیسی صفات حاصل ہوں۔ ان کی وجہ سے نیکی پر عمل کرنا اور گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

گوشہ نشینی

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''قتل و غارت (اور فتنوں کے ایام) کے دوران میں عبادت کرنا ایسے ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔''

فوائد ومسائل:

1- فتنہ وفساد کے ایام میں فتنوں میں شمولیت سے بہتر ہے کہ ان سے الگ تھلگ رہا جائے۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔

2- رہبانیت ممنوع ہے لیکن فتنوں کے ایام میں گوشہ نشینی رہبانیت میں شامل نہیں کیوں کہ اس گوشہ نشینی کا مقصد اپنے آپ کو قتل و غارت اور فساد میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔

3- ہجرت میں وطن چھوڑا جاتا ہے اور گوشہ نشینی میں اہل وطن کی برائیوں اور شرارتوں سے دامن بچانے کے لیے ان سے تعلق محدود کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں عمل مشابہ ہیں اور ان دونوں کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

صحیح عقائد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اسلام شروع میں اجنبی تھا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا، اس لیے اجنبیوں کو مبارک ہو۔''

فوائد ومسائل:

1- ''غریب'' اجنبی اور بے وطن کو کہتے ہیں۔ شروع میں اسلام کی یہ کیفیت تھی کہ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔ معاشرہ اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ اسے سمجھتے اور قبول کرتے گئے حتیٰ کہ ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور کفر و شرک ختم ہو گیا۔

2- خلفائے راشدین کے دور کے بعد اسلام میں بدعات کا ظہور ہوا، بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے رسم ورواج اور خیالات اپنا لیے۔ اس طرح اصل اسلام چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اکثریت نے خود ساختہ رسم و رواج اور غلط عقائد واعمال ہی کو صحیح اسلام سمجھ لیا۔

3- جن اجنبیوں کو مبارک باد دی گئی ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات کی کثرت میں سنت پر عمل پیرا رہیں، غلط عقائد مشہور ہونے پر صحیح عقیدے پر قائم رہیں اور اخلاقی انحطاط کے دور میں صحیح اسلامی اخلاق کو اختیار کریں۔

اجنبی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسلام اجنبی کے طور پر شروع ہوا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہوجائے گا۔ تو اجنبیوں کو مبارک ہو۔''

عرض کیا گیا: اجنبی (غرباء) کون ہیں؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قبائل سے الگ ہونے والے۔''

اللہ کے پسندیدہ لوگ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

وہ ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔
انہوں نے کہا: ''آپ کیوں رو رہے ہیں؟''
حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ایک ارشاد کی وجہ سے رونا آرہا ہے۔
میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے:

''تھوڑا سا دکھاوا بھی شرک ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے، وہ (گویا) اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ گمنام متقی نیک لوگ پسند ہیں جو غیر حاضر ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا، اگر موجود ہوں تو انہیں بلایا نہیں جاتا، نہ انہیں پہچانا جاتا ہے۔

ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں۔ وہ ہر ایک غبار آلود تاریک فتنے سے نکل جاتے ہیں (اور فتنوں سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہوتے۔'')

صاحب کمال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگوں کی مثال ان سو اونٹوں کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ملے۔''

فوائد و مسائل:

1- صاحب کمال لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔

2- عوام میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی اہم ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہودی اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ اور میری امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی۔''

قرآن و سنت پر عمل کرنے والے

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنتی تھا اور ستر جہنمی۔
عیسائی بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) اکہتر جہنمی تھے اور ایک جنتی۔
قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میری امت ضرور تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور بہتر جہنم میں۔''
عرض کیا گیا: ''اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہیں؟
فرمایا: ''جماعت۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''بنی اسرائیل اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ ایک کے سوا وہ سب فرقے جہنم میں جائیں

گے، اور وہ جماعت ہے۔"

فوائد و مسائل:

1- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے جن جن واقعات کی جس جس طرح خبر دی۔ وہ اسی طرح پیش آئے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہے۔

2- فرقوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان اختلافات میں صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

3- مسلمانوں کی اصل "جماعت" وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلی آ رہی ہے۔ اس جماعت سے لوگ الگ ہو کر مختلف فرقوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن اصل "جماعت" بھی قائم ہے۔ مسلمانوں کو اسی "جماعت" کے ساتھ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

4- جماعت سے الگ ہونے والے خواہش نفس یا غلط تاویلات کی وجہ سے الگ ہوئے۔ جو لوگ ان فرقوں میں شامل نہیں ہوئے، وہ قرآن و حدیث پر قائم رہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

5- نجات کا دارو مدار اپنی پارٹی کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عاملین کتاب و سنت مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں "الجماعۃ" میں شامل ہیں۔

دیگر اقوام کی پیروی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم لوگ پہلوں کے طریقے کی (پوری طرح) پیروی کرو گے، جیسے باع باع کے برابر، ہاتھ ہاتھ کے برابر، اور بالشت بالشت کے برابر ہوتی ہے حتی کہ اگر وہ کسی سانڈے کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ضرور اس میں گھسو گے۔"

صحابہ نے عرض کیا:

"اللہ کے رسول! کیا یہودیوں اور عیسائیوں کی (پیروی کریں گے؟)"

آپ ﷺ نے فرمایا: "اور کن کی؟"

فوائد و مسائل:

1- یہود و نصاریٰ کے رسم و رواج کی پیروی کرنا گمراہی کا باعث ہے۔

2- یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہونا ان کی محبت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا مذہب بھی اچھا محسوس ہونے لگتا ہے۔

3- "باع" سے مراد وہ فاصلہ ہے جو دونوں ہاتھوں کے سروں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے، جب دونوں بازو مخالف سمتوں میں دائیں بائیں پھیلا لیے جائیں۔ "ہاتھ" (ذراع) سے مراد ہاتھ کی انگلیوں سے کہنی تک کا فاصلہ ہے۔

4- سانڈے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرنا ایک نامعقول حرکت ہے لیکن یہود و نصاریٰ کی پیروی میں مسلمان یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ یہ کام یا سوچ درست بھی ہے یا نہیں، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی شروع کر دیں گے۔

5- اس پیش گوئی پر عمل کی موجودہ دور میں متعدد مثالیں ہیں، جیسے آج سے چند سال قبل جب "سوشلزم" کا تصور نیا نیا سامنے آیا تو مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن و حدیث کی نصوص کی اس انداز سے تاویل شروع کر دی کہ جس سے سوشلزم کا اسلام میں شامل ہونا ثابت کیا جا سکے۔ جب روس نے سوشلزم کے اس تصور کو چھوڑ دیا تو ان ہی لوگوں نے قرآن مجید سے مغربی جمہوریت اور مادر پدر آزادی کے حق میں "دلائل" تلاش کرنے شروع کر دیے۔

آخر

دلوں پہ نقش رہے گا

نعیمہ ناز

"چراغ تلے" کا چراغ بجھ گیا۔ "خاکم بہ دہن" کا لکھنے والا خاک میں جا سویا، "زرگزشت" کی سرگزشت تمام ہوئی "آب گم" تخلیق کرنے والا اپنے خالق کے حضور پہنچ گیا اور "شام شعر یاراں" کی شام ڈھل گئی۔

تو یوسفی صاحب بھی رخصت ہوئے۔

میں ایک ادنیٰ سی قاری، ان کے بے شمار مداحوں میں سے ایک، ان کے کمال فن کو عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں بیان نہیں کرسکتی۔ کون احاطہ کرسکتا ہے؟ سمندر میں غواص جب بھی اترتا ہے، نیا موتی ہی نکال لاتا ہے۔ انہوں نے جس طرح زندگی کو برتا اور پھر اسے لکھا۔ وہ کلاسک بن گیا۔ زندگی بھی، تحریر بھی، مزاح لکھنا مشکل ہوتا ہے اچھا مزاح لکھنا بہت مشکل اور ایسا مزاح، لکھنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ جس میں شائستگی کے ساتھ ساتھ ادب، مقصد اور زبان وبیان کا رچاؤ ہو، رکھ رکھاؤ ہو۔ یوسفی صاحب نے اس بے انتہا بھاری پتھر کو اٹھا کر فقط چوما ہی نہیں بلکہ سینے سے لگا کر رکھا۔ اس بوجھ تلے خود کو دباتے اور زخماتے ہوئے وہ اردو وادب کے لیے وہ ذخیرہ چھوڑ گئے جو انمول ہے۔ "زرگزشت" میں لکھتے ہیں۔"

"وہ استہزا اور مزاح جو سوچ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی، پھکڑپن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

"شگفتہ نگار اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا۔ سنتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کر کسی نئے افق، کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہوجاتا ہے۔"

انہوں نے اردو زبان پر اور ادب پڑھنے والوں پر جو سب سے بڑا احسان کیا ہے۔ وہ یہ کہ اردو کے پرانے، متروک اور گمشدہ ہوجانے والے قدیم الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے۔ انہیں بڑے پیار سے جھاڑ پونچھ کر بے حد اہتمام اور چاؤ سے اپنی تحریروں میں سمو بھی دیا۔ سجا بھی دیا۔ اب نہ ان کی چمک ماند پڑتی ہے نہ تحریر کی چکا چوند میں کمی آتی ہے۔ اپنے قلم کی نوکیلی کٹیلی دھار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود پر ہی آزمائی۔

"ہاں، زمین پر ذرا زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے چند چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جمگھٹا نظر آیا۔ کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی۔ مثلاً نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چیچل، جینا لولو بریجڈا کا وزن، سیمول جانسن کی بینائی، ناک بالکل قلوپطرہ کی مانند کہ اگر 1/12 انچ بھی چھوٹی ہوتو اس دکھیا کا شمار بدصورتوں میں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا، عمر وہی جو شیکسپیر کی انتقال کے وقت تھی۔"

زرگزشت اور "آب گم" کے عام افراد کا ذکر ہو یا شام شعر یاراں میں مشہور ہستیوں کا ذکر، سب کچھ یوں قلم بند کیا کہ ہنسی کے ساتھ ساتھ پیار بھی آجائے۔ ان کی تحریر میں جہاں ان کے وسیع مطالعے کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہیں ایسا فلسفہ جو پڑھنے والے کو ٹھٹکنے اور پھر سوچنے پر مجبور کردے۔

"قومیں جب اللہ کی زمین پر اترا اترا کر چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہوجاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔"

"ہمیں ان پر بڑا ترس آتا ہے جو کبھی بچپن میں ننگے پیر نہیں پھرے، بارش میں نہیں نہائے،

دھرتی اپنا آپ، اور بھید بھاؤ، جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔"

"لہجہ، لفظ کی تیسری Dimention (جہت) ہے۔ یہ لفظ کو نئے معنی دیتا ہے۔ نئی توانائی، گیرائی اور رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ لہجہ لفظ کا اعتبار ہے۔ لہجہ۔ لفظ کا سمپورن ٹھاٹھ ہے۔"

ان کی تحریر کے لیے مشہور ہے کہ وہ ایک ایک جملہ کئی کئی بار لکھتے تھے۔ نوک پلک سنوارتے تھے۔ جب تک کہ خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ پھر اسے پال لگا دیتے تھے اور عرصے بعد نکالتے تھے۔ سچ پکے سو میٹھا ہو، یہی وجہ ہے کہ ساٹھ سال میں فقط پانچ کتابوں نے انہیں اس مقام پر پہنچا دیا، جہاں دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہیں۔

یوسفی صاحب سنار لکھاری تھے۔ ایک ایک لفظ سونے کا مول، سونے کا تول، قاری جب پڑھتا ہے تو کوئی ایک لفظ بھی چھوڑ نہیں سکتا، کیونکہ بھرتی کا کوئی لفظ ہوتا ہی نہیں، ہر لفظ اپنی جگہ نگینہ سا جڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ نگینے سے الفاظ فقط اردو ہندی کے ہی نہیں بلکہ علاقائی زبانوں کے بھی ہیں۔ جنہوں نے تحریر کو اور بھی توانا اور تازہ کر دیا۔

"اورنگ عالمگیر نے راجپوت سرداروں کے ایک جیش (لشکر) کو ایک دور دراز مہم پر بھیجا، جگ بیت گئے، پر وہ نہ لوٹے، نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں' آخر برہ کی ماری ٹھکرائنوں نے بادشاہ کو ایک عرض داشت پیش کی جو صرف ایک دوہے پر مشتمل تھی۔

سونا لاون پی گئے، سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے، روپا ہو گئے کیس
(پیا سونا لینے گئے اور ہمارا دیس سونا کر گئے ہمیں تو نہ پیا ملے نہ سونا اور بال چاندی ہو گئے)"

قائداعظم کو جلسوں اور پروگراموں میں تقاریر کرتے ہوئے تو بہت لوگوں نے دیکھا اور سنا مگر یوسفی صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے قائداعظم کو عدالت میں بحث و جرح کرتے ہوئے' ان کے پروفیشنل رول میں بہت قریب سے دیکھا۔ اس کا ذکر انہوں نے "شام شعر یاراں" کے پہلے باب میں کیا ہے۔ چیدہ چیدہ اقتباسات پیش ہیں۔

"میں نے پتلون کی کریز واقعی نہیں دیکھی تھی۔ ارے صاحب چہرہ دیکھنے سے فرصت ملے تو کچھ اور دیکھوں، ایک عجیب دبدبے اور رعب کا احساس ہوتا تھا۔ تمکنت، طنطنہ یا رعونت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔"

"قائداعظم کے چہرے پر جو عزم صمیم' ناشکستی' اعتماد اور لہجے میں جو جلالی یقین اور گھن گرج دیکھی' وہ اس حد کمال تک اور کہیں نظر نہیں آئی۔"

"کیا بتاؤں ان کے مونوکل نے مجھے کتنا Fascinate کیا۔ ان کے چہرے پر وہ سجتا تھا، حریف کو قائل یا۔ پسپا لاجواب کرنے کے بعد ان کے بشرے سے فتح مندی یا برتری کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوہ وقار اب بھی وہیں ہے جہاں تھا۔"

"سننے والے انگریزی نہیں جانتے تھے مگر اتنا ضرور جانتے تھے کہ ان کا قائد اپنے موقف اور مطالبے پر ڈٹا رہے گا۔ جب بھی بولے گا سچ بولے گا۔"

اپنی تقریباً ساری کتابوں میں انہوں نے ایک شخصیت کا ذکر انتہائی محبت چاہت، اور للک سے کیا ہے' وہ ہیں ان کی شریک حیات۔

"ان کے لیے ہمارے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ ان کا سہاگ رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ انہوں نے ہماری عادتیں خراب کر دی ہیں۔ اور ہم گھر گرہستی سے اتنے بے خبر ہیں کہ آج بھی نہیں بتا سکتے کہ ہمارے کرتے میں کتنا کپڑا لگتا ہے؟ کریلے کس موسم میں آتے ہیں؟ گوشت کہاں سے آتا ہے؟ ساری کا عرض کتنا ہوتا ہے۔"

"بیگم بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد

ہمیں کچے صحن میں لے گئیں اور بولیں، دیکھو، آج بارش کے پانی سے میں نے دو ٹنکیاں بھرلی ہیں۔ بالکل موتی کی طرح، ڈھیروں، کپڑے دھل جائیں گے۔"

زرگزشت کے اسی باب کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"صبح پونے سات بجے آنکھ کھلی، بیوی ہمارے کپڑوں پر استری کرکے اسکول پڑھانے جاچکی تھیں۔ کپڑوں پر ایک پرچا رکھا تھا جس میں لکھا تھا۔ "رات تمہیں بتانہ سکی ڈاکٹر نے مجھے یرقان بتایا ہے' خوامخواہ ڈھیروں دوائیں اور انجکشن لکھ مارے ہیں۔ شام میں آتے ہوئے ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے دوائی لے آؤں گی۔ ویسے بھی زرد رنگ تمہارا فیورٹ بھی تو ہے۔"

"شام شعر یاراں" کے آخری باب میں رقم طراز ہیں۔

"ٹھیک دو بجے شب' زرد رنگ کی چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میرے بے حد پسندیدہ بسنتی رنگ کی یہ چادر مرحومہ نے بڑے شوق سے سی تھی۔ آخری دن' دم وداع بھی چادر اوڑھے ہوئے تھیں، رخسار بھی ہم رنگ چادر ہو چلے تھے۔ سب نے کہا، یہ چادر بھی فقیر فقرا کو دے دلا دو، لہٰذا میں نے سب سے اتاؤلے باؤلے سوالی کو یہ کفنی سونپ دی۔

کہیں اوڑھ چدریا بجنی گئی
کوئی کفنی پہنے راہ تکت ہے۔

اس بیراگی جٹا دھاری فقیر نے اپنے غم کو تحریر میں یوں سمو دیا۔

"صبح سات بجے جب آنکھ کھلتی ہے تو پہلی نظر کتابوں اور اس بھاگ بھری کی تصویروں پر پڑتی ہے جس نے ساٹھ سال تک بے مثل رفاقت کا حق ادا کیا۔ اسے اس لیے بھی خوش نصیب کہوں گا کہ "خوش مرگ تو کہ ماتم یاراں نہ دیدہ" (تمہاری خوش دوائی پر رشک آتا ہے کہ تم نے ہمارا ماتم نہیں دیکھا)۔

کفن پہنے راہ تکتے تکتے جگ بیت گئے تھے۔

تو پھر یہ ان کے لیے اچھا ہی ہوا کہ یہاں سے رخصت ہوئے اور وہاں کاسنی دوپٹے اور موتیا کے پھولوں کے ساتھ استقبال ہوا ہوگا۔ بہت پہلے ہی "آب گم" میں اعلان کر چکے تھے۔

"ایک روز زمین اوڑھ کے سوجائیں گے ہم بھی۔"

تو زمین نے صدا دے ہی ڈالی، جو مٹی ان کو پیاری تھی۔ اس مٹی میں ہی سو گئے۔

میں، ان کے لیے افسردہ' دل گیر الفاظ و انداز استعمال نہیں کرنا چاہتی، جن کے لفظوں نے ہونٹوں کو مسکرانے اور دلوں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ ان کو بڑی دل دہی اور دل داری سے یاد کرنا چاہیے۔ ان کے پرسے اور افسوس کے لیے آنسو مناسب نہیں مگر کیا کیا جائے کہ بن بلائے مہمان کی طرح وہ بھی آن ٹپکتے ہیں۔

یوسفی صاحب کے ہاں ناسٹلجیا (ماضی پرستی) اپنی تمام تر ندرت، رعنائی بچاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے۔

ان کے صرف فقرے ہی چلبلے نہیں ہیں بلکہ مصرعوں میں ایک آدھ لفظ کی تحریف کرکے انہیں بھی شوخ اور رنگیلا بنا دیا ہے۔

"وہی یعنی وعدہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
"تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیدار بیٹھے ہیں"
"پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں"
"غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے"

یوسفی صاحب کی تحریر کا رکھ رکھاؤ، رچاؤ، لوچ اور بانکپن ان ہی کے ساتھ رخصت ہوا۔

دلوں پر نقش رہے گا میرے زمانے کا
میں اختتام ہوں اک عہد کے فسانے کا

بندھن

زارا انور عباس ہمراہ اسد صدیقی

شاہین رشید

بشریٰ انصاری ہوں یا انور مقصود کا گھرانہ...... ایک سے بڑھ کر ایک باصلاحیت لوگ موجود ہیں۔ پھر ان میں سے تو کچھ کی اولادیں بھی ورثے میں صلاحیتیں لے کر آئی ہیں...... انور مقصود کے بیٹے بلال نے اپنی فیلڈ میں کتنا نام کمایا اور اب بشریٰ انصاری کی بھانجی اور بہت ہی اچھی فنکارہ ''اسماء عباس'' کی بیٹی ''زارا انور عباس'' ڈراموں میں کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں...... آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل ''خاموشی'' میں دیکھ رہے ہیں۔ جس میں انہوں نے بہترین پرفارمنس دے کر اس فیلڈ میں اپنا راستہ ہموار کرلیا ہے۔

چند ماہ قبل ''زارا انور عباس'' شادی کے بندھن میں بندھ گئیں۔ عدنان صدیقی کے بھانجے ''اسد عدنان صدیقی'' سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں...... نیا بندھن، نئی رشتے داریاں اور نئی ذمہ داریاں، نیا ماحول، زارا تو بہت ہی مصروف ہوگئیں پھر ''اماں'' کی نصیحت (اسماء عباس) کہ سسرال والوں کا خیال رکھنا، اونچی آواز میں بات نہیں کرنا۔ بلاوجہ میکے دوڑتی، چلی مت آنا۔ گھر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور صبح جلدی اٹھ جانا...... وغیرہ وغیرہ...... ان سارے جھمیلوں کے باوجود ''زارا'' نے ہمیں انٹرویو کے لیے وقت دیا، یہ ان کا اچھا اخلاق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ انٹرویو مکمل ہونے میں کافی وقت لگ گیا۔

س ''کیا حال ہے زارا جی؟ خوش ہیں اپنی ازدواجی زندگی میں۔''

ج ''جی اللہ کا شکر ہے اور ہاں جی الحمدللہ بہت خوش ہوں۔ اسد بہت اچھے ہیں۔ سسرال میں سب اچھے ہیں۔''

س ''اماں کی نصیحتوں پہ عمل کر رہی ہو؟''

ج ہنستے ہوئے ''جی جی...... اماں تو روزانہ فون پہ اور ملاقات پر ڈھیروں ہدایات جاری کرتی ہیں۔ جو میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔''

س ''میکے جانے کے لیے دن طے کیا ہو گا...... جیسا کہ عموماً لڑکیاں طے کرتی ہیں؟''

ج ''کوئی خاص دن نہیں ہے...... کبھی اسد کے ساتھ چلی جاتی ہوں تو کبھی نہیں بھی جاتی...... امی بھی کہتی ہیں کہ روز روز مت آیا کرو۔ امی کی ایک مزے دار بات بتاؤں...... ایک دن کہنے لگیں کہ ''اگر ایسا ہوا کہ میں تمہارے گھر آئی ہوں اور تم اپنے کمرے میں اور تمہاری ساس کچن میں ہوئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' امی کہتی ہیں کہ صبح جلدی اٹھ جایا کرو کہ سسرال میں دیر تک سونا اچھی بات نہیں ہے اور سب باتوں پہ عمل کرتی ہوں۔''

س ''بڑی بات ہے...... ورنہ مائیں بے شک اچھی باتیں سکھاتی ہیں مگر اتنی نہیں ...... بلکہ اکثر نصیحت کی جاتی ہے کہ گھر کے کام مت کرنا تم بہو ہو میڈ نہیں ہو؟''

ج ''ارے نہیں بھئی...... اماں آج کل کی ماں تو لگتی ہی نہیں ہیں...... بہت پرانی روح ہے، جب پائیں بہت اچھی اچھی باتیں سکھایا کرتی تھیں...... ایک دن ہمارے گھر (سسرال) میں دعوت تھی تو امی نے مجھے صبح ہی صبح فون کیا ''سو تو نہیں رہیں'' آج گھر میں دعوت ہے سب کام کرنے ہیں تمہیں...... کبھی میرا رات میکے میں رہنے کو دل کرے تو امی فوراً کہتی ہیں...... کیا کرنا ہے رات رہ کر......

اپنے گھر میں خوش ہو تو بس ٹھیک پھر اسد بھی اکیلا ہو جائے گا......کوئی ضرورت نہیں رات رہنے کی۔"

س "اور تمہارا ٹی وی پہ کام کرنا سب کو پسند ہے؟"

ج "جی ...... بالکل سب کو بہت پسند ہے کیونکہ ہم دونوں کی فیلڈ ایک ہی ہے......اس لیے نہ انہیں اعتراض ہے اور نہ ہی میرے سسرال والوں کو۔"

س "گڈ......اپنے بارے میں اور اسد کے بارے میں کچھ بتاؤ اور شادی کو کتنے ماہ ہو گئے ہیں؟"

ج "جی ...... میرے میاں صاحب کا پورا نام "اسد آفتاب صدیقی" اور یہ معروف آرٹسٹ "عدنان صدیقی" صاحب کے بھانجے ہیں ہماری شادی 29 دسمبر 2017ء کو ہوئی......نکاح 28 دسمبر کو ہوا اور استقبالیہ 29 دسمبر کو ہوا اور اپنے بارے میں کیا بتاؤں......میرے بارے میں تو سب جانتے ہی ہیں کہ میں کون ہوں۔ کس کی بیٹی ہوں۔"

س "شادی میں آپ دونوں کی پسند کا عمل دخل کتنا تھا؟"

ج "جی ...... شادی ہماری پسند سے ہوئی، ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے، اگرچہ ہم دوست نہیں تھے، مگر ایک دوسرے کو جانتے تھے، ان سے ملاقات "سجل علی" کے ذریعے سے ہوئی۔ سجل علی میری بھی بہت اچھی دوست ہے اور اسد کی بھی ......تو سجل نے مجھے اسد سے ملوایا پھر بشریٰ خالہ (بشری انصاری) نے ہمیں ملوایا کیوں کہ وہ اسد کے ساتھ کام کر چکی تھیں اور ان کا آپس میں بہت پیار ہے......تو جناب اس طرح ملاقاتیں ہوئیں اور ہم دونوں کی طرف سے گھر والوں کو گرین سگنل ملا تو بات آگے بڑھی۔"

س "شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

ج "الحمد للہ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ کھانا بھی وافر مقدار میں بنا تھا اور کھانا کم بھی نہیں ہوا......البتہ ہم دونوں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور ہمیں لوگ آ آ کر بتا رہے تھے کہ کھانا ایسا تھا، ویسا تھا، یہ پکا ہوا تھا، ایسا پکا ہوا تھا......میٹھے میں فلاں چیز بہت اچھی تھی۔ آئس کریم بہت مزے کی تھی اور ہم خوش ہو رہے تھے کہ سب کچھ اچھا ہو گیا......مگر ہم دونوں نے

کھانا نہیں کھایا...... سب مصروف جو بہت تھے۔"
س "نکاح کے وقت اداس تھیں، روئی تھیں؟"
ج "جی...... نکاح کے وقت میں بہت خوش تھی۔ بہت زیادہ خوش تھی...... بالکل بھی اپ سیٹ نہیں تھی اور نہ ہی اداس تھی، میرے امی، ابو بھی بہت خوش تھے کیونکہ اسد ایک بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ میری فیملی بہت خوش تھی۔ میں بہت خوش تھی۔"
س "منگنی کے دوران ملاقات وغیرہ ہوتی تھی، آنا جانا رہتا تھا؟"
ج "ہماری منگنی اگست میں ہوئی تھی اور نکاح جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا دسمبر میں ہوا...... ان دنوں میں کراچی میں کام کر رہی تھی تو ہماری فیملی کا ملنا جلنا شروع ہو گیا تھا اور ہم واٹس ایپ پہ، فون پہ کافی بات چیت کرتے رہتے تھے اور ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے ہمیشہ۔"
س "رسمیں ہوئی تھیں؟"
ج "نہیں کوئی رسمیں نہیں کی تھیں، جیسا کہ ہوتا ہے کہ جوتا چھپائی ہے، یا دودھ پلائی ہے، بس رستہ رکوائی کی رسم ہوئی تھی، وہ بھی اسد کی بہنوں نے کی تھی اور بھابیوں نے، جب ہم رخصت ہو کر گھر گئے تھے "سسرال" گھر جاتے ہی "ان" کی امی نے مجھے میٹھا کھلایا تھا...... باقی لوگوں نے گھر میں ہی گفٹ وغیرہ دیے تھے...... اور ان سے فارغ ہو کر جب ہم کمرے میں گئے تو اسد اور میں نے دو نفل شکرانے کے پڑھے تھے...... سارا ایونٹ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا اور ہم دونوں نے اور سب نے بہت زیادہ انجوائے کیا۔"
س "شادی کے بعد گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا...... اور "اسد" کو شادی کے بعد کتنا بدلا ہوا پایا آپ نے؟"
ج "ہم لوگ پنجابی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ اسد کی فیملی کا تعلق کراچی سے ہے۔ تو ماحول میں فرق تو تھا اور خاصا تھا...... بلکہ اچھا خاصا تھا...... لیکن گھر کے ماحول میں وہی محبت، وہی پیار اور سب کچھ تھا جو ہمارے گھر میں تھا اور ہے اور جس طرح ہمارے گھر میں بہن بھائیوں میں اور آپس میں محبت ہے اسی طرح ان کے گھر میں بھی ایک دوسرے سے بہت پیار محبت ہے اور سب کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے۔ جس طرح میرے ابا گھر کے بڑے ہیں، تو ہمارے میکے میں بھی ساری فیملی ہمارے گھر میں جمع ہوتی ہے۔ اس طرح اسد کے گھر میں بھی فیملی کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں خواہ عید ہو یا کوئی بھی تہوار ہو تو کافی گہما گہمی ہوتی ہے اسد کے گھر میں...... جیسا میں نے اپنے گھر میں دیکھا ویسا ہی پیار محبت میں سسرال میں بھی دیکھتی ہوں۔"
س "اسد کو کیسا پایا؟"
ج "اسد بہت اچھے ہیں، ابھی تک تو بہت ہی اچھے شوہر ثابت ہو رہے ہیں...... دیکھیں جس گھر میں رشتوں کا احترام ہوگا۔ رشتوں کی اہمیت ہوگی وہاں کا ہر فرد اچھا ہوگا...... یہی بات ہے کہ اسد نہ صرف بہت اچھے انسان ہیں بلکہ بہت اچھے شوہر بھی ہیں۔"
س "عموماً شادی سے پہلے مرد کچھ اور ہوتے ہیں اور بعد میں کچھ اور تو کیا اسد ایک روایتی شوہر ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کا سارا کام ان کی بیگم ہی کرے؟"
ج "اسد بالکل بھی ایسے نہیں ہیں کہ جو شادی سے پہلے کچھ اور ہوں اور بعد میں کچھ اور...... اور نہ ہی روایتی شوہر۔ ان کی بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ صبح کا ناشتہ میں ان کو بنا کر دوں اور پھر ناشتہ ہم دونوں ساتھ کریں...... اس کے علاوہ اور کوئی ایسی بات نہیں ہے ان میں کہ وہ رعب ڈال کر کہیں کہ یہ کر دو وہ کر دو، میرا خود ہی دل کرتا ہے ان کے کام کرنے کو، میں ان کے کپڑے بھی خود ہی استری کرتی ہوں۔ ان کے وارڈ روب کا خیال رکھتی ہوں۔ ان کے شوٹ کے کپڑے میں خود انہیں نکال کر دیتی ہوں۔"

س ''ٹی وی پہ کام کرنے پر اعتراض تو نہیں کرتے؟''

ج ''نہیں بالکل بھی نہیں اور میں اپنے کام کے لیے اتنی کانشس نہیں ہوتی جتنی اسد میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں......انڈراسٹینڈ کرتے ہیں اور اگر اسد کی سپورٹ نہ ہو تو میں آج جو کچھ کر رہی ہوں شاید نہیں کر پاؤں گی۔ کیونکہ پھر مجھے ان کی ضروریات کے لیے ٹائم دینا پڑے گا......لیکن وہ مجھے پورا موقع دیتے ہیں کہ میں ٹی وی پہ دل لگا کر کام کروں۔ انہوں نے مجھ پر کسی بھی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی، میں خود ہی کچھ کروں تو کروں۔ وہ مجھے فورس نہیں کرتے۔''

''نئی دلہن سے پہلے کھیر پکوائی جاتی ہے۔آپ نے پکائی تھی؟''

''میری ساس نے اور میرے سسر نے تو کچھ بھی میٹھا پکانے کو نہیں کہا......لیکن میں نے خود سے ہی چکن کڑاہی بنا کر کھلائی تھی پنجابی اسٹائل کی، پھر میٹھا بھی بنایا......اور پھر آہستہ آہستہ کھانا بنانا شروع کیا، کبھی چائنیز بناتی ہوں۔ کبھی سوپ بناتی ہوں کبھی کانٹی نینٹل کھانے پکاتی ہوں اور جتنا بھی بناؤں، بہت خوش ہوتے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں اور انہوں نے کبھی خواہش ظاہر نہیں کی نہ ہی فرمائش کی کہ یہ بنا کے دو، وہ بنا کے دو...... بہت کوآپریٹو اور بہت سپورٹر ہیں میرے سسرال والے۔الحمدللہ۔''

س ''سسرال میں سب سے قریب کس کے ہو؟''

ج ''میرا سب سے قریبی رشتہ میری درمیانی جٹھانی ''اریبہ'' اور سب سے چھوٹی نند ریحام کے ساتھ ہے، میری ان کے ساتھ بہت زیادہ دوستی ہے اور بہت قریب ہوں میں ان کے اور میرے دو جیٹھ ہیں ان کے ساتھ بھی میری بہت اچھی دوستی ہے۔ بڑی نند کے ساتھ بھی اچھی دوستی ہے مگر جٹھانی اور چھوٹی نند کے ساتھ بہت زیادہ دوستی ہے اور اللہ تعالیٰ اس دوستی کو قائم و دائم رکھے۔(آمین)۔''

س ''آپ کی اور اسد کی شادی کی سب سے زیادہ خواہش مند سُنا ہے کہ بشریٰ انصاری صاحبہ تھیں؟''

ج ''انہوں نے ایک ڈرامہ سیریل کیا تھا اسد کے ساتھ...... ''تا کے کی آئے گی بارات'' اس میں انہوں نے ولی کا رول کیا تھا......بس خالہ کو یہ اتنے پسند آئے کہ انہوں نے کئی بار مجھے کہا کہ ایک بار اس سے مل تو لو......ان کی شدت سے خواہش تھی کہ میری اور اسد کی شادی ہو جائے......سو وہ کامیاب ہو گئیں اور الحمدللہ میں بھی بہت خوش ہوں۔''

س ''اسد کی کوئی بات جو تمہیں بہت پسند ہو؟''

ج ''اسد بہت سادہ مزاج اور بہت زیادہ پوزیٹو سوچ رکھنے والے انسان ہیں۔موڈ آف کر کے بیٹھنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ کسی بات پر بحث ہو تو کہتے ہیں کہ بس بھئی ختم کرو......اس بحث کو۔''

س ''غصہ آتا ہے اسد کو؟''

ج ''بہت کم آتا ہے......مگر وہی بات کہ جب آتا ہے تو بہت شدید آتا ہے......ویسے ابھی ایسا سنا ہی ہے ابھی میں نے ان کا غصہ دیکھا نہیں ہے۔''

س '' اسد کی شاپنگ اپنی پسند سے کرتی ہیں یا رائے لیتی ہیں؟''

ج ''میں......ان کی شاپنگ خود ہی کرتی ہوں۔ کیونکہ مجھے ان کے لیے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔''

اس نئے جوڑے سے بہت سے سوالات کرنے تھے مگر بدقسمتی کہ ان کے پاس ہمارے لیے وقت ہی نہیں تھا......چلیں......ان شاءاللہ پھر کبھی سہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

شگفتہ بھٹی

افسانے، ناولز اور ڈراموں کی دنیا کا ایک بڑا نام شگفتہ بھٹی ہے۔ آج کل ان کا ایک ڈراما سیریل ''بے دردی'' آن ایر ہے جو کہ ایڈز کے موضوع پر مبنی ہے اور یہ پہلا ڈرامہ سیریل ہے جس میں ایڈز کے مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے۔ اب اس کے بعد یقیناً ایک کے بعد ایک سیریل بننا شروع ہو جائیں گے مگر شگفتہ کا نام سرفہرست رہے گا کہ انہوں نے اس بولڈ موضوع کو ڈراما کی شکل میں پیش کیا۔ ایڈز جان لیوا اور ایک طرح سے بدنام بیماری ہے مگر بے گناہ بھی اس میں پھنس جاتے ہیں اور لوگ انہیں برا سمجھتے ہیں۔ شگفتہ بھٹی کو اس موضوع پر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اس بارے میں آپ بھی تفصیل جانیے۔

''کیا حال ہیں شگفتہ؟''

''جی اللہ کا شکر ہے۔''

''بے دردی سیریل لکھ رہی ہیں، بہت ہی عمدہ ہے۔ اتنے نازک اور خطرناک موضوع پر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟''

''بے دردی کی کہانی کسی حد تک سچی کہانی ہے، یہ 2009ء کی بات ہے۔ میری ایک دوست جو کہ ڈاکٹر ہیں۔ یہ کہانی ان کی ایک مریضہ کی ہے جو ایڈز کے مرض میں مبتلا تھی اور ماں بننے والی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس کے سسرال والے لینڈ لارڈز ہیں اور وہ خود ایک غریب ماں باپ کی بیٹی ہے۔ اس کے شوہر نے شادی سے پہلے اسے کہیں دیکھا اور اپنی ماں سے ضد کی کہ مجھے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر اسے بڑی دھوم دھام سے بیاہ کر لے گئیں۔ جس پر سب لوگ بہت حیران تھے کہ اتنے دولت مند لوگ کس طرح ایک غریب لڑکی کو بیاہ کر لے آئے، مگر اس مہربانی کے پیچھے اس کے ماں باپ کی خودغرضی شامل تھی کیونکہ بیٹا ایڈز کا مریض تھا اور وہ اس کے مرض کو دنیا سے چھپائے بیٹھے تھے اور جب بعد میں بات کھلی تو اس غریب لڑکی پر بدکرداری کا الزام لگا کر گھر سے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔ بس یہیں سے میرے ذہن میں ایڈز جیسے موذی مرض پر قلم اٹھانے کا خیال آیا۔ میں نے پہلے اس پر ایک کالم لکھا اور پھر کہانی...... مگر مجھے لگتا تھا کہ اس موضوع پر ڈراما سیریل بھی بننا چاہیے۔ برسوں یہ بات میرے ذہن میں رہی، کئی بار لکھنا چاہا مگر پھر کسی اور کہانی پر کام شروع ہو جاتا تھا۔''

''پھر کس طرح بات طرح آگے بڑھی، آپ اپنی کہانی کس کے پاس لے کر گئیں؟''

''میں چاہتی تھی کہ یہ کہانی کوئی بڑا چینل لے اور ڈرامے کی شکل میں اسے پیش کیا جائے۔ میں چونکہ زیادہ تر ''اے آر وائی'' کے لیے لکھ رہی تھی چنانچہ یہ کہانی میں نے ایک پروڈکشن ہاؤس کے ذریعے اس چینل کو بھیجی جو یہ کہہ کر واپس کر دی گئی کہ اگرچہ کہانی بہت جان دار ہے مگر ایڈز کا موضوع اٹھانا مشکل ہے۔ ڈراما چونکہ فیملیز دیکھتی ہیں تو اس کہانی کو دکھانا اور بیان کرنا سنسر کے لحاظ سے ناممکن ہے مگر ایک پروڈیوسر کو کہانی اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اسے ہر حال میں بنانے کی ٹھان لی اور یہ پروڈیوسر بھی اے آر وائی کے ہی تھے۔ انہوں نے دوبارہ چینل سے بات کی اور آخر کار کہانی کو منظور کرا لیا۔ یوں اس سیریل کو لکھنے کا سفر شروع ہوا۔''

''ایک مشکل موضوع پر قلم اٹھایا تو کچھ ریسرچ ورک بھی کیا ہوگا تاکہ لوگوں کو اس مرض کے بارے میں صحیح طور پر گائیڈ کیا جا سکے؟''

''ایڈز پر سیریل لکھنا بے حد مشکل کام تھا۔ بغیر ریسرچ کے تو ہم کچھ بھی نہیں لکھ سکتے تھے کیونکہ ایسے ڈراموں کو لوگ بہت توجہ کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جب کوئی ایسے مرض میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس بات کو تلاش کرتا ہے کہ کوئی پوزیٹو نقطہ مل جائے چنانچہ پہلے تو میں نے اس مرض کے بارے میں بہت ریسرچ کی، اپنی ڈاکٹرز فرینڈز جس میں گائناکالوجسٹ، اسکن، اسپیشلسٹ اور کینسر اسپیشلسٹ سے رابطہ کیا چونکہ ایڈز کے مریضوں کا زیادہ تر علاج اسکن اسپیشلسٹ کرتے ہیں تو میری اس ڈاکٹر دوست نے کئی ایسے مریضوں سے ملوایا جو ایڈز کا شکار تھے اور ان کی اپنی کہانیاں بہت دردناک اور افسوس ناک تھیں اور بہت دکھی کر دینے والی تھیں اور زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ جن خواتین سے میں ملی ان میں زیادہ تر خواتین بے گناہ' بے قصور اور باکردار تھیں مگر اپنے آوارہ مزاج شوہروں کی وجہ سے اس مرض کا شکار ہوئیں اور نہ صرف اذیت ناک

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں مکمل پڑھ کر
بچے میری پوٹر کو بھول جائیں گے ایسی داستانیں
جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ جنری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
میں آرڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

زندگی سے دوچار ہوئیں بلکہ اپنے گھر والوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کی نفرت کا شکار بھی ہوئیں۔ میں ان سب کی کہانیاں لکھنا چاہتی تھی' ان کے ساتھ ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کو منظر عام پر لانا چاہتی تھی مگر اب ہمارے یہاں سیریز کا رواج ختم ہو گیا ہے لہٰذا سیریل کے لیے کہانی لکھی۔"

"تیاری کے عمل میں اکیلے سفر کیا یا ٹیم کا تعاون ساتھ رہا۔"

"نہیں میں اکیلی نہیں تھی بلکہ میرے ساتھ چینل کی کانٹینٹ ٹیم کی پوری لگن شامل تھی۔ ہم لوگ بہت محتاط تھے کہ کہیں کوئی غلط معلومات نہ چلی جائیں' کہانی کے کردار نہ مرجائیں۔ کہانی کا چارم برقرار رہے اور کہانی کا اصل پیغام بھی پوری تفصیل کے ساتھ لوگوں تک پہنچ جائے۔ ایک ایک قسط کو بعض اوقات تین تین بار لکھا گیا۔ میرے ساتھ ایڈز کے ہر ہر اینگل سے ریسرچ میں میری بھانجی عنزہ جو سائیکلوجسٹ ہے، میری دوست ڈاکٹر نازش جو ماہر امراض جلد ہے اور ڈاکٹر قرۃ العین جو کینسر اسپیشلسٹ ہیں میرے ساتھ ساتھ رہیں۔ "بے دردی" کو لکھنے کا عمل بہت محنت طلب اور تھکا دینے والا تھا مگر ایڈز کا مرض اور اس سے متاثر مریضوں کی اذیت ناک زندگی مجھے مجبور کر رہی تھی کہ معاشرے کے عام لوگوں تک اس مہلک اور جان لیوا مرض کے بارے میں آگاہی دی جائے۔"

"ایڈز کے لیے ایک ہی تصور ہے کہ یہ غلط اور ناجائز تعلقات کی وجہ سے مرد اور عورت میں منتقل ہوتا ہے اور اس وجہ سے لوگ اس مرض کے شکار لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہیں کیا؟"

"ایک وجہ تو ہم اور آپ سب کو ہی معلوم ہے جو کہ نفرت کا باعث بھی بنتی ہے اور دوسری وجہ "انتقال خون" ہے اور تیسری وجہ متاثرہ مریض کی اشیا کا استعمال ہے۔ جہاں ریزر، ٹوتھ برش، ہیر برش، سرنج...... یہاں تک کہ میں نے ریسرچ کے دوران درزی کو بھی مرتے دیکھا (ایڈز) جو ایک دوسرے ساتھی کی سوئی استعمال کرتا تھا، دونوں کو سوئی منہ میں رکھنے کی عادت تھی، پہلی وجہ میں زیادہ قصور وار مرد ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیوی یا کوئی بھی لڑکی اس مرض کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"تو کیسے اندازہ ہو کہ فلاں کو ایڈز ہے اس سے دور رہا جائے؟"

"ایڈز سے بچاؤ کے لیے بہت ضروری ہے کہ اپنے بچوں کی شادی سے پہلے ان کے ہونے والے لائف پارٹنر کے ایچ آئی وی ٹیسٹ کرالیے جائیں تاکہ معصوم زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائیں اور ویسے بھی کسی کی استعمال شدہ چیز خود استعمال نہ کریں کہ خدا جانے اس کے اندر کون سے جراثیم ہوں۔ یاد رکھیں ایچ آئی وی پازیٹو ایڈز نہیں ہوتا بلکہ یہ ایڈز کی انتہائی ابتدائی اسٹیج ہے جس کا کافی حد تک علاج موجود ہے اور اگر بروقت علاج شروع ہو جائے تو مریض کئی سال تک اچھی زندگی گزار سکتا ہے۔ علاج سے اس کا مدافعتی نظام بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈز کے تین اسٹیجز ہوتے ہیں اور آخری اسٹیج بہت دردناک اور اذیت ناک ہوتا ہے جو مریض کو آہستہ آہستہ موت کی طرف لے جاتا ہے اور یہی ڈراما سیریل "بے دردی" کی کہانی ہے۔"

"بہت خوب صورت انداز میں آپ کہانی کو آگے لے کر چلی ہیں۔ ایڈز کا نام سنتے ہی ہیرو کی ماں بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیا پھر اسے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے؟"

"ہاں جی...... بالکل پتا چلتا ہے اور تب ہی وہ اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنے کی خاطر معصوم بچی بیبہ سے اس کی شادی کر دیتی ہے۔ شافع کو یہ مرض اپنے دوست روحیل کی چیزیں استعمال کرنے سے لگتا ہے۔ بیبہ کو چونکہ مرض کی ابتدا میں ہی پتا چل جاتا ہے تو وہ اپنا علاج کرواتی ہے اور پریگنینسی میں اس کا مکمل

علاج کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی پیدا ہونے والی بیٹی ایچ آئی وی پازیٹو نہیں ہوتی۔"

"یوں تو اس سیریل کی کامیابی میں سب کا ہی حصہ ہے مگر آپ کسی خاص کا نام لینا چاہیں گی؟"

"بالکل لینا چاہوں گی، ڈرامے کے پروڈیوسر "عبداللہ سیجا" اور ڈائریکٹر احمد بھٹی نے بہت محنت کی۔ عبداللہ نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ پروجیکٹ کو اپروو کرایا اور احمد بھٹی نے اسے اپنی ڈائریکشن کے ذریعے بہت خوب صورت بنایا اور میں یہ بھی واضح کردوں کہ "بے دردی" ایڈز کے موضوع پر پہلا ڈراما سیریل ہے۔ اس سے پہلے کہانیاں ضرور آئی ہوں گی لیکن سیریل پہلا ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس بولڈ سبجیکٹ کو لوگوں کے سامنے لے کر آؤں اور ایک پیغام بھی ہے اس میں کہ کس طرح اس سے بچا جاسکتا ہے اور کیا علامات ہوتی ہیں۔ اب میرے بعد یعنی میرے سیریل کے بعد اس موضوع پر اگر کوئی سیریل منظر عام پر آیا تو وہ سیکنڈ سیریل ہوگا۔"

"ماں کو اپنی تربیت پر بہت یقین ہوتا ہے' اس کے باوجود جب ماں سنتی ہے کہ اس کے بیٹے کو ایڈز ہوگیا ہے تو وہ عجیب انداز میں چونکتی ہے، کیوں......؟"

"شافع کی ماں کا چونکنا بھی معاشرے کا ایک رویہ ہے کیونکہ اچھا ہونے کے باوجود اس بیماری کے نام سے لوگوں کے ذہنوں میں ایک ہی خیال آتا ہے کہ یہ بندہ کرپٹ ہے۔ معاشرے کا بگڑا ہوا انسان ہے حالانکہ اکثر انسان بے گناہ ہوتے ہیں تو ہمارا پیغام بھی یہی ہے کہ مریض کو کچھ نہ کہا کریں۔

مریض سے نفرت نہ کرے، مرض سے نفرت کریں اور بغیر کسی تحقیق کے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مریض سے نفرت ہے...... تو جب شافع کی ماں کو پتا چلے گا کہ بیٹا بے گناہ ہے تو وہ شرمندگی سے اور اس کی بے گناہی پر بہت روئے گی اور دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹرز کو بھی پہلا خیال یہی آتا ہے کہ بندہ کرپٹ ہوگا۔ اس کے ناجائز تعلقات ہوں گے تب ہی اسے یہ بیماری ہوئی تو ہمیں اس نظریہ کو بدلنا ہے کہ ہر ایڈز کا مریض برا نہیں ہوتا، نہ کرپٹ ہوتا ہے۔ پہلے وجوہات تلاش کریں پھر نفرت کریں یا اسے برا کہیں۔"

"سیریل میں اداکاروں کا انتخاب بہت اچھا ہے، مگر ایک دو فنکار ایسے ہیں جو مایوس کررہے ہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جی' میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں مگر ایسا ہوجاتا ہے، جنہیں ہم بہت اچھا سمجھ کر لیتے ہیں وہ مایوس کرتے ہیں اور جنہیں ضرورتاً یا مجبوراً لیتے ہیں وہ بہت اچھا پرفارم کرتے ہیں۔ آپ جن کی پرفارمنس سے مطمئن نہیں ہیں' ہم بھی اور ہماری ٹیم بھی مطمئن نہیں ہے۔"

"بہت شکریہ شگفتہ! ٹائم دینے کا اور اس پیغام کو دور دور تک پھیلانا چاہیے کہ ایڈز کے مریض سے نفرت نہ کریں، مرض سے نفرت کریں۔" ☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

نورین حفیظ

سب سے پہلے تو آپ کو یہ سلسلہ شروع کرنے پر مبارک باد۔ میری کہانی تھوڑی سی مختلف ہے۔ مگر یہ بھی ہے کہ شادی کے بعد کیسے بھی حالات پیش آسکتے ہیں۔

سوال ''شادی کب ہوئی؟''

ج ''2 جون 2002ء میں۔''

سوال'' شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟''

ج ''شادی سے پہلے زندگی متحرک تھی۔ مصروفیت ہی مصروفیت تھی۔ مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ ابو اور بہن بھائی مطالعہ کے شوقین تھے۔ جب میں چھ سال کی تھی تو میرے ہاتھ میں بچوں کا اخبار دے کر کہا گیا تھا کہ امی کو پڑھ کر سناؤ۔ وہ دن اور آج کا دن رسالے ڈائجسٹ اخبار ناول غرض کوئی چیز بھی دسترس میں ہو اور وہ بغیر پڑھے رہ جائے ناممکن۔ آٹھ یا نو سال کی عمر میں ہی نسیم حجازی ابن صفی، ایم کلیم، رضیہ بٹ اور نادرہ خاتون اور نامعلوم کیا کیا پڑھ ڈالا۔ جب کہ کچھ چیزیں تو سر پر سے گزر جاتی تھیں اور کچھ چیزیں خوف زدہ کر دیتی تھیں۔ خواتین ڈائجسٹ اور شعاع ڈائجسٹ کے پہلے شماروں سے (جبکہ عمر صرف چھ سال تھی) جنوری 2016ء تک کے شمارے پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔

کوکنگ کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ مگر بڑی بہنوں کے ہوتے ہوئے ہم کم کم ہی کچن میں جاتے تھے۔ مگر دونوں بڑی بہنوں کی شادی کے بعد کچن ہمارے انڈر میں تھا۔ مہمانوں کے آنے کے بعد ہم کچن میں جاتے تھے اور ہمارا ذہن چلنا شروع ہو جاتا تھا۔ کم از کم سات آٹھ قسم کے کھانے بنانے کے بعد دستر خوان لگاتے تھے اور مہمانوں کے ساتھ ساتھ امی سے بھی تعریفیں وصول کرتے تھے۔ متحرک اتنے کہ گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ مشین ایمبرائیڈری، کٹنگ، سلائی، فلاور میکنگ، مکرامے، ٹتنگ، کروشیا ہر کام کرنے کا شوق۔ پڑھائی جو بچپن میں ادھوری رہ گئی تھی، اس کو شروع کیا۔ پچیس سال کی عمر میں پرائیویٹ بی گریڈ سے میٹرک کیا۔ انٹر کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پی، ٹی، سی فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ اس کے بعد پرائیویٹ سکول میں پڑھایا۔ امی ابو کا خیال رکھنا ان کو اسپتالوں میں لے کر جانا، ان کے ساتھ ہاسپٹل میں رہنا، بہن بھائیوں کی شادیوں میں ساری ذمہ داری اٹھانا۔ امی سے صرف اتنا کہنا ہوتا امی ایسے کرلیں۔ امی ایسے کرلیں۔ امی کی طرف سے فل سپورٹ۔ ہر چیز میں ہر بات میں اپنی مرضی چلانا۔ پورے خاندان سب ملنے والوں میں ہر دل عزیز۔ مگر ہمیں نہ کسی ستائش اور غرض کی پرواہ۔ ہر لمحہ فعال۔''

سوال ''اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟''

ج ''یہ رشتہ امی کے انتقال کے ڈیڑھ ماہ بعد جڑا۔ اس لیے ہمیں شادی میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ مگر کیونکہ والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور بھائیوں کو اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ اس لیے ہم راضی ہو گئے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہ ہی منظور تھا۔ کیونکہ امی کہتی تھیں کہ میرا دل چاہتا ہے میری زندگی میں ہی ان دونوں (دوسری بہن) کی بھی شادی ہو جائے۔ مگر پھر یہ سوچتی ہوں کہ میں ان کے بغیر کیسے رہوں گی۔''

سوال ''ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟''

ج ''ذہن میں تو بہت کچھ تھا۔ بہت زیادہ تعلیم، بہت اچھی جاب، اچھا گھر لونگ کیرنگ، لمبا چوڑا،

اسمارٹ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر، احسان ہے کہ زیادہ تعلیم اور اچھی جاب تو نہیں تھی۔ مگر بندہ بہت زیادہ کیئرنگ اور لونگ ملا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ باقی ساری باتیں حرف غلط کی طرح سے مٹ گئیں اور صرف وہ بندہ اور اس کی باتیں یاد رہیں۔''

سوال ''منگنی کتنے عرصے رہی؟ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟''

ج ''منگنی تو نہیں۔ صرف زبانی رشتہ ہوا تھا اور وہ تقریباً دو مہینے رہا کیونکہ امی کا چہلم کر کے بھائی جان سعودیہ چلے گئے تھے۔ ان کو جب رشتے کا پتا چلا تو انہوں نے کہا کہ میں یہ آخری فرض بھی اپنے ہاتھوں سے پورا کروں گا۔ اس لیے میرے آنے کے بعد شادی کی تاریخ دی جائے۔ 22 مئی کو وہ اچانک آ گئے اور 2 جون کو ہماری شادی ہوئی۔ رہی فون یا ملاقات۔ تو مجھے تو امی کی یادوں سے ہی فرصت نہیں تھی۔ جو میں ان سے ملنے یا فون پر بات کرنے کا سوچتی۔ حالانکہ حفیظ کی بہت خواہش تھی کہ میں ایک مرتبہ ان سے مل لوں۔ میرے بہن بھائیوں نے بھی بہت کہا مگر میں نے انکار کر دیا، یہاں تک کہ میں نے ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔

امی کی زندگی میں ہر بات میری چلتی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ بہنیں یہ نہ سوچیں کہ یہ ہر بات میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔ اور شادی بھی اپنی مرضی سے کی۔ ویسے بھی آپ ایک نظر دیکھ کر کیا کر سکتی ہیں، ہوگا تو وہی جو آپ کے نصیب میں ہے۔ اور الحمد اللہ میرا نصیب بہت اچھا ہے۔''

سوال ''شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟''

ج ''بہت اچھے خیالات تھے۔ کیونکہ ہم ایک جوائنٹ فیملی میں رہ رہے تھے۔ ہماری دو بھابھیاں تھیں اور ہم لوگ پانچ بہنیں تھیں۔ دو بہنوں کی شادی کے بعد ہم لوگ تینوں بہنیں اور دونوں بھابھیاں ایسے رہتے تھے کہ پورا محلہ رشک کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں کبھی کسی بات پر اختلاف نہیں ہوا۔ ہمارے ابو/امی ہم سے زیادہ ہماری بھابھیوں کا خیال رکھتے تھے، ہمارے تینوں بھائی بہت ہی اچھے تھے انہوں نے ہمیں پڑھایا لکھایا، شادیاں کیں اور ابھی بھی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں، مگر میرا سسرال کشمیر میں تھا اور یہ اکیلے کراچی میں رہتے تھے۔ مگر ہمارے گھر کے اوپر پورشن میں ان کی سابقہ سالی صاحبہ براجمان تھیں اور ایک سالی پڑوس میں۔ ان دونوں نے پورے سسرال کی کسر پوری کر دی، حفیظ کی پہلی بیگم آٹھ سال بریسٹ کینسر میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئی تھیں۔''

سوال ''شادی کے بعد تعلیم چھوڑنی پڑی یا کوئی قربانی دینی پڑی؟''

ج ''شادی کے بعد صرف اپنی مصروفیات کی قربانی دینی پڑی۔ کیونکہ گھر کا کام تو ایک گھنٹہ میں ختم ہو جاتا تھا اور مجھے ادھر ادھر جانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے دن گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔''

سوال ''شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے درمیان لین دین کے معاملے میں بدمزگی ہوئی؟''

ج ''شادی بہت اچھی اور بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ کیونکہ میں جس چیز کو منع کرتی۔ بھائی جان کہتے تم خاموش رہو۔ سب کی شادیوں میں اتنا شور کرتی تھیں کہ یہ بھی ہوگا وہ بھی ہوگا اب تمہاری شادی میں بھی سب کچھ ہوگا۔ الحمد للہ سب کام بخیر و خوبی ہوئے۔ رخصتی میں سب لوگ بہت روئے یہاں تک کہ ملنے والے بھی اور بھائی جان نے حفیظ سے کہا کہ یہ میری سب سے اچھی بہن ہے۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔ اس بندے نے اس بات پر اتنا عمل کیا کہ آخری دم تک میرا بہت زیادہ خیال رکھا۔''

سوال ''شادی کے بعد آپ کو دیکھ کر شوہر نے کیا کہا؟''

ج ''دیکھ تو انہوں نے مجھے اسٹیج پر ہی لیا تھا۔ اپنے دوست سے کچھ کمنٹ کیے ہوں تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھ سے اتنا کہا کہ جائیے کپڑے چینج کر کے آئیے، بہت گرمی ہے۔''

سوال ''شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟''

ج ''شادی کے بعد زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ وہ نورین جو بڑی پھنے خان تھی۔ اس کی بولتی بالکل بند ہوگئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مکان کے لیے لڑائی جھگڑے، کورٹ کچہری تھانے تحصیل سب شروع ہو گئے کیونکہ مکان ان کی پہلی بیگم کے نام لیز تھا اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں سب بہن بھائیوں کا بھی شرعی طور پر حصہ بنتا تھا۔ کوئی خوش نصیب دن ایسا ہوتا تھا جب ہمارے گھر میں دنگل نہ ہوتا ہو۔ باہر لڑائیاں ہو رہی ہوتی تھیں اور میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر رو رہی ہوتی تھی۔ اور دعائیں مانگ رہی ہوتی تھی۔ کیونکہ نہ مجھے لڑنا آتا تھا اور نہ مجھ سے شور شرابا برداشت ہوتا تھا۔ آخر کار جب میری برداشت کی حد ختم ہو جاتی تھی تو میں ان کے درمیان میں آکر سب لوگوں کو ہٹاتی تھی۔

ایک بات ہے کبھی کسی بچے نے میرے ساتھ بدتمیزی نہیں کی۔ نہ اوپر والی سالی رفیعہ آپا کے بچوں نے، نہ برابر والی سالی کے بچوں، نے البتہ جانو آپا برابر والی سالی مجھے اور حفیظ کو ایسی ایسی گالیاں دے کر جاتی تھیں کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، مگر میں صرف اپنی امی کی نصیحت پر عمل کرتی تھی کہ بیٹا کیچڑ میں پتھر مارو گی تو تمہارے اوپر بھی چھینٹیں آئیں گے۔ یا یہ کہ کتے نے تو تمہیں کاٹ لیا تم کتے کو کہاں کاٹو گے۔

اوپر والی سالی کے آٹھ بچے ایک بہو۔ برابر والی سالی کے دس بچے ایک بہو۔ اور ہم دو میاں بیوی، مگر ایک بات ہے کہ جب رفو آپا کی اکلوتی بیٹی میرے ساتھ بدتمیزی کرتی تھی اور میں رو رہی ہوتی تھی۔ تو رفو آپا مجھ سے آکر معافی مانگتی تھیں اور مجھے گلے لگاتی تھیں۔ حالانکہ ان کے شوہر پرویز صاحب نے ہی سب کو کورٹ کا راستہ دکھایا تھا۔ میں حفیظ سے کہتی تھی کہ اس مکان کو چھوڑ دیں مگر وہ کہتے تھے کہ میری محنت کی کمائی اس پر لگی ہے میں اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ ہم نے سات سال کیس لڑا اور ساڑھے چار لاکھ روپے اس کیس پر لگائے مگر پھر بھی کمپرومائز کر کے اس گھر سے نکلنا پڑا۔ کیونکہ جانو بیگم نے بیس لاکھ کا مکان صرف ساڑھے چھ لاکھ میں کورٹ کے ذریعے سیل کروا دیا تھا۔ اس لیے شوہر سمیت سب بہن بھائیوں کو صرف ایک لاکھ تیس ہزار روپے ملے۔ اگر میں ان سات سالوں کا احوال لکھوں تو پورا ناول تیار ہو جائے۔''

سوال ''شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟''

ج ''شادی کے تیسرے دن۔ کیونکہ حفیظ کا تو کوئی رشتے دار کراچی میں تھا ہی نہیں اور جس نے ہماری شادی کروائی تھی۔ وہ اوپر والی سالی کی دیورانی تھیں۔ اس لیے وہ بھی ولیمے میں مہمانوں کی طرح

شرکت کر کے واپس چلی گئی تھیں۔ اس لیے ہم نے ولیمے کے دوسرے دن صبح کھیر مکس کا پیکٹ منگا کر کھیر بنائی۔ اس کے بعد پورے گھر کی صفائی کی۔ بارہ بجے کے بعد اپنے میکے پہنچے۔ حفیظ نے بھائی جان سے خوب ڈانٹ کھائی کہ اتنی دیر میں کیوں آئے۔ کیونکہ ہمارے سب رشتے دار واپس جانا شروع ہو گئے تھے۔"

سوال" کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟"

ج" ہمارے میاں جی ورلڈ کے کک تھے۔ انہیں ایک سے ایک کھانے پکانے آتے تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے میرے پکائے ہوئے کھانوں پر تنقید نہیں کی۔ البتہ انہوں نے شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی میری دعوت کی۔ یہ اس دن دوپہر میں اچانک گھر آ گئے۔ میں سالن پکانے جا رہی تھی۔ انہوں نے مجھے روک دیا۔ اور خود ہی ٹماٹر، ہری مرچوں اور ہرا دھنیا کی "دوری ڈنڈے" میں چٹنی بنائی۔ نمک کی لسی بنائی۔ تندوری نان کے اوپر مکھن لگا کر ہمیں لنچ کرایا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ کھانا کھایا تھا اور مجھے بہت مزہ آیا۔"

سوال" سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی، کن باتوں پر تنقید؟"

ج" میری اپنی سسرال جو کہ آزاد کشمیر میں ہے۔ وہاں تو میں شادی کے تین سال بعد گئی تھی۔ وہاں پر تو، مجھے اتنی محبت اور تعریف ملی کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی اور ابھی تک میری بہت تعریف ہوتی ہے کیونکہ میں تقریباً ڈیڑھ دو سالوں بعد چکر لگاتی رہتی ہوں۔ مگر حفیظ کی سابقہ سالیوں نے بھی میری بہت تعریف کی۔ وہ اپنے بچوں سے کہتی تھیں کہ دیکھو تم اب سو کر اٹھی ہو اور آنٹی نے سارا کام بھی کر لیا ان کے کپڑے بھی دھل گئے ان کا کھانا بھی پک گیا۔ مگر سب سے اچھی تعریف رفو آپا کے شوہر پرویز بھائی نے کی۔ جو کہ میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ نورین میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری امی کو دیکھتا اور ان سے ملاقات کرتا کہ انہوں نے تمہاری اتنی اچھی تربیت کی ہے۔

دوسری تعریف۔ میں حفیظ کے بینک جانے کے بعد (حفیظ بینک میں گارڈ تھے) قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ تو انہوں نے کہا کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برکتیں کیوں نہیں ہوں گی۔ جب اس کی بیوی شوہر کو آفس بھیجنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرے۔

شادی کے فوراً بعد یہ تنقید شروع ہو گئی تھی کہ نورین اتنی خوب صورت ہے اور حفیظ سے بہت چھوٹی بھی ہے۔ یہ تو پندرہ دن بعد ہی اس کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔

سسرال میں جیٹھ محلے والوں سے کہتے تھے کہ میں نے نورین کو کبھی ننگے سر نہیں دیکھا۔ اور جٹھانی نے تو مجھے اپنی چھوٹی بہن بنا لیا تھا۔ وہ بھی محلے والوں سے کہتی تھیں نورین میرے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے۔ میرے بچوں کے لیے اتنے مہنگے گفٹ لے کر آتی ہے۔ بچے میرے اخلاق اور پیار کے دیوانے تھے۔ کیونکہ میں ان کے چاچو کو پندرہ سالوں بعد کشمیر لے کر گئی تھی، چھوٹے بچوں کو تو اپنے چاچو کی شکل بھی یاد نہیں تھی۔ اس لیے سب بچے اپنے چاچو سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔"

سوال" سسرال نے آپ کو وہ مقام دیا۔ جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی گئی؟"

ج" جی ہاں میں نے جب سے سسرال جانا شروع کیا۔ وہاں مجھے بہت زیادہ عزت اور محبت ملی۔ یہاں تک کہ ہم دونوں میاں بیوی نے اپنی سب سے چھوٹی بھتیجی کا رشتہ بھی کروایا۔ ہم لوگ کراچی میں ہوتے تھے اور بانی اور ریاض ہمیں فون پر ایک ایک بات بتاتے تھے۔ جو کہ ان کی شادی شدہ بہنوں کو بھی پتا نہیں ہوتی تھی۔ ان کے پڑوسی بھی مجھ سے بہت

محبت کرتے تھے۔ پورے علاقے میں شور مچ جاتا تھا کہ کراچی والی چاچی اور چاچو آ رہے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ مئی میں کشمیر گئے تو 2 جون کو بچوں نے ہماری شادی کی سالگرہ بہت اچھے طریقے سے منائی تھی۔ باقاعدہ کیک اور ناشتے کا سامان بمع کولڈ ڈرنک کے آیا تھا اور سب بچوں نے ہمیں گفٹ دیے تھے اور ہمیں بہت مزہ آیا تھا۔

ریاض کی شادی سے ایک مہینے پہلے سے ہی فون آنا شروع ہو گئے تھے کہ آپ آ کر اپنے ہاتھوں سے ریاض کی شادی کریں۔ اس شادی میں ہم لوگوں نے بھرپور طریقے سے شرکت کی۔ شیروانی، غرارہ، عبایا اور دیگر سوٹوں اور سینڈلوں کے ساتھ ساتھ سونے کا لاکٹ بھی دلہن کو منہ دکھائی میں دیا اس شادی میں ہم نے تقریباً پچاس ہزار سے زیادہ خرچ کیا۔ مگر مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ حالانکہ اس وقت ہم کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ حفیظ بینک میں گارڈ تھے اور میں حجاب الحریم میں جاب کرتی تھی۔"

سوال "سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟"

ج "میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں کہ جتنی محبت اور اہمیت مجھے میکے میں ملی۔ حالانکہ میں اپنے بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر ہوں اتنی ہی سسرال میں۔ میری سوچ سے بھی زیادہ یہاں تک کہ میں اپنے اور حسین بھائی اور ان کی فیملی کو کشمیر لے کر گئی تو ان لوگوں نے اتنی زیادہ خاطر تواضع کی کہ حسین بھائی ابھی تک ان کی تعریف کرتے ہیں۔"

سوال "بچوں کی پیدائش عورت کے لیے بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے۔ خصوصاً پہلا بچہ۔ ایک طرف خود میں آتی تبدیلی، دوسری طرف شوہر اور سسرال والے، آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا؟"

ج "آہ، صرف اس سوال کی وجہ سے میں نے اپنی کہانی لکھی ہے۔ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ جب ہم کشمیر پہنچے تو ہمارے جیٹھ کے سات بچوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کے تین بچے کنوارے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ہم دونوں ہی بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے جیٹھ سے کہا کہ یہ تینوں بچے ہمارے ہیں، ہم ہی ان کی شادی کریں گے وہ تینوں بھی ہم سے بہت پیار کرتے تھے اور ہمیں چھوٹے اماں ابا کہتے تھے۔ وہ لوگ جو بھی فرمائش کرتے تھے۔ ان کو پورا کرنا ہمارا فرض ہوتا تھا۔ خاص طور پر ریحانہ کی۔ اس کے لیے میں ریڈی میڈ فراکس جیولری، سینڈلیں، میک اپ بکس غرض یہ کہ کیا کیا نہیں لے کر گئی اور وہ لوگ بھی اپنا سب کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ رہتے تھے۔

ہم دونوں فخر کرتے تھے کہ اگر ہماری اولاد نہیں ہے تو کیا ہوا؟ یہ تینوں تو بالکل ہماری اولاد کی طرح ہیں اور ویسے بھی ہم سے محبت کرتے ہیں میری تو خواہش تھی کہ میں کشمیر میں رہوں مگر ہمارے میاں جی نہیں مانتے تھے کہ جب تک میرے ہاتھ پیر چل رہے ہیں۔ مجھے کام کرنے دو۔ بعد میں کشمیر چلے جائیں گے۔ مگر یہ حسرت ہی رہی۔

ہم لوگ 21 جولائی 2012ء میں آخری مرتبہ کشمیر گئے، ہماری جٹھانی کو چیسٹ کینسر ہو گیا تھا ان کو دیکھنے۔ واپس آنے کے دس ماہ بعد 24 مئی 2013ء کو حفیظ کی بہت زیادہ طبیعت خراب ہو گئی، میں کشمیر والوں کو ایک ایک بات بتاتی تھی کہ آج تمہارے چاچو کی یہ رپورٹ آئی ہے۔ آج یہ رپورٹ۔ آج وہ اپنے بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔ آج بچوں کو۔

ریاض اس وقت سعودیہ میں تھا۔ وہ 6 جون کو کشمیر چھٹی پر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے اتنا کہا کہ تم کراچی اترنا اور اپنے چاچو سے ملتے ہوئے کشمیر جانا۔ مگر وہ سیدھا کشمیر چلا گیا۔ اس کے چاچو بار بار سوال کر رہے تھے۔ ریاض نہیں آیا اور میں ان کو تسلیاں دے رہی تھی۔ 8 جون کو حفیظ کو خون کی الٹیاں آئیں اور وہ کومے میں چلے گئے۔ 10 جون رات بارہ بجے وہ مجھے روتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی

کے پاس چلے گئے۔ وہ مہینہ جو میرے لیے خوشیاں لے کر آیا تھا۔ وہی میرے لیے غم کا پہاڑ بن کر آیا۔
میں نے ریحانہ کو فون پر بتایا کہ تمہارے چاچو چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے کسی کی کال اٹینڈ نہیں کی۔ وہ لوگ پوری رات مجھے فون کرتے رہے مگر میری آنکھوں اور کانوں میں حفیظ کی حسرت بھری نظریں اور آواز تھی۔ ”ریاض نہیں آیا“۔
دوسرے دن بھائی جان نے ریاض کی کال اٹینڈ کی اس نے کہا ”چاچو کی ڈیڈ باڈی بھیج دیں“۔
بھائی جان نے جواب میں کہا۔ ”تم آ کر لے جاؤ۔“ مگر ان لوگوں کو تو آنا ہی نہیں تھا اور پھر یہ بھی ہے کہ حفیظ کی مٹی کراچی کی تھی اس لیے ان کو نیو کراچی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ حالانکہ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں ان کو کشمیر بھیج دیتی۔ کیونکہ وہاں تو وہ لوگ پہاڑ کی چوٹی پر رہتے ہیں اور نیچے اترتے ہوئے ان کے آبائی قبرستان ہیں اس لیے وہ جب نماز پڑھنے جاتے ہیں یا آتے ہیں تو قبرستان کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔ کراچی میں تو کوئی مہینوں میں ہی ان کی قبر پہ جاتا ہے۔
سوال ” آپ جوائنٹ فیملی سے اتفاق کرتی ہیں۔ یا علیحدہ رہنا پسند کرتی ہیں؟“
ج ”میں مکمل طور پر جوائنٹ فیملی کے حق میں ہوں، کیونکہ ہمارے میکے کا ماحول بہت زبردست تھا اور سسرال کا بھی۔ جب اتنی زیادہ محبتیں ہوں تو چھوٹی موٹی باتوں کو درگزر کر دینا چاہیے۔“
سوال ” آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں کیں؟ اور آپ کس حد تک اس میں کامیاب رہیں؟“
ج ”میرے سسرال کا ماحول تو بہت اچھا تھا۔ بس وہاں پر مذہب کی کمی تھی۔ مکمل دیہاتی ماحول تھا۔ کسی کو بھی اردو بولنا نہیں آتی تھی۔“ میری وجہ سے انہوں نے کافی حد تک اپنے آپ کو تبدیل کیا...... اور سب نمازی ہو گئے۔ سب کو اردو بولنا آ گئی۔
اب آخر میں ہم دونوں میاں بیوی نے بڑی محنت اور جدوجہد سے بہن بھائیوں کے توسط سے ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا اور میں اس میں اکیلی رہتی ہوں، حفیظ کی پنشن آتی ہے۔ اس سے گزارہ کرتی ہوں۔ میں آٹھ سالوں سے جوڑوں کی مریضہ ہوں۔ میرے لیے اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا بہت مشکل ہے۔ حالانکہ سب بہن بھائی مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس رہو۔ مگر اس گھر میں حفیظ کی یادیں ہیں اس لیے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں کہیں جا کر رہوں اور سب سے بڑی میری خوش نصیبی کہ سب فلیٹ والے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ دن تو دن اگر میں رات کو بھی کسی کو مس کال کروں تو وہ لوگ فوراً میرے پاس آتے ہیں کہ کیا بات ہے۔
اس نفسا نفسی کے دور میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی فیملی یا خاندان کے درمیان میں ہوں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر میری بڑی بہن رہتی ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی بالکل بچوں کی طرح میرا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری امی کی یہ ہی نصیحت تھی۔ کہ بیٹا بڑوں کی عزت کرو اور چھوٹوں سے محبت کرو۔ آج یہ ہی بات میرے کام آ رہی ہے۔
میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی ہوں۔ اور خواتین اور بچیوں کو دینی مسئلے مسائل بتاتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ (آمین) مجھے ساتھ ایمان کے دنیا میں رکھے اور ساتھ ایمان اور عزت و آبرو کے دنیا سے اٹھائے۔ (آمین)
ساری زندگی گزار کے مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ کسی سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کرو۔ صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگاؤ۔ وہ رزاق و رحیم ہے اس نے رزق کا وعدہ کیا ہے اور وہ ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں بندے کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسے لوگوں کو وسیلہ بناتا ہے جہاں تک ہماری سوچ کی رسائی بھی نہیں ہوتی۔

☆

صائمہ اکرام چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے' ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے

ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔

شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے

پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔
یہ جان کر کہ منال، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منال اور برہان کی بے تکلفی سے اسے اناہیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس سمجھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔
مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔
صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔
اناہیہ، درشہوار اور منال کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی
مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ منال کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔
ہم زاد، شہزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور اناہیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔
برہان کی شادی کا منال کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانے لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔
برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیرہ سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔
مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔
صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد، شہزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔
ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہو جاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔
میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، درشہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔
برہان، منال کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور منال کو بھی پتا ہے۔

سعد کو اچانک منائل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔
شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔
درشہوار، ارسل کے کمرے میں جا کر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاجدار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ درشہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔
شیری، ارتضٰی کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور ارتضٰی ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے ......

۱۶
سولہویں قسط

"آئی ایم سوری۔ میں ارتضٰی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آسکتی۔"
اس کی بات پر ارتضٰی نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔ بات دل کو خوش کرنے والی تھی لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا۔ شہرزاد اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ عام حالات میں تو یہ بات سن کر اس پر شادیٔ مرگ طاری ہو جاتی۔
"فار گاڈ سیک شہرزاد، ان لوگوں کا تم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، وہ تمہیں نہیں جانتے۔" ہم زاد جھنجلایا۔
"جب ان کا مجھ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے تو بے فکر رہو، وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔" شہرزاد نے غصے سے فون بند کر دیا جبکہ دوسری طرف ہم زاد کا دماغ کھول اٹھا۔
"کیا ہوا، میرے بارے میں کون بات کر رہا ہے؟" ارتضٰی نے تشویش زدہ انداز میں پوچھا۔
"میرے سیکیورٹی گارڈ رضا کی کال تھی۔۔۔" شہرزاد نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ "ہمارے پیچھے ایک جیپ میں ہے وہ اور اس کا کہنا ہے کہ اگلے سگنل پر میں اس کی گاڑی میں آجاؤں کیونکہ وہ لوگ آپ کے پیچھے ہیں۔"
"وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، آپ کو اس کی بات مان لینا چاہیے۔" ارتضٰی نے سنجیدگی سے کہا، وہ اس وقت خود بھی شہرزاد کی وجہ سے دباؤ میں تھا۔
"لیکن ارتضٰی! آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں میں؟" شہرزاد کی فکرمندی اسے اچھی لگی۔
"ڈونٹ وری، ان کی گاڑی کے پیچھے بھی دو گاڑیاں سادہ کپڑوں میں موجود اہلکاروں کی ہیں، آپ ٹینشن مت لیں۔ بس اگلے سگنل پر اتریں، میں بھی آپ کی وجہ سے ہی ٹینس ہو رہا ہوں۔" ارتضٰی مسلسل بیک مرر سے اپنے پیچھے کھڑی گاڑی پر نظر رکھے ہوا تھا۔
آغا شاہی ایونیو کا اشارہ آچکا تھا اور گاڑی جیسے ہی سگنل پر رکی، شہرزاد نے ہلکا سا جھک کر ارتضٰی کی سائیڈ پر دیکھا، اس کی گاڑی کے برابر میں ایک جیپ آکر رکی تھی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا ہم زاد اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک آرمی آفیسر کی اوٹ میں تقریباً چھپا ہوا تھا، اس نے چہرے پر گلاسز لگا رکھے تھے۔
شہرزاد کے سیل فون کی گھنٹی بجی، اس کا دل بے اختیار دھڑکا، اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کال اٹینڈ کی۔
"کم آن شہرزاد! تھوڑا گھوم کر آنا پڑے گا، میں تمہاری رائٹ سائیڈ پر ہوں۔ پلیز، آجاؤ میری جیپ

میں۔'' ہم زاد کے لہجے کی سنجیدگی سے اسے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔
''او کے میں آتی ہوں؟'' زندگی میں پہلی دفعہ اس کے ہاتھ پیر پھولے، کیونکہ ارتضٰی اسے مسلسل گاڑی سے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔
''بات کرواؤ میری تم ارتضٰی سے۔'' ہم زاد کی اگلی بات نے اسے حیران کیا۔
اس نے خاموشی سے سیل فون ارتضٰی کی طرف بڑھایا، اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ اس مصروف شاہراہ پر ان کے تعاقب میں آنے والے لوگ ابھی کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے آگے اور پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ ہم زاد نے ارتضٰی سے صرف تیس سیکنڈ بات کی تھی۔
''آپ پلیز اتریں اور پیچھے سے گھوم کر جانے کے بجائے آگے سے جائیں۔'' ارتضٰی اپنے حواسوں میں تھا اور اسے بھی اس وقت صرف اسی کی ٹینشن تھی۔
شہرزاد نے ذرا سا جھجک کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسی وقت برابر والی جیپ کا بھی دروازہ کھلا اور ہم زاد نیچے اترا۔
''پلیز شیری! جلدی جائیں، سگنل کھل جائے گا۔'' ارتضٰی ایک دم چیخا۔
''ہاں، ہاں جا رہی ہوں۔'' شہرزاد نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنا پہلا قدم نیچے رکھا۔
''فار گاڈ سیک، ہری اپ، ٹائم نہیں ہے۔'' شہرزاد نے جیسے ہی زمین پر دوسرا قدم رکھا، پچھلی گاڑی میں موجود لوگ یہ سمجھے کہ شاید ارتضٰی بھی اس کے ساتھ اتر رہا ہے۔ گاڑی کے دروازے جھٹکے سے کھلے اور تین چار لمبے تڑنگے نوجوان بڑی سُرعت سے کلاشنکوف لیے نیچے اترے۔
شہرزاد نے خوف زدہ انداز سے ان سب کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اسے لگا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہے، ان لوگوں کی آنکھوں میں اس قدر اشتعال، غصہ اور وحشت تھی کہ وہ وہیں جم گئی۔
''شہرزاد! پلیز موو......!'' ہم زاد اپنی جیپ سے نکلتے ہوئے بلند آواز میں چیخا۔ ''گاڑی کے سامنے سے آؤ، پیچھے سے نہیں۔''
لیکن اس کے قدم زمین میں گڑ چکے تھے، اس نے کلاشنکوفوں کا رخ اپنی جانب دیکھا اور اسے لگا کہ ہم زاد کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ارتضٰی کے نہیں شاید اسی کے پیچھے آئے تھے اور اس سوچ نے اس کی روح فنا کر دی۔
اسی کے ساتھ وہ ہوا، جس کا کسی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ فضا ایک دم گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھی، اردگرد کے ماحول میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر بے اختیار زمین پر بیٹھتی چلی گئی اس کے قدموں میں خون کی ایک لکیر تیزی سے بہتی ہوئی آ رہی تھی جب اس نے ایک مضبوط انسانی ہاتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔
''ارتضٰی!'' شہرزاد نے خوف زدہ نگاہوں سے گاڑی کی طرف دیکھا۔
''وہ ٹھیک ہے، تم چلو میرے ساتھ۔'' ہم زاد نے اس کا بازو نرمی سے پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ شہرزاد صرف ایک نظر ہی اس کی طرف دیکھ پائی۔ مغرب کے بعد پھیلنے والے اندھیرے میں اس کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگے۔
وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھی، اسی وقت اس کی نگاہ، زمین پر گری ہوئی ان چار بندوں کی لاشوں پر پڑی، جنھوں نے اس پر بندوقیں تانی تھیں اور اس کے دل کو تھوڑا اطمینان ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی نظر اپنی

گاڑی کے دروازے کے پاس گرے ہوئے ارتضیٰ پر پڑی، اس کا دل دھک سے رہ گیا، ارتضیٰ کے بازو سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا اور وہ تکلیف سے دہرا ہو رہا تھا۔

"ارتضیٰ ...... ارتضیٰ ......" وہ ہم زاد سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس کی طرف بھاگی، ارتضیٰ کے ارد گرد سیکیورٹی اہلکاروں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ شہزاد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ ہم زاد کو بالکل بھول گئی۔

وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے کی وجہ سے زمین پر بکھری ہوئی کرچیوں میں ایک نوکیلا شیشہ شہزاد کے جوتے کے تلے کو کاٹتا ہوا اس کا پیر زخمی کر گیا اور اس کے منہ سے بلند آواز میں سسکی نکلی اور وہ بیٹھ گئی۔

وہ تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا، اس کے پاؤں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

"جلدی کرو شہزاد۔ میڈیا کی گاڑیاں پہنچ رہی ہیں۔ یہاں تماشا بن جائے گا، لیٹس موو۔" اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ فضا میں ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیوں کے ہارن گونج رہے تھے۔ وہ اس کا سہارا لے کر لنگڑاتی ہوئی جیپ تک پہنچی۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے میں مدد دی۔

"تم نکلو انہیں لے کر، میں باقی سچویشن ہینڈل کرتا ہوں۔" میجر توصیف اس کے پاس آ کر عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

"تھینکس توصیف! لیکن شہزاد کا نام نہیں آنا چاہیے میڈیا میں۔!!!" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے میجر توصیف کو ہدایت کی۔

"ڈونٹ وری۔" میجر توصیف کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ جبکہ شہزاد میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ سکے۔

وہ اپنے فون پر آنے والی کالز میں مسلسل بزی تھا اور ہائی کمان کو اس سلسلے میں آگاہ کر رہا تھا، جبکہ شہزاد کے دل و دماغ پر اس وقت ارتضیٰ کا زخمی وجود سوار تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اس کے لیے دعا گو تھی اور اب تو اسے اپنے پیر کی تکلیف بھی بھول چکی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" اس نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے اپنا سیل فون ڈیش بورڈ پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کالز سے فارغ ہو چکا تھا اور اب بڑے اطمینان اور سکون سے اپنے بالکل برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

یہ وہ لڑکی تھی جس کے ساتھ وہ محبت کی مضبوط ڈور میں بہت سالوں سے بندھا ہوا تھا اور اتنے سالوں کی آنکھ مچولی کے بعد اب اس کے دل میں شدت سے یہ تمنا جاگی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے سامنے بات کر سکے، وہ لمحہ آ چکا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں، تم ٹھیک ہو ناں؟" وہ فکرمند انداز میں گویا ہوا۔

"جی!" شہزاد کو اپنے سر پر منوں وزن محسوس ہوا، اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سر اٹھا کر اپنے سے چند انچ پر بیٹھے ہوئے اس شخص کو دیکھ سکے جس نے کتنے سالوں سے اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

اس کی گاڑی قریبی اسپتال کی پارکنگ میں رک چکی تھی۔ وہ جلدی سے نیچے اترا اور اس کی طرف کا دروازہ

کھولا، سورج غروب ہو چکا تھا، ملگجا سا اندھیرا ہر چیز پر غالب آ چکا تھا۔ پارکنگ میں لگی لائٹس جل چکی تھیں۔
''اپنا ہاتھ دو مجھے۔'' ہم زاد نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تا کہ اسے اترنے میں مدد دے سکے۔
''میں اُتر جاؤں گی۔'' آگے بھی شہرزاد تھی، اس نے مضبوطی سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر جیپ سے اترنے کی کوشش کی، شیشے کی کرچیاں اس کے پاؤں میں کافی اندر تک دھنس گئی تھیں، یہی وجہ تھی اس نے جیسے ہی پیر نیچے رکھنے کی کوشش کی، اس کے منہ سے سسکی نکلی۔
''جب ضرورت سے زیادہ بہادری دکھاتی ہو تو بالکل اچھی نہیں لگتی ہو۔'' وہ ہلکا سا جھنجلا کر گویا ہوا۔ وہ ایک الیکٹرک پول کے عین نیچے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں شہرزاد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
''اب کیوں سر جھکائے کھڑی ہو؟''
شہرزاد نے ہمت کر کے سر اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑے شخص کی شہد رنگ آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ہم زاد نے شرارت سے اسے فوجی اسٹائل میں سلیوٹ کیا، وہ بوکھلا گئی۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے مترشح تھی، شہرزاد کا چہرہ سرخ ہوا، اس نے محض ایک نظر اسے دیکھا اور اس کے نقوش اسے جانے پہچانے لگے۔
''دیکھ لو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔'' وہ نچلا ہونٹ دبائے، بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔
اس کا سارا اعتماد اس وقت دھواں بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ دراز قد، کلین شیو، گھنے بال اور سرخ و سپید رنگت والا یہ ہینڈسم لڑکا اسے یاد آ ہی گیا، جس کی ٹھوڑی پر ہلکا سا بھورے رنگ کا تل تھا اور بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنو، مدمقابل کو کنفیوز کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ مری کانوینٹ میں اس سے ایک سال سنیئر تھا، اور اس کے حوالے سے ماضی کی کئی خوش گوار یادیں اس کے دماغ میں محفوظ تھیں۔
''شہرزاد! غور سے دیکھو اور پہچانو، کون ہوں میں۔'' وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔
''اتنی کمزور یادداشت نہیں ہے میری حمزہ خالد!'' اس نے ہلکا سا جل کر اس کا پورا نام لیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔
''حمزہ نہیں میجر حمزہ اور تمہارا ہم زاد!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر شرارت سے جھکا۔
''اِٹس ناٹ فیئر!'' اس نے اپنے پاؤں کی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
''میرے نزدیک بھی محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز نہیں لیکن اتنے سالوں سے تمہارے پیچھے در بدر ہو رہا ہوں، اب اتنا مارجن تو دو گی ناں؟'' وہ جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں بولا تھا۔
شہرزاد کی نظریں اس کے مضبوط ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں، جنہیں وہ سینے پر باندھے بڑی فرصت سے اس کے سامنے کھڑا گہری نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ سکے۔
''امید ہے اس بار دوستی کا ہاتھ نہیں ٹھکراؤ گی۔'' حمزہ اسے بہت سال پرانی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔
''اچھا نہیں کیا آپ نے۔'' وہ ہلکا سا جھینپ کر بولی۔
''اور تم نے اچھا کیا تھا، یاد ہے صرف تمہارے ایک ووٹ کی وجہ سے ہارا تھا میں اسکول کا الیکشن۔'' وہ شرارتی انداز میں گویا ہوا۔

''اس چیز کا بدلہ لیا ہے آپ نے۔'' اس نے بھی برجستگی کا مظاہرہ کیا۔
''بدلہ صرف نفرت کا لیا جاتا ہے محبت کا نہیں، محبت تو صرف دینے کا نام ہے شہزاد سہگل! لیکن تم یہ بات نہیں سمجھو گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں گویا ہوا۔ اسے اس وقت اپنی ساری ڈیوٹیز بھولی ہوئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری زندگی یونہی اسے دیکھتے ہوئے گزار دے، یہ وہ لڑکی تھی جسے اس نے برسوں چاہا تھا۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں بالوں کو لاپروائی سے کیچر میں باندھے ہوئے بالکل عام سے حلیے میں وہ اسے بہت خاص دکھائی دے رہی تھی۔
جبکہ شہزاد کی نگاہیں اب اس کے فوجی بوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔
''ہاں تو میم کیا کہتی ہیں آپ؟'' وہ ایک دفعہ پھر شرارتی انداز سے گویا ہوا۔
''فی الحال تو میرے پاؤں کی تکلیف مجھے۔ کچھ بھی کہنے سے روک رہی ہے۔'' اس نے گھبرا کر بات پلٹی۔
''اوہ آئی ایم سوری، تم یہیں کھڑی رہو، میں اندر سے وہیل چیئر لے کر آتا ہوں۔'' وہ فکر مند ہوا۔
''نہیں، میں خود چل لوں گی۔'' شہزاد نے ہلکا سا لنگڑا کر چلنے کی کوشش کی اور حمزہ نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''تم کبھی نہیں بدلو گی شہزاد۔'' وہ اس کی بات پر اب پہلی بار کھل کر مسکرائی، اور اس نے دوسری بار اپنے سامنے کھڑے اس مضبوط شخص کی طرف دیکھا، جس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی، وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا اور وہ بوکھلا کر تیز تیز چلنے لگی۔
☆☆☆
مری کے پہاڑوں پر اترنے والی وہ دوپہر بہت عجیب تھی۔
جو اپنے دامن میں بے شمار طوفان لیے نمودار ہوئی تھی لیکن میر ہاؤس کے مکین اس بات سے انجان تھے۔
میر ہاؤس میں صبح سے افراتفری کا سماں تھا، کیونکہ شام میں درشہوار اور انابیہ کی بارات اور ولیمے کا فنکشن اکٹھا تھا، گھر دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج تو نمیرہ کی بولتی بھی بند تھی۔ اس نے جب سے وہاج اور تاجدار بیگم کی گفتگو سنی تھی، اس کا دماغ کھول رہا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی۔
''بھابھی! یہ ساری لڑکیاں کہاں ہیں۔ مہمان بار بار پوچھ رہے ہیں ان کا۔'' ندرت بیگم بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی جیٹھانی کے کمرے میں داخل ہوئیں جو کہ ساڑھی کا بلاؤز ہاتھ میں پکڑے بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔
''مجھے تو لگتا ہے، ان لڑکیوں کو کسی نے بددعا دے دی ہے، جس کو دیکھو، منہ پھلائے گھوم رہی ہے، چلو درشہوار اور انابیہ کی تو شادی ہے، یہ طوبیٰ اور نمیرہ کو کیا تکلیف ہے۔'' تاجدار بیگم نے ہاتھ میں پکڑا بلاؤز بیڈ پر پھینکا۔
''ان کے بھی مزاج بگڑے ہوئے ہیں، جس کو دیکھو، کونے کھدرے میں چھپی بیٹھی ہے، ایسا لگتا ہے شادی نہیں خدانخواستہ کوئی ماتم ہے اس گھر میں۔'' ندرت امی تلخی سے گویا ہوئیں۔
''گھر مہمانوں سے نہ بھرا ہوتا تو ایک دفعہ تو ضرور میں ان چاروں کی طبیعت سیٹ کر دیتی۔'' تاجدار بیگم جھنجھلا کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ''ویسے پوچھ کون رہا ہے بچیوں کا، پتا بھی تو چلے۔''

''پھپھو اصغری چار دفعہ پوچھ چکی ہیں، ان کو تو اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے کہ درشہوار ان کو سلام کرنے کیوں نہیں آئی اور انابیہ کیوں منہ چھپائے بیٹھی ہے ان سے۔'' ندرت امی نے بتایا۔

''پھپھو اصغری کو بھی اللہ جانے کون سا کیڑا کاٹتا ہے، ہر اس معاملے میں گھستی ہیں، جس سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں ہوتا، انہیں بٹھاؤ نا شارقہ کے کمرے میں، وہی دے ان کے سوالوں کے جوابات۔''

تاجدار بیگم کا سارا دھیان اپنے بلاؤز کی طرف تھا جسے درزن نے خاصا تنگ کر دیا تھا اور اس وجہ سے وہ خاصی ٹینشن میں تھیں۔

''سوتن صاحبہ کے اپنے مزاج بگڑے ہوئے ہیں، وہ اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے گھوم رہی ہیں، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر پورے گھر میں چل کیا رہا ہے، مسئلہ کیا ہے سب کے ساتھ۔۔؟'' ندرت کی بات پر تاجدار بیگم نے چونک کر اپنی دیورانی کا چہرہ دیکھا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر نمیرہ بجھے بجھے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ دونوں نے غور سے اس کی افسردہ شکل کو دیکھا۔

''ممانی جان! ڈرائیور سے کہیں، درشہوار اور انابیہ کو پارلر چھوڑ آئے۔''

''پارلر تو وہ چھوڑ آئے گا مگر یہ تم کس خوشی میں منہ لٹکائے گھوم رہی ہو۔'' تاجدار بیگم نے لگے ہاتھوں اس کی کلاس لی تو وہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ممانی جان! میں تو بس ایسے ہی۔'' اس نے گھبرا کر صفائی دینے کی کوشش کی۔

''ایک دفعہ شادی خیر خیریت سے نبٹ جائے تو میں سیٹ کرتی ہوں تم سب کے دماغ، فی الحال تو میں اس کم بخت شریفاں کو دیکھوں، جس نے سارے بلاؤز کا ستیاناس مار دیا ہے، رات کو فنکشن پر پہننا تھا مجھے۔'' وہ اپنا بلاؤز اٹھا کر کمرے سے نکل گئیں۔

''درشہوار کا موڈ، کچھ ٹھیک ہوا کہ نہیں؟'' ندرت بیگم نے دائیں بائیں دیکھ کر ذرا سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''اس کا موڈ تو مری کے موسم کی طرح پل پل بدلتا ہے، اب ہونٹوں پر خاموشی کا تالا لگائے بیٹھی ہے، اللہ جانے کیا چل رہا ہے اس کے دماغ میں۔'' نمیرہ بیزاری سے کہتی ہوئی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''میری تو دعا ہے بس آج کی رات گزر جائے، کل کو خود ہی ارسل سیٹ کر دے گا اسے۔'' ندرت بیگم منہ بنا کر گویا ہوئیں، تو نمیرہ نے یوں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ سیٹ کر ہی نہ دے۔

☆☆☆

ٹینا بیگم نے جھنجلا کر ہاتھ میں پکڑا اسیل فون صوفے پر پھینکا۔

ٹی وی لاؤنج میں ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی رومیصہ نے پریشانی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ٹی وی اسکرین کے سامنے ٹہلتے ہوئے بیسوں دفعہ شہزاد کا نمبر ڈائل کر چکی تھیں، جو مسلسل بند جا رہا تھا۔ ارتضی پر ہونے والے حملے کی خبر اس وقت میڈیا کا گرما گرم موضوع بنی ہوئی تھی، حالانکہ چاروں حملہ آور موقعے پر ہی مارے جا چکے تھے، لیکن اس خبر پر ہونے والے تبصروں نے ماحول خاصا گرم کر رکھا تھا۔

ٹی وی پر آنے والی خبروں کے مطابق ارتضی حیدر اس وقت اکیلے ڈرائیو کر رہے تھے، اس سارے قصے میں شہزاد کا نام کہیں پر بھی نہیں لیا جا رہا تھا لیکن شیری کے پرائیوٹ گارڈ رضا کی طرف سے ملنے والی اطلاع نے ٹینا

بیگم کو شدید قسم کی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا، جس کے مطابق، شیری اس حملے کے وقت ارتضی کے ساتھ تھی، اور اس خبر کی تصدیق شہزاد کے سیل فون کے مسلسل بند ہونے نے بھی کر دی تھی۔

''یا اللہ میری بچی کو اپنی حفظ وامان میں رکھنا۔'' وہ فکر مند انداز میں دعائیں مانگ رہی تھیں۔

''مام، اگر شیری ان کے ساتھ ہوتی تو کم از کم کوئی ایک چینل تو یہ نیوز دیتا۔'' رومیصہ نے ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ہوسکتا ہے اس کا نام ارتضٰی نے نکلوا دیا ہو۔'' ان کو تسلی نہیں ہوئی۔

''ارتضٰی تو خود زخمی ہو کر ہاسپٹل پہنچے ہوئے ہیں، ان کو کہاں اس وقت ایسی چیزوں کا ہوش ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے رضا کو واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے ایک دفعہ پھر ٹینا بیگم کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

''بے وقوف لڑکی! رضا ایسی غلط بیانی کیوں کرے گا؟ وہ بتا چکا ہے مجھے کہ اس کی شیری سے دو دفعہ بات ہوئی تھی، جب وہ ارتضٰی کے ساتھ پنڈی سے نکلی تھی۔'' ٹینا بیگم نے جھنجھلا کر اسے تفصیل سے بتایا۔

''تو پھر اس بے وقوف کو کس نے کہا تھا کہ اسے اکیلا چھوڑے، تنخواہ کس چیز کی لے رہا ہے وہ۔'' رومی کو اس کے گارڈ پر غصہ آیا۔

''اپنی بہن کی حرکتوں کا اندازہ نہیں ہے تمہیں؟ ایک کے بجائے دس گارڈز بھی ہوتے تو تب بھی وہ یہی حرکت کرتی۔ خود کو بہت پھنے خان سمجھتی ہے ناں۔ اب پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔'' ٹینا بیگم کی پریشانی کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''مام! ٹھیک ہوگی وہ، اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوا ہوتا تو اس وقت ٹی وی پر ٹکر چل رہا ہوتا۔'' وہ روانی میں کچھ غلط بول گئی۔

''شٹ اپ رومی! بات کرنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیا کرو، کیسے منہ پھاڑ کر تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی، اللہ نہ کرے میری بیٹی کو کچھ ہو، تم بھی کمال کر دیتی ہو۔'' وہ ایک دم غصے میں آگئیں۔

''آئی ایم سوری مام! میرا یہ مقصد نہیں تھا، لیکن آپ بھی تو بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں، اتنے بڑے حادثے کے بعد کہاں انسان کو اپنا ہوش رہتا ہے، رابطہ کرلے گی وہ۔ آپ خواہ مخواہ اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔'' رومی ہلکا سا چڑ گئی۔

''جب خود ماں بنو گی تب پتا چلے گا تمہیں، ماؤں کے دل کیسے ہوتے ہیں۔'' ٹینا بیگم انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ گئیں۔ رومیصہ نے گھبرا کر اپنا دوپٹہ پھیلا لیا۔ ابھی تو اس کی پریگننسی کا اسٹارٹ تھا لیکن وہ حد درجہ خائف ہو چکی تھی۔

ٹینا بیگم کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سیف الرحمٰن تھے، انہوں نے کن اکھیوں سے رومی کی طرف دیکھتے ہوئے کال اٹینڈ کی، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کو پسند نہیں کرتی۔

''ہاں سیفی! بتاؤ کچھ پتا چلا شیری کا؟'' انہوں نے محتاط انداز میں پوچھا۔ دوسری طرف رومی کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ وہ مسلسل اپنے سیل فون پر کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی، دوسری طرف سیف الرحمٰن نے شاید کوئی تسلی بخش اطلاع دی تھی جسے سنتے ہی ان کا چہرہ پرسکون ہوا۔

''تھینکس گاڈ، چلو کچھ تو تسلی ہوئی مجھے، اب خود کانٹیکٹ کرلے گی وہ۔'' ٹینا بیگم کے حلق سے ایک لمبا سانس خارج ہوا اور رومی کی وجہ سے انہوں نے سیف الرحمٰن سے مختصراً بات کر کے فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے سیفی انکل؟'' رومی کے اس سوال پر انہیں خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا، وہ کہاں ان کے بارے میں اتنی تمیز سے بات کرتی تھی۔

''بتا رہے ہیں شیری، میجر توصیف کے ساتھ ہے اور بالکل خیریت سے ہے، لیکن ارتضیٰ خاصا زخمی ہوا ہے اس حادثے میں۔''

''آپ کو جانا چاہیے ان کی عیادت کے لیے۔'' رومیصہ نے دانستہ ماں کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی۔

''جب تک میری شیری کے ساتھ بات نہیں ہو جاتی، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ٹینا بیگم کے ضدی انداز پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور خوش قسمتی سے دوسری طرف شہزادی تھی۔

''شیری! کہاں ہو تم؟'' رومی بے تابی سے گویا ہوئی تو ٹینا بیگم جلدی سے اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

''ہاسپٹل میں ہوں یار!'' دوسری طرف شہزاد خاصی تھکی تھکی سی تھی۔ وہ اس وقت میجر حمزہ کے ساتھ اپنے پاؤں کی مرہم پٹی کروا رہی تھی۔

''ٹھیک تو ہو نا؟'' رومیصہ کو فطری پریشانی نے گھیرا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں، بس ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گی گھر۔'' شہزاد نے اسے تسلی دی۔

''مام کا ٹینشن سے بُرا حال ہے، یہ لو بات کروان سے۔'' اس نے سیل فون ٹینا بیگم کی طرف بڑھایا، جو انہوں نے بے تابی سے پکڑ لیا۔

دوسری طرف موجود شہزاد نے انہیں اطمینان دلایا تھا۔ رومی نے بھی دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا ورنہ اسے اپنے اگلے دو گھنٹے مزید برباد ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

☆☆☆

درشہوار کے پورے وجود پر ایک محسوس کیا جانے والا سکون تھا۔

اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ بیوٹی پارلر جانے کے لیے اپنا بیگ تیار کیا، اور بہت سوچ سمجھ کر چیزیں رکھیں، زرد رنگ کے مایوں والے سوٹ میں ملبوس انابیہ جو اس وقت اس کے کمرے میں موجود تھی اس نے حیرانی سے اس کا پُرسکون چہرہ دیکھا۔

''آپ نے چیزیں رکھ لیں اپنی۔'' درشہوار نے چھوٹے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بیا کی طرف سرسری انداز میں دیکھا۔

''ہاں رکھ لیں، لیکن درشہوار! تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' بیا پریشانی سے بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

ویسے تو برہان کے سرد رویے نے اسے بھی پریشان کر رکھا تھا لیکن اس وقت اس کی تشویش کی ایک بڑی وجہ درشہوار کی پُراسرار خاموشی تھی۔ رات مہندی کے فنکشن کے بعد سے اس کے پورے وجود پر ایک سکوت سا طاری تھا، جو اس کی فطرت اور مزاج دونوں کے خلاف تھا۔

''کیوں بیا۔۔؟ مجھے کیا ہونا ہے۔۔؟'' اس نے نظریں چُرا کر اپنے بالوں میں برش کیا، وہ بیا کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریزاں تھی۔

''تمہاری ارسل کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' انابیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح سے بات کا آغاز کرے۔

''مجھے اب کسی سے کوئی بات نہیں کرنی بیا، ان سب نے جو کرنا تھا کرلیا۔'' اس کا لہجہ اتنا سرد اور سپاٹ تھا کہ بیا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں؟'' وہ اس کا تلخ انداز دیکھ کر افسردہ ہوئی۔

''اس کے علاوہ اور کیا آپشن ہے اس گھر کی لڑکیوں کے پاس؟'' درشہوار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب سے انداز میں مزید گویا ہوئی۔ ''ہمارے ہاں تو لڑکیوں کو اپنی مرضی سے سانس لینے کا حق نہیں دیا جاتا، لائف پارٹنر کا انتخاب تو بہت دُور کی بات ہے۔''

''ارسل بہت اچھا لڑکا ہے درشہوار۔'' انابیہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''لیکن میں میر ہاؤس کی سب سے بُری اور ضدی لڑکی ہوں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی، انابیہ کو اس کی ہنسی روتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بات پر کوئی تبصرہ کرتی، طوبیٰ منہ بناتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

''آپ دونوں کی باتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں، شاہ میر ویٹ کر رہا ہے باہر گاڑی میں۔'' اس کی اطلاع پر درشہوار چونکی اور ہلکی سی بے چینی کا شکار ہوئی۔

''کیا میر و بھیا جائیں گے ہمیں پارلر چھوڑنے؟''

''ظاہر ہے دو دو دلہنوں کو کوئی اکیلا تھوڑی بھیجے گا۔ سلمیٰ بوا بھی ساتھ ہوں گی۔'' طوبیٰ کی اگلی بات نے درشہوار کو مزید پریشان کیا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس کا ذہن اب تیزی سے کوئی حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا۔

''چلیں بیا۔'' درشہوار نے سیاہ رنگ کی چادر سے خود کو ڈھانپتے ہوئے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی۔

''ہاں چلو، ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے۔'' انابیہ نے اپنا بھی سامان اٹھایا اور وال کلاک کی طرف نظر ڈالی جہاں شام کے پانچ بج رہے تھے۔

''منہ ڈھانپ کے باہر نکلنا، کافی مرد ہیں لان میں۔'' ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تاجدار بیگم نے دونوں کو ایک ساتھ نصیحت کی۔

''اللہ حافظ امی۔'' درشہوار کے منہ سے بلا ارادہ نکلنے والے ان دو لفظوں نے تاجدار بیگم کو ہلکا سا چونکایا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان پر غور کرتیں، درشہوار اور انابیہ دونوں سیڑھیاں اتر کر ہال کمرے کی طرف بڑھ چکی تھیں۔

میر ہاؤس میں اس وقت مہمانوں کا جم غفیر تھا اور ملازمین کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں، آج شام سات بجے پی سی میں درشہوار اور نمیرہ دونوں کا مشترکہ فنکشن تھا چونکہ انابیہ اور برہان کا نکاح ہو چکا تھا اس لیے ان کا ولیمہ اور درشہوار اور ارسل کی بارات کا فنکشن تھا۔

میر ہاؤس کے بڑوں نے ساری تقریبات کو ایک ہی دعوت میں نبٹانے کا فیصلہ کیا تھا اور وقت پی سی بھوربن میں ملک کے کئی اہم منسٹرز اور سیاست سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی آمد متوقع تھی۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟'' درشہوار جیسے ہی شاہ میر کی جیپ میں آکر بیٹھی، اس نے بغور اپنی بہن کا پرسکون چہرہ حیرانی سے دیکھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے؟ آپ گاڑی چلائیں بس۔'' وہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں بولی تو شاہ میر نے تھوڑا سکون کا سانس لیا۔

انابیہ اور سلمٰی بوا بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ درشہوار نے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان کے پورے لان میں قناتیں لگی ہوئی تھیں اس لیے ہادی کا گھر بالکل بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

لان میں اس وقت کافی لوگ موجود تھے، شاہ میر نے جب ان تینوں کو پارلر کے سامنے اتارا تو اس کی چھٹی حس اسے کسی بڑی گڑبڑ کا اشارہ کررہی تھی، لیکن پریشانی کا سرا اس کے ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ وہ سلمٰی بوا کو ان کا دھیان رکھنے کا کہہ کر بھی پارلر کے سامنے پورے پانچ منٹ تک کھڑا رہا لیکن محتشم صاحب کی کال پر اسے واپس جانا پڑا۔

وہ مری کی ایک خوب صورت کوٹھی میں بنا ہوا ایک جدید قسم کا سیلون تھا اور آج کل شادیوں کا سیزن ہونے کی وجہ سے وہاں کافی رش تھا۔ انابیہ اور درشہوار دونوں انتظار گاہ میں پہنچ گئی تھیں اور استقبالیے پر موجود لڑکی نے انہیں وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک ورکر لڑکی ان کے عروسی لباس لینے ان کے پاس آئی تو درشہوار نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا۔

''اوہ نو! اپنے لہنگے کی چولی تو گھر بھول آئی ہوں میں۔'' درشہوار نے پلان کے مطابق انابیہ کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

''فون کردوناں، طوبیٰ بھجوادے گی۔'' انابیہ فکر مند ہوئی۔

''لیکن الماری کی چابیاں تو میرے پاس ہیں۔'' درشہوار نے جان بوجھ کر پریشانی کا مظاہرہ کیا۔

''پلیز، آپ جلدی منگوائیں، آپ کے بعد دو اور برائیڈز کی بکنگ ہے ہمارے پاس۔'' ورکر کے فکر مند انداز پر انابیہ گھبرا کر بولی۔

''میں شاہ میر کو فون کرتی ہوں، وہ چابی آکر لے جائے گا۔''

''رہنے دو اس کا ویسے ہی موڈ خراب ہے، سلمٰی بوا! آپ ٹیکسی میں چلی جائیں اور چپکے سے لے کر آجایئے گا۔'' درشہوار کے مشورے پر انابیہ ہلکا سا پریشان ہوئی۔

''بوا اکیلی کیسے جائیں گی؟''

''دس منٹ کی ڈرائیو پر تو گھر ہے، بوا! آپ پلیز ٹیکسی لے کر چلی جائیں۔'' درشہوار کے دوٹوک انداز پر بوا پریشانی سے کھڑی ہوئیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں، جلدی جائیں، ٹائم بہت کم ہے، سات بجے پہنچنا ہے ہمیں ہال میں۔'' اس نے بوا کو کچھ بھی سوچنے کا موقع دیے بغیر بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف لے گئی اور سلمٰی بوا کو اس کے ضدی انداز پر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

''پلیز آپ برائیڈل روم میں آجائیں اور آپ کا ڈریس جیسے ہی آتا ہے گھر سے تو بتا دیجیے گا۔'' بیوٹیشن جیسے ہی انابیہ کو لے کر وہاں سے نکلی، درشہوار نے سکون کا سانس لیا، اب میدان صاف تھا، اس نے اپنی چادر اتار کر بیگ کے اندر سے اپنا سیاہ رنگ کا گاؤن نکالا اور خاموشی سے دوسرے پورشن کی طرف چلی گئی، وہاں جا کر گاؤن پہنا، اچھی طرح سے چہرے پر نقاب لیا اور بڑے اطمینان سے اپنا بیگ اٹھا کر پارلر سے نکل گئی۔

☆☆☆

شہزاد کے پاؤں پر بینڈ یج ہو چکی تھی۔
وہ حمزہ کے ساتھ ہاسپٹل سے نکلی تو اس وقت شدید ذہنی اور جسمانی تھکن کا شکار تھی۔
ایک تو یہ حادثہ اور دوسرے حمزہ کے ساتھ اس اچانک ملاقات نے بھی اسے خاصا بوکھلا رکھا تھا، وہ دانستہ طور پر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ حمزہ کی گہری نگاہیں اسے بار بار بوکھلاہٹ کا شکار کر رہی تھیں۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس کی یہ فطری سی بوکھلاہٹ میجر حمزہ کو کتنا محظوظ کر رہی تھی، اور وہ باقاعدہ اس چیز کا لطف لے رہا تھا جبکہ شہزاد کو دل ہی دل میں خود پر غصہ آ رہا تھا اور وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔
اسی دوران حمزہ اپنے سیل فون پر اس حادثے کی مسلسل تازہ ترین لے رہا تھا۔ اسے یک طرفہ گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ میجر توصیف سارا معاملہ ہینڈل کر چکا ہے اور ارتضیٰ کو ہاسپٹل میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔
''میڈم! چلیں گھر۔'' وہ چلتے چلتے رکا اور جھک کر اس کے پاؤں کو دیکھنے لگا۔ ''وہیل چیئر منگوا لوں پارکنگ تک جانے کے لیے۔''
''نہیں، میں چل لوں گی۔'' وہ بینڈ یج کی وجہ سے بمشکل چل رہی تھی۔
''اب درد تو نہیں ہو رہا؟'' حمزہ نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے فکرمند لہجے میں پوچھا۔ اس نے شہزاد کے منع کرنے کے باوجود پین کلر انجکشن بھی لگوا دیا تھا۔
''نہیں، بہتر ہوں۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولی تو اس کا چابی گھماتا ہوا ہاتھ ساکت ہوا۔ شہزاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس شخص کی نظروں کا سامنا کرنا بھی کسی امتحان سے کم نہیں تھا اور اس بات کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔
''کیا ہوا۔'' وہ نظریں چرا کر بولی۔
''جب تم مسکراتی ہو تو اچھی لگتی ہو لیکن جب ''زبردستی'' مسکراتی ہو تو اس سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہو، کیونکہ اس زبردستی کی مسکراہٹ کے پیچھے کسی دوسرے کو ریلیکس کرنے کی دانستہ کوشش ہوتی ہے۔'' حمزہ معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنوں کو ایک دفعہ پھر بے ربط کر گیا۔
''مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔'' وہ جان بوجھ کر انجان بنی اور گاڑی کے شیشے سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ شہزاد کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ محبت کے معاملے میں ساری لڑکیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔
''اگر میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں تو یقین مانو، دنیا کا کوئی بھی بندہ حمزہ خالد کو نہیں سمجھ سکتا۔'' وہ گاڑی کی اسپیڈ جان بوجھ کر آہستہ رکھے ہوئے تھا۔
''حمزہ خالد کو اس دور میں بھی کوئی سمجھ نہیں پایا تھا، تو اب کیا خاک سمجھے گا۔'' وہ ماضی کا حوالہ دے رہی تھی۔
''سچ سچ بتاؤ، مجھے دیکھ کر شاک تو لگا ہو گا کہ نہیں؟'' اس کے لہجے سے شوخی جھلکی۔
''ہاں بہت زیادہ، کیونکہ میں دنیا کے ہر بندے پر ہمزاد ہونے کا شک کر سکتی تھی لیکن آپ پر نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''اس لیے کہ ہماری آپس میں کبھی بھی بہت زیادہ بات چیت یا دوستی نہیں رہی۔ تم ایک سال جونیئر بھی تو

تھیں مجھ سے۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔
''میری اس دور میں کسی کے ساتھ بھی دوستی نہیں تھی۔'' شہرزاد نے اسے یاد دلایا۔
''ہاں تبھی تو اچھی لگتی تھیں مجھے، ہمیشہ تمہیں اپنی چھوٹی بہن کے لیے پریشان ہوتے ہی دیکھا تھا میں نے۔'' وہ اس کی باتوں کو مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔
''اور میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ تم پتا نہیں مجھے پہچان بھی پاؤ گی یا نہیں، بیچ میں اتنے سالوں کا گیپ بھی تو تھا۔ اس کے علاوہ ہماری کبھی بہت زیادہ فرینڈشپ بھی تو نہیں رہی تھی، لیکن تم نے تو میرا پورا نام لے کر حیران کر دیا شہرزاد۔''
''یہ اتنی بھی حیرانی کی بات نہیں کیونکہ میں آج بھی وہ بات نہیں بھولی، جب آپ نے رومی کی خاطر چار لڑکوں کی ٹھکائی کی تھی۔'' اس نے اسکول دور کے ایک واقعے کی طرف اشارہ کیا، جب رومی کا اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا اور اس موقعے پر حمزہ نے ان لڑکوں کو اچھا خاصا مارا تھا۔
''ٹرسٹ می، تمہاری خاطر تو میں پورے مری کانونیٹ سے لڑ سکتا تھا لیکن تم نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔''
اس کے معنی خیز انداز پر وہ ہلکا سا بوکھلائی اور فوراً موضوع گفتگو تبدیل کیا۔
''پلیز ان ساری باتوں کو چھوڑیں اور مجھے ہاسپٹل ڈراپ کر دیں۔'' شہرزاد کو اس وقت ارتضٰی کی خاصی ٹینشن تھی۔
''کون سے ہاسپٹل؟'' وہ حیران ہوا۔
''جہاں ارتضٰی کو ایڈمٹ کیا ہوا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''شہرزاد! آر یو آن یور سینسز۔ تم سے چلا جا نہیں رہا اور تم ہاسپٹل جاؤ گی۔'' وہ ہلکا سا جھنجھلا گیا۔ اسے ارتضٰی کے لیے اس کی بے چینی بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی، اس پہلی ملاقات میں تو اس کی توقعات ویسے ہی زیادہ تھیں۔
''یار! وہ زخمی ہے اور میں اس حادثے کے وقت اس کے ساتھ تھی، اچھا تھوڑی لگتا ہے ایسے۔'' وہ جذباتی ہوئی۔
''اور جو مجھے بُرا لگ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ ہو کر ارتضٰی کے لیے ٹینس ہو رہی ہو۔؟'' وہ ناراض ہوا تو شہرزاد چپ ہو گئی۔
''کیا واقعی تم نے ہاسپٹل جانا ہے اس سے ملنے کے لیے۔؟'' اس نے آس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کی ناراضی محسوس کر کے انکار کر دے گی لیکن شہرزاد نے بھی آج اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔
''ہاں، مجھے اس سے ملنے جانا ہے۔'' اس کی سنجیدگی پر حمزہ نے میجر توصیف کو کال کر کے ہاسپٹل کی معلومات لیں اور گاڑی کا رخ موڑ دیا۔
حمزہ دل ہی دل میں اس سے خفا ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان محسوس کی جانے والی خاموشی کا طویل وقفہ آ چکا تھا۔ اس نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں کھڑی کی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر خود دوسری طرف دیکھنے لگا۔
شہرزاد ہلکا سا جھجک کر نیچے اتر آئی۔ اس نے کن اکھیوں سے اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش دیکھے، اس کی رنگت خاصی شفاف تھی اور ہلکی سی ناراضی پر اس کا چہرہ سرخ ہو کر دہکنے لگتا۔ اپنے فوجی ہیر کٹ اور

دراز قامتی کے ساتھ وہ اچھا خاصا ہینڈسم تھا، اور کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہوسکتا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا، شہرزاد کا خیال تھا کہ وہ اسے ڈراپ کر کے یہیں سے واپس چلا جائے گا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ جب وہ پس پشت رہ کر اس کا اتنا خیال کرتا ہے تو سامنے آ کر کیسے اسے بیچ راستے میں چھوڑ سکتا ہے۔

شہرزاد پاؤں میں بینڈیج کی وجہ سے بہت آہستہ چل رہی تھی اور وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے خود بھی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ ریسپشن پر پہنچے، سامنے مسز عالیہ قریشی کھڑی تھیں، جو اس کی طرف دیکھ کر بے تابی سے اس کی طرف لپکیں، لیکن اس سے پہلے کہ وہ شہرزاد سے ملتیں، ان کی نظر اس کے ساتھ کھڑے میجر حمزہ پر پڑی اور ان کے چہرے پر تغیر رونما ہوا۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھیں۔

''ارے حمزہ بیٹا! تم کب آئے پاکستان؟ ہادی نے بتایا ہی نہیں مجھے۔'' وہ بڑے پرجوش انداز میں اس سے ملیں اور اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ وہ خود بھی بڑے والہانہ انداز میں ان سے ملا۔

''بس دو تین دن ہی ہوئے ہیں آنٹی! کہاں ہے وہ آپ کا خبیث بیٹا؟'' اس کی بے تکلفی پر شہرزاد چونکی۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی کئی منظر ایک ساتھ روشن ہوئے۔ انسے اب جا کر یاد آیا کہ ہادی کا چہرہ اسے اتنا جانا پہچانا کیوں لگتا تھا، وہ حمزہ کا کلاس فیلو تھا۔

''کچھ فرینڈز آئے ہوئے ہیں اس کے، ان کے ساتھ بزی ہے وہ۔'' وہ مسکراتے ہوئے اب شہرزاد کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''چار دفعہ کالز کر چکا ہوں، ایک دفعہ بھی ملنے نہیں آیا۔'' اس نے شکایت کی۔

''تو تم خود چلے جاؤ ناں مری، وہ کون سا دور ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور شہرزاد کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو ناں شیری، اور یہ حمزہ کہاں سے مل گیا تمہیں؟'' وہ محبت بھرے انداز میں اس سے ملیں اور اس سے پہلے کہ شہرزاد ان کی بات کا کوئی جواب دیتی، ان کی نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟ کیسے چوٹ لگی؟''

''آنٹی! یہ ارتضیٰ کے ساتھ تھیں اس حادثے کے وقت۔'' حمزہ کی اطلاع پر مسز عالیہ قریشی کا رنگ اڑا۔

''اوہ مائی گاڈ، مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔ تم ٹھیک ہو ناں شیری۔'' وہ پریشان ہوئیں۔

''یہ تو ٹھیک ہی ہوتی ہیں آنٹی، بس اپنے ساتھ رہنے والوں کو پریشان رکھتی ہیں۔'' اس کے جتاتے ہوئے لہجے پر وہ ہلکی سی الجھن کا شکار ہوئیں اور چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا، حمزہ کے ساتھ اس کی موجودگی ان کو حیران کر رہی تھی۔

''میری بہت اچھی فرینڈ ہیں شیری، کونوینٹ میں مجھ سے اور ہادی سے ایک سال جونیئر تھیں، اس حادثے میں، میں ہی ریسکیو کر کے لایا ہوں انہیں۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''مسز قریشی! کیسی طبیعت ہے اب ارتضیٰ کی؟'' شہرزاد نے دانستہ ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کی۔

''اب تو کافی بہتر ہے، گولی نے اس کے بازو کو چھوا ہے اور اس وجہ سے خون بھی خاصا ضائع ہو چکا ہے اس کا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے ملنا تھا اس سے۔'' اس کی بے چینی پر حمزہ ایک دفعہ پھر کوفت کا شکار ہوا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' وہ ان دونوں کو لے کر ارتضیٰ کے کمرے کی طرف چلی آئیں۔ کوریڈور میں سیکورٹی گارڈز اور پولیس کی کافی نفری موجود تھی۔ وہ تینوں جب ہی ارتضیٰ کے کمرے میں داخل ہوئے، وہ اس وقت مکمل ہوش میں تھا، اور ایک نرس اس کے ہاتھ پر ڈرپ لگا رہی تھی۔

ارتضیٰ نے جیسے ہی شہزاد کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں کی چمک میں ایک دم اضافہ ہوا جو حمزہ کی زیرک نگاہوں سے چھپ نہ سکا۔ شہزاد بھی فکر مند انداز میں اس کی طرف بڑھی، لیکن اس سے پہلے ارتضیٰ کی نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔

''شیری! کیا ہوا آپ کے پاؤں کو۔؟ آپ ٹھیک ہیں ناں۔؟'' اس نے بے چین انداز میں اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ٹیس اس کے بازو میں اٹھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے سسکی نکل آ گئی۔

''بیٹا! دھیان سے۔ کیا ضرورت ہے اٹھنے کی۔'' مسز قریشی نے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن تم اپنا خیال رکھو۔''

''کیسی طبیعت ہے ارتضیٰ؟'' وہ ہلکا سا جھجک کر گویا ہوئی اور ساتھ ہی اس نے کن اکھیوں سے حمزہ کی طرف دیکھا، جو اس وقت ہونٹ بھینچے بالکل خاموش اور ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ کھڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی یہاں لایا گیا ہو۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ہاسپٹل سے نکل جاتا۔

''میں ''اب'' ٹھیک ہوں۔'' ارتضیٰ کے معنی خیز انداز پر حمزہ نے بے چینی سے کھڑے کھڑے پہلو بدلا۔ اسی وقت ارتضیٰ کی بھی اس پر نظر پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے مسز قریشی کی طرف دیکھا تو انہوں نے فوراً تعارف کی رسم نبھائی۔

''ان سے ملو، یہ میجر حمزہ ہیں، ہادی کے بیسٹ فرینڈ اور شیری کے ساتھ بھی کافی دوستی ہے ان کی۔۔'' مسز قریشی کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ مسکرایا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ حمزہ کی طرف بڑھایا، جسے اس نے بادل نخواستہ تھاما تھا۔

''نائس ٹو میٹ یو۔'' حمزہ نے رسماً کہا اور کوفت بھرے انداز میں ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا، جس کی نظریں بار بار بھٹک کر شہزاد کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر رہی تھیں لیکن خیریت ہوئی اسے کوئی آفیشل کال آ گئی، جسے سنتے ہی وہ الرٹ ہوا۔

''آئی ایم سوری، مجھے نکلنا ہوگا۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''شیری کی ٹینشن مت لو، اسے میں ڈراپ کر دوں گی۔۔'' مسز عالیہ قریشی نے اس کی مشکل آسان کی۔

''او کے ارتضیٰ، اینڈ شہزاد۔ نائس میٹنگ ود یو۔۔'' وہ رسمی سی گفتگو کر کے دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا، شہزاد کی نظریں اس پر اور ارتضیٰ کی والہانہ نگاہیں شہزاد پر جمی ہوئی تھیں وہ جی بھر کر بدمزا ہوا۔

''جنرل خالد کا بیٹا ہے یہ، اس کی ماں بیسٹ فرینڈ تھی میری۔'' مسز عالیہ قریشی نے اس کے کمرے سے نکلتے ہی بلند آواز میں تبصرہ کیا تو شہزاد چونک گئی، وہ دل ہی دل میں اندازہ لگا چکی تھی کہ اگر وہ ہادی کا بیسٹ فرینڈ ہے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہادی ان دونوں کے تعلق سے واقف نہ ہو۔

☆☆☆

شادی ہال اس وقت بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

لہراتے آنچل، روشنیاں، خوشبوئیں اور بیک گراؤنڈ میں بجتا ہوا میوزک۔

پی سی بھوربن کے اس ہال کی ریسپشن پر میر حاکم علی سفید رنگ کے کلف لگے سوٹ میں اپنے دونوں بیٹوں محتشم علی اور خاقان علی کے ساتھ موجود تھے۔ ان سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

ایک طرف برہان کا ولیمہ تھا تو دوسری طرف ارسل اور درشہوار کی شادی کا فنکشن تھا۔ اس وقت شہر کی کریم

یہاں پر موجود تھی۔خواتین اور مردوں کا علیحدہ علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔
نیوی بلیو کلر کی کام والی فراک میں طوبیٰ کا سوگوار سا حسن دیکھنے والوں کو دور ہی سے اس کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔وہ لوگ تیار ہو کر وقت سے پہلے شادی ہال میں پہنچ چکی تھیں، تا کہ مہمانوں کو ریسیو کر سکیں۔شاہ میر جو کسی کام سے خواتین والے پورشن میں آیا تو طوبیٰ کو دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا۔سیاہ کلر کے پینٹ کوٹ میں وہ اس وقت بے حد جاذب نظر آ رہا تھا۔
''فار گاڈ سیک طوبیٰ! آج تو موڈ اپنا فریش رکھو۔''
اس نے ذرا آہستہ سے اس کے پاس آ کر کہا تو طوبیٰ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، وہ آج کل ویسے ہی ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔شاہ میر اس کے آنسو دیکھ کر پریشان ہوا اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہال کے ایک کونے کی طرف لے آیا۔نمیرہ نے اسٹیج پر کھڑے ہوئے یہ منظر بڑے بوجھل دل کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے نصیب کی بارشیں کسی اور کی چھت پر برس چکی ہیں۔
''میں نے کہا ناں، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا، تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے یا خود پر۔۔؟'' وہ طوبیٰ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہا تھا۔
''پتا نہیں کیوں میرو، بہت دل گھبرا رہا ہے میرا۔'' اس کی سہمی ہوئی آنکھیں دیکھ کر شاہ میر کو ایک دم اس پر پیار آیا۔
''جب اتنا ہینڈسم لڑکا تمہارے سامنے کھڑا ہو گا تو دل تو گھبرائے گا ناں۔۔'' وہ اس کے تھوڑا اور قریب ہو کر کھڑا ہوا۔
''بہت پیاری لگ رہی ہو تم، دل چاہ رہا ہے داجی سے کہوں کہ ہمارا بھی آج ہی نکاح پڑھوا دیں۔'' وہ اس کے صبیح چہرے کو بھرپور نظروں سے جانچ رہا تھا طوبیٰ کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔
''پلیز میرو! جاؤ یہاں سے، کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ گھبرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔
''اچھا ہے، کوئی دیکھ ہی لے بلکہ داجی ہی دیکھ لیں تا کہ انہیں اپنا فیصلہ بدلنے میں آسانی ہو جائے۔۔'' وہ شرارت بھرے انداز میں گویا ہوا۔
''کیا مصیبت ہے یار، جاؤ ناں۔'' وہ ہلکا سا جھنجلا اٹھی، ویسے بھی آج دوپہر سے اس کے دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔ جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی، پریشان تو شاہ میر بھی تھا لیکن مرد ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی چیز کو زیادہ دیر تک خود پر طاری نہیں کر سکتا تھا۔
''تم چھوڑو ساری باتوں کو اور یہ پہنو، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک نازک سی گولڈ کی انگوٹھی نکال کر زبردستی اس کے ہاتھ میں پہنائی تو طوبیٰ کا شرم کے مارے برا حال ہو گیا۔
''اب گھر کے بڑوں کو خیال نہیں تو ہمیں ہی سب کچھ کرنا ہو گا ناں۔'' وہ شوخی سے بولا تو طوبیٰ مسکرا دی۔
''شاہ میر! میری بات سنو پلیز۔'' اسی وقت حواس باختہ انداز میں نمیرہ ان کی طرف آئی۔طوبیٰ نے گھبرا کر اپنا انگوٹھی والا ہاتھ دوپٹے کے نیچے چھپا لیا اور نمیرہ کا پریشان چہرہ دیکھا۔''کیا ہوا؟''
''قیامت ٹوٹ پڑی ہے شاہ میر۔'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔
''ہوا کیا ہے آخر؟'' وہ بوکھلایا۔
''انابیہ کی کال آئی ہے پارلر سے، درشہوار وہاں سے غائب ہو گئی ہے۔۔'' اس نے ان دونوں کی سماعتوں

میں بم پھوڑا۔

''واٹ؟ کہاں غائب ہوگئی۔؟'' شاہ میر کی پریشانی سے آواز بلند ہوئی۔

''آہستہ بولو پلیز۔ کوئی سن لے گا'' اس نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا، سب مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے، جبکہ شاہ میر کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا، اس کے سارے وہم اور اندیشے مجسم ہو کر اس کے سامنے آ چکے تھے۔ درشہوار کی خاموشی کا بھید کھل چکا تھا۔

''وہ اپنے بیگ سمیت پارلر سے کہیں چلی گئی ہے اور اتا بیہ بہت ٹینشن میں ہے۔ پلیز جاؤ تم وہاں۔''

''مائی گاڈ!'' شاہ میر کے ساتھ ساتھ طوبیٰ کا بھی دماغ بھک کر کے اڑا۔

''یہ کیا کیا اس پاگل لڑکی نے۔'' طوبیٰ نے خوف زدہ نگاہوں سے شاہ میر کی طرف دیکھا جس کے وجود کا سارا لہواس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''تم پلیز فوراً جاؤ، وہ بہت رو رہی ہے، میں ندرت امی کو بتاتی ہوں۔'' نمیرہ کا آدھا جملہ ابھی منہ میں ہی تھا کہ شاہ میر میزائل کی سی تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلا، اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھا۔ سامنے وہاج اپنے کچھ فرینڈز کے ساتھ کھڑا خوش گپیوں میں مصروف تھا، وہ شاہ میر کو پریشان انداز میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکا۔

''یار امی سے پوچھو کتنی دیر ہے درشہوار اور ریا کو؟ داجی بار بار پوچھ رہے ہیں؟''

''آپ میرے ساتھ چلیں وہاج بھائی۔'' شاہ میر نے زبردستی ان کا ہاتھ پکڑا اور اس کے لہجے میں کچھ تھا جو وہاج کو اپنی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

مونیکا کی چوری چھپے شادی کے فیصلے نے جارج کو ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔

انجائنا اٹیک کے بعد وہ تین دن ہاسپٹل میں رہا اور جب گھر پہنچا تو بدنامی اور رسوائی اس کے گھر کی دہلیز پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی، مونیکا نے ان سب کو اپنی کرسچین کمیونٹی میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''اس سے تو اچھا تھا، میں اس کا پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔۔'' مارتھا اٹھتے بیٹھتے ہوئے اسے بددعائیں دے رہی تھی۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی منہ چھپائے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہاں کی کمیونٹی کے بچے ان پر مونیکا کے حوالے سے فقرے کستے اور ان کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنا کوئی اتنا بھی آسان کام نہیں تھا۔۔

''میں چھوڑوں گا نہیں اسے۔'' مونیکا کا چھوٹا بھائی لال آنکھوں کے ساتھ سارا دن بیٹھ کر ایک ہی فقرے کی گردان کرتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنی بہن کو کھڑے کھڑے گولی مار دیتا، اوپر سے جارج کو اس علاقے کے کونسلر نے گھر خالی کرنے کے لیے دن رات تنگ کر رکھا تھا۔

دوسری طرف مونیکا، ذوالکفل کے ساتھ عمرہ کر کے واپس آئی تو بہت پرسکون تھی وہ دونوں لاہور میں اپنی نئی اور خوش گوار زندگی کا آغاز کر چکے تھے، عمرہ نے مونیکا کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا کر دیا تھا، اس کے اندر کا اضطراب اور بے چینی ختم ہو چکی تھا اور سونے پہ سہاگہ، اللہ نے جلد ہی اسے خوش خبری سنا دی تھی۔ اس خبر نے ان دونوں کی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

''اللہ مجھے جو بھی اولاد دے گا۔ میں اس کو حافظ قرآن بناؤں گی۔'' اس دن کھانا میز پر لگاتے ہوئے مونیکا

نے بڑے پرجوش انداز میں اپنے شوہر کو بتایا تو اس کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

''مونیکا! اس سے پہلے تم میری ایک بات مانو گی؟'' ذوالکفل کے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ ٹھٹک گئی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ کی تو ہر بات ہی مانتی ہوں۔'' اس کے چہرے پر بے ریا مسکراہٹ تھی۔

''میرے خیال میں ہمیں اپنے پیرنٹس سے معافی مانگ کر ان کو منا لینا چاہیے، وہ لوگ ہم سے خفا ہیں۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' مونیکا نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں۔ ہم دونوں ملتان جائیں اور میں اپنی حویلی میں لے جا کر تمہیں، تمہارا حق دلاؤں تاکہ کل کو میری اولاد کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔''

''کیا وہ لوگ مجھے قبول کرلیں گے۔'' مونیکا کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔

''تھوڑا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔'' وہ پرامید تھا۔

''بس ٹھیک ہے پھر ہم لوگ کل ہی ملتان کے لیے نکل جاتے ہیں۔'' وہ فوراً تیار ہوگئی اور ذوالکفل کے چہرے پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ در آئی کیونکہ اپنی شادی شدہ زندگی کے اس مختصر عرصے میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ مونیکا کی طبیعت میں بے انتہا لچک تھی ذوالکفل کی باتوں پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین کرلیتی تھی اور اس کا روز بروز بڑھتا ہوا یہ یقین ذوالکفل کی اس کے حوالے سے ذمے داریوں میں مزید اضافہ کررہا تھا۔

☆☆☆

ارسل نے جھنجلا کر واڈروب کا پٹ بند کیا اور سیل فون کان سے لگا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف فون کال پر رومیصہ تھی۔

جس نے آج خلاف معمول کوئی تیسری دفعہ اسے کال کی تھی۔ اسے عجیب سی بے چینی لاحق تھی، جبکہ ارسل مر کر بھی اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ آج اس کا اور درشہوار کا نکاح ہونے جارہا ہے، کیونکہ رومیصہ جیسی جذباتی لڑکی سے بعید بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں شادی ہال میں پہنچ کر ایک ہنگامہ کھڑا کردیتی۔

''رومی میری جان! کیوں اتنا زیادہ ہائپر ہورہی ہو تم۔'' وہ ہر ممکن طریقے سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا ارسل! تم بس ہر حال میں کل اسلام آباد واپس آؤ۔'' وہ ضدی انداز میں بولی۔

''آخر ہوا کیا ہے، کچھ پتا بھی تو چلے۔'' وہ پریشان ہوا۔

''مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، عجیب سی طبیعت ہورہی ہے میری ان دنوں۔'' رومیصہ کی اس بات پر وہ ہلکا سا پریشان ہوا۔

''اچھا تم ٹینشن مت لو، میں کل آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' ارسل نے فوراً ہی دل ہی دل میں حساب کیا اور جلدی سے جوتے پہننے لگا، اسے شادی ہال میں پہنچنا تھا کیونکہ رومیصہ کی کال کے دوران بار بار شاہ میر کی کالز آرہی تھیں۔

''تم آرہے ہو ناں؟'' رومیصہ مشکوک ہوئی۔

''ارے یار! کیوں نہیں آؤں گا، مجھے کیا تمہاری حالت کا اندازہ نہیں ہے۔'' اس کے محبت بھرے انداز پر وہ تھوڑا مطمئن ہوئی۔

''اچھا۔فون بند کرو تم، بعد میں بات کرتا ہوں تم سے، کیونکہ ماموں کی کال آرہی ہے بیچ میں۔'' ارسل نے نرم لہجے میں اسے کہا تو وہ خلاف توقع مان گئی۔

وہ غیر ارادی طور پر ڈریسنگ کے شیشے کے سامنے آن کھڑا ہوا، فان کلر کے پینٹ کوٹ میں اس کے سارے وجود پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میر ہاؤس سے کہیں دور بھاگ جائے۔ وہ درشہوار نام کا کوئی بھی طوق اپنے گلے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن حالات اسے اس نہج پر لے آئے تھے جہاں پر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی وقت ملازمہ دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے جو وہ اس کے کمرے میں سجانے کے لیے لائی تھی۔

''اٹھاؤ یہ پھول شول، کوئی ضرورت نہیں ہے میرے کمرے میں یہ گند پھیلانے کی۔'' اس نے اپنا غصہ ملازمہ پر اتارا، تو وہ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

''یہ تو بڑی بیگم صاحبہ کا حکم ہے، وہ خفا ہوں گی۔'' ملازمہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

''جو خفا ہوتا ہے، وہ ہوتا رہے، تم جاؤ یہاں سے۔'' اس کے مشتعل انداز پر ملازمہ گھبرا کر بکے اس کے بیڈ پر رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔

ارسل نے بیڈ کی سائیڈ پر رکھا بکے غصے سے اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پورے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا، اسی وقت اس کے سیل فون پر میر حاکم علی کی کال آنے لگی، اس کا دماغ ایک دم ٹھکانے پر آیا اور اس نے ایک لمبا سانس خارج کر کے خود کو نارمل کیا اور ان کی کال اٹینڈ کی اور دوسری جانب حسب توقع وہ اسے شادی ہال میں آنے کا حکم دے رہے تھے اور اس حکم کو ٹالنا کم از کم اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

☆☆☆

میر ہاؤس پر کسی نے ڈرون حملہ ہی تو کیا تھا۔

پورے گھر میں ایسا زلزلہ آچکا تھا جس نے اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس حادثے کی سب سے پہلے خبر بھی تاجدار بیگم کو ہوئی تھی۔

اس وقت سب مہمان ہوٹل جا چکے تھے جب انابیہ کی تاجدار بیگم کو کال آئی، جسے سنتے ہی ان کا رنگ فق ہوا، وہ گھر کے کمروں کو لاک لگوا رہی تھیں تاکہ مکمل سکون اور تسلی کے ساتھ شادی ہال میں جا سکیں۔

''بی بی جی! ارسل صاحب کے کمرے میں فریش پھول اور بکے رکھ دیے ہیں۔'' ایک ملازمہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تو سامنے تاجدار بیگم کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا، ملازمہ گھبرا کر پانی کا گلاس لینے کے لیے کچن کی طرف دوڑی۔

وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی لمبے لمبے سانس لے کر اپنی رکی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی بمشکل کوشش کر رہی تھیں۔ اسی وقت ہال کمرے کی سیڑھیوں سے تیزی سے اترتا ہوا ارسل ان کی حالت دیکھ کر چونکا۔

''کیا ہوا ممانی جان، آپ گئیں نہیں ہوٹل؟'' وہ پریشانی سے ان کے پاس آیا۔

''ادھر آؤ ارسل! میری بات سنو بیٹھ کر۔'' وہ خوف زدہ انداز میں کھڑی ہوئیں، ارسل ان کی حالت دیکھ کر فکرمند ہو گیا، تاجدار بیگم نے صدمے کی سی کیفیت میں اس کا ہاتھ پکڑا تو ارسل کو احساس ہوا کہ وہ برف کی طرف سرد ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے ممانی جان؟ سب خیریت تو ہے ناں؟'' وہ گھبرا گیا۔

”تم جلدی سے اپنے ماموں کو کال کرو، انہیں بتاؤ، ہم پر قیامت ٹوٹ گئی ہے۔ فوراً گھر پہنچیں۔“ تاجدار بیگم کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔ ارسل کے اندر انہونی کا احساس جاگا اور اس کا پہلا دھیان درشہوار کی طرف ہی گیا۔

”بتائیں تو سہی، ہوا کیا ہے؟ تاکہ اس حساب سے انہیں بلوا سکوں۔“ ارسل نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھایا اور ملازمہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر ان کے منہ سے لگایا، جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئیں۔

اسی وقت حواس باختہ انداز میں شاہ میر اور وہاج ہال کمرے میں داخل ہوئے، ان کے پیچھے دلہن بنی ہوئی انابیہ انتہائی سہمے ہوئے انداز میں اندر آئی، ان دونوں کو دیکھ کر تاجدار بیگم خوف زدہ انداز میں کھڑی ہوئیں۔

”پتا چلا درشہوار کا؟“ تاجدار بیگم کے اس جملے کو سنتے ہی ارسل کے سر پر پورے گھر کی چھت آن پڑی، اس نے بوکھلا کر شاہ میر اور وہاج کی طرف دیکھا، جن کے چہرے بہت سی ان کہی داستانیں سنا رہے تھے۔

”پتا چلتا تو اس وقت وہ خود نہیں اس کی لاش یہاں پڑی ہوتی۔“ وہاج کا مشتعل انداز ارسل کو سارا معاملہ سمجھا گیا، وہ سمجھ چکا تھا کہ درشہوار اپنا کارنامہ سرانجام دے چکی ہے، اگرچہ اس سے پورے خاندان کی عزت داؤ پر لگ گئی تھی لیکن ارسل کو دل ہی دل میں ایک کمینی سی خوشی کا احساس ہوا، بظاہر اس نے اپنے چہرے پر حد درجہ پریشانی طاری کر رکھی تھی لیکن وہ اب اندر سے کافی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔

”سچ سچ بتاؤ بیا! تم سے کوئی ذکر کیا تھا اس نے؟“ تاجدار بیگم انابیہ کی طرف لپکیں اور التجائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”خدا کی قسم تائی اماں! مجھے نہیں پتا، میں تو برائیڈل روم میں تھی، اسی نے سلمیٰ بوا کو گھر بھیجا تھا زبردستی۔“ انابیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے، اس کے لہجے کی سچائی پر ایمان لا کر تاجدار بیگم صوفے پر بیٹھ گئیں اور دوپٹہ منہ پر

رکھ کر رونے لگیں۔

"وہ ہم سب کی عزت خاک میں ملا کر جا چکی ہے، میں چھوڑوں گا نہیں اسے۔" وہاج جس وقت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اسی وقت میر حاکم علی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یقیناً ثمیرہ اور ندرت امی ان کو اس سانحے سے باخبر کر چکی تھیں۔ ان کو دیکھ کر تاجدار بیگم بوکھلا کر کھڑی ہوئیں۔ ان کے پیچھے محتشم علی اور میر خاقان تھے، جس طوفان سے وہ ڈر رہی تھیں وہ پوری قوت کے ساتھ آ چکا تھا۔

☆☆☆

درشہوار کو ہادی ہاؤس کے گیراج میں رکھے سامان کے پیچھے چھپے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

اس وقت مری کے پہاڑوں پر ایک گہری تاریک رات اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور آج تو آسمان پر دور دور تک کوئی ستارے بھی نہیں تھے، وہ ٹیکسی لے کر پارلر سے سیدھی وہیں پہنچی تھی اور دبے قدموں سے اس گھر کے گیراج میں آ کر بیٹھ گئی، ان کے گھر میں چاروں طرف قناتیں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ خاصی مطمئن تھی کہ یہاں کا منظر وہاں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ بے چینی سے اس بات کی منتظر تھی کہ ہادی کا ملازم گھر سے باہر نکلے اور وہ موقع دیکھ کر اندر گھس جائے، اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ ہادی اور سعد دونوں ہی اس وقت گھر پر نہیں تھے اور نہ جانے کیوں اسے اس بات کی شدید خوش فہمی تھی کہ میر ہاؤس کے مکینوں کا دھیان کبھی بھی اس گھر کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ اسی وقت اس نے ہادی کے ملازم کو گنگناتے ہوئے باہر جاتے دیکھا۔

رات کے ملگجے اندھیرے میں وہ آہستہ سے اٹھی اور دیوار کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا، ملازم کے ہاتھ میں بڑے بڑے دو شاپر تھے وہ شاید کوڑے کے ڈرم میں ڈالنے کے لیے لے جا رہا تھا۔

درشہوار کا دل بُری طرح سے دھڑکا، وہ اس وقت اپنی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہادی کے گھر آئی تھی، جس نے اسے مہندی کی شام بُری طرح دھتکارا تھا اور اس نے اسی وقت دل ہی دل میں اس سے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی اور درشہوار جو ٹھان لیتی تھی، اس سے ایک انچ بھی ہٹانا انتہائی مشکل کام تھا۔

وہ ملازم سے نظریں بچا کر تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوئی اور سیڑھیاں چڑھ کر ہادی کے بیڈ روم میں گھس گئی، اس نے اطمینان سے اپنا چھوٹا بیگ اس کی الماری میں رکھا اور بڑے مطمئن انداز سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت میر ہاؤس میں کیا قیامت ٹوٹی ہوئی ہو گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس گھر کے مکین اس خبر کو ہر ممکن چھپانے کی کوشش کریں گے۔

دوسری طرف میر ہاؤس کے ہال کمرے میں اس وقت موت کا سا سناٹا تھا۔ میر محتشم کے کندھے جھکے ہوئے اور خاقان علی کے چہرے پر ایک مبہم سا استہزائیہ تاثر تھا جو بہت غور کرنے پر ہی سمجھ میں آ سکتا تھا۔

"وہ منحوس لڑکی جہاں ملے بس اسے گولی مار دو، اس گھر میں اس کی لاش بھی نہیں آنی چاہیے۔" حاکم علی نے فون پر کسی کو سرد لہجے میں احکامات دیے اور تاجدار بیگم سمیت سب نے دہل کر ان کے پتھریلے چہرے کی طرف دیکھا اور سب کی سانس رک گئی۔

"میں اس لڑکی کو پورے خاندان کے لیے عبرت کا نشان بنا دوں گا، آئندہ اس خاندان کی کوئی بھی لڑکی ایسی حرکت کرنے سے پہلے سو بار سوچے گی۔" وہ مشتعل انداز میں اپنے ارادوں سے آگاہ کر رہے تھے۔

"لیکن ابا جی! یہ بتائیں اب کرنا کیا ہے؟" شارقہ بیگم نے تھوک نگلتے ہوئے بولنے کی ہمت کی۔ وہ بھی

شادی ہال سے گھر آ چکی تھیں اور وہاں ندرت بیگم ہی سارے خاندان کو سنبھال رہی تھیں، ابھی یہ خبر گھر کے بڑوں کے درمیان ہی تھی اور اسے ہر ممکن چھپایا جا رہا تھا۔

''سارا قصور اس جاہل عورت کا ہے، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔'' محتشم علی نے سرخ آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ تاجدار بیگم اپنے میاں کا جارحانہ مزاج دیکھ کر سہم گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آنے والا وقت ان کے لیے کتنا سنگین ہو سکتا ہے۔

''چھوڑوں گا تو میں بھی کسی کو نہیں، لیکن یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے محتشم علی۔'' حاکم علی جھنجلا کر گویا ہوئے۔ ''تم لوگ ہمیشہ اپنی جذباتیت سے معاملات کو خراب کر دیتے ہو، عمر گزر گئی سیاست میں لیکن معاملات کو ہینڈل کرنا نہ آیا۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟'' محتشم علی نے اذیت کی انتہا پر اپنے سر کے بال کھینچے، تو تاجدار بیگم کا سانس رک گیا۔ انہوں نے کب اپنے میاں کو اس حالت میں دیکھا تھا۔

''محتشم تم اور خاقان جاؤ اور برہان کا ولیمہ نبٹاؤ، کہہ دینا کہ میری طبعیت ٹھیک نہیں اس لیے درشہوار اور ارسل کا نکاح بعد میں ہوگا۔'' وہ اپنے ہاتھ کی چھڑی پر زور ڈال کر کھڑے ہوئے، خاقان علی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''ابا جی! لوگ طرح طرح کے سوال کریں گے۔''

''لعنت بھیجو تم لوگوں پر۔ ابھی اس خبر کا دھواں تک نہیں نکلنا چاہیے باہر، ورنہ بہت جگ ہنسائی ہوگی۔ میں، تاجدار اور ارسل کے ساتھ اسلام آباد جا رہا ہوں اور تم سب لوگ یہی کہو گے کہ مجھے انجائنا کا اٹیک ہوا ہے اور درشہوار اور اس کی ماں میرے ساتھ ہیں۔'' ان کے اگلے حکم پر تاجدار بیگم نے کچھ سکون کا سانس لیا، وہ ویسے بھی یہاں رہ کر مہمانوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھیں۔

''لیکن بابا جان! سب لوگ اسلام آباد پہنچ جائیں گے آپ کی خیریت پوچھنے۔'' خاقان نے گھبرا کر کہا۔

''تم آج کی اس مصیبت کو نبٹاؤ، کل کی کل دیکھی جائے گی۔'' وہ بے زار لہجے میں گویا ہوئے۔

اسی وقت تھکے تھکے انداز میں وہاج اور شاہ میر اندر داخل ہوئے، ان کے جھکے ہوئے کندھوں کو دیکھ کر اندر موجود لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ درشہوار کی تلاش میں ناکام لوٹے ہیں۔

''مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر درشہوار زندہ یا مردہ حالت میں چاہیے ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔'' میر حاکم کی اس عجیب و غریب دھمکی پر وہاج اور شاہ میر نے بوکھلا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں پر کسی کے لیے بھی کوئی رعایت نہیں تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

انیلا طالب

دعا

سعدیہ سرتاپا سجی سنوری تھی۔ دعا بار بار آ کے دلہن بنی ماں سے چپک جاتی، حالانکہ نانو نے اسے کتنا سمجھایا تھا کہ جب تک رخصتی نہ ہو جائے تمہیں سعدیہ کے پاس نہیں جانا ...... مگر وہ تو بچی تھی۔

مہمانوں سے بھرے صحن میں چھپتی چھپاتی نانو سے نظریں بچا کر پھر اسی کمرے میں آ جاتی جہاں سجی سنوری سعدیہ اپنی دوندوں کے نرغے میں بیٹھی چپکے چپکے دعا پہ بھی نظر ڈال لیتی تھی۔

کچھ دیر گزری تو سب مہمان گھر سے رخصت ہوتے، باہر کھڑی کاروں، موٹر سائیکلوں اور بسوں پہ سوار ہو کر دلہن لے کے واپس جانے لگے۔

"ارے دعا! تم ادھر ہو؟ کب سے ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں۔ چلو ہاشم کے گھر، جب تک رخصتی نہ ہو۔ تم مجھے نظر نہ آؤ۔"

نانو نے من من بھاری ہوتے قدموں سے چلتے دعا کا ہاتھ پکڑے سختی سے اسے باہر بھیجا۔

کتنی مشکلوں سے عمران راضی ہوا تھا طلاق شدہ عورت سے شادی کے لیے، اسی لیے نانو کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے دعا کو سعدیہ کے پاس جانے سے روکتی رہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو ماں کے ساتھ سونے والی دعا رخصتی کے وقت بے قابو ہو کر ماں کی گاڑی میں نہ بیٹھ جائے۔

ہلکے گلابی رنگ کا کامدار سوٹ جس پہ گولڈن کام نے چار چاند لگا دیے تھے، ساتھ ہم رنگ دوپٹا ماتھے پہ سجا گلابی گولڈن نگینوں سے مزین ٹیکا اسی طرز کے بندے اور نیکلس ...... کلائیوں میں موتیوں سے بنیں لوہے کی چوڑیاں سب کچھ شیشے لگی چادر میں کہیں چھپ گیا تھا ابا نے گھونگھٹ نکالی سعدیہ کو ساتھ لگا کر خوب پیار کیا۔ نانو نے بھی اپنی بیٹی کے بوسے لیتے پیار کر کے سیاہ کار جسے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اس میں بٹھایا۔

ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بیٹھا تھری پیس سوٹ میں ملبوس عجلت میں دکھائی دیتا عمران جلد از جلد اپنی دلہن لے کے جانا چاہتا تھا تب ہی تو بار بار پیچھے مڑ مڑ دیکھتا کہ سعدیہ پچھلی سیٹ پہ بیٹھی ہے کہ نہیں، وہ بیٹھی تو اس نے شکر کیا۔

اردگرد لوگوں کا جم غفیر تھا۔ محلے والے گاؤں والے اور گھر کے لوگ گاڑی کے آس پاس کھڑے تھے۔ ہاشم کے گھر کے گیٹ سے دعا آنسو بہاتی گھونگھٹ میں چھپی اپنی ماں کی ایک جھلک کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے صرف گھونگھٹ ہی نظر آ رہا تھا۔ سعدیہ نے دعا کی تلاش میں اردگرد نظریں دوڑائیں مگر ناکامی ہوئی۔ اسی پل سیاہ چمچماتی پھولوں سے سجی کار فراٹے بھرتی ہوئی یہ جا وہ جا۔

آنسوؤں کا سیلاب نو سالہ دعا کی خوب صورت سی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ وہ اپنے رخساروں پہ بہتے آنسو صاف کرتی گیٹ کی درز سے ابھی بھی وہاں دیکھ رہی تھی جہاں سے اس کی ماں کو لے کر کار دھول اڑاتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

"تم نے مارا ہے دعا! پری کو؟" بڑی ممانی غصے سے بولیں کھلونوں سے کھیلتی بچیوں میں سے دعا پر نظریں گاڑے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں ممانی! پری یہ والا گل دان توڑنے لگی تھی، میں نے صرف اس سے لے کر سینٹرل ٹیبل پہ رکھا تو یہ رونے لگ گئی۔" دعا نے معصومیت سے کہتے ہوئے لاؤنج میں پڑے سنہری رنگ کے ایک خوب صورت سے گل دان کی طرف اشارہ کر کے کیا۔

"دعا کان کھول کر سن لو میرے بچوں سے لڑنے اور ان کے منہ سے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں۔"

یہ گھر تمہارا نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھا کرو۔"
گم صم سی دعا حیرت سے وہیں بیٹھی رہی کہ جب اس نے کچھ کہا بھی نہیں تو یہ ڈانٹ کیوں؟ ویسے بھی پہلے جب ممانیاں یا ماموں کچھ کہتے تھے ایسا تو اس کی ماں سنبھال لیتی تھی یا نانو۔ اسی لیے وہ زیادہ محسوس نہ کرتی مگر اب سعدیہ کی رخصتی ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا تھا ۔نانو ساہیوال گئی تھیں ماریہ خالہ کے پاس اسی لیے ممانی بھی خوب دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

☆☆☆

موسم بہت پیارا ہو رہا تھا۔ لان میں لگے امرود کے درخت گلاب و لیموں کے پودے اور سرخ و سفید پھول، گھر کی رونق بڑھا رہے تھے۔ دعا نے پائپ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ مستیاں کرتی قلقاریاں مارتی وہ پائپ کے پانی کی دھار کو دور تک اچھالتی، بڑے دنوں بعد آج وہ اس طرح شرارتیں کر رہی تھی ورنہ تو جب سے سعدیہ گئی تھی اس کی مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ دعا کبھی پانی امرودوں کے درخت پر بہاتی اور کبھی سرخ گلابوں پہ...... اس نے پائپ کا رخ اپنی جانب کیا۔ اس کی باربی ڈول کی تصویر والی فیروزی گلابی امتزاج والی قمیص بمعہ کیپری بھیگ گئی۔ وہ خوشی سے لان کی گھاس پر اچھل اچھل کر پانی ڈالتی کودتی اور ساتھ "ہو ہا" کی آوازیں نکال رہی تھی۔
"دعا! یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے؟" چھوٹی ممانی کی پاٹ دار آواز گونجی تو اس نے فوراً پائپ کا رخ گھاس کی جانب کیا اور نظریں چرا گئی۔
"پہلے تمہاری ماں کو نکالا ہے اب تم نے بھی نکلنا ہے اس گھر سے؟" بالکونی میں کھڑی ممانی ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتی دعا کا سینہ چیر گئی تھیں۔
"پہلے سات آٹھ سال طلاق شدہ ماں ہمارے سینوں پر مونگ دلتی رہی اور اب یہ پتا نہیں کب تک اس گھر میں بیٹھی رہے گی۔" چھوٹی ممانی نے بڑبڑاتے ہوئے بالکونی میں کھڑے اتنی آواز سے کہا تھا کہ پائپ کا نل بند کرتی دعا نے اچھی طرح سن لیا۔

☆☆☆

نانو بھی ساہیوال سے آ گئی تھیں مگر حالات ویسے کے ویسے رہے۔ کبھی کبھی سعدیہ سے بات ہو جاتی تو دعا کچھ ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ مگر چوبیس گھنٹے جس دباؤ والی زندگی میں وہ رہ رہی تھی اس کا گزارہ بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ سارا سارا دن ممانیاں اسے طعنے دیتی رہتیں، بات بات پہ ٹوکتیں۔ بلاوجہ مارتیں۔ نانو کا رعب آہستہ آہستہ کم ہو گیا تھا۔ تینوں ماموں بھی اب تو سرعام اسے ٹوکتے' باتیں سناتے، نانو وقت کے ساتھ ساتھ بوڑھی اور بیمار رہنے لگیں۔ ابا کی سنتا کون تھا۔ تینوں بیٹے اپنے اپنے کاموں میں مگن۔ اب تو نانو بھی آئے دن ہونے والے (نواسی کی وجہ سے) جھگڑوں سے تنگ آنے لگیں دعا جو کبھی ماں کے بغیر رہتی نہ تھی خاموشی سے اپنی عمر سے کئی گنا بڑے ذہن کی بدولت صبر کے گھونٹ پیتی آرام سے رہنے لگی۔

☆☆☆

سعدیہ کی پہلی شادی احمر سے ہوئی تھی جو کہ ورکنگ ویزے پر اٹلی میں تھا۔ گھرا چھا تھا سسرال والے اچھے اور سب سے بڑھ کر احمر جو کہ نہ صرف خاصا ہینڈسم بلکہ بہت محبت کرنے والا شخص تھا۔ سعدیہ نے بے شک گاؤں میں ہی آنکھ کھولی' وہیں پلی بڑھی پر اس کی زبان درازی پھوہڑپن دیکھ کے بالکل نہ لگتا کہ وہ گاؤں کے چودھریوں کی بیٹی ہے۔ ایسے چودھریوں کی کہ جہاں عورت کا طریقہ سلیقہ سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بھابیوں پہ رعب جھاڑنے والی سسرال میں بھی یہ حربہ استعمال کرنے لگی تو احمر نے خاصی دھلائی کی اور کہا۔ "بے شک ہم تمہاری طرح چوہدری نہیں پر تم لوگوں سے کم بھی نہیں۔ میری ماں بہنوں پر اگر کوئی جھوٹی غلط بات لگائی یا ان سے بدتمیزی کی تو میں فوراً سے پہلے فارغ کردوں گا۔" سعدیہ دانت کچکچا کر رہ گئی اس کے دل میں اسی وقت احمر کے خلاف بدگمانی پھیل گئی تھی۔ روز بروز جھگڑے بڑھنے لگے۔ کبھی ثانیہ اور کبھی ثانیہ سے سعدیہ پنگا لے لیتی یا کبھی ساس کے آگے زبان درازی کرتی۔ مہمان آتے تو بھی سارا کام ثانیہ' ثانیہ پہ چھوڑ کے اونچی آواز میں ٹی وی لگا کر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ دعا کی پیدائش نے بھی اسے گھر کے معاملے میں انوالو نہیں کیا، وہی نوک جھونک وہی روز روز کی چخ چخ، کاموں پہ جھگڑے سب اسی طرح تھا۔ معاملہ جب حد سے زیادہ بڑھا تو دعا کے پیدائش کے ایک سال بعد ہی احمر نے تنگ آ کے سعدیہ کو طلاق دے دی۔

بڑی منتوں اور التجاؤں کے بعد آخر احمر نے دعا سعدیہ کی جھولی میں ڈال دی کیونکہ وہ جانتا تھا سعدیہ زبان دراز' جھگڑالو سہی پر ایک ماں تو ہے وہ اتنی چھوٹی بچی اس کی ماں سے چھیننا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس نے تانیہ ثانیہ کی شدید خواہش کے باوجود روتی دھوتی سعدیہ کو دعا دے دی۔

طلاق کا داغ لے کے بیٹی جب گھر آئی تو نانو خاصی رنجیدہ ہوئیں۔ ابا بھی چپ کر گئے، اب بھی کبھی کبھی سعدیہ بھابیوں کے آگے بول لیتی' نانو بھی بیٹی کا ساتھ دیتیں۔ مگر آہستہ آہستہ جو طعنے' جو اذیتیں سعدیہ کو ملیں انہوں نے اسے خاصا تبدیل کر ڈالا۔ دعا میں تو اس کی جان تھی۔ اس کے حوالے سے کوئی بات ہوتی تو بھی وہ بول پڑتی مگر بھابیوں سے سات باتیں سننے کو ملتیں، آخر تنگ آ کے اس نے عمران سے شادی کرنے کی ہامی بھرلی جو کہ اس کی دولت کے لالچ اور کچھ خوب صورتی سے مرعوب ہو کے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ دو جوڑوں میں ابا نے بیٹی رخصت کردی۔

حالات ایک تو پہلے جیسے نہ تھے دوسرا انہوں نے پہلی دفعہ کی طرح شادی نہ کی تھی۔ محض نکاح کر کے رخصت کردیا۔ پھر بھی کافی لوگ بلائے تھے ان کے لیے یہی بہت تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سعدیہ بھی خاصی بدل گئی عمران اور اس کی ماں کی کنجوس عادت نے اسے چڑچڑا بنا کے رکھ دیا۔ بیٹی کی فکر الگ عمران کے دو بچوں آیان اریشمان کو سنبھالنے کی تھکن الگ جو کہ بے شک اس کے بھی بچے تھے مگر اسے لگتا کہ عمران کا ان پہ حق زیادہ ہے۔ ساس کے چونچلے الگ دیکھنے پڑتے وہ احمر کی ماں کی طرح خوش اخلاق نہیں تھیں گھریلو حالات کی تنگی زیادہ ـــــ ہوئی تو عمران سعودیہ چلا گیا۔ دعا کی روتی آواز بھابیوں کے طنز اس کا دل چھلنی کرنے لگے تب ہی سعدیہ نے فیصلہ کرلیا وہ دعا کو اپنے ساتھ اپنے سسرال لے جائے گی۔

☆☆☆

"دعا" تمہارے بابا کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں دعا کو اٹلی بھیج دیں۔ میں سارا انتظام کروا دیتا ہوں۔" سعدیہ، آیان اور اریشمان کو بیڈ پہ سلا کر اس کے پاس آئی تھی جو گھٹنوں میں سر دیے خاموش سی بیٹھی تھی۔

"ماما۔ منع کردیں انہیں، میں ادھر ہی رہوں گی اپنی ماما کے پاس۔" پندرہ سال کی عمر کو چھوتی گھونگھریالے بالوں والی دعا نے سعدیہ کے گرد

مرحبا
مرحبا
لال مہندی
/MarhabaLaboratoriespk
UAN: 111-152-152
www.marhaba.com.pk

بانہیں پھیلا دیں۔

"مگر دعا! تم جانتی ہو عمران بھی مجھ سے ناراض ہیں جب سے تمہیں لائی ہوں۔ اور میری ساس ان کا تو تمہیں پتا ہے کتنی باتیں تمہارے سامنے سناتی ہیں۔ میری جان تم کیسے رہو گی یہاں' ہوں۔" سعدیہ نے دعا کو ساتھ لپٹاتے پیار سے کہا تو وہ محبت سے مخمور لہجے میں بولی۔

"ماما! مجھے سچی محبت چاہیے جو آپ سے ہی ملتی ہے ورنہ ممانیاں بھی تو باتیں کرتی تھیں میں برداشت کر لیتی تھی اب بھی کر لوں گی۔"

"اچھا میری جان۔" دعا کے دونوں گالوں پر پیار کر کے سعدیہ دوسرے کمرے میں چلی آئی اس پہ بوجھ لدا ہوا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

☆☆☆

دعا کے ہاتھ میں دودھ سے لبالب بھرا گلاس تھا جسے وہ آہستہ آہستہ سپ لیتی پی رہی تھی۔

"ارے ادھر دو یہ دودھ تمہیں کس نے دے دیا اپنے بچوں کا تو پورا نہیں ہوتا غیروں کی اولاد کون سینے سے لگائے۔" سعدیہ کی ساس نے جھٹ دعا کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھینا۔ تیزی سے باہر نکل کر دعا واشنگ مشین سے کپڑے نکالتی سعدیہ سے رو رو کے کہہ رہی تھی۔

"ماما! مجھے نہیں یہاں رہنا مجھے اپنے بابا کے پاس جانا ہے مجھے اٹلی جانا ہے۔"

دعا زار و قطار رو رہی تھی۔ اس سے مزید ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

فیصلہ گو کہ کیا جا چکا تھا مگر پھر بھی عمل کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

پیلے رنگ کے خوب صورت کرتے اور نیلی جینز میں ملبوس دعا دائیں ہاتھ میں بریف کیس پکڑے رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے اٹلی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ سعدیہ بھی کچھ کم نہ رو رہی تھی۔

"دعا اپنا خیال رکھنا، وہاں تانیہ' ثانیہ تمہاری دادو' تمہارے بابا سب ہوں گے۔ پریشان نہ ہو۔" سعدیہ نے دعا کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی دعا سر ہلاتی رہی۔

سعدیہ جانتی تھی دعا کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے مگر اسے ان حالات میں رکھنا اس سے بھی بڑھ کے مشکل تھا تب ہی دل پہ پتھر رکھ کے فیصلہ کر لیا۔

"ماما میں آپ سے ملنے آتی رہوں گی جب بھی ہم پاکستان آئیں گے' میں آیا کروں گی۔" دعا نے ماں کو پریشان دیکھتے ہوئے حوصلہ دیا۔

"دعا! پتا ہے تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکوں گی لیکن ماں کی اس مجبوری کو بھول مت جانا دعا۔" سعدیہ نے گاڑی کے ہارن کی آواز نظر انداز کرتے اس سے کہا۔ ابھی وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔

"ارے سعدیہ! کہاں رہ گئیں، گیٹ بند کر کے جلدی آؤ عمران کا فون ہے۔"

چابک کی طرح اس کے کانوں میں ساس کی آواز آئی تھی۔ دعا فوراً ہی مل کے چلی گئی جہاں اس کے بابا' اس کی پھوپھیاں اس کے لیے جان نثار کرنے کو تیار تھیں۔ بے شک احمر نے شادی کر لی تھی مگر آج بھی وہ دعا سے بہت محبت کرتا تھا تب ہی تو اس کے ایک فون کرنے پر اسے ہمیشہ کے لیے پاس بلا لیا۔

مضطرب سی سعدیہ گیٹ کے بند کرنے کے بعد اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھتی یہ سوچ رہی تھی۔ ان ماؤں کی دعائیں میری دعا کی طرح جگہ جگہ رلتی ہیں جنہیں کچے رشتے کو نبھانا نہیں آتا' جنہیں محبت و سلیقہ شعاری سے گھر چلانا نہیں آتا... جنہیں سچی محبت کرنے والوں کو سنبھالنا نہیں آتا۔ ان کی بیٹیاں ایسے ہی دکھ سہتی ہیں۔"

سعدیہ' دعا کی یادوں میں بسی اندر آ کے اس کے لیے دعا کرنے لگی یہ دعا ہی تو تھی جس نے اس کی دعا کو دوبارہ پھر سچی محبت کرنے والوں میں لا بٹھایا...... اور یہ بھی دعا ہی تھی جسے اس کی دکھی ممتا کو سکون دینا تھا۔

☆

یار دلدار

افشین نعیم

عادل اپنا بیگ کھولے پچھلے آدھے گھنٹے سے کپڑے سلیکٹ پھر ریجیکٹ، پھر سلیکٹ، پھر ریجیکٹ کرنے میں مصروف تھا۔

انس ایک طرف چادر بچھائے کپڑے استری کر رہا تھا، احسن موبائل پر گیم میں مصروف تھا۔

حیدر کی بہن کی شادی تھی، وہ گھر گیا ہوا تھا، محب اللہ عصر کی نماز پڑھنے مسجد گیا ہوا تھا۔

انس کے کپڑے استری ہوگئے، اس نے چادر

لپیٹ کر سائیڈ پر رکھی۔ استری دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔

احسن کی گیم کا ایک راؤنڈ ختم ہوگیا۔ اس نے موبائل بند کر کے چارجنگ پر لگا دیا۔

محب اللہ نماز پڑھ کر واپس آگیا۔

بس نہ ہوا تو عادل کا کام مکمل نہ ہوا۔ وہ ہنوز کپڑوں کے انتخاب میں ناکام تھا۔

محب اللہ نے ٹوپی سر سے اٹھا کر سرہانے رکھی۔ اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ دھیان سے عادل کی کارروائی ملاحظہ کرنے لگا۔

محب اللہ کی دیکھا دیکھی احسن بھی اس کے ساتھ ہی جڑ کر اسی کے انداز میں عادل کی جانب منہ کر کے بیٹھ گیا۔

اب چونکہ انس کی فی الحال دوسری کوئی مصروفیت نہیں تھی سو وہ بھی محب اللہ کے دوسری جانب اس کے کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک تینوں خاموش بیٹھے عادل کو کپڑوں کی اٹھا پٹخ کرتے دیکھتے رہے تب ہی عادل کو غیر معمولی سی خاموشی کا احساس ہوا۔

گردن گھما کر دیکھا۔ تینوں قطار میں بدھا کے اسٹائل میں بیٹھے اسے گھور رہے تھے۔ ایسے کہ ان پر پتھر کے مجسموں کا گمان ہو رہا تھا پلک تک نہیں جھپک رہے تھے۔

"کیا ہے......؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے......؟"

"جب تیری مہم اختتام کو پہنچے گی نا، ہم تالیاں

اع (یاردل دار......افشین نعیم) Yar dil Dar

بجائیں گے۔" احسن کے لب ہلے۔

"تو پھر بجالو تالیاں، اختتام کو پہنچ گئی ہے میری مہم۔"

"بڑا سیانا ہے تو، الیکشن مہم کی طرح، بغیر کسی نتیجے کے ہی مہم ختم ہوگئی۔"

"تو کیا کروں......؟" ڈھول گلے میں ڈال کر ناچنا شروع کر دوں......؟

"دھیرج، یار دھیرج، غصہ کیوں کھا رہا ہے۔ لا مجھے بتا، میں کچھ مدد کر دیتا ہوں۔ یہ تیری کل چھ شرٹس ہیں۔ چار پینٹیں ہیں اور ایک یہ شلوار سوٹ ہے جو شاید تو نے آخری بار عید کی نماز کے لیے پہنا تھا۔ اب اس میں سے تو نے حیدر کی بہن کی شادی کے لیے کپڑے چننے ہیں۔ ہے نا......؟" احسن نے سوالیہ نظروں سے عادل کو دیکھا۔ عادل نے گردن ہلائی۔

"ایسا کر مہندی پر یہ شلوار سوٹ پہن لے۔ اور شادی والے دن کے لیے۔ ہوں......" تھوڑا توقف کیا۔ "آنکھیں بند کر کے شرٹس اٹھانا شروع کر، تین نمبر پر جو بھی شرٹ ہاتھ میں آئے بس وہی تیری لکی شرٹ ہوگی۔ پھر اس کے ساتھ پینٹ سیٹ کر لے۔" احسن نے آسان حل تجویز کیا۔

انس نے تالیاں بجائیں۔ محب اللہ نے صرف گھورنے پر اکتفا کیا۔ "اس سے بہتر ہے میں شرٹس کے اندر پتھر لپیٹ لپیٹ کر تجھے مارنا شروع کروں۔ جس پتھر کم شرٹ سے تیرا سر کھل گیا نا بس وہی لکی شرٹ منتخب کرلوں۔"

"یہ تجویز زیادہ بہتر ہے۔" انس کی بتیسی باہر آئی۔ پھر احسن کے گھورنے پر فوراً ہی اندر کرلی۔

محب اللہ اپنی جگہ سے اٹھا، دو شرٹس اور ایک پینٹ اٹھا کر عادل کی جانب بڑھائی۔ "یہ دونوں دن کے لیے۔ اب بیگ بند کردے۔" عادل نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

"تم لوگوں نے تیاری نہیں کرنی؟" عادل نے بغیر کسی کا نام لیے سوال کیا۔

جواب احسن کی جانب سے آیا سب سے پہلے۔

"بھئی، میں تو آنکھیں بند کر کے بیگ میں ہاتھ ماروں گا۔ جو کچھ بھی نکل آیا۔ بس وہی پہنوں گا۔" ہاں اس بات کا خیال رکھوں گا، کہ بیگ انس کا ہو۔"

انس خاصا خوش لباس انسان تھا

انس نے پھر کھی کھی شروع کر دی۔ "احسن بھائی! آپ ماشاءاللہ قد کاٹھ میں مجھ سے بہت بہتر

ہیں۔ میرے کپڑے پہن لیے تو لگے گا، بچپن کے کپڑوں میں شادی میں شریک ہوئے ہیں۔"

"پھر کیا ہو گیا۔ میرے کون سے ماموں کے پتر کی شادی ہے۔"

تب ہی احسن کو کچھ خیال آیا۔ "مولوی تو کیا پہنے گا شادی میں......؟"

"نہیں یار! میں نے معذرت کر لی ہے حیدر سے، اباجی کی طبیعت زیادہ خراب ہے، مجھے شاید گھر جانا پڑے۔ تم لوگوں نے نکلنا کب ہے......؟"

"کل دوپہر میں نکلیں گے۔ پرسوں شام ان شاءاللہ واپس۔"

محب اللہ نے گردن ہلائی۔

"عادل! چائے پلا یار!" محب اللہ عادل کی طرف مڑا۔

"کبھی قرعہ فال کسی اور کے نام بھی نکال لیا کر۔"

"کسی اور کے ہاتھ کی چائے میں وہ بات کہاں۔" پیار سے عادل کو دیکھا۔

"بس بولتی بند کرا دیا کر۔" منہ بناتا چائے بنانے اٹھ گیا۔

☆☆☆

"حیدر! شی، شی......بات سنو۔"

حیدر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

"یہاں ہوں میں۔" آواز دیوار کے پرلی طرف سے آ رہی تھی۔

اب کے ماہی کا چہرہ دیوار کے دوسری طرف سے برآمد ہوا۔ غالباً اسٹول ـــ رکھ کر اس پر چڑھی تھی۔

"اف کیا بچپنا ہے ماہی......؟ شادی والا گھر ہے۔ کوئی دیکھ لے گا تو سو، سو باتیں بنیں گی۔"

"باتیں بننے کی کیا تک ہے بھلا؟ خالہ زاد ہیں ہم دونوں، بچپن کے منگیتر ہیں۔" ماہی نے ناک چڑھائی۔

"اچھا بولو، کیا بات ہے؟"

"وہ جو تم چوڑیاں لائے ہو نا میرے لیے، اتنا چھوٹا سائز ہے۔ یہ دیکھو سارا ہاتھ زخمی کر لیا میں نے، پھر بھی نہ چڑھ کر دیں۔"

ماہی نے کہتے ہوئے کلائی سامنے کی۔ جگہ جگہ کٹ لگے ہوئے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اگلی بار کلائی کاٹ کر ساتھ لے جاؤں گا۔ پھر ناپ کی چوڑیاں آ جائیں گی۔ خوش......؟"

ماہی نے تڑپ کر ہاتھ پیچھے کیا، ظالم کہیں کا۔

"انگوٹھی بھی چھوٹی ہے۔"

"اوکے، اگلی مرتبہ انگلی بھی کاٹ کر ساتھ لے جاؤں گا۔ اب جاؤں میں؟"

"مجھے ضروری بات کرنی ہے تم سے، رکو، دو منٹ۔"

"دو منٹ سے زیادہ ہی ہو گئے ہیں مجھے رکے ہوئے۔ بات کرو تم۔"

"تمہیں کچھ اندازہ ہے اس خطرے کا جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے؟" سوالیہ نظروں سے حیدر کو دیکھا۔

"تیسری عالمی جنگ کا خطرہ......؟" ذہن پر زور ڈال کر جواب دیا۔

"نہیں، میں اپنے اور تمہارے بارے میں بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے سمجھ گیا۔ نہ تمہاری کلائی کاٹوں گا نہ انگلی۔"

"حیدر!" وہ چیخ اٹھی۔ "سیریس ہو کر سنو۔ میری پھپھو جن کو بیس سال بعد اچانک ہی مٹی کی خوشبو اور بھائی کی یاد واپس کھینچ لائی ہے نا، ان کے تیور مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ ضرورت سے بلکہ حد سے زیادہ واری صدقے جا رہی ہیں مجھ پر۔"

"تو اس میں خطرے والی کون سی بات ہے؟" حیدر سمجھ نہیں پایا۔

''خطرہ پھپھو نہیں ان کا وہ لنگور نما لندن پلٹ چھچھورا بیٹا ہے۔ سارا سارا دن ابو کے کان میں پتا نہیں کیا کیا کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں۔''

اب کے حیدر کو کچھ کچھ اندازہ ہوا خطرے کا۔

''کیا کروں......؟'' بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''تمہارے ابا نے اگر دس تولے زیور کی شرط نہ لگائی ہوتی نا تو ابھی نازی کے ساتھ ساتھ ہماری شادی بھی ہو جاتی۔''

''حیدر پلیز، کچھ کرو۔ تمہیں پتا ہے نا ابا پیسے کے کس قدر لالچی ہیں اور وہ پھپھو دن رات پیسہ چھنکا رہی ہیں ان کے سامنے۔ یہ نہ ہو وہ مجھے لے کر اڑن چھو ہو جائیں اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔''

''ایک ہی حل ہے۔ تمہارے والد محترم کو گولی مار کر پھڑکا دوں۔''

''حیدر! میں سنجیدہ ہوں۔'' ماہی جھنجھلائی۔

''تم سنجیدہ نہیں ہو، ماہی ہو، حیدر کی ماہی اور میرے ہوتے کوئی ایسا سوچے گا بھی نا، اس کی تو جان لے لوں گا۔ تم پریشان مت ہو، کرتا ہوں میں کچھ۔'' حیدر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ماہی دیوار کے پیچھے گم ہو گئی۔

☆☆☆

''گھر آرام سے مل گیا......؟ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تم لوگوں کو......؟''

عادل، انس اور احسن ابھی کوئی پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچے تھے اب وہ چاروں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

مہندی کا فنکشن شروع ہونے میں دو، ایک گھنٹے تھے ابھی، رات یہیں ٹھہر کر، دن میں شادی کا فنکشن اٹینڈ کر کے شام تک واپسی تھی۔

''بھئی، مجھے تو بہت تکلیف ہوئی۔ پورا راستہ یہ احسن اتنا بڑا تربوز جیسا سر میرے کندھے پر ٹکا کر اتنے واہیات خراٹے لیتا رہا۔'' عادل نے چائے کا زوردار سڑپا کھینچا۔

''میں تو بہت مزے میں تھا حیدر بھائی۔'' انس نے خوشی سے بتایا۔

''ہاں اس کی سیٹ سے اگلی سیٹ پر دو نقاب پوش حسینائیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سانس روک کر بیٹھا رہا۔ تین گھنٹے بچہ۔'' عادل نے خوشی کی وجہ بتائی۔

''عادل بھائی! ان کے منہ آگے تھے۔ پیچھے صرف نقاب پوش سر نظر آ رہے تھے۔'' انس نے کچھ کھسیا کر بتایا۔

''دیکھ لو۔ اس پر بھی بچے کا سفر کس مزے سے کٹ گیا۔ حیدر نے دانت نکالے۔

انس نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔

''اچھا سنو یارو! تم لوگوں کی دوستی کا امتحان آن پہنچا ہے۔''

''تو نے ہمیں شادی میں شرکت کے لیے بلایا ہے یا پرچا دینے؟'' احسن کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

حیدر نے اس بات کو قطعی لفٹ نہیں کرائی اور خالو اور ان کے بھانجے سے جڑے مسئلے کو گوش گزار کیا تفصیل سے۔

''اب مجھے کوئی حل بتاؤ اس مسئلے کا۔ میرے پاس تو دس تولے زیور کا پیسہ پتا نہیں کبھی اکٹھا ہو گا کہ نہیں؟'' حیدر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''لا لے! تو مجھے اپنے خالو کے درشن کروا دے، پھر باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔'' احسن نے خدمات پیش کیں۔

''اور ان کے لندن پلٹ بھانجے کو میرے حوالے کر اور بے غم ہو جا۔''

یہ آفر عادل کی طرف سے آئی تھی۔

''میرے اندر تو ایسی کوئی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے تو آپ اپنے ساتھ ہی رکھیے گا۔'' انس کچھ شرمندہ شرمندہ سا بولا۔

☆☆☆

ایک خالی پلاٹ میں قناتیں لگائی گئی تھیں۔

مردانہ اور زنانہ پورشن الگ الگ تھے۔
مہمان بھی ابھی اکا دکا ہی پہنچے تھے۔ صد شکر کہ خالو مع اپنے بھانجے کے جلدی آ گئے میدان میں۔
''خالو جان! یہ میرے دوست ہیں۔'' حیدر نے ان تینوں سے خالو کا تعارف کرایا۔
احسن تو کچھ اس عقیدت سے ملا کہ بس ہاتھ چومنے کی کسر رہ گئی تھی۔
اس کے بعد بھانجے سے تعارف کا مرحلہ آیا۔
پتلا، لمبا، سوکھا سڑا انسان، لمبے لمبے بال، ٹائٹ سی شرٹ، بالکل ٹانگوں کے ساتھ چپکی ہوئی جینز، ٹانگیں کیا تھیں بے چاری ٹوتھ پکس محسوس ہو رہی تھیں جینز کے اندر پھنسی ہوئی۔
''یار! یہ ان کا بھانجا ہے کہ بھانجی! منہ حیدر کے کان میں گھسا کر عادل نے سرگوشی کی۔ حیدر نے اس کے پاؤں پر پاؤں مارا۔
''ہائے، آئی ایم سکی۔'' بھانجے نے خود ہی ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا جس کو عادل نے بڑی محبت سے تھاما (آ جا، بیٹے تیرا آپریشن کروں)
''جی، یہ سخاوت ہیں، میرے خالو کے بھانجے، حال ہی میں لندن سے آئے ہیں۔'' حیدر نے تعارف کروایا۔
پھر انس اور حیدر تو ادھر ادھر ہو گئے۔ احسن اور عادل نے اپنا اپنا کام شروع کیا۔
عین اس وقت جب شامیانہ کھچا کھچ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ پلاٹ کے ایک کونے میں احسن بڑی عقیدت سے خالو جان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔
بس نہ چلتا تھا کہ ان کے قدموں میں خود کو نچھاور کر دے۔ خالو بڑی توجہ اور دھیان سے اس کی باتیں سن رہے تھے، سر دھن رہے تھے۔ اب ان کے درمیان کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ تو وہ جانتے تھے یا پھر ان کا اللہ۔
دوسری جانب عادل، سکی عرف سخاوت سے محو گفتگو تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے عادل کی گفتگو سن رہا تھا۔
لیکن زیادہ دیر نہ سن پایا۔ اٹھ کر محفل ہی سے چلا گیا۔
عادل کا آدھا مشن اختتام کو پہنچا۔ باقی آدھے کے لیے وہ ہاتھ جھاڑتا، خالو اور احسن کی طرف آ گیا۔
اس تقریب کے اختتام پر وہ کس حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ اس کا فیصلہ آنے والی صبح کو کرنا تھا۔

☆☆☆

حیدر، ان لوگوں کو ناشتہ کروا کر دیگوں والے کی طرف نکل رہا تھا۔ جب خالو جان اور خالہ کی آمد ہوئی۔
''السلام وعلیکم!'' اس نے با آواز بلند سلام کیا۔
''وعلیکم السلام۔'' جواب دونوں نے دیا پر خالو نے جس محبت سے پکڑ کر اسے بھینچا اور پھر ساتھ ہی اگلا جملہ، ''کہاں جا رہا ہے میرا بیٹا......؟''
''بیٹا!'' اس قدر شیرا ٹپک رہا تھا جملے سے کہ حیدر کو اپنے پاؤں چپکتے محسوس ہوئے۔
جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا۔ اس کے اور خالو کے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے۔
ماہی اور اس کا رشتہ سراسر دونوں بہنوں کی پسندیدگی کی بنا پر تھا ورنہ خالو کبھی دل سے راضی نہ ہوئے تھے اس رشتے کے لیے۔
خالہ، خالو اس کو لیے اندر داخل ہوئے۔ امی کو سامنے بٹھا کر مطالبہ کیا گیا کہ آج نازی کے فنکشن میں حیدر اور ماہی کا نکاح بھی کر دیا جائے، رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ امی اور نازی تو گویا سکتے میں ہی آ گئیں۔ خود حیدر کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھا۔
''لیکن، اس قدر ایمرجنسی میں......؟ ایسی بھی کون سی آفت آ رہی ہے؟''
حیدر تھوڑا جھنجھلایا۔ (الٹے دماغ کا آدمی)

''بس بیٹا! زندگی اور موت کا کیا بھروسا......؟
جو کام زندگی میں ہو جائے وہی اچھا۔'' خالو نے کچھ بے چارگی طاری کی چہرے پر۔
حیدر نے حیرت سے، خالو کے ہٹے کٹے وجود پر نظر ڈالی (اب اتنا بھی کو ئیک ایکشن کرنے کو نہیں کہا تھا، ان مسخروں کو)
وہ خالہ، خالو کو امی سے بحث مباحثہ کرتا چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس آیا۔
''یہ کیا، کیا ہے تم دونوں نے......؟'' تیور خاصے جارحانہ تھے۔
''ہم نے۔'' عادل نے احسن کو دیکھا، ''کیا کیا ہے......؟'' آنکھ کے اشارے سے احسن سے پوچھا۔ ''کیا کیا ہے ہم نے؟''
''ہم نے تیرا بگڑا کام بنا دیا ہے۔ جا پانی لے کر آ، پاؤں دھو دھو کر پی ہمارے۔'' جواب احسن کی طرف سے آیا۔
''میں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا تو نہیں کہا تھا۔'' حیدر چڑچڑا ہو رہا تھا۔
''یار! مجبوری تھی'' عادل نے بے چاری سی شکل بنائی۔
حیدر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''دیکھ، اگر یہ پروگرام کچھ دن بعد ہوتا تو ہمیں دوبارہ کرایہ لگا کر آنا پڑتا، سو ہم نے سوچا......''
بات مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ حیدر نے تکیہ زور سے اسے دے کر مارا۔
''احسان فراموش آدمی! بجائے شکر گزار ہونے کے قاتلانہ حملے کر رہا ہے۔'' عادل نے تکیہ واپس اس کی طرف اچھالا۔
''احسان فراموش کے بچے، اب عین نکاح کے ٹائم پر میرا وہ لالچی سسر دس تولہ سونا لکھوانے کی فرمائش کرے گا تو میں کیا کروں گا......؟''
حیدر کی پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔
''نہیں لکھوائے گا۔ حق مہر شرعی ہو گا۔'' عادل نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے احسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔
''ڈرامے بازو! یہ آخر تم لوگوں نے کیا چکر چلایا ہے؟''
''یہ اس بنگالی بابے کا پلان تھا سارا۔'' عادل نے انگلی سے احسن کی جانب اشارہ کیا۔
''کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' انس کے لیے مزید خاموش رہنا ممکن نہیں رہا تھا اب۔

☆☆☆

نازی کی رخصتی سے پہلے پہلے حیدر اور ماہی کا نکاح ہو گیا بغیر کسی بدمزگی کے۔
حیدر کے دل میں شک اٹھاتے اندیشے۔ دل ہی میں رہ گئے۔ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا گیا۔
مہمان رخصت ہو گئے۔ اس کے یار، بیگ تیار کیے جانے کو بیٹھے تھے جب حیدر ایک تالا اٹھائے اندر آیا۔
''ہاں تو اب بتاؤ، کیا چکر چلایا تم دونوں نے......؟''
''تو، آم کھانے سے مطلب رکھ، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے۔''
''ضرورت مجھے نہیں، تم لوگوں کو پڑے گی اب یہ دیکھو'' تالا ان لوگوں کو دکھایا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کے کنڈے میں ڈال کر بند کر دیا۔
''اب یہ تالا تب کھلے گا جب مجھے تفصیل سے ساری بات بتاؤ گے۔'' وہ ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔
احسن نے عادل اور عادل نے احسن کو دیکھا۔ یعنی کہ بتانا ہی پڑے گا۔

☆☆☆

پلاٹ کے ایک کونے میں احسن، خالو جان کے ساتھ بڑی عقیدت سے بیٹھا ہوا تھا۔ بس نہ چلتا تھا۔ ان کے قدموں میں خود کو نچھاور کر دے۔
''بس چچا جان! کیا بتاؤں، کس قدر عظیم انسان ہیں اپنے یہ حیدر صاحب۔ ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ

ہم ان جیسے نہیں ہیں۔ ورنہ آپ خود سوچیے، جس انسان کا کروڑوں روپے کا فلیٹ ہو اسلام آباد جیسے شہر میں، جو لاکھوں کی گاڑی میں گھومتا ہو اسے کیا ضرورت ہے کہ ہم جیسے غریب لوگوں کو مفت رہائش دیے رکھے اپنے ساتھ۔''

''کروڑوں کا فلیٹ، لاکھوں کی گاڑی! اس کنگلے کے پاس۔'' خالو جان، جس قدر حیران ہوتے کم تھا۔

''بس جی، یہی تو بات ہے حیدر صاحب کی، غریب پرور انسان ہیں۔ غریبانہ رہن سہن رکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کی امارت کا پتا نہ چل سکے۔ آپ کبھی ادھر آئیں۔ جس لگژری فلیٹ میں ہم لوگ رہتے ہیں نا جو حیدر صاحب کی ملکیت ہے، وہ دیکھ کر آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ لاکھوں روپے تو جی ان کی تنخواہ ہے۔ کتنے ہی گھرانے ان کے پیسوں پر پل رہے ہیں۔'' احسن نے کن انکھیوں سے بڑے میاں کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

ہونٹوں سے ٹپکتی رال کے ساتھ ساتھ چہرے پر بے یقینی سی پھیلی نظر آرہی تھی۔

(مطلب تھوڑی اور ورکنگ کرنی پڑے گی)۔

''اتنا امیر کبیر ہے یہ تو بہن کی شادی کیوں دھوم دھام سے نہ کی۔ ماں کو بھی میرا خیال ہے حسابی کتابی ہی پیسے دیتا ہے۔''

حیدر کی اتنی امارت انہیں ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''آپ کو یقین نہیں آرہا تو ہمارے ساتھ چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔'' (ہائے میرے اللہ کہیں چل ہی نہ پڑے ساتھ)

''اصل میں یہ ظاہر اس لیے نہیں کرتے کہ پھر لالچی لوگ ان کو ایسے آکر چمٹیں گے جیسے شہد کو کھیاں۔ آپ حیدر صاحب سے تذکرہ نہ کیجیے گا ورنہ وہ مجھ پر ناراض ہوں گے کہ میں نے کیوں ان کی اصلیت کھول دی۔

''لیکن اتنا پیسہ بندے کے پاس ہو تو چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟'' خالو جان کو یہ بات ہضم ہو کے نہ دے رہی تھی۔

''اصل میں نا، بات یہ ہے،'' احسن نے رازداری سے اپنا منہ ان کے کان سے قریب قریب جوڑ لیا۔ ''انہوں نے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ......''

تھوڑا توقف کیا۔

''کہ کیا......؟'' خالو جان کی بے چینی انتہا کو پہنچی۔

''کہ ان کے کوئی انتہائی قریبی رشتے دار ہیں جو کہ انتہائی لالچی ہیں۔'' (دونوں مرتبہ انتہائی پر خاصا زور دیا) اور ان کے ساتھ، کوئی خاص تعلق جڑنا طے ہے۔'' خالو جان کے کھڑے ہوئے کان مزید کھڑے ہوئے۔

''تو وہ ان لوگوں سے اپنا پیسہ چھپانے کے لیے اتنا غریبانہ رہن سہن رکھتے ہیں۔ تاکہ......''

ڈرامائی توقف دیا۔

''تاکہ......؟''

''کیا......؟'' خالو جان کا پورا جسم کان بن چکا تھا۔

''تاکہ ان لالچی لوگوں سے پیچھا چھڑانے میں آسانی رہے۔ اصل میں نا وہ تمام لالچی (لالچی پر پھر خاصا زور دیا) لوگوں سے تعلق ختم کرنا چاہتے ہیں۔

اپنی بات کے اختتام پر بڑے میاں کے تاثرات ملاحظہ کیجیے۔ جہاں پر زلزلے کے سے آثار پائے۔ خاصی تسلی ہوگئی۔

پلاٹ کے دوسرے حصے میں نگاہ دوڑائیں تو عادل سخاوت عرف سکی سے محو گفتگو تھا۔

''بس بے چارے حیدر بھائی بے خبری ہی میں مارے گئے۔ ماں نے بچپن میں ہی نسبت طے کردی اپنی بھانجی کے ساتھ۔ اب ان بے چاری کو بھی کیا پتا تھا کہ بڑی ہوگی تو یہ مسائل ہوں گے۔''

''کیسے مسائل......؟'' سکی کے کان کھڑے ہوئے۔

''پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں لڑکی کو۔ کتنی ہی بار اپنے ساتھ سونے والوں پر قاتلانہ

حملہ کر چکی ہے۔ ایک بار تو مانو، اپنی ماں کو جان سے ہی مارنے لگی تھی۔ وہ تو باپ کی عین وقت پر آنکھ کھل گئی۔ دیکھیے آپ کسی سے تذکرہ نہ کیجیے گا ورنہ میرے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ عادل نے رازداری سے کہا۔

''تو یہ لوگ علاج کیوں نہیں کرواتے اس کا......؟''

''بہت کوشش کی علاج کروانے کی مگر چہ چہ......'' افسوس سے سر ہلایا۔ اس بے چاری کا مرض لاعلاج ہے۔

''اب حیدر بھائی تو پوری کوشش کر رہے ہیں جان چھڑانے کی۔ اللہ کرے کوئی اور کاٹھ کا الو پھنس جائے تو حیدر بھائی کی جان چھوٹ جائے۔''

بس......کاٹھ کے الو کی اس سے زیادہ سننے کی ہمت نہیں تھی بے چارہ محفل ہی چھوڑ کر چلا گیا۔

عادل ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا۔ پلان کو آخری حصے تک پہنچانا اور اپنا پسندیدہ رزلٹ حاصل کرنا یہ کام عادل کے ذمے تھا۔

خراماں خراماں چلتا وہ ان دونوں کی جانب آیا۔ کرسی گھسیٹ کر احسن کے مقابل بیٹھ گیا۔ افسوس سے سر جھٹکا۔

''بے چارہ کتنا اچھا انسان ہے پر عمر کتنی کم لکھوا کر لایا۔''

خالو نے اپنا زلزلہ زدہ چہرہ اٹھا کر عادل کو دیکھا۔

عادل، احسن کی جانب متوجہ تھا۔

''بے چارے کو بلڈ کینسر ہے۔ ہر ایک سے چھپا رکھی ہے یہ حقیقت۔ بس مجھے سامنے پا کر ایک غم گسار دوست مل گیا۔ دل بہت بھاری ہو رہا تھا سو میرے سینے میں یہ راز منتقل کر دیا۔ اب یہ راز میرے ساتھ ہی قبر تک جائے گا۔'' عادل نے نادیدہ آنسو صاف کیے۔

''زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کا مہمان ہے۔''

''اچھا یار احسن! تو نے کسی سے تذکرہ تو نہیں کیا، وہی جو حیدر بھائی کا باس اپنی بیٹی ان سے بیاہنے کو تیار بیٹھا ہے۔'' آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

......

سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ با آسانی خالو کے کان تک پہنچ سکے بس۔

یہ جھٹکا خالو کے لیے آخری ثابت ہوا۔

''بات سنو بیٹو!'' انہوں نے احسن اور عادل کو ایک ساتھ پکارا۔ ''ایک مشورہ چاہیے تم لوگوں سے۔ آخر کو تم حیدر بیٹے کے اتنے قریب ہوتے ہو۔''

عادل اور احسن نے فاتحانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مشورہ ہی دینے کے لیے تو یہ سارا چکر چلایا تھا۔

☆☆☆

حیدر، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

''یار میری سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ میرے لیے رحمت ہو کہ زحمت؟''

''رحمت!'' عادل نے دانت نکالے۔

''اب یہ جو اتنی پراپرٹی شو کرنی ہے مجھے، گاڑی، لگژری فلیٹ وغیرہ وغیرہ۔'' یہ سب کیسے ہوگا؟''

اب اس کا جواب تو ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

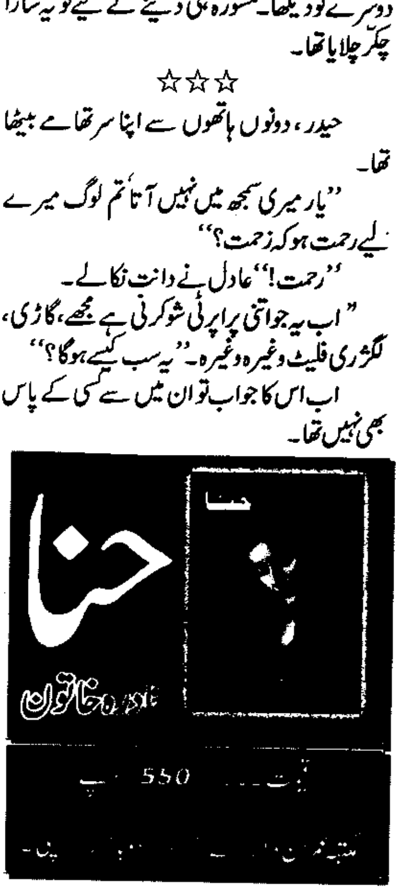

چھوٹی جس قدر عقل کی کھوٹی تھی، اتنی ہی نازونعم اور انفرادی وامتیازی حیثیت کی حامل تھی۔

اماں کی تو اس میں جان تھی، آہ! بے چاری کا طفلی دور یتیمی میں بسر ہوا تھا۔ فقط دو ماہ کی تھی کہ ابا

حمیرا عروش

چھوٹی

نے اگلے جہان کے لیے رخت سفر باندھا۔
گو کہ اب تک وہ زیست کے بیس برس بخیرو خوبی گزار چکی تھی مگر اماں آج بھی اس کی محرومیوں پر نظر ثانی کرتیں تو دل خون کے آنسو روتا۔
تمام عمر ہاتھ کا چھالا بنا کر، سینے سے چمٹا کر رکھا۔ اس کی خاطر مدثر اور سبحان کو بھی قابل اعتنا نہ گردانتیں۔ سبحان اس سے دس جبکہ مدثر بارہ برس بڑا تھا۔ وہ ان کی بھی حد درجہ لاڈلی تھی۔
اماں کی لاڈو کو۔ خاندان میں بھی خاصی اہمیت حاصل تھی تب ہی کسی موقع پر نظر انداز ہونا بری طرح کھلتا تھا۔
جوں ہی بڑی دلہن نے گھر میں قدم رکھا۔ اگلی صبح ہی چھوٹی کو اپنی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا، جب بڑے بھیا نے بند کمرے میں نئی نویلی دلہن کے ساتھ ناشتا کیا اور وہ اپنے کمرے میں اماں کے سینے میں منہ چھپا کر اتنی شدت سے روئی کہ اماں کا دل بھی ان ہی آنسوؤں میں بہہ گیا۔
لقمے حلق سے نہ اتر پائے تھے کہ اماں نے دھڑا دھڑ دروازہ پیٹا اور بڑے بھیا کے وہ لتے لیے کہ دلہن نے بھی کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔
''جورو کے غلام! بیوی کے ساتھ حلوہ پوریاں اڑاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس یتیم بہن کا خیال نہ آیا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟ ہائے! اللہ نے باپ کا سایہ کتنی جلدی اٹھا لیا۔ اگر آج باپ سلامت ہوتا تو دنیا یوں پیروں تلے نہ روندتی میری بچی کو......'' اماں کا واویلا کسی طور کم نہ ہوا۔ جب تک کہ دونوں بہو بیٹے نے ان کے پاؤں نہ پکڑے اور چھوٹی کو آگے بڑھ کر گلے نہ لگا لیا۔
نو بیاہتا کو پہلی صبح ہی چھوٹی کی مستحکم حیثیت کا ادراک ہو چکا تھا لہٰذا آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی حتی المقدور سعی کی۔
البتہ دولہا میاں آئندہ کسی بھی روز دلہن کے ساتھ ناشتہ کرنے کا خیال بھولے سے بھی دل میں نہ لائے بصورت دیگر چھوٹی کی حق تلفی کا احتمال تھا۔

☆☆☆

''اماں! یہ دیکھیں، یہ سالن بنایا ہے بھابھی نے؟'' وہ ڈونگی میں سالن بھر کر اماں کے سامنے لائی۔ اماں نے تنقیدی نظریں گاڑ دیں اور نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ تیل ضرورت سے زائد استعمال کیا گیا ہے۔
شام کو بڑے بھیا کی آمد پر وہ فضیحتہ ہوا کہ دلہن رانی آٹھ آٹھ آنسو روئی، مگر پوچھنے والا کوئی دردمند نہ تھا۔
''دیکھ لیا، بنو رانی کس قدر فضول خرچ ہے۔ ارے، بیوگی میں پائی پائی جوڑ کر یہ آشیانہ بنایا ہے۔ اگر ایسی شاہ خرچیاں میرے گھر ہونے لگیں تو جلد ہم روڈ پر آ کھڑے ہوں گے۔ دیکھو لڑکے! اس عورت کو ابھی سے قابو کر لو، ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کو کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔''
چھوٹی کا ازبر کرایا ہوا سبق اماں نے من و عن کہہ سنایا۔ بڑے بھیا مارے اشتعال کے پیچ و تاب کھانے لگے اور مہینہ بھر پرانی دلہنیا کو درشت لہجے میں باور بھی کروا دیا۔
''آئندہ کبھی بھی سالن بناتے ہوئے اماں سے پوچھ کر چیزیں استعمال کرنا۔'' سہمی ہرنی رانی محض گردن ہلا پائی۔
وہ تمام شب اس کی سرتاج سے اماں کی کفایت شعاری کے قصیدے سنتے گزری تھی۔

☆☆☆

''اماں! دعوت میں پہننے کے لیے بھابھی نے ریڈ جوڑا نکالا ہے۔ انہیں کہیں پنک پہن لیں۔'' چھوٹی نے اماں کے کان میں سرگوشیانہ انداز میں کہا تو اماں سر ہلاتی دلہن کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔
دلہن نے ہدایت سن کر سر ہلایا اور استری شدہ سرخ جوڑا تہہ کر کے الماری میں رکھا اور گلابی نکالنے لگی۔
''ہونہہ! موئی کا بڑا ارادہ تھا محفل میں چھانے کا مگر میں نے سارا ارادہ خاک میں ملا دیا، ہاہاہا۔'' چھوٹی دل ہی دل میں ہنستی الماری سے سرخ جوڑا نکالنے لگی۔
اماں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔

"میری شہزادی پر تو یہ رنگ خوب جچتا ہے۔ کان کے پیچھے کالا ٹیکا ضرور لگالینا۔ تجھے نظر بھی جلد ہوجاتی ہے۔" اماں ہدایت دیتی اپنی تیاری کی غرض سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

رانی تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی تو چھوٹی نے ناقدانہ نظروں سے گھورا پھر از خود تجزیہ پیش کیا۔

"بھابھی! آپ کو تو میک اپ کرنا ——— بھی نہیں آتا، بس دیکھیں، کیسا پھٹا پھٹا ہے۔"

رانی جو تیار ہو کر خاصا خوش گوار محسوس کر رہی تھی، یکلخت بد دل ہوگئی تھی۔ بڑے بھیا چلنے کی ہدایت جاری کرتے آن وارد ہوئے۔

ان کے دوست کے ہاں دعوت میں جانا مقصود تھا، خاصے خوش گوار لمحات گزار کر وہ لوگ رات گئے گھر لوٹے۔

☆☆☆

رانی نے جس روز سے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ گھر کا ماحول عجیب تناؤ کا شکار رہتا۔ چھوٹی نہایت معمولی باتوں میں نقص نکالنا گویا اپنا فرض گردانتی اور رائی کا پہاڑ بنا کر اماں اور بھائی کے سامنے پیش کر کے رانی کی شامت بلواتی چونکہ وہ مقابل آنے کے بجائے پیٹھ میں خنجر گھونپنے کی حامی تھی لہٰذا ناقص العقل رانی کی عقل سے معاملہ بالاتر تھا۔

لاشعوری طور پر اماں اور بڑے بھیا کسی بھی معاملے میں رانی کی حمایت کر کے چھوٹی کی وقعت کسی طور کم نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا رانی ہی قصوروار ٹھہرائی جاتی۔ مدثر رانی سے بہن کی سعادت مندی پر گویا ہوتا۔

"تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہاری اکلوتی نند کتنی باتہذیب و باتمیز ہے۔ اس کی صلح جوئی ہے کہ کبھی تمہارا سامنا کرنے یا بدتمیزی کرنے کا خیال تک دل میں نہیں لاتی ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو بھابیوں کا مقابلہ کرتے سارا لحاظ بالائے طاق رکھتی ہیں۔" وہ بہن کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا۔

☆☆☆

ماں بننے کی نوید رانی کو ہواؤں میں اڑا لے گئی۔ وہ شاداں و فرحاں تھی کہ چھوٹی سے اس کی مسرت کسی طور پر ہضم نہ ہوسکی۔

اماں دادی بننے کی نوید پا کر بے کراں نہال تھیں، نادانستہ طور پر وہ چھوٹی سے بے اعتنائی برت کر پُراشتیاق انداز میں چھوٹے کپڑے اور بچھونے بنانے میں جت گئیں، مستزاد رانی کو آرام کرنے کی ہدایت بھی جاری کردی۔

چھوٹی جلے پیر کی بلی بنی بمشکل تمام ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنے لگی بالآخر لومڑی صفت ذہن میں ایک ترکیب سما ہی گئی۔

"اماں! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ سلائی مشین پر جھکی اماں کے نزدیک آ کر سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"ہاں چھوٹی، بول۔" اماں نظر اٹھائے بغیر ہمہ تن گوش ہوئیں۔

"آپ سے ایسی بات کرتے شرم آتی ہے اماں! پر......" اس نے تمہید باندھی۔

"ارے...... جو بھی بات ہے، کہہ دے۔ اماں ہوں تیری، ماں بھی سہیلی کی طرح ہوتی ہے۔" اماں نے حوصلہ بڑھایا۔

"اماں! میری دوست کے بھتیجے کی پیدائش سے قبل ڈاکٹر نے اس کی بھابھی کو زیادہ سے زیادہ چلنے کا اور کام کرنے کا کہا تھا۔ اس حال میں آرام کرنے سے ڈاکٹر سخت منع کرتے ہیں، مگر بھابھی صاحبہ تو بیڈ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔" اماں نے پرسوچ انداز میں موٹے عدسوں والا چشمہ آنکھوں کے سامنے کیا۔ لوہا گرم دیکھ کر وہ مزید گویا ہوئی۔

"رقیہ کی بھابھی روز صبح سب سے پہلے اٹھ کر جھاڑو پوچا کرتی تھیں۔ شام کی صفائی الگ اور پھر رات کو دو گھنٹے واک کر کے سوتی تھیں۔" اماں کا ماتھا

ٹھنکا۔

''شکر ہے خدایا! تُو نے بتادیا۔ ارے، ہم قدامت پرست لوگوں کو آج کل کے طور طریقوں کا کیا علم؟ ڈاکٹر کے پاس تو ساتویں مہینے میں ہی بھیجوں گی۔ موئے ابھی سے شاپر بھر بھر دوائیاں شروع کروادیں گے۔ اچھا ہوا جو تُو نے بتادیا۔'' اماں خودکلامی کے انداز میں گویا ہوئیں۔

☆☆☆

اس دن کے بعد اماں نے کڑے تیوروں سے رانی سے ہر پر مشقت کام کروایا۔ اماں کی ہدایت پاکر مدثر اسے روز رات کو چہل قدمی کے لیے لے جاتا۔

''مجھ سے بالکل چلا نہیں جارہا مدثر!'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل تمام بولی۔

''اماں نے کہا تھا' دو گھنٹے مکمل کر کے گھر لوٹنا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا نا، وہ بڑی ہیں۔ ہم سے کئی گنا زیادہ تجربہ کار ہیں۔'' اس نے ڈپٹا۔

اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

اس کی طبیعت بے حد خراب رہنے لگی تھی۔ وہاں شنوائی صرف چھوٹی اور اماں کی ہوا کرتی تھی لہٰذا وہ رودھو کر از خود خاموش ہوجاتی۔

دن سبک روی سے اپنا راستہ ناپ رہے تھے کہ فقط تین ماہ بعد وہ اس خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

حسب معمول اس روز بھی مدثر نے آفس سے آکر اسے قریبی پارک میں ——— چلنے کا کہا مگر وہ انکار کرگئی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مدثر! پیٹ میں بہت درد ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

اس کے لہجے میں ایسا سوز پنہاں تھا کہ اک پل کو اس کا دل بے چین سا ہوا تھا اور خلاف توقع وہ ڈپٹنے کے بجائے خاموش ہوگیا۔ مگر اماں کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً پاٹ دار آواز میں بیٹے کو صلواتیں سنانے لگیں۔

''اس ڈیڑھ چھٹانک کی لڑکی کی باتوں میں فوراً آجایا کر۔ جھلا نہ ہو تو، ارے عورتوں کی یہی چالاکیاں ہوتی ہیں مرد کو اپنا غلام بنانے کی اور تجھ جیسے عقل کے اندھے ایک اشارے پر بندر کی طرح ناچنا شروع کردیتے ہیں۔ وے! بیویوں کی باتوں پر سر دھننا کوئی مردانگی نہیں ہوتی۔'' اماں نے اسے آئینہ دکھایا تو اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

''چل رانی! اٹھ، میں اب ایک لفظ نہیں سنوں گا۔'' وہ درشتی سے گویا ہوا۔

وہ بے بسی کی انتہا پر اٹھ کھڑی ہوئی، ممتا کا احساس، رحمت و دلی مسرت سخت زحمت محسوس ہونے لگی۔

''اے اللہ! مجھے اس مصیبت سے نجات دلادے۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھ کر زیرلب گویا ہوئی اور شوہر کی تقلید میں آگے بڑھ گئی۔

معاشرے کے کچھ کریہہ چہرے یوں بھی ممتا کا احساس فراموش کراتے ہیں۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتی چھوٹی کا قہقہہ بند کمرے میں گونجا۔

اس روز رانی کی اپنی بددعا اس ننھی جان کو کھا گئی تھی، جس نے دنیا میں آنکھ تک نہ کھولی تھی۔

اسے اپنے جملے کا ادراک اس پل ہوا، جب اسٹریچر پر بے دم سی پڑی وہ زیست و مرگ کی کشمکش میں آنکھیں موندے لیڈی ڈاکٹر کی گفتگو سن رہی تھی۔

''توازن برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے ڈی این سی ہوئی ہے' انہیں اس حالت میں سخت آرام کی ضرورت تھی مگر آپ کی نااہلی اور بے وقوفی آپ پر بڑی بھاری پڑی ہے۔ انہیں کچھ روز انڈر آبزرویشن رکھنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر درشت لہجے میں کہہ کر اسے آئی سی یو میں منتقل کرنے کی ہدایت جاری کرنے لگی۔

وہ اس کی زندگی کے لیے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ تب ہی گزشتہ بے شمار روز نگاہوں میں گھوم گئے، اس کا تھکا تھکا انداز...... یوں جیسے کوئی زندگی سے شکست تسلیم کرلے۔ اپنی فرعونیت بھی اس

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Perfumed Talc
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

پر روز روشن کی طرح عیاں ہوئی تھی۔ کئی بار اس نے اماں اور اس کے مقابل آ کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی مگر اماں گرج کر کہتیں۔

''شوہر کے آگے اپنی لن ترانیاں پیش کرنا سعادت مند بیویوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔''

''اماں! میں تو بس اتنا کہہ رہی تھی کہ......''

''دیکھ رہا ہے تو! میری ہدایت کا کتنا اثر لیا ہے، اب میرے سامنے زبان کھل گئی ہے۔ ہونہہ! بھائی! تم ہی اس کو سر پر چڑھا کر ناچو، ہم تو باز آئے۔'' اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''آئندہ ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو وہ دن تمہارا اس گھر میں اور میری زندگی میں آخری ہوگا۔ مجھے بیویوں کی صفائیاں پیش کرنے والی عادت سخت ناپسند ہے۔''

وہ وارننگ کے انداز میں بولا، یہ جانے بغیر کہ اس کی آنکھوں سے امید و مان کا احساس مدھم پڑ کر دور کہیں سناٹوں میں مدغم ہوا تھا اور دل کی سرزمین پر سرخ آندھیاں چل پڑی تھیں۔

ہاں...... اسے اپنی زیادتیاں اب یاد آ رہی تھیں۔ اب...... جب حد ٹوٹ چکی تھی۔

''اماں! میرا دودھ کا گلاس کہاں گیا؟'' چھوٹی کی جھنجلاتی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔

اس آواز پر اس کا چہرہ آنے والے طوفان کے ڈر سے زرد پڑ گیا تھا۔ اماں کو حقیقت کا ادراک ہوا تو فوراً چڑھ دوڑیں۔

''اب میری چھوٹی کے منہ سے لقمہ چھینا کرے گی یہ نابنجار! سمجھا لے اس کو۔''

دودھ کا گلاس بچپن سے صرف چھوٹی کا مقدر تھا، اب جب کہ رانی قے و متلی کے باعث غذائی کمی کا شکار ہو چکی تھی، تب بھی وہ کسی کے لیے قابل اعتنا نہ تھی۔ اس کی صحت گھریلو نت نئے ہنگاموں اور اماں کی بخیل طبیعت کی نذر ہو گئی تھی۔

وہ ایک بار پھر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

وہ ہسپتال میں زندگی کے اذیت ناک ترین دن گزار کر وحشت زدہ سی گھر کی جانب محو سفر تھی۔ آنے والے ہنگامہ آرائیوں سے پُر دنوں کا احساس خون کے آنسو رلا رہا تھا جو کہ اپنی متاع حیات کے ہاتھ دھونے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں تو ساتھ بیٹھا مدثر یک دم بے کل ہو گیا اور اماں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں چن لیے۔ اماں اس کی اس جرأت پر ششدر ہی تو رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

''دس دن ہو گئے مہارانی کو بستر سنبھالے ہوئے، اب کہہ دو، شرافت سے اٹھ کر گھر کے کام سنبھالے۔ کاموں میں جُت کر میری چھوٹی کملا کر رہ گئی ہے۔''

اماں نے صبح آفس جانے سے قبل ہدایت جاری کی۔

''اس کی طبیعت ابھی بہتر نہیں ہوئی ہے۔'' اس نے طمانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ اماں کی تو مانو سر پر لگی اور تلوؤں پر بجھی۔

''بس بس...... بہت ہو گیا۔ کئی دنوں سے تیرے بدلے تیور نوٹ کر رہی ہوں۔ بڑا خیال رکھنے لگا ہے اس کلموہی کا۔ بوڑھی ماں اور یتیم بہن کا ذرا خیال نہیں رہا ہے۔ نجانے کیا گھول کر پلا دیا میرے معصوم کو۔ ارے ایک خوشی تو دے نہ سکی، ذرا جو امید بندھی تھی وہ بھی ختم کر دی۔'' اماں اشتعال بھرے انداز میں بولیں۔

''یہ سب اللہ کی طرف سے تھا اماں! اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں کہہ کر کمرے میں جا کر رانی کو آرام کرنے کی تلقین اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے آفس روانہ ہو گیا جب کہ اماں اور چھوٹی انگشت بدنداں رہ گئیں۔

☆☆☆

چھوٹی کے کئی رشتے مسترد کرنے کے بعد مدثر اور سبحان کی نگاہوں میں حسام جچا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ

اور ہم پلہ لوگ ان کے معیار پر پورا اترے تھے۔

"مجھے تو رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا ہے اماں! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" سبحان نے استفہامیہ نظروں سے ماں کی جانب دیکھا۔

"جب تم دونوں بھائیوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو میری رائے بھی مثبت ہی ہوگی۔" اماں نے خاصے مضمحل لہجے میں جواب دیا۔ چھوٹی کو خود سے جدا کرنے کا خیال یوں ہی انہیں اداس کر دیا کرتا تھا۔

پھر آناً فاناً معاملات طے ہوتے چلے گئے۔

بالآخر رخصتی کا دن بھی آن پہنچا۔

اماں کی حالت قابل دید تھی، وہ آخر تک چھوٹی کی ساس کو اپنی لاڈوں پلی بیٹی کی ناز برداریاں بیان کرتی رہیں اور ہزار بار ادا کیا ہوا جملہ ایک بار پھر دہرایا۔

"دیکھو سلمٰی بہن! اپنی چھوٹی کو میں نے بڑے نازوں سے پالا ہے۔ سختی تو دور کی بات ڈانٹنے تک سے ہمیشہ گریز کیا ہے، اس کے ساتھ سدا نرمی روا رکھنا۔"

"بہن! سب ہی اپنی بیٹیوں کو نازوں سے پالتے ہیں، تم انوکھی نہیں ہو۔ صاحب زادی اتنی ہی لاڈلی تھیں تو گھر میں ہی سنبھالے رکھتیں اور اگر ہم پر اعتبار نہیں تھا تو پہلے ہی انکار کر دیتیں۔ ہم نے کوئی زبردستی تھوڑی ہاں کہلوائی تھی۔"

نکاح کے فوراً بعد سمدھن صاحبہ کا دماغ عرش معلٰی پر پہنچ چکا تھا۔ چند لمحات قبل جو بہو کے واری صدقے اور بیٹے کے سسرالیوں کی دلی ممنون دکھائی دے رہی تھیں، جلد پینترا بدل گئیں۔

ان کے تیور دیکھ کر کے اماں دل تھام کر رہ گئیں۔

بہرحال چھوٹی گھر بار نگاہیں لیے سسرال سدھاری۔

☆☆☆

صبح اماں سمیت سب ہی گھر والے ناشتہ لے آئے تو اپنوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شادمانی دوڑ گئی۔ خاصے خوش گوار ماحول میں ناشتہ کیا گیا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ اجازت لے کر رخصت ہوئے کہ ولیمے کی تیاریاں ہنوز تکمیلی مراحل میں تھیں۔

"ارے! دیکھ لیے اس کے طور طریقے، اپنوں کے سامنے تو بڑا کھلکھلا رہی تھی، ان کے جاتے ہی سانپ سونگھ گیا۔ جھوٹے منہ مجھے یا میری بیٹیوں کو ناشتے کا نہ پوچھا۔ میری چھوٹیوں نے صبح سے لقمہ نہ توڑا کہ بھابھی کے ساتھ ناشتہ کریں گے مگر اس کو تو اپنوں سے فرصت نہ ملی۔ میری معصوم بچیوں کا دل کٹ کر رہ گیا، سسرال والوں کا ذرا خیال نہیں ہے۔ پہلے دن اپنا رنگ دکھا دیا، آگے کیا گل کھلائے گی؟"

مہمانوں کے رخصت ہونے کی دیر تھی، ساس صاحبہ جو بمشکل تمام ضبط کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتار رہی تھیں، فوراً پھٹ پڑیں۔

نجانے کیوں سدا کی نڈر اور پر اعتماد چھوٹی لمحوں میں بھیگی بلی دکھائی دینے لگی۔ مستزاد دولہا میاں کی خفیف نگاہوں کا سامنا۔ گزشتہ اعتماد تو محض اماں کا عنایت کردہ تھا، چھوٹی کا اصل روپ تو یکسر مختلف تھا۔ اپنی ذات کا یہ بھید آج آشکار ہوا تھا۔

اماں بھی موجود تھیں اور ان کی خود ساختہ شکایتوں کا دفتر بھی ہنوز قائم تھا۔ ماں بہنوں کے سامنے بیوی کو ڈپٹتا بڑا بھیا بھی موجود تھا۔ بس چہرے بدل گئے تھے۔ نام اور چہروں کے تصادم سے وقت اور حالت کا رخ بدل گیا تھا۔

دولہا میاں کی پُرزور ہدایت پر اس نے نجانے کس دل سے ساس سے معافی مانگی تھی اور پھر دونوں چھوٹیوں کو چھوٹی بہن کہہ کر گلے لگایا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ دونوں چھوٹیوں کی وہ خود چھوٹی بہن معلوم ہو رہی تھی مگر بڑی بھابھی کے اعلیٰ رتبے کے تقاضے مختلف تھے، وہ نبھا گئی۔

ڈری سہمی، کپکپاتے لب اور پیشانی پر پانی کے قطرے...... اپنی ذات کا یہ پہلو بڑے تاب ناک انداز میں عیاں ہوا تھا۔

وہ خجل سی سوچے جا رہی تھی اور اماں، چھوٹیاں اور دولہا میاں اس پر نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ کسی نئی تنقید کے لیے۔

☆

زندگی جمود کا نام نہیں، یہ مسلسل حرکت سے عبارت ہے۔نوعیت خواہ کچھ بھی ہو مگر بدلاؤ زندگی کا اصول ہے۔

زیادہ وقت نہیں بیتا جب ''پہلوانوں کے شہر'' گوجرانوالہ کے اندرون میں واقع چاندنی چوک کے گلی نمبر سات کے مکان نمبر...... کے منقش لکڑی کے خوب صورت دروازے والے گھر کے مکین ایک نازک احساسات اور حساس طبع لڑکی کو بیاہ کر لائے تھے......نیلوفر!

سارے زمانے سے شاکی اور پلک جھپکتے ہی سب کی درستی کی خواہش مند نیلوفر نے جب پہلی بار حجلہ عروسی میں ضیغم مشتاق کو دیکھا تھا تو اس کا طول و عرض پر پھیلا ہاتھی سا وجود اسے آٹھ آٹھ آنسو رلا گیا تھا۔گول مٹول میدے کی بوری جیسا ضیغم جسے ماں لاڈ پیار میں محض ٹھنسانے کا فریضہ مسلسل ادا کرتی رہتی تھی اور والد شیخ مشتاق گو کہ خود بھی کھانے اور بے تحاشا کھانے کے شوقین واقع ہوئے تھے مگر وہ ضیغم کے گھر پر رہ کر ہر وقت کھاتے رہنے اور سوتے رہنے کے بھی سخت خلاف تھے۔

نیلوفر تو شروع سے ہی اس رشتے سے برگشتہ تھی مگر بڑی بہن کے سمجھانے اور محض ماں کا مان رکھنے کی خاطر اس نے اس شادی کے لیے ہامی بھری تھی۔مگر خود کو مکمل طور پر حالات کی سپرد نہیں کیا بلکہ ضیغم کو سدھارنے کے لیے کمر کس لی اور پھر جلد ہی ساری دنیا نے ضیغم کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ نیلوفر کی دن رات کی برین واشنگ اور اس کا بے تحاشا موٹاپا کم کرنے کے لیے جانے والی سب تدبیریں رنگ لائیں اور وہی ضیغم جس پر شادی کے بعد پہلی نگاہ

ام طیفور

نہ جائے یہ دن

ناولٹ

پڑتے ہی نیلوفر نے دوسری ڈالنا گوارانہ کیا، اب دیکھ دیکھ کے سیر نہیں ہوتی تھی۔

لحیم شحیم اور موٹے آلو جیسا ضیغم ایک اسمارٹ اور ہینڈسم مرد کا روپ دھار چکا تھا مگر یہ سب آسان نہیں تھا۔

نیلوفر کو ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑنا پڑا تھا۔

اسے راہ راست پر لانے کے لیے بہت بڑا ڈرامہ رچانا پڑا تھا جس میں اس کے دست راست اس کی اکلوتی نند صبغہ اور نندوئی نوید تھے، جنہوں نے ضیغم کو ڈرانے دھمکانے سے لے کر اس کا ایک فرضی کوچ ڈرائیور سے پھڈا کرانے تک، ہر مرحلے پر اس کا ساتھ دیا تھا۔

اس کوچ ڈرائیور کے خوف سے پہلے تو ضیغم چھپتا پھرا اور آخر کار اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور دن رات کسرت کر کے خود کو اس قابل بنایا کہ کہیں بھی، کبھی بھی، کیسے بھی وہ اس کوچ ڈرائیور کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا اور یہیں یہ نیلوفر سے چوک ہوگئی کیونکہ جس کوچ ڈرائیور سے خوف زدہ کر کے ضیغم کو سر سے پاؤں تک تبدیل کیا گیا تھا۔ اس بے چارے کی تو ہواؤں کو بھی خبر نہ تھی کہ کوئی اس کو پھینٹی لگانے کے لیے تاک میں بیٹھا ہے۔

یوں پہلی بار یہ معاملہ نیلوفر کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا کیونکہ اب اس کا شوہر ایک بھوندو قسم کا سیدھا سادا، گول مٹول سا آلو نہیں تھا بلکہ وہ پہلوانوں کے شہر کی بھرپور لاج رکھنے والا باکمال شہری بن چکا تھا جو بات بعد میں کرتا تھا اور آستینیں پہلے کستا تھا۔

یہ تو تھا اب تک کا قصہ، جس پر نیلوفر نے نوید ہی کی مدد سے کسی نا کسی طرح قابو پالیا تھا۔

لیکن پکچر ابھی باقی ہے.....!

☆☆☆

پڑوس میں کہیں مرغ نے بانگ دی تھی اور شیخ جی اپنے بستر سے یوں چھڑاپی (چھلانگ) مار کر اترے تھے کہ مسرت بانو کی چیخیں نکل گئی تھیں، کیونکہ شیخ جی کا پیران کے پیر پر پڑا تھا۔ ساری رات جب شیخ جی کروٹیں بدل بدل کر بیڈ کی چولیں ہلا دیتے تو تنگ آکر مسرت بانو تکیہ اٹھاتیں اور نیچے فرش پر لیٹ جاتیں۔ رات بھی ستر القابات سے نوازنے کے بعد وہ زچ ہو کر نیچے بے فکری سے لیٹی تھیں کہ شیخ جی نے "دن خون مارا" اور دونوں پیروں سے انہیں کچلنے کے بعد وہ سنگھار میز کی سیدھ میں کھڑے، شیشے میں دیکھتے ہوئے انگڑائی لینے لگے۔

مسرت بانو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھینچ کر تکیہ شیخ جی کو جڑ دیا۔ بے چارے "مست ماحول" میں تن کر کھڑے تھے، یکدم توازن بگڑنے سے سنگھار میز پر ہی الٹ گئے۔ سر الگ شیشے سے ٹکرا کر چکرا کر رہ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اسے تھامتے مڑے اور کچکچاتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"تو تو جب سے بیاہ کر آئی ہے تب سے میری دشمن ہے، تیرا بس چلے تو مجھے دوجی منزل سے دھکا دے دے.....!"

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے شیخ جی۔ آپ کا بس چلے تو مجھ مسکینی پر رات سوتے میں بس چلوا دیں، جس طرح سے آپ روزانہ میرے پاؤں کا کچومر نکالتے ہیں نا، وہ میں ہی جانتی ہوں۔"

مسرت بانو اپنا پیر دباتے ہوئے کوس رہی تھیں۔ شیخ جی نے لاپروائی سے ناک چڑھا کر ہاتھ جھٹکا اور ایک دفعہ پھر مڑ کر شیشے میں اپنا جائزہ لینے لگے۔

"ہک ہا۔ ایک وقت تھا کہ راہ چلتے لوگ مجھے محمد علی کے دھوکے میں روک روک کر آٹو لیتے تھے۔"

"ظاہر ہے، ہر ویلے چوک پر کھڑے رہو گے تو لوگوں نے کسی آرے (کام) تو لگانا ہے نا۔ رکشہ (آٹو) منگوانے پر ہی سہی۔"

مسرت بانو نے درمیان سے ہی جملہ اچک کر بدلہ پورا کیا۔ شیخ جی نے فٹے منہ کہتی نظروں سے گھورا اور سر کھجاتے ہوئے دوبارہ شروع ہوئے۔

"کم عقل زنانی کسی کو نہ دے اللہ..... رکشے والا آٹو نہیں کہہ رہا میں۔ لیکن تجھے بھلا کیا پتا ہوگا۔

تیرے ابے کے رکشے جو چلتے تھے اس لیے تیرے دماغ کی گڈی کی بریک وہیں لگنی ہے نا۔ میں تو اپنا وہ وقت یاد کررہا ہوں جب جوبن ٹوٹ کر برستا تھا۔ سب کہتے تھے ''مشتاق تو ہو بہو محمد علی ہے۔ اس کے لیے تو زیبا آئے گی۔'' پر مل گئی مجھے مسرت بانو! بس جی۔ یاد آتا ہے وہ گزرا ہوا زمانہ۔''

''وہ موٹا پیٹ اور پھولا غبارہ۔'' مسرت بانو نے بیچ میں ٹوک کے لقمہ دیا۔ ''میں تو جب سے ویاہ کے آئی ہوں، ایک دن جوبن نہیں دیکھا جو ٹوٹ کے برسا ہو۔ ہاں موٹاپا ہی آتے دیکھا۔''

''بس...... بس تیری ان ہی باتوں نے مجھے نظر لگا دی ہے۔ تجھ سے ایک دن بھی برداشت نہیں ہوا کبھی کہ تیرا خاوند تجھ سے زیادہ سوہنا اور گبھرو جوان ہو۔ ایسا مجھے ٹھنسا ٹھنسا کے گینڈا بنایا کہ میرے سڈول جسم کے جگہ جگہ سے ''ڈولے'' نکل آئے ورنہ جو میری چمکیں تھیں، قسم سے ایک لشکارہ مارتا تو پورے محلے کی کڑیاں اکٹھی ہو جاتیں۔''

''آہو...... جوتیاں لگانے کے لیے۔ شکر نہ کرنا شیخ جی کہ آپ کا ویاہ ہی ہو گیا کیونکہ آپ کی کرتوتیں تو ایسی تھیں کہ کوئی اپنی ''کڑی'' نہ دیتا آپ کو شادی کے لیے۔ میرے ماں پیو کا احسان مانیں کہ اپنی چن تارے ورگی کڑی آپ کے موٹے پلے سے باندھ دی...... ہنہ...... بات کرتے ہیں۔'' مسرت بانو نے جوش میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر شیخ جی کی طبیعت صاف کی تو۔ انہوں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی کیونکہ مسرت بانو کے پاس کھولنے کے لیے بڑا لمبا چوڑا کھاتہ تھا۔

شیخ جی نے بیوی کو غصیلی نگاہ سے دیکھا پھر پلٹ کر شیشے میں خود کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے کے بعد سرسوں کے تیل کی شیشی اٹھائی۔ تیل نکال کر سر اور چہرے پر ملا اور شیشے میں اپنے آپ کو ہی دیکھ مار کر دل پشوری کی۔

مسرت بانو کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں شیخ جی کی یہ حرکتیں...... ٹوکے بنا رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔

''بس کردیں شیخ جی! باہر جائیں اب۔ ضیغم کہہ گیا تھا کہ روغن والے بندے صبح صبح آ جائیں گے اور یہاں آپ کا اپنا پلستر ہی نہیں ختم ہو رہا۔''

شیخ جی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک تیکھی نظر بیوی پر ڈال کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ مسرت بانو نے پرسکون سانس لیا۔ اب کم از کم چار پانچ گھنٹے وہ سکون سے نیند پوری کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

کمرے سے باہر آتے ہی شیخ جی نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ حیرت کی بات تھی کہ نیلوفر ابھی تک ناشتہ بنانے نہیں اتری تھی۔ انہوں نے چھوٹے کو آواز دی اور مین گیٹ کا تالا کھولنے کا کہہ کر وہیں ایک کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ چہرے پر بے زاری سی چھائی تھی۔ یوں ہی دائیں جانب دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ ڈرائنگ روم کا سارا سامان ڈھیر کی صورت پڑا تھا۔ صوفے، سینٹر ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل، اس کی کرسیاں، ڈیکوریشن پیس اور سینریاں۔

''اوہ تیری خیر! تو یہ ضیغم کا بچہ ڈرائنگ روم کو اکھاڑا بنانے کے چکروں میں ہے۔ لو بھلا بتاؤ۔ اب شیخ مشتاق کے گھر میں اٹھک بیٹھک لگا کرے گی، جن کے گھر کسی زمانے میں اٹھے ہوئے سے بیٹھا نہیں جاتا تھا اور بیٹھا ہوا لیٹنے کو ترجیح دیتا تھا۔ پاگل دا پتر! وٹہ مارے گا شیخوں کی عزت کو۔'' شیخ جی بڑبڑائے جا رہے تھے اور اسی اثناء میں نیلوفر سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تو انہوں نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ وہ سلام کرنے کے بعد کچن کا رخ کرنے لگی تو شیخ جی اس سے پوچھ بیٹھے۔

''اوئے نیلی پتر! یہ اپنا ضیغم نے ڈرائنگ روم کا سارا سامان باہر کیوں نکال رکھا ہے۔ مجھے تو لگا تھا کہ وہ پچھلے کمرے کو روغن کرا رہا ہے اکھاڑے کے لیے۔ پر یہاں تو متھے (سامنے) پر ہی سب کچھ سجنے لگا ہے۔'' وہ

سامان کو تشویش سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا ابا جی! کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ، اور کرتے کچھ اور ہی ہیں۔ ابا جی! یہ ضیغم کا باڈی بلڈنگ کا شوق تو میرے گلے کو آ گیا ہے۔ اب تو ہر گھڑی دل ہولتا ہے میرا۔ کب کس سے لڑ بھڑ کے آجائیں۔"

نیلوفر کے اپنے ہی خدشات تھے۔ شیخ جی کے سامنے ساری پریشانی کھول کر رکھ دی۔
"پتر! ہم ہی تو اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے نا ہر وقت۔ پوتی، ڈنگر وغیرہ۔ ان ناموں کے علاوہ اور کوئی نام مجھے سوجھتا نہیں تھا اس کے لیے اور مرد کو جتنی مرضی چوٹ مارلو، سہہ جائے گا مگر انا پر پڑے گی تو بلبلا اٹھے گا۔ ضیغم اب اتھرا بیل ہے۔ حساب سے ہی قابو آئے گا وہ، تو فکر نہ کر پتر۔ اسے اکھاڑا کھولنے دے پھر نارمل ہو جائے گا، جب ساری توانائی ادھر ہی صرف ہو جائے گی ہے نا تو باہر پنگے کم لے گا۔ چل ناشتا بنا۔ اب تو میرے اندر دنگل ہو رہا ہے۔"
نیلوفر کو شیخ جی کی باتوں سے کچھ حوصلہ ضرور ہوا تھا مگر وہ پرامید پھر بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

چار آدمی ڈرائنگ روم میں رنگ و روغن کا کام کر رہے تھے اور شیخ جی مسلسل ان کے سر پر سوار تھے۔ ان چاروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔
"اوئے...... اوئے...... دھیان سے مار کوچی۔ یہاں سے جگہ چھوڑ دی ہے تو نے۔ پیسے لینے ہیں پورے کہ نہیں......اور مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایک کمرے کو تم چار جنے کیوں آچمٹے ہو۔ یہ تو اکیلا بندہ بھی کر سکتا تھا۔ مفت میں دیہاڑی لے لو گے مجھ سے۔ ہونہہ......"
"باؤ جی! ضیغم پائی نے سپیشل کہا تھا جی، کہ زیادہ بندے لے جانا تا کہ آدھی دیہاڑی میں کام مک مکا جائے۔" ان میں سے ایک جو شکل سے بے زار لگ رہا تھا، چڑ کر بولا۔
"بوہتی ٹیں ٹیں نہ کر اور مڑنگا (موڑ) سیدھا رکھ...... ورنہ یہی کوچی تیرے بوتھے پر پھیر دوں گا۔ جانتا نہیں ابھی تو مجھے۔" ضیغم کی دادا گیری کی وجہ سے موقع محل کے مطابق اب وہ بھی تڑیاں خوب دیتے تھے۔
مزدوروں نے انہیں نظر انداز کر کے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے ساتھ ساتھ ہی باتیں بھی جاری تھیں۔
"یار جیدے! سوچتا ہوں کہ کریانے کی ہٹی ڈال لوں۔ یہ کام بڑا کتا ہے۔ طرح طرح کے "کتے" بندے ٹکر جاتے ہیں۔ جی اوب گیا میرا تو اب۔" سیڑھی پر چڑھے ایک مزدور نے لفظ "کتے" کو ذرا ہلکی آواز میں ادا کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔
شیخ جی آنکھیں سکیڑے مسلسل دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ کان بھی چوکس تھے۔ دوسرا مزدور جو بڑے انہماک سے پینٹ کر رہا تھا، کھردرے لہجے میں بولا۔
"تیرا کیا ہے اکرم! تُو تو ہر چار ماہ بعد نیا کام پکڑنے کی ٹھانتا ہے مگر بھاگ دوڑ کر واپس اسی کتے کام میں آجاتا ہے۔ تیری مہربانی، میرا جی اچاٹ نہ کیا کر۔ مجھے اس کام میں اچھی دیہاڑی لگتی ہے۔ میں بڑا راضی ہوں۔"
"اتر...... اتر تو ذرا نیچے......" شیخ جی، اکرم سے مخاطب تھے۔ "تیرا واقعی اس کتے کام میں جی نہیں لگتا۔ کب سے دیکھ رہا ہوں کہ کوچی (برش) ایک ہی جگہ پر پھیرے جا رہا ہے۔ اتر ذرا، میں تجھے دکھاؤں کہ ہاتھ کیسے چلاتے ہیں۔ اتر......" شیخ جی اکرم کو سیڑھی سے اترنے کا کہہ رہے تھے۔
وہ بھی بے نیاز سا بندہ تھا، شانے اچکاتا، برش کو سیڑھی کے بانس کے ساتھ بندھے پینٹ کے ڈبے میں ڈالا اور کمینی مسکراہٹ سے شیخ جی کو دیکھتا نیچے اتر آیا۔ سکون سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر اس

نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگالی۔
شیخ جی نے ایک کینہ توز نظر اس پر ڈالی اور دوسری لمبی بانس کی سیڑھی پر۔ بے ساختہ تھوک نگل کر بھنویں اچکائیں۔ پھر دل ہی دل میں خود کو حوصلہ دیتے ہوئے سیڑھی پر پاؤں دھرا۔
''چل بھئی شیخ مشتاق۔ چڑھ جا سولی۔ مطلب سیڑھی۔ دکھا اس مشٹنڈے کو کہ روغن کیسے کیا جاتا ہے اور شیخ پیسے کیسے بچاتا ہے۔ اس کمینے کی تو میں چھٹی کراتا ہوں اور اس کی دیہاڑی جائے گی میری جیب میں۔''
شیخ جی تھر تھراتی سیڑھی پر چڑھ تو گئے پر اب نیچے دیکھنے سے گریزاں تھے۔ ہر دو سیکنڈ کے وقفے سے سیڑھی میں سے چرررر کی آواز آتی تو شیخ جی دل میں دعا کرتے کہ یا اللہ! یہ میرا پاجامہ پھٹنے کی آواز ہو، شالا سیڑھی کو کچھ نہ ہو۔''
پوری ہمت مجتمع کرتے انہوں نے برش ہاتھ میں تھاما اور اکرم کو للکار کر بولے۔
''دیکھ اوئے ادھر...... تو جس کام کو ''کتا'' کہہ رہا ہے نا، وہ تو کوئی ''کھوتا'' بھی کر لے۔ دیکھ ادھر۔''
''دیکھ رہا ہوں باؤ جی! قسمے دیکھ رہا ہوں۔''
اکرم کے لہجے میں شرارت صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ہنسی بھی آرہی تھی۔ باقی تینوں مزدور بھی شیخ جی کی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔ اکرم بھانپ گیا تھا کہ اندر سے شیخ جی سہمے ہوئے ہیں۔ اس کے جی میں یونہی ان کا ریکارڈ لگانے کی سمائی۔
''ہک ہا...... باؤ جی وڈے لوکاں دیاں وڈیاں باتاں۔ اب یہی دیکھ لو جی کہ ماشاء اللہ جثے سے ہی تسی کھاتے پیتے گھر کے لگتے ہو۔ جسامت بھی ببر شیر ورگی۔ (دل میں اس نے گینڈا کہا تھا) جس کام میں بھی ہتھ ڈالو گے، ہو کے رہے گا جی...... ورنہ ہمارا ایک ساتھی بیلی تھا جی نواز...... بالکل جی آپ جیسا تگڑا اور صحت مند۔ پچھلے مہینے ہی مرا ہے بے چارہ۔''
برش شیخ جی کے ہاتھ میں اور شیخ جی سیڑھی پر کھڑے لرز اٹھے۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگے۔ اکرم نے ایک اور ہوکا بھرا اور بولا۔
''اب جی جس کی آئی ہو، اس کا بس بہانہ ہی بنتا ہے جی۔ وہ اپنا نواز، بالکل ایسے ہی، آپ ہی کی طرح شوہدا بن کے چڑھا تھا سیڑھی پر۔ ہزار دفعہ سمجھایا تھا جی کہ کام کے ٹیم دھوتی نہ پہنا کر۔ پر نہ جی۔ اک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ دھوتی اڑ گئی جی پاؤں سے اور دو جے ہی لمحے نواز ہوری تھلے۔ منکا تڑوا لیا جی اس نے اپنا۔ بس جی وقت پورا ہو گیا تھا ورنہ آپ بھی تو ہو جی۔ کیسے کرلی (چھپکلی) کی طرح چڑھ گئے اوپر ورنہ کوئی پتا لگتا ہے، ابھی پاؤں پھسلے اور تسی آہو......''
اکرم ہمدردانہ جذبات گوش گزار کر کے سگریٹ کا لمبا کش لینے لگا جبکہ شیخ جی مانو بے جان تصویر کا فریم بن گئے کہ بس ٹنگ گئے تو ٹنگ گئے، اب کوئی چھیڑنے کی کوشش نہ کرے۔ دل پر ایسا خوف طاری ہوا تھا کہ جنبش بھی نہ کر رہے تھے۔
''بس سوہنیو! آئی ہوئی کی باتیں ہیں۔ ابھی چار مہینے پہلے ہمارا ایک ساتھی......''
''تیری تو......!'' شیخ جی نے اوپر سے ہی تاک کے نشانہ لیا اور برش اکرم کو کھینچ مارا۔ ''تیرے سب ساتھی بیلی بھی مرنے ہیں جب میں اوپر ٹنگا ہوا ہوں۔ ادھر آ جلدی سے۔ پکڑ سیڑھی کس کے۔ مجھے نیچے اتار اور چڑھ تو اوپر۔ شام تک سارا کمرہ روغن ہو جائے ورنہ تیری میرے ہاتھوں آ جائے گی...... سمجھا۔''
اکرم اپنے سر کا گومڑ ہاتھ سے دباتا اٹھ کھڑا ہوا جہاں شیخ جی نے برش کھینچ کے مارا تھا۔ اسے ''دل پشوری'' مہنگی پڑ گئی تھی۔ شیخ جی نے جس وقت سیڑھی سے قدم فرش پر دھرا، ایک سکون بھرا سانس لیا تھا۔
کمرے سے باہر نکل کر انہوں نے چھوٹے کو

آواز دے کر بلایا۔ جیب سے دس کا نوٹ نکالا اور اسے تھما کر بولے۔

''یہ صدقے کے پیسے ہیں، اپنی جیب میں رکھ لے۔ شام کو یاد سے مجھے نکڑ والی ہٹی سے پان مسالا لا دینا۔ اپنی طرف سے...... سمجھا۔''

چھوٹے نے ایک نظر دس کے نوٹ پر ڈالی اور دوسری شیخ جی پر۔ دل ہی دل میں حسب سابق ''چول'' کہا اور نوٹ جیب میں ڈال کر غائب ہو گیا۔ نیلوفر نے کچن کی کھڑکی سے سارا منظر دیکھ کر مسکراہٹ دبائی اور سر جھٹک کر کام میں مشغول ہو گئی۔

☆☆☆

''ہزار دفعہ کہا ہے نیلی کہ مجھے یہ مرغن کھانے ذرا کم دیا کرو۔ مجھے دگنا ورک آوٹ کرنا پڑتا ہے ان کو ہضم کرنے کے لیے۔'' نیلوفر نے ضیغم کے آگے نہاری لا کر رکھی تو وہ چڑ کر بولا۔

قریب ہی شیخ جی اور مسرت بانو ابھی ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ شیخ جی چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے جبکہ مسرت بانو ان کی پائنتی کی طرف بیٹھی مسلسل اپنے لیے جگہ میں وسعت پیدا کرنے میں سرگرداں تھیں۔

دوپہر کے کھانے پر نیلوفر ہمیشہ ضیغم کا انتظار کرتی تھی۔ دونوں ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے۔ آج مسرت بانو نے نہاری بنوائی تھی اور ضیغم کی جان جاتی تھی اب ایسے کھانوں سے۔ اسے اپنی صحت کا جنون کی حد تک خیال رہتا تھا اور نیلوفر اس معاملے میں اس کا بھرپور ساتھ دیتی تھی۔ اس وقت بھی نہاری دیکھ کر ضیغم نے الجھن کا اظہار کیا تو شیخ جی کی زبان پر کھجلی ہوئی۔

''آہو تو صحیح کہتا ہے پتر! میں بھی جب اتنا بھاری کھانا کھا لوں تو مجھے بھی بازار — میں جا کر کچھ زیادہ ہی "واک آوٹ" کرنا پڑتا ہے...... ہاہاہا

شیخ جی قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ جبکہ ضیغم نے کھانے سے ہاتھ روک کر خاصے اچنبھے سے شیخ جی کو دیکھا تھا۔

''اباجی! میں نے ورک آوٹ کی بات کی ہے یعنی کہ ورزش...... آپ بھی حد کرتے ہیں، کہاں سے کہاں لے گئے بات......''

''یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے میرے بچے!'' مسرت بانو نے جمائی روکتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''ہر بات میں'' کرکٹ لے آتے ہیں۔ سارے کھیل میں انہیں اگر کوئی بات پسند ہے تو بس یہی...... آوٹ......''

مسرت بانو کو چارپائی پر لیٹنے کی جگہ مل گئی تھی لہٰذا نیم غنودہ آواز میں اپنی فراست کا اظہار کرنا ان پر لازم تھا۔ ضیغم نے لاچاری سے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور خاموشی سے نوالے لینے لگا۔ کچھ بھی کہنا عبث تھا لیکن شیخ جی کے لیے نہیں۔

''تو نے میری ہر بات میں بولنا ہوتا ہے۔ بارہویں کھلاڑی کی طرح، دھیان اپنی طرف کرانے میں لگی رہتی ہے۔ ہونہہ......''

''بس کر دیں شیخ جی...... بس کر دیں۔ چپ کر کے میرے پتر کو روٹی کھانے دیں آپ۔ ویسے ضیغم......'' مسرت بانو نے تیوری چڑھائے شیخ جی کو گھورا اور پھر خود ہی بیٹے کو ٹوک بیٹھیں "پتر یہ جو تو نے ڈرائنگ روم کا یتیموں والا حال کیا ہے۔ سارا سامان باہر برآمدے میں لاوارثوں کی طرح پڑا ہے۔ پتر بھلا کیا چاند چڑھائے ہیں ڈرائنگ روم میں جو سامان سمیت نہیں چڑھ سکتے تھے؟'' مسرت بانو کو بڑا قلق تھا سامان کا۔ جو برآمدے میں پڑا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ نیلوفر نے شوہر کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا اور گلاس میں پانی انڈیلا۔

''اماں......! میں وہاں جم بنا رہا ہوں۔ آج کل بڑا ان ہے یہ کاروبار...... اور ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا ہے اماں! اس لیے مجھے یہی

کمرہ سوٹ کرتا ہے اس کام کے لیے.....''

''تُو بھی کس کو سمجھا رہا ہے ضیغم!'' شیخ جی کی آواز ابھری۔ ''بھلا اس کو کیا پتا کہ جم کیا شے ہے۔ اس کی تو اپنی عقل جیم ہے۔ او ناقص العقل! ضیغم اس کمرے میں لڑکوں کو ورزش کروائے گا۔ چند دنوں میں میرے جیسی باڈیاں نکلا کریں گی باہر۔ یہ چوڑے چکلے چھاتیوں والے اور موٹے موٹے ڈولوں والے۔ آہو.....!''

''آپ لوگ اب چپ بھی کریں۔ نیلی اٹھالو یار! اب بس.....!'' ضیغم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر نیلوفر کو برتن سمیٹنے کا کہا اور پھر شیخ جی سے مخاطب ہوا۔ ''ابا جی کل صبح آپ دکان پر مت جانا۔ کچھ بندے آئیں گے مشینیں لے کے۔ ان سے سیٹ کروا لینا۔ مجھے کل صبح جمشید کو اڈے سے لینے جانا ہے ورنہ میں خود ہی کر لیتا۔''

''ہائے.....کون جمشید بھلا، وہ تیری پھوپھی کی دیورانی کا بھانجا؟ وہ کیا کرنے آرہا ہے۔''

مسرت بانو کو نند کے ہر رشتے دار کی پہچان بھی تھی اور خار بھی۔ فوراً چمک کے پوچھا تھا۔

''جی اماں! وہی جمشید..... اصل میں اس کا کوئی پھڈا ہو گیا ہے۔ اسی کے لیے آرہا ہے۔'' ضیغم نے سرسری انداز میں بتایا مگر مسرت بانو کے کان کھڑے ہو گئے۔

''اوئے کیسا پھڈا پتر؟'' وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''دیکھ پتر تو اپنی پھوپھی کے لکتوں کو نہیں جانتا۔ اپنے پھڈوں میں دوسروں کو پھنسا تو لیتے ہیں، اس کے بعد خود پتلی گلی سے نکل جاتے ہیں پتر۔ کوئی ضرورت نہیں تجھے اس کی لڑائی میں پڑنے کی۔'' مسرت بانو کو پتنگے لگ گئے تھے۔ ہاتھ یوں مسل کر بول رہی تھیں جیسے ہتھیلیوں میں جمشید کو دبایا ہو۔

''او اماں! آ تو لینے دیں اسے۔ پہلے سے ہی شور کیوں ڈال رہی ہیں آپ۔ ویسے بھی جم کے کام میں مدد کر دے گا میری اور کچھ اسے خود بھی کسرت کرانی ہے۔ ذرا تگڑا کرنا ہے اسے۔''

''ہائیں.....! اسے کیا تگڑا کرنا ہے تو نے۔ وہ پیدا ہوا تو سنگل پسلی تھا۔ رو رو کے ڈیڑھ کو پہنچا ہے۔ اب تُو بڑا بھی زور لگا لے تو دو پوری کر لے گا۔ بس اس سے آگے اس نے نہیں جانا۔ پتر اس کا ورگ (جسامت) ہی نہیں موٹا ہونے والا۔ وہ نمانا تو زور کی ہوا بھی چلے تو کھڑے سے گر جاتا ہے۔ نکے ہوتے کو اس کی ماں جب بھی آندھی چلتی تھی تو منجھی کے ساتھ باندھ دیتی تھی۔ قسمے.....'' مسرت بانو پر مبالغہ آرائی تو ختم تھی۔ برتن سمیٹ کر ٹیبل کو کپڑے سے صاف کرتی نیلوفر کو ہنسی آئی تھی تو ضیغم بھی مسکرائے بغیر نہیں رہا تھا۔ شیخ جی کے خراٹے البتہ بلند ہو رہے تھے۔ وہ سو چکے تھے ورنہ جملہ ضرور ٹانکتے۔

''اماں! اب تو میں اس کی مدد کا وعدہ کر چکا ہوں۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ کسی لڑکی کا چکر ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے مگر لڑکی کا چچا زاد زبردستی اس کا منگیتر بنا ہوا ہے۔ باپ ہے نہیں اور ماں سسرال والوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لڑکی بالکل بھی راضی نہیں اس لنگور سے شادی کرنے کے لیے۔ وہ اور اس کی ماں بھی جمشید کو پسند کرتے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ اس لیے وہ مجھ سے مدد لینے آرہا ہے اور میں اس کی مدد کروں گا۔'' ضیغم کے تیور بتاتے تھے کہ بات محض اتنی نہیں۔ اسی لیے نیلوفر نے کرید نے والے انداز میں پوچھا۔

''آپ اس لڑکی کے منگیتر کو لنگور تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے دیکھا ہوا ہے کیا پتا جمشید سے زیادہ اچھا ہو۔'' ''صرف دیکھ نہیں رکھا، اس پر ہاتھ بھی صاف کر رکھا ہے۔'' ضیغم نے مسکراتے ہوئے ہتھیلی کھجائی۔

''کیا مطلب ضیغم پتر! سیدھی بات بول۔ بل

نہ دے۔'' مسرت بانو کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔ نیلوفر سے پہلے ہی انہوں نے پوچھ لیا۔

''اماں یہ منگیتر وہی کوچ والا ہے جس سے میرا پرانا پنگا ہے۔ جس نے مجھے چھ ماہ دہشت میں مبتلا رکھا تھا۔ گھر کا ہو کے رہ گیا تھا میں۔ میرا کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا اور پھر جب مجھے اس کے ٹھکانے کا معلوم ہوا تو وہاں پہنچ کے اسے چار چوٹ کی مار ماری تھی میں نے۔ چھ ماہ کے ہراس کا بدلہ چھ منٹوں میں لیا تھا۔ یہ خبیث وہی ہے اماں!''

ضیغم کے پھولے نتھنے۔ طیش سے سرخ پڑتا چہرہ اور تھرتھراتا جسم۔ نیلوفر کا دل کیا یہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ جائے اور اپنے بال نوچ ڈالے۔ اس ''پپلو'' کو ''ببلو'' بنانے کے چکر میں اس کا میاں موالیوں جیسی حرکتوں میں ملوث ہو چکا تھا۔ مسرت بانو کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا تھا لیکن جب وہ جھٹکے سے سنبھل گئیں تو گھرکتے ہوئے بولیں۔

''ہا...... ہائے...... وے یہ مویا بار بار کیوں متھے لگ جاتا ہے یا پھر ضیغم تجھے ہی شوق ہے اس سے آڈا لگانے کا...... میں تجھے بتا رہی ہوں، خبردار جو تو اس پھڈے میں پڑا تو...... آہو!''

''میں مرد ہوں اماں! مرد۔'' ضیغم صاحب غصے میں نشست چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ''کیا گھر بیٹھ جاؤں چوڑیاں پہن کے۔ میرا ابھی اس سے حساب کتاب کا کھاتہ بند نہیں ہوا۔ اب ہی تو مزہ آئے گا اس سے مقابلہ کرنے کا۔ آپ فکر نہ کریں، میں اس دفعہ اسے ایسی دھول چٹاؤں گا کہ سات نسلیں یاد کریں گی اس کی۔'' ضیغم تن فن کرتا یہ جا وہ جا پر بانو پریشانی سے سر تھام کے بیٹھ گئیں۔ نیلوفر چپ چاپ کچن میں کھسک گئی تھی۔

باہر ''شیخ جم خانہ'' کا بورڈ آویزاں ہو چکا تھا۔ ڈرائنگ روم کی ہیئت بدل کے رہ گئی تھی۔ ہر قسم کی مشین وہاں سج چکی تھی۔ اسپاٹ لائیٹس کی روشنی نے ماحول کا رنگ بدل دیا تھا۔ ضیغم آج صبح سے ان ہی کاموں میں مصروف تھا۔ کل جمشید بھی آ چکا تھا مگر ضیغم نے اسے اور گھر والوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ آرام سے بیٹھ کر ایک دوسرے کا حال احوال ہی پوچھتے۔ مسرت بانو کو تو سب سے زیادہ کرید تھی۔ کتنے ہی چکر وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر لگا چکی تھیں جو اب جم خانہ تھا مگر ضیغم نے اندر جھانکنے تک کا موقع نہیں دیا تھا۔ مکمل پارٹیشن کے بعد یہ حصہ بالکل الگ محسوس ہو رہا تھا۔

سارے دن کی مصروفیت کے بعد ضیغم اور جمشید باہر دوستوں میں نکل چکے تھے۔ شیخ جی، مسرت بانو اور نیلوفر اشتیاق کے مارے ڈرائنگ روم دیکھنے چلے آئے تھے۔ وہاں تو منظر ہی بدل چکا تھا۔ مسرت بانو نے انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

''ہائے میں مر گیا...... اوئے پاغلے...... چھوڑ...... آدم خور نا ہووے تے...... چھوڑ میرا ہاتھ......'' شیخ جی مارے تکلیف کے بلبلا اٹھے تھے۔ کیونکہ مسرت بانو نے اپنے بجائے ان کی انگلیوں کو چبا لیا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ دانستہ تھا یا نادانستہ۔

''ہا...... ہائے شیخ جی...... قسمے! مجھے پتا نہیں لگا ورنہ میں ایسی بے سوادی شے منہ میں نہ لیتی۔'' مسرت بانو نے ہنسی دباتے ہوئے ان کا ہاتھ سہلایا تھا۔ شیخ جی نے غصے سے ہاتھ کھینچا اور جم کا ناقدانہ جائزہ لینے لگے۔

''تیرے پتر نے اتنے پیسے اجاڑ دیئے ہیں اس کلے کمرے پر کہ اتنے تو میرے ولیمے پر بھی نہیں لگے ہوں گے۔''

''یہ آپ کو ہر بات کے آخیر میں اپنا ہی ولیمہ کیوں یاد آتا ہے؟'' مسرت بانو چڑ کر بولی تھیں۔

''وہ اس لیے کہ اس دن میرے ابا جی بھی بالکل یہی جملہ بار بار بولتے تھے۔'' مشتاق نے ولیمے پر اتنے پیسے اجاڑ دیے ہیں کہ اتنے میں میرے دو ہو

جاتے۔'' اس جملے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ تو نہیں سمجھے گی۔''

''پلیز آپ دونوں جھگڑا ختم کریں۔ دیکھیں تو سہی کہ ضیغم نے اس کمرے کی حالت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔'' نیلوفر نے ساس، سسر کا دھیان بٹایا اور ستائشی انداز میں بولی۔

''ہونہہ...... یہ حالت بدلی ہے؟ بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے اس نے میرے ڈرائنگ روم کا۔ ہائے مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس کمرے کا سارا فرنیچر کہاں کھپاؤں۔'' مسرت بانو کی اپنی ہی فکریں تھیں۔ نیلوفر دھیان دیے بغیر ہر مشین کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھی۔

''تو ایسا کر مسرت بانو! ایک ایک صوفہ باتھ روم میں رکھوا دے۔ بندہ آرام سے بیٹھ ہی جائے۔'' شیخ جی پوری سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ مسرت بانو غصے سے منہ پھیر گئیں۔

اسی اثناء میں شیخ جی ذرا آگے ہوئے اور ٹریڈمل پر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ میں ہی اس کا بیلٹ چل پڑا اور شیخ جی کا رنگ فق ہو گیا۔ آف کا بٹن نہ جانے کون سا تھا، مگر بدحواسی میں اسپیڈ تیز کرنے والے بٹن کو دو تین دفعہ پریس کر دیا۔ بیلٹ تیزی سے بھاگنے لگا اور اوپر شیخ جی اپنے موٹے پیٹ پر باندھی لنگی کے ساتھ اس سے بھی تیز بھاگنے لگے۔ رکتے تو منہ کے بل گرتے اور مزید تیز بھاگنے کا یارا نہ تھا۔ مسرت بانو ہنس ہنس کے دہری ہوتی وہیں بیٹھ گئی تھیں۔

''اوئے...... اوئے نیلی پتر! او بند کرا سے۔ او سوئچ کھینچ دے پتر...... او جلدی کر...... میری بس ہونے لگی ہے۔''

نیلوفر نے فٹافٹ آگے بڑھ کر مشین کو بند کیا تو شیخ جی کی جان میں جان آئی۔ جھینپ مٹانے کے لیے بولے۔

''دفع دور...... یہ بھی کوئی مشین ہوئی بھلا۔ اتنا تیز تو مجھے تب نہیں پچنا (بھاگنا) پڑا تھا جب مسجد سے واپسی پر کتا میرے پیچھے پڑا تھا۔ لے دس...... کلیجہ منہ کو آگیا۔''

''جانے دیؤ شیخ جی! ایسی باتیں!''

مسرت بانو نے شیخ جی کو کہاں بخشنا تھا آڑے ہاتھوں لینے سے۔

''تو اپنی ٹر ٹر بند کر، مجھے بھلا بھاگنا نہیں آتا؟ اپنے ویلے میں، میں اتنا تیز بھاگا کرتا تھا کہ لوگ مجھے۔''

''بھگوڑا کہتے تھے۔'' مسرت بانو نے فقرہ پورا کیا۔ نیلوفر بظاہر ادھر ادھر متوجہ تھی مگر شیخ جی جانتے تھے کہ وہ مسکراہٹ چھپا رہی ہے۔ وہ یک دم جوش سے آگے بڑھے اور ویٹ بار اٹھا لیا۔ ''کڑک...... کڑک کڑک......'' ان کی کمر سے یوں آوازیں ابھریں جیسے لڑکیوں نے اکٹھے ڈانڈیا کھیلی ہو۔

''ہائے...... ہائے میں مر گیا۔ ہائے...... نیلی پتر! پکڑ ذرا، اتروا میرے مونڈھوں سے یہ وزن۔ ہائے......!'' نیلوفر اور مسرت بانو دونوں نے ہی فوراً آگے بڑھ کر ویٹ نیچے رکھے لیکن مسرت بانو کو پھر ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔ شیخ جی ابھی تک اسی حالت میں تھے جس میں وزن اٹھاتے وقت تھے۔ نیلوفر نے فکرمندی سے ساس کو ٹوکا۔

''امی کچھ کریں، ابا جی کی کمر سیدھی نہیں ہوئی ابھی۔ آپ انہیں باہر لے جا کر چارپائی پر بٹھائیں، میں ضیغم کو بلاتی ہوں۔''

''تو ان کو کس نے کہا تھا اتنی ''انت چکیں'' کمر میں چک تو پڑنی تھا نا۔'' مسرت بانو شیخ جی کو دونوں بازوؤں سے سہارا دیتی باہر لے جاتے ہوئے بولیں۔

''ہائے...... بول لے بول لے۔ تیرے ہاتھ موقع لگا ہے۔ ذرا اب کے مجھے اچھا ہونے دے، شیخ کا بچہ نہیں جو تجھے اس پٹے (بیلٹ) میں نا دیا۔'' شیخ

جی کی دھمکی پر مسرت بانو نے ایسا برا مانا کہ آؤ دیکھا نا تاؤ، اپنے دونوں بازو واپس کھینچے اور شیخ جی دھڑام سے چارپائی پر۔ کمر کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا تو وہ بلبلا اٹھے۔ صد شکر کہ مسرت بانو نے انہیں چارپائی پر پٹخا تھا، نیچے فرش پر نہیں۔

''او تیری ایسی کی تیسی، تیرا ککھ نہ رہوے۔ مسرت بانو اک واری مجھے کھڑا ہو جانے دے، دیکھ تیری کیسی طبیعت صاف کرتا ہوں' شیخ جی دانت کچکچاتے ہوئے کہنے لگے۔ مسرت بانو نے استہزائیہ انہیں دیکھا اور بولیں۔ ''شکر کریں کہ منجی پر پھینکا ہے ورنہ مجھے تو پٹے میں دینے چلے تھے نا، میں آپ کو ''صدقے'' میں دے دیتی۔ ہونہہ...... وڈے آئے۔''

''ہالا! چل دینا ہی ہے تو وہ جو تیری خالہ زاد ہے نا بیوہ، اس وچاری کو دے دے۔ تجھے دعائیں دے گی۔'' شیخ جی نے درد بھلا کر فوراً دماغ لڑایا تو مسرت بانو چمک کر بولیں۔

''شکل دیکھی ہے آپ نے شیخ جی اپنی۔ امریش پوری کم ادم پوری...... مفت میں بھی کسی کو ملیں تو چھوڑ جائے۔ اب ذرا منہ کو زپ لگائیں۔ میں چھوٹے کو بھیجتی ہوں تیل دے کر۔ مالش کر دیتا ہے آپ کی۔ میں ضیغم کی خبر لوں، یہ جمشید بھی نجانے کب تک رہے گا اور کیا چن چاڑھ کر جائے گا۔''

مسرت بانو، شیخ جی کو جوابی جملہ کہنے کا موقع دیے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔ پہلے ہی بیوہ خالہ زاد والی بات بڑی مشکل سے ہضم ہوئی تھی۔ وہ بھلا کیوں کسی کو بھی دیتی پھرتی تھیں شیخ جی کو۔ تھیں تو خود بھی شیخانی تھی ناں۔

☆☆☆

نیلوفر ہاتھ میں کافی اور نمکین کو کیز کی ٹرے تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو ضیغم نہا کر باتھ روم سے باہر نکل رہا تھا۔ گیلے بالوں اور کندھوں کو باری باری تولیے سے پونچھتا وہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ گورا چٹا تو وہ ہمیشہ سے تھا اب اسمارٹنیس اور کسرتی جسم اضافی خوبی تھی۔ نیلوفر نے ایک آسودہ سانس بھر کر ٹرے کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ کے کنارے بیٹھ کر ضیغم کو دیکھنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ ایک وقت تھا جب اس نے ضیغم کی سستی اور کاہلی دور کرنے کی خاطر اور اس کے جسم کی چربی ختم کرنے کی خاطر کیسے جتن کیے تھے۔ فربہ جسم اب سکس پیک لیے ہوئے تھا۔ چہرے کے نقوش ابھر کے واضح ہوتے تھے اور اسے پرکشش بناتے تھے۔ نیلوفر کو اسے دیکھ کر بے حد فخر محسوس ہوتا تھا۔

''کیا دیکھے جا رہی ہو۔ مانا میں خاصا ہینڈسم ہوں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے میری بیوی ہی نظر لگاتی پھرے۔'' ضیغم نے فولیہ اس کے منہ پر اچھال کر قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا تو نیلوفر فوراً سنجیدہ ہوئی اور کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ضیغم! یہ کیا تماشا ہے۔ کیوں آپ سب کو نئی پریشانی میں مبتلا کر رہے ہیں؟''

''یار کیسی پریشانی...... اب تم لوگ خود ہی بتا لو تو میں کیا کروں۔ جب میں گھر میں دبکا بیٹھا رہتا تھا تب بھی تمہیں سکون نہیں تھا نیلی، اور اب جب میں مردوں کی طرح ہر چیز فیس کرتا ہوں تب بھی چین نہیں۔ تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں بلکہ تمہیں تو میرا ساتھ دینا چاہیے۔''

''میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی ہوں ضیغم! مگر خواہ مخواہ کی مار کٹائی تو میں نے کبھی بھی آپ کو کرنے کے لیے نہیں اکسایا۔ بہادر ہونا اور بات ہے ضیغم اور بدمعاشی اور بات۔ یہاں تو آپ مفت میں جمشید کے چکر میں پڑ کر اس کوچ والے سے دشمنی مول لے رہے ہیں۔'' نیلوفر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ضیغم کو سمجھائے۔ اس کے تاثرات ''میں نہیں مانتا'' والے تھے اور یہی بات پریشانی کی تھی۔

''میں کسی سے کوئی دشمنی مول نہیں لے رہا۔ میں صرف جمشید کی مدد کر رہا ہوں، جیسے تم نے کبھی

میری کی تھی۔ جمشید بہت دبو ہے نیلی اور اس کوچ والے کو تم نہیں جانتیں، میں لڑا ہوں اس سے۔ وہ کوئی ہلکا بندہ نہیں ہے۔ جمشید کی چٹنی بنا دے گا وہ۔ میں تو بس چاہتا ہوں وہ اس کا مقابلہ کرے، دبک کر پیچھے نہ ہٹے۔ چار دن جمشید کو ذرا جم میں ایکسرسائز کرواؤں گا۔ تھوڑی باڈی بنے گی تو اس کی بھی ٹور نکل آئے گی۔ دیکھنا تم!"

وہ کوکیز کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو آپ کو ضرورت ہی کیا ہے اس لڑکی کی منگنی تڑوانے کی۔ یہ تو خاصی غیر اخلاقی حرکت ہے ضیغم!"

وہ زچ ہوتے ہوئے بولی تو ضیغم اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یار! کیسی منگنی...... کوئی منگنی شگنی نہیں ہوئی۔ اس خبیث نے مشہور کر رکھا ہے ورنہ نہ اس لڑکی کی ماں راضی ہے نہ وہ خود۔ صرف مجبوری ہے کہ باپ سر پر نہیں اور بھائی چھوٹے ہیں۔ اس سانڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ لڑکی جمشید کو پسند کرتی ہے اور یہ بات وہ کمینہ بھی جانتا ہے...... پھر بھی...... پھر بھی باز نہیں آتا اور اب ہم چند دوست جمشید کے ساتھ مل کر اسے ایسے طریقے سے سمجھائیں گے کہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا وہ۔"

ضیغم اس قدر پر جوش تھا کہ نیلوفر کو اسے ہوش میں لانا مشکل ترین امر لگ رہا تھا۔ کافی کا مگ خالی کر کے وہ جا چکا تھا اور نیلوفر سر پکڑے پریشان بیٹھی تھی۔ پھر یکدم ایک خیال آیا۔ اٹھ کر دروازہ بند کیا اور موبائل پر نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے اگلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

"صبغہ! نوید بھائی کہاں ہیں؟" اس نے روہانسے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ کرو صبغہ! کچھ کرو۔ تمہارے بھائی کا دماغ پھر الٹ گیا ہے۔" اسے ایک بار پھر اپنی نند اور نندوئی کی مدد کی اشد ضرورت تھی۔

☆☆☆

"ہاہاہاہا...... تو بھی شیدائی ہے جمشید۔ بھلا اس موٹے کو لانگڑی دیتا تو فرش کی دھول چاٹ رہا ہوتا۔ مجھے بڑا سواد آتا ہے ایسے کاموں میں۔"

جمشید کوئی قصہ سنا رہا تھا اور شیخ جی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے حالانکہ مسرت بانو کو اس سارے میں مسکرانے کو بھی کچھ نہ ملا تھا۔ وہ اکتائے چہرے کے ساتھ ایک نظر میاں کو دیکھتیں تو دوسری کیلا چائے میں ڈبو ڈبو کے کھاتے جمشید کو۔ نیلوفر بھی بے چاری سی شکل بنائے اندر باہر کے چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے بھی کیلوں اور چائے پر الگ الگ ترس آ رہا تھا" چائے، چائے نہ رہی۔ کیلا، کیلا نہ رہا۔" ایسا منظر اس کی نظروں سے پہلی بار گزرا تھا۔

"بس ماموں! میں نے تو ایویں چھوڑ دیا اسے ورنہ وہ تو میری پھونک کی مار تھا۔"

جمشید کے بجلی کے تار سے پتلے وجود کو دیکھتے ہوئے مسرت بانو کو اس بات پر غش سا آیا۔ "لے دس! اُڈ جانا۔ تیرے میں تو خود پھونک بھرنے کی ضرورت ہے۔ شوہدا نہ ہووے تے......!" مسرت بانو نے دل ہی دل میں تاؤ کھایا۔ جمشید کو ایک اور کیلا چھیلتے دیکھ کر وہ رہ نہ سکیں۔ ہاتھ میں جوتی پکڑی اور بولیں۔

"پتر مہمان تُو ہو گا ضیغم کا، پر اب جو تو نے میرے سامنے کیلا چائے میں بھگو کے کھایا نا تے میں نے تیرا سر اپنی چپل سے پلپلا کر دینا ہے۔ رکھ کیلا...... رکھ......!"

جمشید نے سہم کے فوراً کیلا واپس پلیٹ میں رکھا اور شرافت سے کپ اٹھا کے چائے پینے لگا۔ مسرت بانو نے سکون سے چپل فرش پر پٹخی اور اس کی تابع داری پر قدرے خوش ہوتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"ہم...... ہاں...... اب بول کیا کرنے آیا ہے تُو بھلا یہاں۔"

''شادی کرنے......!'' دوٹوک جواب آیا۔
''لڑکی کہاں ہے؟'' کڑے لہجے میں سوال کیا۔
''اپنے گھر......'' پرسکون انداز میں جواب آیا۔
''تو ادھر کیا ہماری ''ککڑی'' سے نکاح پڑھانے آیا ہے۔ سیدھی طرح جواب دے، اتنا مدبر نہ بن ورنہ کرتی ہوں میں ابھی تیری ماں کو فون......''
مسرت بانو نے ڈپٹ کے پوچھا تو جمشید نے شیخ جی کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ شیخ جی اس کے دفاع میں بولے۔
''او بی بی! تجھے کون کہہ رہا ہے اس پھڈے میں آ۔ اتنی پوچھ پڑتال کیوں کر رہی ہے۔ یہ مردوں کا معاملہ ہے۔ مردوں میں ہی رہنے دے۔''
''کون مرد......؟'' مسرت بانو نے جمشید کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔
''مامی! میری مردانگی کو چیلنج نہ کریں۔ معرکے مرد ہی مارا کرتے ہیں اور عشق سے بڑا کوئی معرکہ ہوگا بھلا۔'' جمشید صاحب نے اپنی کھڑکھڑاتی چھاتی پھلائی تو مسرت بانو کو ہنسی آگئی۔
''وے...... تیری ماں نے جب تجھے جنا تھا تو اسے بھی سب نے یہی بولا تھا۔ ''جانی زبیدہ! بڑا معرکہ مارا ہے۔'' آج اس کا معرکہ اک ہور معرکہ مارنے چلا ہے۔ کل کو تم لوگ فوج پیدا کرو گے معرکوں کی۔''
''بس مامی دعائیں چاہئیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن آئے گا جب میرے گھر بھی معرکوں کی لائن لگی ہوگی۔''
''واہ واہ...... دعائیں میری اور لائن تیری۔ ایویں...... ایک تو ہمارے گھر آ کے سیاپا ڈال دیا ہے۔ چنگا بھلا میرا پتر سکون سے بیٹھا تھا، اس کو دوبارہ سے لڑوانے آگیا تو...... مجھے تو سوچ سوچ کے ہی ہول اٹھتے ہیں کہ ضیغم اسی کوچ والے سے بھڑنے کی تیاریوں میں ہے۔ نا تو مجھے یہ بتا۔ تجھے کوئی اور نہیں ملی۔ کسی اور کو پسند کر لیتا تو کیا بگڑتا تیرا...... بول......؟'' مسرت بانو بولنے پر آئیں تو اگلی پچھلی سب گنوا ڈالیں۔
''مامی! اس دنیا میں کوئی بھی لڑکی پارو نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک ہی ہے اور میں بس اسی سے شادی کروں گا ورنہ ماں باپ کے گھر ہی بیٹھا رہوں گا۔'' جمشید کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ شیخ جی کو ہنسی آگئی اس کی بات پر، لیکن مسرت بانو نے طنز کرتے ہوئے کہا۔
''پتر! جو تیرے کسب ہیں نا، تیرے ماں پیو کو چاہیے کہ تجھے گھر ہی بٹھا لیں۔ اس آنکھ کی اندھی کو بھی اللہ جانے تجھ میں کیا نظر آیا ورنہ تیری تو صرف پسلیاں ہی نظر آتی ہیں۔''
''وہ تو آپ فکر ہی نا کریں مامی! ضیغم نے کہا ہے کہ صرف چار دن۔ چار دن میں وہ میرے مسلز بنا دے گا۔'' جمشید نے بڑے شوق سے بازو کی آستین اوپر کی اور اپنا ڈولا دکھایا۔
شیخ جی کی ہنسی کا فوارہ خاصا اونچا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ مسرت بانو نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ جمشید نے مسکین صورت سے اپنے ڈولے کو دیکھا اور اس پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔
''ہنس لیں ماموں! میں نے بھی یہ انڈہ، شتر مرغ کا انڈہ نہ بنایا تو میرا نام۔''
''پیا نہیں۔'' مسرت بانو کو اس کی عرفیت یاد تھی۔
''وہ تو بچپن کا نام تھا مامی! اب تو کسی کو یاد بھی نہیں۔ آپ بھی کدھر سے گڑا مردہ اکھاڑ کر لے آئی ہیں۔'' جمشید برا مانتے ہوئے بولا تو مسرت بانو بولیں۔
''اچھا جی! تیرا بچپن ادھر پہنچ کے ہی ختم ہوا ہے کیا۔ ابھی پرسوں تیری ماں سے بات ہوئی تو بولی۔

””میرے پتّے کا خیال رکھنا۔ ہوا پانی بدلے تو بالکل ایسے ڈھیلا ہوتا ہے جیسے چاولوں کا پتّا بن جاتا ہے اور تو کہہ رہا ہے تیرے بچپن کا نام ہے۔ پتر تو بچپن کا بھی ہو جائے گا نا، رہے گا پتّا ہی اور پھر دیکھ تیری پارو کا نام بھی کیسے تیرے نام کے ساتھ نگینے کی طرح فٹ ہوگا۔ ”پاروپتّا“......“

"میرا خیال ہے کہ مجھے جم میں جا کر ایکسرسائز کرنی چاہیے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔“ جمشید میاں قدرے بُرا مانتے ہوئے اٹھے اور ناک کی سیدھ میں چلتے ڈرائنگ روم میں گم ہو گئے، جہاں اب جم بن چکا تھا۔ کب تک کے لیے۔ یہ آنے والے وقت پر منحصر تھا۔

☆☆☆

گمبیر خاموشی...... تینوں کی نظریں باری باری ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور پھر وہ تینوں سر جھکا کے سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ نوید اور صبغہ کو نیلوفر کی روہانسی شکل دیکھ دیکھ کر ہنسی بھی آ رہی تھی اور ترس بھی۔ بے چاری بلاوجہ مشکل میں پڑ جاتی تھی اور اس کو بھی ان دونوں کے علاوہ کسی پر اتنا بھروسا نہیں تھا کہ اپنا مسئلہ بیان کر کے حل تلاشنے کو کہتی۔

پچھلی بار کی طرح —— دوبارہ اس نے ان ہی دونوں سے رابطہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نوید بھائی اس معاملے کو بھی طریقے سے نپٹیں گے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مگر نوید اسے ستانے کے موڈ میں تھے۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری کر کے آنکھیں سکوڑے اور ایک ابرو اٹھائے سامنے دیوار میں نصب شوکیس کو دیکھتے ہوئے بولے۔

””ہم م م م...... تو بات خاصی بڑھ گئی ہے۔ یہ مسئلہ تو پچھلی بار سے زیادہ سنگین ہے۔ اس کا حل بھی بہت سوچ سمجھ کے نکالنا ہوگا۔“

””مثلاً اس میں پستے بادام ڈلنے ہیں جو آپ کو اتنی سنگینی نظر آ رہی ہے۔ نوید! سیدھے سبھاؤ حل

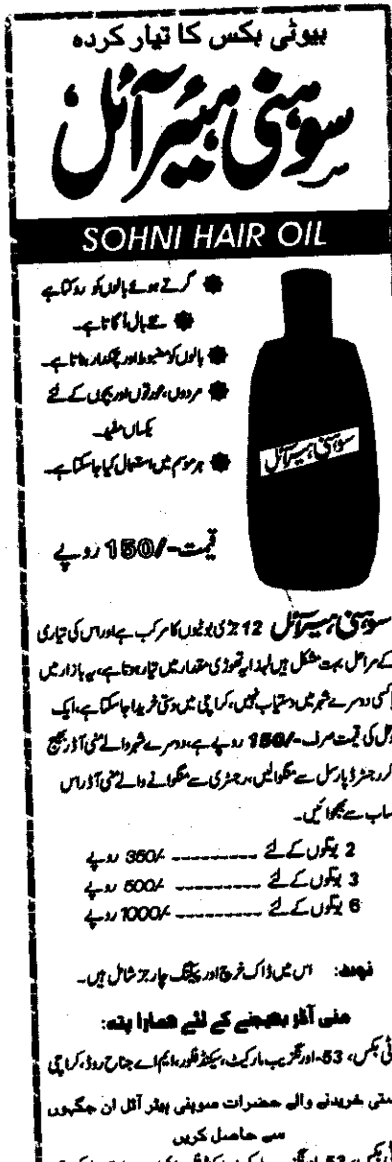

ڈھونڈیں اور یہ رپھڑ ختم کریں۔ ہاں نہیں تو......!"
صبغہ کا نوید بھائی پر اتنا رعب تھا نہیں جتنا میکے میں بیٹھ کر جھاڑا کرتی اور نوید بھائی بھی جان بوجھ کر سن لیتے محض اس کا مان رکھنے کو۔ نیلوفر کے دل میں ان کی عزت مزید بڑھ جاتی تھی۔
نوید بھائی سر کھجاتے ہوئے بولے۔ "اب ایسا ہے کہ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے ہمیں آج کی رات یہاں ٹھہرنا ہوگا۔ ساری صورت حال کو جانچنے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔"
"ہاں تو اس میں کیا مسئلہ ہے نوید بھائی!" نیلوفر نے فوراً جواب دیا۔ "آپ کا اپنا گھر ہے۔ ایک رات چھوڑ جب تک مرضی رہیں۔ لیکن میری یہ مشکل اس طرح حل ہونی چاہیے کہ پچھلی بار کی طرح کسی کو پتا نہ چلے۔ آپ کو تو معلوم ہے ضیغم سوچتے کم ہیں اور عمل پہلے کرتے ہیں۔"
"اے لڑکی! اب میرا بھائی اتنا بھی گیا گزرا نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے کہ پہلے وہ معدے سے سوچتا تھا اب وہ کے لاتوں سے سوچتا ہے لیکن سوچتا تو ہے نا۔" صبغہ نے بات اتنی سنجیدگی سے شروع کی کہ نیلوفر نے یکدم سہم کر زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ آخر کو بھائی تھا صبغہ کا، ہوسکتا ہے ایسا کہنا اسے برا لگا ہو مگر پھر وہ خود بھی بے ساختہ ہنسی تو اس کے بھی اوسان بحال ہوئے۔
"پچھلی بار بھی اس کوچ والے کو پندرہ ہزار دے کے آیا تھا اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی کہ "اللہ کے بندے، صرف دو گھونسوں کا سوال ہے۔ تیری بڑی مہربانی اگر میرے سالے کے دو تین مکے کھالے گا تو...... یہ اس کی ذہنی صحت کے لیے اشد ضروری ہے۔ وہ تو پیسے کا لالچی تھا اس لیے جب ضیغم چار بندے لے کر اسے کٹ چاڑھنے گیا تھا تو اس نے اپنا دفاع نہیں کیا ورنہ نیلوفر بی بی! یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا ضیغم نے سمجھا تھا۔ وہ موالی سا بندہ ہے، ہر وقت غنڈوں میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے لیے بھی دو ہاتھ کی مار تھا ضیغم لیکن نیلے نوٹ دیکھ کر اس خبیث نے لاتیں بھی کھائیں اور گھونسے بھی۔ ایسے ایسے گدھے بیٹھے ہیں یہاں۔"
"یہ آپ کا مجھ پر احسان تھا نوید بھائی! اگر آپ اس کوچ ڈرائیور کو راضی نہ کرتے تو یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ضیغم کا بھرکس نکال دیتا۔
اصل میں ضیغم نے جو چھ ماہ کا عرصہ دہشت میں گزارا تھا، اس کا غصہ کبھی ان کے دل سے گیا ہی نہیں اور اب انہیں دوبارہ اس سے الجھنے کا موقع مل رہا ہے تو وہ پیش پیش ہیں۔ اسی لیے...... اسی لیے نوید بھائی میں چاہتی ہوں کہ آپ ایسا کچھ کریں کہ ضیغم کا اس کوچ ڈرائیور سے سامنا ہی نہ ہو اور جمشید بھائی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے کیونکہ وہ بھی تب تک واپس جانے کو تیار نہیں جب تک کوچ ڈرائیور اس لڑکی سے دستبردار نہیں ہو جاتا۔ میں تو بہت مشکل میں پھنس چکی ہوں نوید بھائی اور ضیغم ہیں کہ کچھ سننے پر راضی نہیں۔"
نیلوفر نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا۔ نوید بھائی نے اپنے جسم میں بھرپور تناؤ پیدا کر کے انگڑائی لی اور پھر بے حد سکون سے بولے۔
"ہو جائے گا...... یہ بھی ہو جائے گا۔ مجھے ایک ہفتہ دو بس۔ جمشید کی اس لڑکی سے بات بھی پکی ہو جائے گی۔ کوچ ڈرائیور بھی پیچھے ہٹے گا اور رہا ضیغم! تو اس کو کوچ ڈرائیور کی لنگوٹی بھی نہیں ملنے والی۔ بس تم کچھ رقم کا انتظام رکھو۔ یہ کرنا پڑے گا۔ مجبوری ہے۔"
"پیسوں کی آپ فکر نہ کریں، میں دینے کو تیار ہوں۔ بس کام ہونا چاہیے نوید بھائی!" نیلوفر نے یقین دہانی کرائی۔
"ہو گیا سمجھو، میں ذرا جم کا چکر لگا لوں۔ دیکھوں تو سہی وہاں کا کیا سین ہے۔"
نوید بھائی کہتے ہوئے اٹھے اور بڑے اشتیاق

سے ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔ پیچھے صبغہ اور نیلوفر خاندان کے قصے چھیڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔''

☆☆☆

جم میں بڑی رونق تھی۔ محلے کے جتنے ویلے نکتے تھے، وہ سب یہاں جمع تھے۔ کسی کو منگیتر کو امپریس کرنے کے لیے ''سکس پیکس'' درکار تھے۔ کسی کی شادی کے بعد توند اس قدر نکل آئی تھی کہ بیوی ہی طعنے دیتی رہتی۔

ضیغم اچھا ٹرینر تھا اور جمشید سب سے نکما ٹرینی۔ نوید نے اس کو پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ وہ ایسی بھاری ایکسر سائزز کا اہل نہیں، اسے ابھی کافی وقت درکار تھا خود کو ورزشی بنانے میں۔ جب کہ یہ سب وہ ایک دو ہفتے کے نوٹس پر کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں ہاتھوں میں ڈمبل اٹھائے انہیں کندھوں سے اوپر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوید کو ہنسی آ گئی۔ وہ جمشید سے پہلے بھی ایک دو بار مل چکے تھے، اس لیے اسے پہچانتے تھے۔ سیدھے چلتے اسی کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ضیغم کسی کو ایکسر سائز کروا رہا تھا، نوید پر نظر پڑی تو دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔ جواباً نوید نے بھی ہاتھ ہلا کر ''لگے رہو'' کا اشارہ دیا۔ انہیں اس وقت صرف جمشید سے کام تھا۔ گلا کھنکار کر مخاطب ہوئے۔

''کیسے ہو یار جمشید! کب آئے؟''

''ارے آپ..... آپ کیسے ہیں نوید بھائی! سوری میں نے آپ کو آتے نہیں دیکھا۔'' جمشید ڈمبل چھوڑ کر اٹھنے لگا تو نوید نے منع کر دیا۔

''نہیں..... نہیں..... پلیز کیری آن! مجھے تو بس تمہارے آنے کی خبر ملی تو یونہی ملنے چلا آیا اور سناؤ خیریت سے تو ہو۔ کسی خاص کام سے آئے ہو؟'' لہجے کو سرسری رکھ کر، کان میں انگلی پھیرتے ہوئے نوید نے پوچھا۔

سامنے بھی جمشید تھا۔ انگلی پکڑاؤ تو بازو کھینچتا تھا۔ فوراً بولا۔

''ہک ہا۔ کیا بتاؤں نوید بھائی! بس دل لگانے کی سزا سہہ رہا ہوں۔ دل ہے کہ لگتا ہی نہیں۔''

قہقہہ کیسے کنٹرول کرتے ہیں، یہ بھی ایک آرٹ ہے اور نوید نہیں جانتے تھے کہ وہ اس ہنر سے واقف ہیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی دل کی چوٹ، بھلانے کے لیے یہاں آئے ہو۔ محبت میں ناکام ہوئے ہو، لگتا ہے۔''

''اللہ نہ کرے نوید بھائی! میں تو کامیاب ہونے آیا ہوں۔ بس ضیغم ہی میری آخری امید ہے۔ ایک دفعہ میں بھی ڈولے شولے بنالوں تو دیکھیں کیسے اس سانڈ کو دھول چٹاتا ہوں۔''

''کسے.....؟'' نوید کے پوچھنے پر جمشید نے الف تا یے ساری کہانی گوش گزار کر دی جسے انہوں نے پورے انہماک سے یوں سنا جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ بعد میں بڑے رازدارانہ انداز میں تھوڑا سا آگے کو کھسکے اور ہاتھ کے اشارے سے کان قریب لانے کو کہا۔

''مروڑنا ہے؟'' جمشید نے سہم کے کان پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں، کھولنا ہے۔'' نوید بولے۔

''کیسے.....'' جمشید کا استفسار۔

''پیچ کس سے۔'' نوید چڑ کر بولے۔ ''ابے کھوتے دماغ۔ یہ تو تمہارا حال ہے کہ اشارے کنائے کی زبان تو تمہیں سمجھ آتی نہیں تو عشق کے لیے تربیتی کورس کیا تھا کیا؟''

''کدھر نوید بھائی! ابھی وہاں ایسا کوئی سینٹر نہیں کھلا۔ ویسے خیال اچھا ہے۔ کیوں نہ میں ہی کھول لوں۔'' جمشید کی باچھیں جوش سے چر کر دائیں بائیں لٹکنے کو تھیں۔ نوید کا جی چاہا کہ اس کے ہاتھ سے ڈمبل لے کے اسی کے سر پر ماریں تاکہ دماغ کا سرکٹ چلے۔

"میں تو تمہارے فائدے کی کہہ رہا تھا، لگتا ہے تمہیں ہی دلچسپی نہیں سننے میں تو ٹھیک ہے لگے رہو ان مشینوں کے ساتھ۔ اگر میرے مشورے پر عمل کرتے تو چار دن کے اندر اندر شادی کے شادیانے بج سکتے تھے۔ قسم سے......"

جمشید پر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سکتے کی سی حالت میں ہاتھ میں تھاما ڈمبل ہتھیلی سے آزاد کیا تو وہ سیدھا پاس کھڑے اونچے لمبے مگر دیا سلائی جیسے لڑکے کے پاؤں پر گرا۔ قینچی چپل میں اس کے پاؤں کی کھلی انگلیوں کا ملیدہ بن گیا مگر یہ جم تھا۔ یہاں ہر لڑکے کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ بہادری اور طاقت کا مظاہرہ کرے۔ کوئی چوٹ شوٹ لگ بھی جاتی تو "اوہ! میں ٹھیک ہوں۔ میں ٹھیک ہوں...... کچھ نہیں ہوا۔" کہہ کر سہہ جاتے، بھلے سے گھر جا کر سارے صحن میں مارے درد کے اچھلتے ہوں۔ بالکل ویسے ہی یہ لڑکا بھی پاؤں پہ ڈمبل گرنے پر چیخ کا گلا تو گھونٹ گیا تھا مگر ایک کرارا ہاتھ بے اختیار جمشید کی گردن پر ضرور دھرا تھا۔ پر جمشید صاحب ہر درد سے بے نیاز دونوں ہاتھ گود میں دھر کر یوں سیدھے ہو بیٹھے تھے جیسے ابھی ابھی نوید بھائی کی مریدی میں آئے ہوں۔

"میں آپ کے ہر مشورے پر جی جان سے قربان ہونے کو تیار ہوں نوید بھائی! بس پارو مجھے مل جائے۔"

اس کے یوں کہنے پر نوید بھائی کو زوردار اسٹروک لگتے لگتے رہ گیا۔ جی ہی جی میں اسے "دیوداس کی سڑی ہوئی آتما" کا لقب دیا اور بظاہر کنپٹی کھجاتے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"پارو تمہاری ہو کے رہے گی دیوا! میرا مطلب ہے جمشیدا! اوہ ہو...... جمشید...... ایک تو تم نے بھی پارو کے نام سے پوری فلم یاد کرا دی۔" نوید بھائی بار بار زبان پھسلنے پر جزبز ہوئے پھر ایک ہاتھ سے جمشید کا کان ذرا سا کھینچ کر اپنے منہ کے قریب لائے اور بولے۔

"کل دوپہر میں چار بجے میرے ساتھ ایک بنگالی بابا کے پاس چلنا ہوگا۔ بس چار دن کے اندر محبوب قدموں میں ہوگا۔ ایسی کاٹ کرے گا کہ پارو کا منگیتر خود اس کی منگنی تم سے کرائے گا۔ بس کل چار بجے تیار رہنا۔"

"میں آپ کا یہ احسان کیسے اتاروں گا نوید بھائی! قسم لے لیں جو مجھ سے یہ جم کا سیاپا ہوتا ہو تو۔ کل میں ٹریڈمل کے پٹے کے اندر آتے آتے رہ گیا۔ اگر جو میں اس میں پھنس جاتا تو دوسری طرف سے میرا "پرنٹ" باہر نکلنا تھا۔ نکا سا تھان بن جاتا میرا۔" جمشید نادیدہ آنسو جھٹکتے ہوئے بولا تو نوید بھائی کو اس پارو نامی بچی پر سچ میں ترس آیا لیکن انہیں تو نیلوفر کا کام کرنا تھا بس اور اس کے لیے جمشید کی عقل سے عاری باتیں سننے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

"وہ ہ......! یار جمشید...... کچھ رقم کا بھی انتظام رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ دس ہزار۔ بس اتنے ہی کافی ہوں گے تمہارے محبوب کو قدموں میں گرانے کے لیے۔" نوید بھائی نے اٹھنے سے پہلے پیسوں کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھا تاکہ جمشید ذہنی طور پر تیار رہے۔

"آپ فکر ہی نہ کریں نوید بھائی! دس چھوڑ، بیس ہزار دوں گا۔ بس میرا کام ہو جائے۔" جمشید نے پچکا سینہ پھلا کے تسلی کرائی۔ نوید بھائی نے گہرا سانس لیا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے جم سے باہر چلے گئے۔ پیچھے اسٹول پر بیٹھے جمشید نے نخوت سے ویٹ بار کو ٹھڈا مارا۔ نتیجے میں سارے میں پیر پکڑے جمشید کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے ہی دن نوید بھائی، جمشید کو ٹھیک شام کے چار بجے بنگالی بابا کے پاس لے گئے اور اس سے

اگلے دن جمشید صاحب علی الصباح بغیر کسی کو بتائے چپکے سے گھر روانہ ہو چکے تھے۔ ضیغم کو جب پتا چلا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، حیرت سے زیادہ افسوس تھا کہ اتنا قیمتی موقع ہاتھ آیا تھا اس کوچ ڈرائیور کو مار لگانے کا جو اس جمشید کی کم ہمتی کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔

مسرت بانو اور نیلوفر جان چھوٹنے پر شکر ادا کر رہی تھیں۔ مگر نیلوفر ابھی بھی فکر مند تھی، کیونکہ جمشید تو واپس چلا گیا تھا مگر نوید بھائی کا ابھی تک کچھ پتا نہ تھا کہ انہوں نے پارو اور جمشید کو ایک کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں۔

مسرت بانو بھی مسرت کے مارے شیخ جی سے چھیڑ خانیاں کرتی پھر رہی تھیں اور شیخ جی چڑ رہے تھے۔ وہ بیٹھے تھے لاؤنج کے کاؤچ پر پیر پسارے۔ آج صبح سے انہیں بدہضمی کی شدید شکایت تھی۔ نیلوفر کے بار بار واک کرنے کا کہنے کے باوجود وہ بس بیٹھے بیٹھے پھکی پھانکے جا رہے تھے اور ڈکاریں لیے جا رہے تھے۔

نیلوفر موبائل پر باتیں کرتی ہوئی وہیں چلی آئی۔ خوشی اس کے لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مسرت بانو کے قریب آ کر وہ رکی اور بولی۔

''یہ لیں پھوپھو! امی سے بات کریں اور میری طرف سے ایک بار پھر بڑی بڑی مبارک باد۔''

موبائل اس نے مسرت بانو کو پکڑا دیا اور خود واپس مڑنے لگی کہ شیخ جی کی آواز پر رک گئی۔

''اے نیلی پتر! خیر تے ہے۔ کس کا فون ہے اور کس کو مبارکباد دے رہی تھی تو۔''

''ابا جی جمشید بھائی کا نکاح ہے اس جمعے کو اسی لڑکی کے ساتھ۔ ان ہی کی مبارکباد دے رہی تھی۔ خوشی کی بات ہے نا یہ تو۔''

''تو کیا ضیغم نے اس کوچ والے کی ہڈیاں توڑ دیں جو یہ نکاح ہونے لگا ہے۔ کوئی رولا شولا نہیں پڑا۔''

''اللہ کا شکر ہے ابا جی کہ بغیر لڑائی کے یہ کام ہو گیا۔ ضیغم کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور اچھا ہی ہوا نا ابا جی۔ کیا پتا کیا ہو جاتا۔ میں تو ضرور جاؤں گی اس نکاح میں، مجھے تو بڑا شوق ہو رہا ہے جمشید بھائی کی پارو کو دیکھنے کا۔''

وہ اپنے دھیان میں بولتی، بات مکمل کر کے کمرے میں جا چکی تھی۔ مسرت بانو ابھی تک موبائل پر مصروف تھیں اور شیخ جی کا دماغ الجھا ہوا تھا کہ آخر یہ سب ہوا کیسے؟

☆☆☆

''دھیان سے سنیں امی! اگر ضیغم بھائی پوچھیں کہ جمشید کا معاملہ سلجھا کیسے؟ تو آپ نے صاف کہنا ہے کہ نوید، جمشید بھائی کو کسی بنگالی بابا کے پاس لے گئے تھے۔ اس نے ایسا عمل کیا کہ چار دن میں جمشید بھائی کی بات پکی ہو کر بات نکاح تک پہنچ گئی۔''

صبغہ بڑے جوش سے ماں کو بتا رہی تھی اور مسرت بانو کے اشتیاق کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ جھوم جھوم کے سن رہی تھیں جیسے بنگالی بابا نے عمل کر کے شیخ جی کی توند اندر کرا دی ہو۔ نوید بھائی بڑے متین صورت بنے فروٹ چاٹ میں سے کیلے چن چن کر کھا رہے تھے۔

''نوید بھائی کچھ بتائیں تو سہی کہ آپ نے آخر کیا کیا؟'' نیلوفر کو تجسس چھپانا اب مشکل ہو رہا تھا کیونکہ نوید بھائی نے کیا کمال دکھایا تھا اور کیسے کر دکھایا تھا، یہ ابھی تک صیغۂ راز میں تھا۔

''کچھ خاص نہیں، میرا ایک دوست ہے جو بہت بڑے نوٹنکی کو جانتا ہے۔ وہ بندہ چار پیسے لے کر بڑے بڑے ڈھونگ کر لیتا ہے۔ مجھ سے بھی اس نے دس ہزار لیے اور سوانگ بھر کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے کچھ دور ایک برگد کا پرانا درخت ہے اس پر ایک پوسٹر چسپاں کر دیا۔ ''محبوب آپ کے قدموں میں...... دو دن کے عمل سے سخت سے سخت بندش کی کاٹ۔ آج

ہی آیئے اور بنگالی بابا سے فائدہ اٹھایئے'' اس سے پہلے کہ پولیس آئے اور بنگالی بابا کو اٹھا لے جائے۔'' بس میں جمشید کو اس کے پاس لے گیا۔ بس جی جمشید صاحب تو اس غلیظ حلیے والے ملنگ پر ریشہ خطمی ہی ہو گئے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے درد کی دوا اسی کے پاس ہے۔'' نوید بھائی کی چاٹ میں سے کیلے ختم ہو گئے تھے اور وہ چمچ مار مار کے کوئی بچا ہوا ڈھونڈ رہے تھے۔ نیلوفر نے فوراً مزید چاٹ ان کے باؤل میں ڈالی اور پوچھا۔

''تو نوید بھائی اس بندے نے جمشید بھائی کو کیا دیا اور وہ کوچ والا کیسے دستبردار ہوا۔ اب یہ نہ کہیے گا کہ یہ سب اس ڈھونگی کے عمل کا کمال ہے۔''

''نہیں...... یہ سب میرا کمال ہے۔'' نوید بھائی نے کالر جھٹک کے کہا۔ ''اس نے تو جمشید کو گھوڑے کی دم کے بال جلا کر ان کا سفوف بنا کر چار پڑیاں پکڑا دیں اور یوں ہی کہہ دیا کہ ''بچہ اس راکھ کو اپنے رقیب کے گھر کی طرف منہ کر کے اڑا دینا۔'' لیکن اس گھونچو کی بے وقوفی کہ ایک پڑی اس کے ابا جی کے ہاتھ لگ گئی اور وہ چورن سمجھ کے پھانک گئے۔ باقی تین کی راکھ وہ اس کوچ والے کے گھر کے باہر کھڑا ہو کر بڑی بہادری سے اڑا آیا۔''

''جو وہ کوچ والا دیکھ لیتا تو اس نے جمشید کو راکھ بنا کے اڑا دینا تھا۔ پاگل نہ ہووے تے۔'' مسرت بانو کو جمشید کی دلیری ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

''دیکھتا کیسے امی! وہ کوچ والا اس وقت میرے ساتھ تھا۔'' نوید بھائی نے انکشاف کیا۔

''کیا......!'' تینوں خواتین کے منہ سے ایک ساتھ ''کیا'' نکل کر ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں بیٹھے شیخ جی کے کانوں میں پڑا تھا اور اب وہ مارے تجسس کے بیڈ کے نیچے سے اپنی چپلیں ڈھونڈ رہے تھے۔

''ہاں نا...... ظاہر ہے اس کا بھی تو کچھ کرنا تھا نا۔ وہ میرے مامے کا پتر تو ہے نہیں کہ میری بات سر جھکا کے مان لیتا۔ میں نے بتایا تھا نا کہ لالچی آدمی ہے۔ پچھلی بار پیسے لے کر ضیغم سے مار کھالی تھی۔ اس بار کچھ زیادہ لے کر اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اللہ اللہ تے خیر صلا۔'' نوید بھائی کا پرسکون انداز تینوں کو رشک میں مبتلا کر گیا تھا لیکن دروازے کے باہر کھڑے شیخ جی کو ماجرا ابھی پلے نہیں پڑا تھا۔ بس صبغہ کی اگلی آواز کان میں پڑی۔

''تو اصل بنگالی بابا تو ہمارے سامنے ہوئے نا۔ میں تو آپ کی عقیدت مند ہو گئی نوید! ویسے یہ بنگالی عامل۔ کتنا پیسہ بنا لیتے ہوں گے نا نوید! ایک ہی جست میں دس ہزار...... اُف...... حد ہو گئی ویسے۔ کیا خیال ہے نوید! آپ بھی اسی فیلڈ میں کیوں نہیں آ جاتے۔''

صبغہ کی بات پر ایک زوردار قہقہہ پڑا تھا۔ مسرت بانو نے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوتے اپنا بھاری ہاتھ نوید کے کندھے پر دے مارا اور چاٹ میں سے بمشکل ڈھونڈا ہوا آخری کیلا پھڑک کے دور جا گرا۔ وہ بے چارے ترسی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

نیلوفر اتنی خوش اور مطمئن تھی کہ اس کے چہرے کا سکون صاف دکھائی پڑتا تھا لیکن دروازے کے باہر کھڑے شیخ جی کا اطمینان بھی دیدنی تھا۔ ان کے چہرے کا سکون صرف وہی محسوس کر سکتے تھے۔

☆☆☆

جمشید کا نکاح بخیریت ہو گیا تھا۔ مسرت بانو اور نیلوفر، صبغہ اور نوید کے ساتھ خاص بلاوے پر گئی تھیں۔ وہاں انہیں وی آئی پی پروٹوکول ملا تھا۔ جمشید اور اس کے گھر والے بچھ بچھ جا رہے تھے۔ جمشید کو تو پارو سے مطلب تھا مگر اس کے گھر والوں کو اس چلتی دکان سے جو پارو کے نام اس کے مرحوم والد کر گئے تھے اور یہ بات اب سے پہلے کسی کو پتا نہیں تھی۔

کوچ ڈرائیور جس کے ساتھ ضیغم نے متھا مارنا تھا، عاجز سالے کے فرائض پوری تن دہی سے انجام دے رہا تھا۔ کھانے کے وقت نوید بھائی کو اس نے بھی کوئی بیسویں دفعہ آ کر پوچھا تھا۔

''بھائی جان! اور کچھ......'' اور نوید بھائی چوڑے ہو کر نفی میں سر ہلا رہے تھے اور منہ چلا رہے تھے کیونکہ ٹیبل بھری پڑی تھی ''ہور کچھ'' سے۔

''لو بھئی صبغہ! آج اگر تمہارا بھائی بھی آ جاتا نا ساتھ اور دس جوتے مار کر ایک بھی نہ گنتا تب بھی اس بندے نے اسے کچھ نہیں تھا کہنا۔'' نوید بھائی نے صبغہ کو مخاطب کیا۔

''نوید بھائی! ویسے مجھے یہ اتنا خطرناک لگا تو نہیں جتنا آپ لوگوں کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا۔'' نیلوفر نے نفاست سے فرنی کھاتے ہوئے کہا۔

''سب پیسے کا کمال ہے پیسے کا۔'' نوید بھائی نے آواز مدھم رکھتے ہوئے کہا۔ ''پچیس ہزار کم نہیں اس کے لیے۔ یار و تو کئی مل جائیں گی مگر پچیس ہزار روز روز نہیں ملتے۔ یہ جو دکان پارو بی بی کے نام ہے نا، اس کا پتا اس کو بھی اب ہی لگا ہے، لیکن اب چڑیاں کھیت نہیں چگ گئیں بلکہ باز، چڑیاں ہی اچک کے لے گئے۔''

''ہائے میں مر گئی، او نوید! تیرے سوہرے کو پتا لگا نا کہ تو نے اپنے پچیس ہزار اس نکٹے کے پیچھے برباد کر دیے ہیں تو وہ خود آ کر اس کی آندروں میں سے رقم نکال لیں گے۔'' مسرت بانو کو سوچ کر ہی غش آ گیا تھا۔ یہ پیسے نیلوفر نے دیے تھے اور ظاہر ہے ضیغم سے ہی کسی بہانے نکلوائے تھے لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ انجان بن کر کھانا کھاتی۔ مسرت بانو اگر یہ سوچ رہی تھیں کہ یہ رقم نوید نے ان کی ہمدردی میں پلے سے لگائی ہے تو سوچتی رہیں۔ اس کی بلا سے۔ کم از کم اس سے تو چھٹکارا ملا۔

☆☆☆

لاہور سے واپسی کا سفر بے حد خوش گوار تھا۔ وہ چاروں ہی ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہے تھے۔ صبغہ کے دونوں بچے دادی کے پاس تھے اس لیے نوید بھائی اور صبغہ نے ان دونوں کو گھر اتار کر اپنے گھر واپس جانا تھا۔ مسرت بانو کو کھانے اور سفر کی خماری چڑھی ہوئی تھی، وہ گاڑی میں ہی ہچکولے کھا رہی تھیں۔ نیلوفر کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی تاکہ ضیغم کو ساری روداد سنا سکے، وہ ویسے بھی جمشید سے ناراض تھا جس کی بزدلی کی وجہ سے کوچ ڈرائیور سے دو دو ہاتھ کرنے کا نادر موقع ہاتھ سے نکل۔ گیا تھا۔ نیلوفر کو یقین تھا کہ وہ اسے پیار سے سنبھال لے گی۔ جب ایک فریق لڑائی سے پیچھے ہٹ گیا تھا تو اس کو بھی دل میں کینہ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان ہی سوچوں میں سارا رستہ کٹا تھا اور اب وہ محلے کی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ داہنی طرف میں آٹھواں گھر ان کا تھا۔ ایک، دو، تین...... چھ، سات، آٹھ......نوید حیران پریشان آگے نکل گئے تھے۔ صبغہ اور نیلوفر کے بھی حیرت سے منہ کھلے ہوئے تھے۔ مسرت بانو چونکہ نیند میں تھیں اس لیے ان کا منہ کھلا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

''یا حیرت...... گھر کدھر گیا؟'' نوید کے منہ سے جملہ ادا ہوا۔

''ہائے ......نوید! اباجی اور بھائی ناراض ہو کر گھر بیچ تو نہیں گئے۔'' صبغہ کی روہانسی آواز ابھری۔

''کیسی باتیں کرتی ہو صبغہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ نوید بھائی آپ گاڑی پیچھے لیں۔'' نیلوفر نے بوکھلائی ہوئی آواز میں نوید سے کہا۔ گاڑی ریورس گیئر پر ڈالتے ہوئے ان سب کی نظریں اس لین کے ہر گھر کا بغور جائزہ لے رہی تھیں اور پھر نوید نے ایک گھر کے آگے گاڑی روک دی۔

''یہی ہے، شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ تم لوگ بھی یقین کر لو۔'' ٹرانس کی سی کیفیت میں نوید کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔ نیلوفر اور صبغہ کے چہرے

گاڑی کے شیشوں سے آدھے باہر لٹک رہے تھے۔
حیرت کی جگہ اب صدمے نے لے لی تھی۔
''عامل بابا'' بڑے شیخ جی! ستر سالہ تجربہ، بنگال کے جنگلوں میں چلّے کاٹ کر ہر قسم کے جنات کو قابو میں کر رکھا ہے۔ ایک ہفتے میں سخت سے سخت کاٹ کر کے "محبوب" اپنے اماں، ابا سمیت آپ کے قدموں میں۔ "منی بیک گارنٹی کے ساتھ!" (یہ پیشکش صرف خواتین کے لیے ہے)
عامل بابا چھوٹے شیخ جی"۔ ستر سال سے بڑے شیخ جی کے ''چھوٹے'' کی حیثیت سے خدمت کرنے کا تجربہ۔ ''محبوب'' کو دو گھونسوں کے بل پر آپ کے تلوے چاٹنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔''
''شاید یہ آپ ہی لوگوں کا گھر ہے نیلوفر! ہی ہی......'' کھسیائی اور پھنسی ہوئی ہنسی کے ساتھ صبغہ نے سارا کریڈٹ ان ہی کے حوالے کیا۔
یہ لمبا چوڑا بورڈ ان ہی کے گھر کے ماتھے پر آویزاں تھا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اب۔
نیلوفر نے سکتہ زدہ انداز میں مسرت بانو کی ٹانگ پر ہاتھ مار کر انہیں جگایا۔
''اٹھیں امی! دیکھیں کیسا کارنامہ انجام دیا ہے ہمارے ''شوہروں'' نے......''
مسرت بانو ہڑبڑا کر اٹھی تھیں۔ دو منٹ ان کے حواس بحال ہونے میں لگے۔ گھر کو خوب اچھی طرح گھورا۔ مزید گھورا اور پھر دلدوز چیخ مارتے ہوئے بولیں۔
''میں صدقے، میں قربان...... ہائے شیخ جی تسی تے میرا نام روشن کر دتا ساریاں زنانیاں وچ۔ ہائے میں واری جاؤں۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی! یہ نام روشن نہیں ہوا۔ ڈوب گیا ہے، وہ بھی اندھے کنویں میں۔''
نیلوفر کا دل بھی ڈوبا۔ یک نا شد تین شد۔
''جانی...... تو تو ہے ہی کھسماں نو کھانی، ناشکری۔ تجھے کیا پتا کیسی ٹور بننے والی ہے ہماری محلے میں۔ یہ وڈی سی لائین لگی رہا کرے گی باری کے انتظار میں۔ ہائے! اپنے تو وارے نیارے ہی ہو گئے۔ میں چلی شیخ جی کے پاس۔ ہورے میری کسی مدد کی ضرورت ہو انہیں۔ تو بھی آجا، ضیغم کی خیر خبر لے۔ چل شاوا۔''
مسرت بانو سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اتریں اور تقریباً بھاگتی ہوئی گھر کے اندر جا گھسیں۔ مارے بے بسی کے نیلوفر کی آنکھیں بھر آئیں۔ ایک مصیبت سے جان ابھی چھوٹی نا تھی کہ دوسری سر پر تیار کھڑی ہوتی تھی۔ اس نے اسٹیئرنگ پر ماتھا ٹیکے نوید کو دیکھا اور پھر صبغہ کو۔
پھر تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
''نوید بھائی!'' نیلوفر کرلائی۔
''نوید!'' صبغہ کی دہائی۔
''کیا......کیا......نوید!''
بس میری ہی جان شکنجے میں ہے آئی۔
مجھے بخش دو تم اور تمہاری بھرجائی۔
میرے بس کا روگ نہیں تمہارا باپ اور بھائی!'
نوید دونوں ہاتھ اور چہرہ اوپر اٹھائے زچ ہونے کی انتہا پر تھے۔
''پلیز......! کچھ کریں......'' نیلوفر اور صبغہ کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔
نوید نے اسٹیئرنگ وہیل کے ہارن پر سر رکھ دیا تھا۔ ہارن کی چنگھاڑتی آواز اور ان دونوں کی منتیں ترلے سب گڈمڈ ہو رہے تھے۔ نوید کو لگا ان کی آنکھوں کے آگے نیلے پیلے ستارے، کہکشاں، بادل۔ سب دھمال ڈالنے کو زمین پر اتر آئے ہیں۔

الٹا چکر

ناظمہ زیدی

بیل کی آواز آئی تو سجی سنوری رانیہ جلدی سے باہر آئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکان تھی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے دل سے تیار ہوئی تھی اور کھانا بھی خوب دل لگا کر پکایا تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر دروازہ پہلے ہی کھولا جا چکا تھا۔ پانچ سالہ مناہل نے اس سے بھی پہلے دروازہ کھول دیا تھا۔

"السلام علیکم ماموں!"

"وعلیکم السلام!" مجاہد نے جواب دیا اور قدم زینے کی طرف بڑھا دیے۔ رانیہ دل مسوس کر رہ گئی۔ ساری تیاری خاک ہوئی اور گرما گرم کھانا ٹیبل پہ دھرا رہ گیا۔ وہ تھکے قدموں سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔

رانیہ کم عمر سی اور بھولی لڑکی تھی۔ وہ بیاہ کر آئی تو گھر میں سوائے ساس کے کوئی اور نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں مست رہنے والی لڑکی تھی۔ کبھی لوگوں کے رویوں پر غور نہ کیا۔ مگر اس کی شادی کے پندرہ بیس دن بعد ہی بڑی آپا (نند لڑ جھگڑ کر گھر آ بیٹھیں۔)

"اماں! اب میں نہیں جانے کی۔" ہر لڑکی کی طرح جذباتی ڈائیلاگ۔

اماں بھی خوب ان کا مقدمہ لڑیں۔ رانیہ نے بہترا سمجھایا آپا! چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ آپ اپنے گھر لوٹ جائیں۔ تین بچے ہیں آپ کے۔" مگر اس کی کیا حیثیت۔

خیر آناً فاناً اوپر والے پورشن کی تعمیر شروع ہو گئی۔ گھر کافی کھلا تھا۔ نند گورنمنٹ جاب کرتی تھیں اور سسر بھی کام کرتے تھے۔ سو پیسے کی تنگی نہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہی آپا مکمل ساز و سامان کے ساتھ یہاں سیٹ ہو گئیں۔ ان کے شوہر بھی چکر لگاتے تھے۔ ہر ویک اینڈ پہ چلے آتے۔ آپا اور بچوں کے چہرے کھل جاتے اور وہ بڑے ٹھسے سے ان کے ساتھ سیر پہ جاتیں مگر واپسی پہ ان کے میاں سرخ چہرے کے ساتھ لوٹتے۔ خدا جانے کیا ڈیمانڈیں تھیں جو پوری نہ ہوتی تھیں۔

خیر رانیہ کو ان کے رہنے سے یا یہاں شفٹ ہونے سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مسئلہ تھا اس کی پرائیویسی' اس کی پرسنل باتیں ساس نند جس کی بہ آواز بلند تشہیر کرتیں۔ رانیہ بہت جلد سمجھ گئی کہ اس کے شوہر پیٹ کے ہلکے ہیں' وہ کم بولنے لگی۔ مگر شوہر سے بھی بھلا کوئی بات چھپی رہ سکتی ہے جیسے دائی سے پیٹ......؟؟؟

اب وہ بتاتی تو گویا خاندان بھر کو خبر ہوتی اور نہ بتاتی تو جی شوہر کی نافرمان ہے۔ ''لعنت برستی ہے ایسی عورتوں پر۔''

''اور جو خود لعنت کا سامان گھر میں لیے بیٹھی تھیں۔'' یہ فقرہ اس کی نوک زبان پر آ ہی گیا۔ آخر کب تک برداشت کرتی۔ انسان ہی تھی ناں جانور تو نہیں اور بھیا سچ بات تو یہ ہے کہ جانور بھی احتجاج کرتے ہی ہیں۔ چیونٹی کو بھی پیر کے نیچے مسلو گے تو وہ کاٹے گی ہی......

مسئلے تو خیر بہت تھے جو آپا کی آمد کے ساتھ شروع ہوئے۔ رانیہ نے نمازیں' وظیفے بڑھا دیے تو ساس نے اور تیز کی تسبیح۔ ارے بھئی نہ جانے کی۔ بھلا بیٹی چلی گئی تو ان کا کون تھا۔

رانیہ پر یہ عقدہ اب کھلا کہ نند صاحبہ صرف چھٹیوں میں ہی سسرال کو رونق بخشتی تھیں۔ ایسے میں اگر رانیہ کی بات بے بات پکڑ نہ ہوتی تو خیر تھی۔ اس کے میاں نے چھٹیاں لیں ہنی مون پر جانے کے لیے۔ رانیہ بے حد خوش تھی کہ کبھی پہاڑ نہ دیکھے تھے۔ سارا دن اندر گھس کر پیکنگ کی۔ جلدی جلدی بس میں چڑھی اور شیشے کی طرف بیٹھ گئی۔ جھٹ شیشہ کھولا اور تازہ ہوا اندر اتاری۔

''آہ آزادی کا سانس پندرہ دن کے لیے۔''

''دلہن شیشہ بند کرو، گڈو کو رات سے کھانسی ہے۔'' اس نے رخ موڑا تو حواسوں پر حقیقتاً بجلی گری۔ آپا ساتھ والی سیٹ پر براجمان' میاں بھی دوسری طرف کی دو سیٹوں پر بڑے دونوں بچوں کو سنبھالے بیٹھے۔ نہ کوئی ہنی رہا نہ مون، زہر کا پیالہ تھا جو وہ پیتی رہی اور مسکراتی رہی۔ (مروتاً)۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ نندوئی جی کے چکر کم ہوتے گئے اور رانیہ کی سزا بڑھتی چلی گئی۔ دو بیٹے پیدا کر کے بھی وہ اپنے میاں کی من بھائی نہ ہوئی، رانیہ کی حالت خستہ ہوئی تو گھر کی خستہ تر۔ اوپر والا پورشن سجتا چلا گیا۔

خاندان بھر کی محفلیں اوپر لگتیں، ہنسی ٹھٹھوں کی آواز آتی' نیچے رانیہ کڑھتی رہتی۔ اول تو کہیں جانا ہی نہ ہوتا، کہیں جاتے بھی تو آپا کے تینوں بچوں میں سے کوئی نہ کوئی ساتھ۔ اب ایسے میں کیا بات ہوتی۔ رانیہ تنگ آ گئی تھی۔

ایک دن اس نے آپا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے کہ آپا خدا کے لیے نہ اپنا گھر برباد کریں اور نہ میرا۔ آپ کے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اپنے گھر کو لوٹ جائیں۔

بس اس کا یہ کہنا غضب ہو گیا۔

''آج میں نے تجھے گھر سے نہ نکلوایا تو کہنا۔''

آپا نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ دروازہ چھوٹے بھیا کے آنے پر ہی کھلا۔ پریشان حال آپا، سرخ سوجی ہوئی آنکھیں۔ مجاہد' رانیہ پر چڑھ دوڑا۔

''تم نے آپا کے شوہر کو فون کیا تھا۔''

''جی کیا تھا۔'' رانیہ نے سچ جواب دیا مجاہد کو توقع نہ تھی۔

''میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا رانیہ، اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

''ارے بلا اس کے بھائی کو اور دے طلاق۔''

ساس کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ مگر رانیہ نے اس کی نوبت نہ آنے دی۔ اپنا بیگ پیک کیا اور بچے لے کر گھر سے نکل گئی۔ مجاہد کا غصہ اترا تو گھر واپس آیا۔ دیکھا تو رانیہ غائب۔ اسے تشویش ہوئی۔ اسے بیوی سے محبت تو تھی، بس ماں اور بڑی بہن کے حقوق سامنے آ جاتے۔ ماں سے پوچھا تو ''رہنے دے چار دن بھائی کے گھر، عقل ٹھکانے آ جائے گی۔''

ایک ہی بھائی تھا دیہاڑی دار مزدور۔ پانچ بچوں کا باپ، خود کھاتا کہ رانیہ کے خرچے پورے کرتا۔ مجاہد نے ایک دن فون کیا تو وہ رانیہ کے بارے میں لاعلم تھا۔

مجاہد از حد پریشان تھا۔ ''کہاں گئی بچوں کو لے کر۔''

آپا نے ہاتھ جھاڑے۔ ''خس کم جہاں پاک۔''
رانیہ کا پتہ صاف ہوا تو اوپر نیچے کا پورشن ایک ہو گیا۔ مجاہد ایک دن اپنے کاغذات ٹھیک کر رہا تھا کہ اسے یہ پرچا ملا جس پہ رانیہ کے ہاتھ کی تحریر تھی۔
''مجاہد! میں نے ہمیشہ اس گھر میں زیادتیاں برداشت کیں، آپا کی جلی کٹی سنی۔ مگر میں آپ کا بدلا ہوا چہرہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ نے میرے کردار پر شک کیا۔ آپ مجھے طلاق دینے کی بات کر رہے تھے تو سن لیجیے۔ یہ کبھی نہ ہو گا۔ پہلا خواب ان آنکھوں نے آپ کا ہی دیکھا اور بند ہوتے سے بھی ان میں آپ کی شبیہہ ہو گی۔''
رانیہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اپنی کسی دوست کے پاس رہ کر نوکری کر رہی ہے۔ مگر اماں اور آپا نے یہ بات مجاہد سے چھپائے رکھی۔
☆☆☆
وقت کا پہیہ چلتا گیا۔ گزرتے وقت نے مجاہد کو رانیہ کی کمی محسوس ہونے نہ دی۔ اس کے بیٹوں کی محبت بڑے آرام سے بھانجے بھانجی کے حصے میں آ گئی۔ اماں اور آپا نے رانیہ کو نندوئی کے ساتھ جی بھر کے بدنام کیا۔ جس کے نتیجے میں مجاہد کا دل رانیہ سے سخت ہوتا گیا۔ وقت اور سرکا تو آپا نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر دی۔ مجاہد کا کمرہ معاذ کو دے دیا گیا۔ مجاہد ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ دلہن بیاہ کر گھر آئی تو آپا نے وہی رویہ روا رکھا جو رانیہ کے ساتھ تھا۔ مجاہد نے دبے لفظوں میں دو ایک بار ذکر کیا تو آپا نے ڈپٹ کر چپ کرا دیا اور جب وہ رانیہ کا مقدمہ ہی نہ لڑ سکا تو بھلا آپا کی بہو کا کیسے لڑتا؟؟؟
☆☆☆
معاذ اور دلہن کسی دعوت پر مدعو تھے۔ انہوں نے رسماً بھی اماں کو شرکت کی دعوت نہ دی تھی۔ معاذ تیار ہو کر باہر آیا تو دیکھا کہ اس کے بیوی کے ہاتھ میں زیور کے نام پر کچھ بھی نہیں۔
''ارے تمہارے میکے میں دعوت ہے۔ کوئی زیور تو پہنو۔'' معاذ نے کہا۔
''وہ زیور تو سارا اماں نے لے لیا۔'' اس نے جواب دیا۔
''اماں! اس کا زیور دیں۔'' معاذ نے ماں کو مخاطب کیا۔
''ارے میں کیا کھا جاؤں گی جو دل چاہے لے لے۔'' بڑی آپا نے جلدی سے صفائی پیش کی۔
''بس اماں! رہنے دیں آپ۔'' معاذ تو جیسے پھٹ پڑا۔ ''سب جانتا ہوں میں اور سب دیکھ رہا ہوں مگر مجھے ماموں سمجھنے کی غلطی ہرگز مت کیجیے گا۔ اتنا کانوں کا کچا اور عقل کا اندھا نہیں ہوں۔''
''آئے ہائے یہ دن بھی آنے تھے اس چار دن کی آئی نے اپنی طرف کر لیا۔'' آپا حسب عادت اور حسب دستور بلیک میلنگ پر اتر آئیں۔
''ارے کون نہیں جانتا اس چنڈال نے کیسے تیرے باپ کو ورغلایا اور ہم سے جدا کیا۔'' آپا نے باقاعدہ ہاتھ مسلے۔
''رہنے دیں اماں!'' معاذ کی مسکراہٹ طنزیہ تھی۔ ''کوئی جانتا ہو نہ جانتا ہو۔ میں سارے قصے کا چشم دید گواہ ہوں ممانی نے فون آپ کے کہنے پر کیا تھا، آپ کی صلح کروانے کے لیے اور آپ نے اس کو بھی ان کا قصور بنا ڈالا۔ میں اتنا بڑا تو نہ تھا کہ ممانی کی سائڈ لیتا مگر دل میں آپ سے خائف ضرور ہو گیا تھا۔ ماں اور بہن کے حقوق اپنی جگہ مگر میں کبھی کسی کے لیے اپنا گھر نہیں اجاڑوں گا۔
اور ہاں۔''
معاذ نے اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ جو منا ہل دو ماہ سے آپ کی شہہ پر گھر بیٹھی ہے ناں جلدی اسے چلتا کریں ورنہ ہم نے کرائے کا گھر دیکھ لیا ہے۔''
اپنے کمرے میں لیٹے مجاہد کی آنکھوں سے کون کون سے پردے تھے جو ہٹ رہے تھے۔ وقت کا الٹا چکر شروع ہو گیا تھا۔ وہی چکر جو رانیہ کو نیچے اور آپا کو اوپر لے گیا تھا اسی چکر نے آپا کو عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔
☆

فرح بخاری

بن پاکھی

دھرمیشور کلکتہ کا مشہور رئیس، بظاہر مویشیوں کا بیوپاری ہے لیکن درپردہ وہ سندر بن سے لائے نایاب جانوروں کی بیرون ملک اسمگلنگ کا کام، ابوصالح کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ بنگلہ دیشی ابوصالح کا فشری کا قانونی کاروبار ہے اور صمیم طالب اس کا بزنس پارٹنر ہے لیکن دونمبر دھندے میں ابوصالح دھرمیشور کا ساتھی ہے۔

ایک چھاپے میں دھرمیشور، ابوصالح کو پھنسوا دیتا ہے تو وہ انتقاماً اپنے بھروسے کے آدمی رافع محمد کے ذریعے اس کی بیٹی ویملا کو اغوا کرالیتا ہے۔ ویملا اپنی سوتیلی ماں سے تنگ ہے اور اس اغوا میں، اس کی رضامندی بھی شامل ہے۔ دونوں کے درمیان تاوان کی رقم آدھی آدھی بانٹنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر ابوصالح، دھرمیشور سے ڈیل کرکے خود کو دھوکے سے پھنسائے گئے معاملے سے بری کروالیتا ہے۔

وہ رافع، دھرمیشور اور ویملا تینوں کو فریب دے رہا ہے اور تینوں ہی ابوصالح کی بدنیتی سے بے خبر ہیں۔ رافع، ویملا کو منصوبے کے مطابق دوسرے آدمیوں کے حوالے کردیتا ہے مگر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے وہ پتا چلالیتا ہے کہ ویملا ان کے قبضے میں نہیں، وہ اسے جنگل میں بے ہوشی کی حالت میں ملتی ہے۔

دوسری قسط

مکمل ناول

اور جلد ہی وہ جھاڑیوں شاخوں اور درختوں والی جگہ سے نکل کر ایک نسبتاً کھلی جگہ پر آ گیا تھا۔ اُسے آس پاس کسی بستی کی امید تھی لیکن وہ کھلی جگہ جنگلی جانوروں کی چراگاہ جیسی تو تھی پر کھیت نہ تھے۔ نہ ہی کھلی جگہ کے پار کہیں کوئی گھر دکھائی دیتا تھا۔ وہ چونکہ ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اب اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ پانی سے وہ کتنا دور ہے اور اس کی ناؤ یہاں سے کس سمت میں اور کتنے فاصلے پر ہے لیکن فی الحال ویملا کے ہوش میں آنے تک اسے یہیں رُک کے رہنا تھا۔

تیر کمان والا بیگ نیچے رکھ کر ویملا کا سر اُس نے اسی پر ٹکا دیا۔ کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالتے وہ روشنی کے کسی چھوٹے سے نقطے کی تلاش میں تھا۔ ویملا کی حالت دیکھتے وہ اسے جلد از جلد کسی بستی میں لے جانا چاہتا تھا۔ جانے وہ دوا اثر کر رہی تھی یا نہیں۔ اسے فوری مزید طبی امداد کی ضرورت تھی، اگر بستی کہیں آس پاس نہیں تھی تو دوسرا راستہ کسی طرح اپنی کشتی تک پہنچنے کا تھا۔ لیکن کشتی وہاں سے بہت دور تھی اور ویملا یہاں اکیلی۔ بے چینی سے لبوں کو کاٹتے وہ اس کی حالت دیکھنے دوبارہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''کیا بک رہے ہو اعظم!'' ابو صالح سامنے کھڑے تمیزل اور اعظم پر برس رہا تھا جو ویملا کو ویرانے میں چھوڑ کر آنا فاناً اُس سے آ ملے تھے۔

''صوب! آپ نے کہا تھا لڑکی کو کہیں بھی ویرانے میں چھوڑ کر نکل آنا۔'' اعظم اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے ابو صالح کے غصے کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

''رافع کو کیوں بتایا لڑکی کے بھاگ نکلنے کا اور...... اور تم لوگوں نے رافع کی کال اٹینڈ ہی کیوں کی۔ اب وہ ہر قیمت پر لڑکی کو ڈھونڈ نکالے گا۔'' ابو صالح کا بس نہیں چل رہا تھا سامنے کھڑے دونوں منحوسوں کا قتل کر دیتا۔ لڑکی ایک بار پھر رافع کے قبضے میں جانے والی تھی۔ یعنی رافع سے اسے دور کرنے کا مشن فیل ہو چکا تھا اور اب اگر اُسے لڑکی مل گئی تو وہ ضرور اُسے اپنے گاؤں لے جائے گا کیونکہ جہاں اعظم اور تمیزل نے لڑکی کو چھوڑا وہاں سے رافع کا گاؤں قریب پڑتا تھا اور یہی قرینِ قیاس تھا۔

''چلو جاؤ یہاں سے۔'' اُن دونوں کو نکال باہر کرتے ابو صالح نے ایک نمبر ملایا۔

''ایک ضروری کام آن پڑا ہے ہاشم!''

''کہو ابو صالح!'' ہاشم نصر کو اس کے لہجے کی کمزوری اس لمحے بڑی تشویش ناک لگی تھی۔

''یار! وہ لڑکا ہے ناں رافع محمد! وہ ایک لڑکی کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا ہے۔''

''آں۔ ہاں ہاں۔'' ہاشم کا دماغ ایک دم چوکنا ہوا۔ رافع کو بھلا وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ دھنی، الفت اور راجو کی شکایت پر جسے ایک سال پہلے علاقے سے نکلوایا تھا۔ وہ جانوروں کا رکھوالا، جوان کے غیر قانونی کاموں کے آڑے آ رہا تھا۔

''وہ گاؤں واپس کیوں آ رہا ہے۔ اس کی ماں نے تو واپس ادھر منہ نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔''

''اس کی ماں کو کچھ پتا نہیں۔ فی الحال وہ ایک لڑکی کے ساتھ ہے اور سنو! وہ لڑکی ہمارا مال ہے۔ اُس کے پیچھے پولیس بھی لگی ہے۔ انڈیا سے آئی ہے بنا پیپرز کے۔'' ابو صالح نے دھیرے دھیرے سارا معاملہ ہاشم کو بتانا شروع کیا۔

''ہوں، تو اب؟'' بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُسے بس اب اتنا جاننا تھا کہ ابو صالح کو کیسی مدد چاہیے تھی۔

''مجھے لگتا ہے، رافع نے لڑکی کو ڈھونڈ نکالا تو ضرور پہلے گاؤں جائے گا کیونکہ قریب اور کوئی بڑا گاؤں نہیں ہے اور مجھے اب لڑکی کو کسی طرح رافع سے الگ کرنا ہے بلکہ......'' ابو صالح نے کچھ دیر رُک کر سوچا۔ ''مجھے صرف لڑکی چاہیے کیونکہ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو صاف میرا نام لے دے گی۔ تم ایسا کرو، لڑکی کو شرن کھولا سے نکال کر کسی طرح مونگلا بھجوا دو۔ وہاں سے میرے آدمی کسی طرح اُسے بارڈر پار کرا دیں گے۔ اب اس کا بنگلہ دیش میں رہنا

میرے لیے مصیبت بن رہا ہے۔"

"اور رافع؟"

"جس نے تمہارے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اُسے سزا نہیں دینا چاہو گے۔" ابوصالح پہلی مرتبہ مسکرایا تو بات ہاشم کی سمجھ میں بھی آسانی سے آ گئی۔

"یوں کہو لڑکی سے زیادہ اب یہ رافع تمہارے لیے مصیبت بن رہا ہے۔" ہاشم نے اس بار کھل کر ابوصالح کا مضحکہ اُڑایا۔ جواباً وہ بھی بنا برا مانے ہنس پڑا تھا۔

"ماردو سالے کو۔ تمہارا کام بھی آسان ہو جائے گا۔"

"ہوم۔ مجھے دھنی سے بات کرنے دو، فی الحال یہ تمہارا اندازہ ہے کہ وہ گاؤں آئے گا۔ مجھے ذرا اپنے بندوں کے ذمے لگانے دو۔" ہاشم نے اس مرتبہ اجازت لے لی اور ابوصالح پیشانی کو انگلی سے مسلتے آنکھیں موند کر آرام کرسی پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

"ویملا...... اے ویملا......" وہ ہولے ہولے اس کے رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ اس کے پاس تو اتنا پانی بھی نہیں تھا کہ دو چھینٹے ہی ویملا کے چہرے پر مار سکتا۔ آستین ہٹا کر رافع نے دھبوں کو دیکھا۔ وہ دھبے تو موجود تھے جن پر رافع نے لیپ لگایا تھا لیکن اس کے علاوہ کہیں مزید کوئی نشان نمودار نہیں ہوا تھا۔ اُمید کی جا سکتی تھی کہ زہر بجائے مزید پھیلنے کے دوا نے کھینچ ڈالا ہو۔

"ویملا......" اُس نے جگانے کی کوشش جاری رکھی۔ اس مرتبہ ویملا نے ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

"ہوش میں آؤ ویملا! دوا سے تمہاری طبیعت سنبھلے گی۔" وہ زبردستی اسے سہارا دے کر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ زہر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اثر کے دوران مریض کا سو جانا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اب ویملا کے جسم میں کیسا زہر پھیلا تھا، یہ تو رافع سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن اسے ہوش میں رکھنے کی تدبیر تو کر سکتا تھا۔ سہارے سے بیٹھی ویملا نے اب خود کو سنبھال کر اپنے حواس یکجا کرنے کی کوشش کی تھی۔ رافع نے اپنا ہاتھ اس کی پشت پر سے ہٹا لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ خود کس حد تک پہلے سے بہتر ہوئی ہے۔

"اب کیسا لگ رہا ہے ویملا؟ کیا کہیں درد بھی محسوس ہو رہا ہے۔"

"اب نہیں۔" سرنفی میں ہلاتے اب وہ آستین ہٹا کر آپ اپنے دھبوں کو دیکھ رہی تھی۔

"سوری میرے پاس صاف پانی بھی نہیں ہے۔ شاید تمہیں پیاس لگی ہو۔"

"کوئی بات نہیں۔" دھیمے لہجے میں کہتے وہ ابھی بھی اپنے ہاتھوں پیروں کے نشان جانچ رہی تھی۔

"کس چیز نے کاٹا تھا تمہیں؟ کیا تم نے دیکھا۔"

"کوئی پانی کا جانور تھا۔" وہ قدرے سست لیکن مکمل آرام دہ حالت میں آتے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔ چادر اُس نے شانوں پر لی تھی کیونکہ مچھر ایک بار پھر کانوں میں بھنبھنانے لگا تھا۔

"مجھے تو چھپکلی جیسی کوئی چیز لگی پر اس کی شکل ذرا الگ تھی۔"

"ہاں وہ مونیٹر لیزرڈ ہو شاید......"

"پیچھے کیچڑ جیسے پانیوں میں وہ پھیلے ہوئے تھے بے شمار اور اَن گنت، میں بھاگ رہی تھی اور مچھر، کیڑے مکوڑے اور ایسی چیزیں مجھے چپکتی جا رہی تھیں۔"

"تم کیوں بھاگیں ویملا! اور کیسے؟" رافع نے اندر سے اُبھرتا سوال پوچھ ہی لیا۔ "تم لوگ تو لانچ پر تھے پھر خشکی پر؟"

"ہاں ہم یاٹ میں ہی تھے۔ ان آدمیوں نے پانی کا چوڑا پاٹ چھوڑ کر سب سے آخر والی تیسری ندی کی طرف یاٹ کو موڑا۔ اُن دونوں کے ارادے اور نیت تو میں لانچ میں بیٹھتے ہی بھانپ گئی تھی۔ وہ

دونوں بار بار مجھے لانچ کے نیچے والے کمرے میں جانے کو کہہ رہے تھے اور وہاں میں ہرگز نہیں جانا چاہتی تھی۔ ایک بار میں اندر کے کمرے میں چلی جاتی تو یہ باہر سے بند کر کے مجھے بالکل ہی قید کر دیتے۔
میں ان سنی کر کے ڈھٹائی سے وہیں کھلے ڈیک پر بیٹھی رہی۔ ایک کو ذرا زیادہ غصہ آیا تو وہ بازو سے کھینچ کر مجھے زبردستی اندر لے جانے لگا۔ بھاگیے (نصیب) نے میرا ساتھ دیا اور اسی وقت سامنے سے ایک مسافر بوٹ آتی دکھائی دی۔ پرانی سی اس بوٹ میں ڈھیر سارے لوگ بھرے تھے۔
انہیں دیکھ کر میں نے ہیلپ ہیلپ چلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی بوٹ قریب کر کے شور مچا دیا۔ ہمارے ڈرائیور نے جب یہ دیکھا تو یاٹ کو تیزی سے بھگا لے گیا۔ میں نے بوٹ والوں سے چلا کر کہا کہ کال پولیس۔ اب معلوم نہیں انہوں نے کچھ کیا یا نہیں پر ہمارے ڈرائیور نے یاٹ کنارے پر روک دی اور مجھے لے کر بھاگنے لگے۔ شاید وہ پولیس بوٹ سے ڈر رہے تھے۔ میں تو آپ یہی پرارتھنا کر رہی تھی کہ کسی طرح ہم خشکی پر آئیں اور میں کہیں بھاگ سکوں۔ میں ان سے ہاتھ چھڑا کر دوڑنے لگی۔ وہاں جنگل بہت گھنا تھا۔ مجھے بچتے بچاتے دور نکل بھاگنے میں بہت مدد ملی لیکن اندھیرا بڑھ رہا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سے تو بچ نکلی آگے کیا ہوگا۔''
ویملا سر جھکائے اب آرام دہ حالت میں بیٹھی خود ہی اسے تمام تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔ دھیان سے اس کی باتیں سنتے اور انہماک سے اس کی جانب دیکھتے رافع نے اس کی تکلیف پوری شدت سے اپنے دل پر محسوس کی تھی۔ ہاں لیکن یہ سن کر ایک گونہ سکون بھی محسوس کیا تھا کہ ویملا کی عزت محفوظ رہی تھی۔ ورنہ اعظم اور تمیزل کی نیت تو ویسی ہی نکلی تھی جیسا رافع کو وہم اٹھا تھا۔
''آئی ایم سوری!'' آہستگی سے جواباً وہ بس یہی کہہ پایا۔ ویملا بنا تبصرہ کیے دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔
''تمہارا نام رافع ہے؟'' وہ پھر ہلکا سا مسکرائی اور رافع کے بند دماغ کی کوئی کھڑکی پہلی بار کھلی تو ویملا اب تک اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔
''ہاں!''
''جنگل میں بھٹکتے، اندھیرے اور تنہائی میں گھبراتے اپنی سہایتا (مدد) کے لیے میں تمہیں پکارنا چاہتی تھی، تمہیں آواز دینا چاہتی تھی، پر ہر بار ہی میری زبان کھلتے کھلتے بیچ میں رک جاتی کہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تمہارا نام۔'' اس کی آواز جانے کیا یاد کر کے بھرا سی گئی۔ بات بھی پوری نہیں کر پائی اور چہرا ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔
رافع کا تو پہلے ہی گزرے چند گھنٹوں میں طرح طرح کے خدشات نے حال برا کر رکھا تھا۔ آنکھوں میں نمی چھپائے، کرب سے لب کاٹتے وہ ایک لفظ بھی تسلی کا بول نہیں پایا۔ بھیگی آنکھوں سے وہ اسے دیکھتا جاتا اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا کہ وہ ٹھیک ٹھاک تھی اور ان دو حیوان نما انسانوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی تھی۔
''تمہیں تمہارے ساتھیوں نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟''
ویملا نے بھیگے لہجے پر قابو پاتے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں اور رافع اس کے جملے پر بری طرح چونکا۔ ویملا کے ایک ہی جملے نے ایک دم اپنی اوقات یاد دلائی اور وہ چپ سا کن بیٹھا رہ گیا۔ وہ اعظم اور تمیزل کو اس کا ساتھی کہہ رہی تھی اور غلط بھی کہاں تھی۔ بظاہر تو وہ ان ہی کا ہی ساتھی تھا۔ ہاں بس اتنے یقین کے ساتھ ضرور اسے پکارا گیا تھا کہ وہ اسے اپنی عزت کا دشمن نہیں سمجھتی تھی۔
''وہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔'' رافع کے لہجے میں صاف کھردرا پن آیا تھا۔ ویملا استہزائیہ ہنسی۔
''تم نے مجھے اپنی مرضی سے ان کے حوالے کیا تھا۔
''میں اس کے لیے سوری کر چکا ہوں۔ میں

نہیں جانتا تھا، وہ ایسے نکلیں گے۔"
"جانے میں کبھی اپنے گھر جا پاؤں گی؟"
عجیب حسرت تھی ویملا کے لہجے میں، رافع کا دل چاہا کہہ دے کہ آج تم اپنے ہی کھودے گڑھے میں گری ہو۔ ایک دوسرے کو ڈھونڈ لینے کے سارے سحر کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ تو صفر تھی اس کے لیے جب سے اس کے متعلق یہ جانا تھا کہ وہ چند روپوں کے عوض خود اپنے آپ کو داؤ پر لگانے سے باز نہیں آئی تھی۔ ہاں پر شام سے ہی اس کی تلاش میں دیوانوں کے سے انداز میں اس کو کھوج لینے کی چاہ اور وہ جنون خود رافع بھی جاننے سے قاصر تھا کہ کیا نام دے اُس جذبے کو..... اور...... اور نہ ہی دے تو اچھا ہے۔ وہ سر جھٹک کر اپنے خیالات کی نفی کرنے لگا۔ شاید وہ کبھی اپنی ذات کو ایسے مشکل سوال و جواب کے کٹہرے میں نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا۔
اگر تم ٹھیک ہو تو ہمیں اپنی کشتی تک پہنچنا ہے۔ یہ چراگاہ ٹائیگرز کے لیے مشہور ہے۔ یہاں بیٹھے رہے تب بھی صبح تک جاگ کر وقت کاٹنا پڑے گا۔ کیوں نہ اپنی کشتی تک پہنچ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔"
"مجھے بہت شدت کی پیاس لگی ہے۔"
"میرا بھی یہی حال ہے۔ لیکن پانی ملنا یہاں بہت مشکل ہے۔ تم ہمت کرو اٹھنے کی۔ ہم واپسی کے لیے کوئی آسان راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ کشتی ذرا سی بھی قریب ہوتی تو میں تمہیں یہاں چھوڑنے کا رسک لے لیتا لیکن وہ جگہ کافی دور ہے۔"
"چلو۔" ویملا نے کھڑے ہو کر چادر اپنے گرد لپیٹی تاکہ مچھروں وغیرہ سے کسی حد تک بچاؤ کیا جاسکے۔ رافع نے چراگاہ کے کنارے کنارے سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ بادلوں میں ہلکی گھن گرج کا آغاز ہوا تھا۔
"تمہارا سامان؟" اپنا شکاری تھیلا کندھے پر ڈالتے رافع کو ویملا کا ہینڈ بیگ یاد آیا۔
"وہیں لانچ میں رہ گیا سب کچھ۔" وہ ٹارچ کی روشنی میں ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ چراگاہ چھوڑ کر رافع نے گھنے جنگل میں قدم رکھ دیا تھا کیونکہ بہرحال انہوں نے پانی کی طرف بڑھنا تھا۔ کہیں سائیکلون سے متاثرہ ٹوٹے پھوٹے درختوں کے انبار تھے تو اچانک کہیں پانی سامنے آجاتا۔ دریا کی لہروں کا شور سنائی دینے لگتا تو ان کے لیے اطمینان بخش ہوتا لیکن ابھی شاید وہ دریا سے دور تھے۔
رافع کو چلتے چلتے اچانک کسی تیسرے ذی روح کی قریب کہیں موجودگی کے احساس نے رکنے پر مجبور کیا۔ ویملا کو اس نے بازو سے پکڑ کر ایک جگہ پہ ساکن کیا۔ بولنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں کے قدم یک لخت رکے، اس کے باوجود کسی حرکت کی آواز ابھی بھی آس پاس موجود تھی۔ جھاڑیوں سے پیچھے کچھ تھا۔
"باگھ۔" رافع نے ویملا کی کلائی پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے اس کے کان میں سرگوشی کی اور وہ پوری جان سے ہل کر رہ گئی تھی۔ رافع نے آس پاس کے درختوں کو ایک نظر دیکھا۔ باگھ سے بچنے کے لیے ویملا کو درخت پر چڑھنے کا کہتا لیکن اُس میں کچھ اور خطرہ تھا۔ درختوں سے لپٹے شاخوں اور پتوں کے ہم رنگ زہریلے سانپ پہلی نظر میں تو دکھائی بھی نہیں دیتے تھے۔ ویملا بے چاری تو ابھی بھی زہریلے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے سے لڑ رہی تھی۔
"تم یہیں رُکو ویملا!" اس نے ویملا کو بنا سنبھلنے کا موقع دیے آرڈر دیا اور اکیلا آگے بڑھنے لگا۔
"اور تم۔" وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
رافع نے منہ پہ انگلی رکھ کے اسے بولنے سے منع کیا اور بندوق کندھے پہ ڈال کر آگے بڑھنے لگا۔ ویملا اسے جانے سے باز رکھنا چاہتی تھی پر بولنے سے منع کر کے وہ اسے مزید پابند کر گیا تھا۔ جانے ٹائیگر کہاں تھا اور وہ۔ اب تو وہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ویملا کو اُس کے انتظار میں کچھ بیس منٹ سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ پریشانی اور ایک ہی حالت میں کھڑے رہنے کی تھکاوٹ سے اس کا جسم اکڑنے لگا

تھا۔ رافع کے اتنی دیر بعد بھی واپس نہ آنے پر اب اس کی تشویش بڑھنے لگی تھی۔ نہ گولی کی آواز آئی تھی۔ نہ رافع کے تیر چلانے سے شیر کی دھاڑ ہی سنائی دی تھی۔ جانے کہاں چلا گیا تھا وہ۔ ویملا کے لیے مزید وہاں رُکے رہنا دشوار ہو چکا تھا۔ رافع کو ڈھونڈ لینے کی خواہش میں وہ خود ہی آگے بڑھنے لگی۔ ٹائیگر کے آس پاس کہیں ہونے کے خوف نے اسے آواز بھی حلق سے نکالنے نہیں دی۔ وہ ماتھے کا پسینہ پونچھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ جس سمت میں رافع غائب ہوا تھا وہاں آکر سامنے دکھائی دیتے راستے پر چلنے لگی، اب جانے وہ صحیح کر رہی تھی یا غلط۔ پر آگے بڑھنا شاید ناگزیر تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اسے گھاٹ تک جانا تھا اور اس کی تو ایک ہی سمت تھی۔ گھاٹ پر پہنچ کر رافع اور اس کی کشتی کو وہ ڈھونڈ ہی لیتی۔ دور تک نظر آتے کنارے پر ایک دوسرے کو تلاش کر لینا آسان تھا بہر حال۔

قریب کہیں پانی میں حرکت جیسی آواز ہوئی تو ویملا ٹھٹھک کر رکی۔

پانی؟ کیا وہ دریا کے نزدیک ہے۔ پر ایسا کیسے ہوسکتا تھا اور آواز بھی دریا کے شور جیسی نہ تھی۔ پانی میں کچھ گرنے کی آواز تھی یا وہ حیران حیران سی آواز کی سمت بڑھی۔ آگے کیچڑ زدہ جگہیں تھیں، کہیں کہیں کائی اور خشکی بھی تھی۔ خشکی پر قدم رکھتی وہ آواز کے تعاقب میں جھاڑیوں کو ہٹاتی اچانک جہاں آنکلی تھی وہ تو......

رافع!'' ویملا کی چیخ نے درختوں پہ سوئے پرندوں کو اُڑا ڈالا۔ وہ پانی نہیں بلکہ دلدلی کیچڑ کی آواز تھی۔ وہ دلدل جس میں رافع کمر تک پھنسا دھیرے دھیرے نیچے غائب ہو رہا تھا۔

''رافع...... رافع......'' وہ بے تحاشا چیختی اس کی طرف پاگلوں کے انداز میں بڑھی تھی جیسے ہاتھ بڑھا کر بچا لے گی۔ لیکن کنارے کی کیچڑ میں دھنستے پہلے قدم نے ہی بتا دیا کہ رافع پر کیا بیت رہی تھی۔ جسے وہ ایک قدم سمجھ رہی تھی وہ اس کی آدھی ٹانگ اندر کھینچ گیا تھا اور رافع تو عین درمیان میں پھنسا تھا۔

ویملا نے ٹانگ واپس کھینچتے فوراً گلے سے چادر نکال کر اس کی طرف پھینکی، پر وہ رافع تک پہنچنے سے پہلے ہی کیچڑ پہ گر گیا۔ ویملا نے چادر واپس کھینچ کر پھر وہی عمل دہرایا، لیکن بے سود۔ رافع کا اس سے فاصلہ قریب تین میٹر سے بھی کچھ زیادہ کا تھا۔ ویملا نے کچھ پیچھے کئی درخت کے تنے اور شاخیں گری ہوئی دیکھی تھیں۔ جلدی سے بھاگ کر وہ ایک لمبی شاخ اٹھا لائی۔

''یہ لو رافع! اسے پکڑنے کی کوشش کرو۔'' ویملا نے مضبوط بیل جیسی اس شاخ کو آگے پھینکا۔ رافع نے ہاتھ بڑھا کر اس کا دوسرا سرا پکڑ لیا۔ ویملا نے پیچھے کو ہٹتے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن بہت زور لگانے پر بھی شاید وہ کچھ انچ آگے کھسکا ہو۔ ویملا نے ہار نہ مانتے کوشش جاری رکھی لیکن رافع کو اپنی جانب کھینچنے کی کوشش میں وہ اسے تھوڑا اور نیچے دھنسا بیٹھی تھی۔ اب سے پہلے اگر وہ کمر تک دلدل میں پھنسا تھا تو اب وہ سینے تک نیچے چلا گیا تھا۔ یعنی سائیڈ کی طرف کھینچنا زیادہ سودمند نہ تھا۔ کیونکہ بہر حال یہ عام پانی نہیں بلکہ دلدل تھی جو صرف نیچے ہی نیچے کھینچتا جاتی تھی۔

''کچھ بولو رافع! میں کیا کروں۔'' وہ اب رو دینے کو تھی۔ رفتہ رفتہ نیچے جاتا رافع کا جسم ویملا کی جان نکال رہا تھا اور وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے ہر قیمت پر رافع کو بچانا تھا۔ اوپر سے رافع کی نہ سمجھ میں آنے والی خاموشی کا بھی سامنا تھا۔ نہ وہ زور لگا رہا تھا، نہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ویملا کو ہر خطرے سے با آسانی نکال لے جانے والے کا اپنے بارے میں ایسا رویہ کیوں تھا۔

اور سینے سے معاملہ اب گردن کی اور جانے لگا تھا۔ ویملا کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ منہ پہ ہاتھ رکھے وہ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ نظر مخالف سمت والے ایک درخت پر پڑی جو عین دلدل

کے اوپر کافی آگے کو جھکا ہوا تھا۔ کسی طرح اگر رافع اس کی کسی شاخ کو پکڑ لیتا۔ رافع نے اپنے دونوں بازو اگرچہ پہلے ہی اوپر کر رکھے تھے لیکن شاخ بہرحال بہت اونچی تھی۔ کسی طرح وہ اس شاخ کو نیچے جھکا سکتی لیکن درخت اسکی مخالف سمت میں تھا اور...... ویملا نے ہاتھ میں پکڑی اس جنگلی مضبوط بیل کو دیکھا۔ ایک لپکا سا کوندا دماغ میں اور اس نے فوراً ہی عمل پیرا ہوتے بیل کو گھما کر درخت کی طرف پھینکا۔ بیل درخت تک پہنچی تو ضرور لیکن بس چھو کر نیچے گر گئی۔ اس نے ہمت نہ ہارتے دوبارہ یہی عمل زیادہ طاقت سے دہرایا۔ اس بار بھی بیل درخت سے ٹکرا کر رافع پر جا گری۔ ویملا نے تیسری کوشش میں اور زیادہ زور لگایا اور اس بار بیل درخت کی شاخوں سے الجھ کر وہیں کہیں پھنس گئی اور یہی وہ چاہتی تھی۔ ویملا نے اب ہاتھ والی سائیڈ کو اپنی جانب کھینچا تو شاخ نیچے کو جھک آئی۔

''رافع......'' وہ خوشی سے چیخی۔ ''شاخ کو پکڑو۔''

رافع نے اپنا سر اوپر اٹھایا، شاخ اس کے ہاتھ کی رسائی میں تھی۔ اس نے شاخ کے کنارے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

''اوپر کھینچو۔ خود کو اوپر......'' ویملا چلا رہی تھی۔ رافع نے اوپر کی جانب زور لگایا لیکن بے فائدہ۔ اس کی ٹھوڑی اور ہونٹ دلدل میں دھنس چکے تھے۔ ویملا نے بوکھلاہٹ میں بیل کو مزید اپنی طرف کیا اور اس مرتبہ درخت میں الجھی بیل سلجھ کر کھل گئی، ویملا ایک جھٹکے سے پیچھے جا گری۔ اٹھ کر بیٹھتے پھٹی آنکھوں سے رافع کو دیکھا اور...... اف...... ایک سکون بھری سانس بے ساختہ اُس کے حلق سے نکل گئی۔ بھلے بیل اور درخت کا رابطہ آپس میں ٹوٹ چکا تھا لیکن رافع نے شاخ کے کنارے کو ابھی تک تھام رکھا تھا۔ پر وہ خود۔ ویملا کا دم اس کی حالت دیکھ کر گھٹنے لگا۔ وہ ناک تک اندر جا چکا تھا۔ اب آنکھیں اور پھر...... وہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔ شاخ رافع کے نیچے جانے سے

اور نیچے جھکتی جا رہی تھی بجائے اس کے کے رافع خود کو اوپر کھینچتا لیکن رافع کے لیے اس حالت میں خود زور لگانا اب شاید ممکن نہیں رہا تھا۔

ویملا نے دلدل کی سائیڈ سے گھوم کر وہ فاصلہ بھاگتے ہوئے عبور کیا اور اب وہ خود درخت والی سائیڈ پر آ چکی تھی۔ بنا سوچنے میں وقت ضائع کیے ویملا درخت پر چڑھ کر اس شاخ کی طرف بڑھنے لگی جو رافع کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں کے زیادہ تر درخت نم ہونے کی وجہ سے نرم اور لچکیلے تھے اور ان کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ بوجھ آ جانے سے وہ جھٹکے کے ساتھ ٹوٹنے کے بجائے لچکدار ہو جاتے تھے۔ جس مضبوط تنے پر ویملا لیٹ کر آگے بڑھ رہی تھی وہ اتنا موٹا بہرحال تھا کہ بہت آگے آ جانے پر بھی اس کا بوجھ سہار سکتا تھا۔ اب ویملا کو جلد از جلد کسی بھی طرح رافع کا ہاتھ تھامنا تھا۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں وہ خود بھی نیچے گر سکتی تھی لیکن ادراک کے کچھ لمحے بعض اوقات ایسے ہی بے سروپا موقعوں پر اُترا کرتے ہیں۔ اپنے گرنے کے خیال کے ساتھ ہی ویملا کے دماغ میں آیا۔ کہ اگر وہ رافع کو نہ بچا سکی تو اپنے آپ کو خود ہی دلدل کے حوالے کر دے گی۔ آج وہ یہاں سے جائے گی تو رافع کو ساتھ لے کر ورنہ......

رافع کا سر تک دلدل میں ڈوب چکا تھا، سطح پر صرف اس کے بالوں کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور اب اس سے پہلے کہ شاخ سے اس کا ہاتھ چھوٹ جاتا ویملا کو اس ہاتھ تک پہنچنا تھا۔ شاید چند سیکنڈز کی بات تھی۔ دلدل میں پورے ڈوبے رافع کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ جاتے اور شاخ کو اس کا ہاتھ خود بخود چھوڑ دیتا۔ ویملا نے خود کو تھوڑا اور آگے لے جاتے جھک کر اپنا ہاتھ رافع کے ہاتھ تک لے جانا چاہا۔ بس ذرا سا فاصلہ۔ ویملا نے خود کو مزید نیچے کی طرف لاتے بالآخر رافع کی کلائی پکڑ لی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک شاخ کو تھامے ہوئے تھا اور ویملا کا اصل امتحان اب شروع ہوا تھا۔ دلدل میں بہت نیچے تک دھنسے ایک مرد کو اوپر کھینچنا تھا جو بظاہر تو ناممکن ہی تھا۔

اس دوران رافع سر تک دلدل میں ڈوب چکا تھا۔ دیر کی متحمل وہ نہیں ہوسکتی تھی۔ فوراً ہی ہاتھ اوپر کھینچا۔ پہلی کوشش تو اتنی ناکام گئی کہ رافع اپنی جگہ سے انچ بھر بھی ہلا نہیں تھا۔

ویملا کے پاس سوچنے کا ٹائم نہیں تھا اسے رافع کو صحیح سلامت دلدل سے باہر نکالنا تھا یا آج دنیا نے دو جانوں سے ایک ساتھ ہاتھ دھونا تھے۔

اس نے بلاتوقف دوبارہ کندھے اور کہنی پر زور دیتے اپنا ہاتھ اوپر کیا۔ رافع کا سر پھر سطح سے باہر آ گیا تھا۔ پر ویملا کے لیے اتنی کامیابی کافی نہیں تھی۔ ذرا سا رُکنے یا تھکنے پر ہاتھ ڈھیلا بھی پڑ سکتا تھا حتیٰ کہ پھسل بھی سکتا تھا۔ اس نے زور لگانا جاری رکھتے پھر ہاتھ کو اوپر لے آتے رافع کو گردن تک باہر کیا۔ ویملا کے بازو میں اس وقت بے حد شدید درد ہو رہا تھا۔

مسئلہ اس وقت ویملا کو یہ درپیش تھا کہ رافع بالکل بے سدھ ہو چکا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اگر ویملا اس کے پورا ڈوبنے سے پہلے اس کی کلائی تھام لیتی تو حواسوں میں رہتے رافع ضرور خود بھی اوپر آنے کی جدوجہد کرتا، لیکن اب ساری ذمہ داری ویملا کی تھی جو بے حس و حرکت رافع کو سینے تک نکال لائی تھی۔ لیکن یہ جاننا خود اس کی سمجھ سے بھی باہر تھا کہ وہ اسے کنارے تک کیسے لائے گی۔ اب تو زور لگانے پر رافع مزید اوپر بھی نہیں آرہا تھا۔

بازو پر رافع کے جسم کا وزن اب ناقابل برداشت تھا۔ ویملا کی آنکھیں بے بسی کے احساس سے نم ہوگئیں۔ شاید وہ اس سے زیادہ رافع کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اور شاید یہی انجام تھا دنیا سے دور اُن دونوں کی زندگی کا۔ ویملا ہار رہی تھی اور یہ احساس مار دینے کے لیے کافی تھا کہ وہ رافع کو لمحہ لمحہ خود سے جدا کرنے کا آپ باعث بن رہی تھی۔

''میں بھی مر جاؤں گی رافع!'' وہ کسی جذبے کے تحت یک لخت دھاڑ مار کر روئی تھی۔ جب ایک زوردار چھینک کے ساتھ رافع کے پورے جسم نے شدت کا جھٹکا کھایا تھا۔ ویملا کے تھکے ستے وجود میں نئی زندگی سی پیدا ہوئی۔ رافع کے منہ، ناک وغیرہ میں کیچڑ گھس جانے سے وہ ہوش کھو بیٹھا تھا۔ چھینک اُس لمحے سوائے ایک غیبی مدد کے اور کچھ نہ تھی۔ منہ، ناک اور کانوں کی بندش کھل جانے سے وہ یک لخت ہوش میں آیا تھا۔

''رافع! اوپر آنے میں میری مدد کرو۔ جلدی کرو رافع! میرا ہاتھ چھوٹ رہا ہے۔'' وہ اب جوش سے چلا رہی تھی۔ رافع کے پاس سر اوپر اُٹھا کر دیکھنے کی مہلت نہیں تھی۔ البتہ اس نے بات سن اور سمجھ لی تھی اور اسی کے بل پر وہ اپنی کہنی پر زور دیتے اوپر کو اُٹھا۔ پہلی مرتبہ میں ہی وہ سینے تک اونچا ہو چکا تھا۔

''رافع اپنا دوسرا ہاتھ دو۔ میں تمہیں ایک شاخ پکڑاتی ہوں۔'' اس نے کھینچ کر ایک شاخ رافع کی طرف جھکائی اس نے ویملا کے کہے پر عمل کرتے فوراً ہی شاخ کو تھام لیا اور اب وہ اس ہاتھ کے سہارے اونچا ہو رہا تھا۔ اس سے ویملا کے بازو پر بھی اس کے جسم کا وزن کم پڑ رہا تھا لیکن ویملا ابھی بھی اس کی کلائی چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ رافع نے اگلے جھٹکے میں اپنا پورا جسم کیچڑ سے باہر نکال لیا اور شاخ پر جھولتے ہوئے کنارے کی طرف لمبی چھلانگ لگا دی۔ ویملا کے لیے یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ رافع نے ہوش میں آتے ہی چند منٹوں کے اندر وہ کر دکھایا تھا جو وہ اتنی دیر سے کر نہیں پائی تھی۔ خوشی سے ہنستے اس کی بھیگی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔ بازو کا درد یاد تھا نہ اس طرح درخت پر اپنی ایسی آکورڈ موجودگی۔ وہ بیک وقت ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی۔

رافع کنارے پر اُلٹا لیٹا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ویملا سنبھل سنبھل کر نیچے اتری اس کے قریب آئی۔ اپنی آنکھیں اس نے جلدی سے صاف کرلی تھیں۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اس کا چہرا دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہوں۔'' وہ کیچڑ میں لت پت اب اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھوں اور بازوؤں کو جھٹکتے وہ شاید کیچڑ سے

نجات چاہ رہا تھا۔ ویملا کو ہنسی آ گئی۔ رافع نے حیرت سے بھنویں سکوڑیں تو وہ ہنسی روک کر آگے آگے چل پڑی۔

''ایسے بھوت صرف ہاتھ جھٹکنے سے انسان نہیں بنا کرتے، سمندروں پانی چاہیے۔''

اُس نے اس بار اونچا اونچا اعلان کیا تو رافع بھی ہنس پڑا۔ بنا ساحل تک جائے واقعی بھوت سے انسان بننا ناممکن تھا۔ پانی کا شور تھوڑا سا اور آگے جانے پر سنائی دینے لگا تھا۔ رافع نے ندی کنارے آ کر سب سے پہلے خود کو پانی کے حوالے کر کے جسم کا سارا کیچڑ اُتارا۔ نہا کر اب وہ گھاس پر لیٹ گیا تھا۔ جانے اُلٹا لیٹنے میں اسے کیا سکون ملتا تھا۔ تھوڑی اپنے ہاتھوں پر ٹکائے وہ سر کو گردن تک اٹھائے ہوئے تھا۔

''تمہارا یہ احسان میں سدا یاد رکھوں گا۔'' وہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ایک خشک لکڑی سے سامنے مٹی پر کچھ لکھ رہا تھا۔

''یاد رکھنے کو اور بھی بہت کچھ ہے۔'' وہ جانے کیوں بنا سوچے کہہ گئی۔ رافع نے چونک کر اس کی صورت دیکھی تو وہ سنبھلی۔

''یہ احسان نہیں۔ یہ تو مول لے تھا ذرا سا۔ اُن تمام احسانوں کا جو تم نے مجھ پر کیے۔'' وہ غور سے اس وقت مٹی میں کھدے اس لفظ کو دیکھ رہی تھی جو ابھی رافع نے لکھا تھا پر شاید بنگلہ میں لکھا تھا کیونکہ وہ مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔

''اچھا۔'' وہ ذرا سا ہنسا۔ ''بڑی جلدی احسان چکاتی ہو۔''

''لیکن تم وہاں گرے کیسے۔'' ویملا کو حیرت تھی کہ رافع تو خود کسی ٹائیگر سے کیا کم تھا۔ یہاں کے چپے چپے سے واقف۔ بھلا وہ کیسے اتنی غفلت برت سکتا تھا۔

''ٹائیگر کو میں نے تیر مارا تو وہ غضب ناک ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے بھاگنے میں بھلا جانا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ ٹانگ کا زخم جلد ہی اس کے قدم روک دے گا لیکن وہ اتنا غصے میں تھا کہ بنا اپنی چوٹ کی پرواہ کیے بھاگتا رہا۔ میں بڑی بڑی چھلانگیں لگاتا آگے بھاگ رہا تھا ایسے میں کہاں دھیان رہتا ہے کہ آپ کدھر ہیں۔ پیروں تلے دلدل کا جب مجھے بُوجھا (احساس) ہوا میں اس کے بیچ میں آ چکا تھا۔

''اور ٹائیگر......؟'' ویملا آنکھیں پھیلائے پورے انہماک سے سن رہی تھی۔

''بڑا استاد تھا۔'' رافع کا بے ساختہ ہلکا سا قہقہہ نکل گیا۔ ویملا دھیان سے اسے دیکھتے بے اختیار نظر چرا گئی۔ کم بخت ہنستا ایسے تھا گویا دھرتی پر احسان کر رہا ہو۔

''دلدلی جگہ آتے ہی وہ ایکدم پہلے سلو ہوا اور پھر بڑے آرام سے راستہ بدل گیا۔ آج اگر تم نہ آتیں تو رافع محمد کو زندہ نگل لینے والی اِس قبر کا قیامت تک کسی کو نشان بھی نہ ملتا۔'' وہ سر نفی میں ہلاتے مسکرا کر رہ گیا اور ویملا کو لگا اس کے کانوں کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔

''رافع محمد؟'' اُس نے تعجب سے دہرایا۔ ''تم مسلم ہو؟'' اور رافع نے جواباً بس حیرت سے اُسے ایک نظر دیکھا۔

''ہاں ویسے ہو سکتے ہو۔ مجھے شاید یوں ہی لگا تھا۔'' ویملا نے خود کو سنبھالتے لہجہ نارمل کیا۔ پھر اندر ہی اندر اپنے آپ کو سرزنش کی۔ ''وہ کچھ بھی ہو مجھے کیا؟''

''اور تم ایسے مُردوں کی طرح کیوں دھنستے ہی جا رہے تھے۔ اپنے بچاؤ کا کوئی سادھان نہیں کر رہے تھے۔ مرنے کا شوق ہو رہا تھا۔'' ویملا دھیان بدلنے کو پھر وہیں آ گئی۔

''جلا (دلدل) میں آپ جتنا زیادہ پرتر ودھ (مزاحمت) کرتے ہیں، وہ اتنا ہی تیزی سے آپ کو اپنی اور کھینچتی ہے۔'' رافع نے اسے رسان سے مطلع کیا۔ ''میں نے سوچا، مرنا تو ہے ہی۔ ذرا دھیرے دھیرے جان دیں۔''

''لیکن تم آواز تو نکال سکتے تھے۔ ایک بار بھی شاید تم نے مجھے بلایا نہیں۔''

"بلایا تھا لیکن دلدل میں نیچے جاتے جانے کا پریشر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ آواز میرے گلے سے گھٹی گھٹی نکل رہی تھی۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں اب نکلنا چاہیے۔" وہ بڑی دقت سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ ویملا بھی مسلسل اپنا بازو دبائے جا رہی تھی۔

"اور کہاں جائیں گے ہم؟"

"میرے گاؤں!" رافع نے سہولت سے آگاہ کیا۔

"اچھا۔ وہ کس لیے؟" ویملا نے اندر کہیں دبا دبا سا جوش اُبھرتا محسوس کیا۔

"کیونکہ اس طرح جنگل میں خوار ہونے کی اب مجھ میں ذرا بھی سکت نہیں۔ پھر گاؤں یہاں سے زیادہ دُور بھی نہیں اور ریسٹ کی تو میرا خیال ہے تمہیں بھی شدید ضرورت ہے۔" وہ اب اُٹھ کر اپنا سامان اُٹھا رہا تھا۔

"اور یہ ناؤ کہاں سے لی؟"

"ایک دوست سے مانگی ہے۔" وہ اب کشتی میں بیٹھ کر اس کا موٹر آن کر کے اسے اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ویملا نے سامنے کا تختہ اپنے بیٹھنے کے لیے منتخب کیا۔

"اس پر تو ہفتوں لگ جائیں گے۔" تیز رفتار لانچ کے مقابلے اس بے چاری سی کشتی کی کیا بساط تھی۔" ویملا نے بھی چھوٹتے ہی تبصرہ کر دیا۔

"کہاں ناں۔ گاؤں بالکل قریب ہے۔" رافع اس کی رواں ہوتی زبان سے ایک بار پھر عاجز آ رہا تھا۔ بادل بنا برسے کہیں دُور ہی نکل گئے تھے۔ کھلے آسمان پر پھر چاند کی اجارہ داری تھی۔ رافع اور ویملا کے پُرخطر سفر کی ایک اور طویل رات کا کچھ اور ہنگامہ خیزیوں کے اضافے کے ساتھ اختتام ہو رہا تھا۔

نتیجے میں ہاتھ آئی تھیں کچھ نرم سبک احساسات کی تتلیاں، خواب و خواہش کے جزیروں سے آئے کچھ روشن جگنو، جنہیں مٹھی میں دبائے ویملا تو کبھی مٹھی نہ کھولنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی اور رافع؟

ویملا سے پیٹھ موڑے دور سے آتی اپنے گاؤں کی سوندھی، مست ہواؤں کو ناک سے روح کے اندر تک محسوس کرتے بہت شاد، بہت مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ ہاں مگر اُس لمحے رافع کی ماں اگر یہ جان لیتی کہ اس کا بیٹا گاؤں میں داخل ہونے کے لیے کتنا پُرجوش اور خوش ہے تو آدھی موت وہیں مر جاتی۔

☆☆☆

"یہ کیسا سودا اور کیسی ڈیل ہے ابوصالح! آج پانچ روز ہو گئے میری بیٹی کو جنگلوں میں بھٹکتے۔ بتا سکتے ہو وہ زندہ بھی ہے یا......" دھرمیشور کے ضبط کا پارا اب چھوٹنے لگا تھا۔ ارمیندر اور پولیس کی ناکامی کے بعد وہ ایک بار پھر ابوصالح کے منہ لگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"کیسی منحوس باتیں کر رہے ہو دھرما!" ابوصالح کا سکون قابلِ دید تھا۔ "بٹیا کو آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔ آخر ہمارے دیش میں مہمان ہے وہ۔"

"ایک بار مجھے میری بیٹی کی آواز ہی سنوا دو۔ ہوا میں ٹامک ٹوئیاں مارتے میرا دم پھول گیا۔ مجھے میری بچی سے ملوا دو۔ تمہاری تو ہر شرط ماننے بیٹھا ہوں۔"

"اور پولیس دھرمیشور؟" ابوصالح کا لہجہ دفعتاً سخت تُند ہوا۔ "پولیس کو میرے پیچھے لگا کر تم کون سی دوستی نبھا رہے تھے۔"

"بھگوان کی سوگندھ ابوصالح! پولیس کو تمہارا نام نہیں بتایا۔ بس سب کچھ عجیب سٹپٹاہٹ میں ہو گیا۔ پلیز میری ویملا کو کسی طرح واپس بھجوا دو۔"

"اپنے بینک کی ڈیٹیل بھیج رہا ہوں میری رقم وہاں ٹرانسفر کروا دو، تمہاری لڑکی تمہیں صحیح سلامت دو روز میں مل جائے گی۔"

ابوصالح کو پورا یقین تھا کہ ہاشم اپنا کام ہر حال میں مکمل کر کے ہی رپورٹ دے گا۔ تب ویملا ایک بار پھر اس کے سامنے ہوگی۔ لہٰذا پورے اعتماد سے ہامی بھر لی۔ دھرمیشور بھی پولیس کو درمیان میں ڈال کر پچھتا رہا تھا۔ معاملہ میڈیا میں بھی جا سکتا تھا جو وہ ہرگز افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال ابوصالح کی مان لینے

میں ہی عافیت تھی۔ جانے ویملا کے ساتھ کون آوارہ جنونی بندھ گیا تھا جو وہ خود بھی سامنے آنے اور رابطہ کرنے کو تیار نہ تھی۔ ایک بار ویملا مل جاتی، اُس آوارہ کو تو وہ خود دیکھ لے گا۔ سگار کے لمبے کش کھینچتا وہ سرخ آنکھوں میں شدید بے چینی سموئے ہوئے تھا۔

☆☆☆

کچی مٹی کی دیواروں اور گھاس پھونس کی چھت سے بنے اس کے گھر میں اندر لکڑی کا کام تھا۔ رافع نے آج تقریباً ایک سال بعد اپنا یہ گھر کھولا تھا۔ جب سے وہ لوگ ایشوری پور شفٹ ہوئے تھے یہ ایسے ہی بند پڑا تھا۔ رافع نے ایک کھاٹ صاف کر کے اس پر چادر اور سرہانہ رکھتے ویملا کو بلایا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ مجھے نہا کر کپڑے بدلنے ہیں۔ پھر چاہو تو تم بھی فریش ہو جانا۔ میرے آنے تک سو جاؤ تم۔"

"تم کہیں باہر جا رہے ہو؟" ویملا نے آرام دہ نرم بستر پر فوراً ہی نشست سنبھالی۔

"ہاں۔ بس یہیں پاس...... میرے آنے تک بے فکر ہو کے نیند پوری کرو۔"

"خالی پیٹ نیند آئے گی کیا۔" اس نے منہ بسورا۔

"اوہ ہاں۔" وہ بے چاری شاید پچھلی صبح سے بھوکی تھی۔ اُس نے خود تو جمال بابا کے ہاں کھانا کھالیا تھا اور پیاس۔ رافع کو اچانک خیال آیا وہ تو شدت سے پیاسی بھی تھی۔ رافع نے باہر جا کر پہلے اس کے لیے صاف پانی کا بندوبست کیا۔ پھر ساتھ والی جمنا موسی سے ناشتے کی استدعا کی۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے ناشتہ ہی تیار کر رہی تھیں۔ اسی وقت ایک ٹرے بنا کر دے دی۔ رافع آٹھ دس منٹ میں ہی ناشتہ لیے واپس آیا۔

"ارے اتنے جلدی۔" ویملا نے خوشی سے چمکتے ہاتھ آپس میں رگڑے۔ "ویسے تو میرا حلیہ بھی ایسا نہیں کہ بنا نہائے ناشتے کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤں۔" وہ خود ہی ہنسی۔ "لیکن چلو آج کا میل کچیل بھی معاف ہے۔"

"ہاں۔ پہلے پیٹ بھرنا ضروری ہے۔ تم شاید کل صبح سے بھوکی ہو۔ پھر نہانے کے لیے تمہیں صاف کپڑے چاہئیں۔ تمہارے پاس وہ بھی نہیں۔" رافع کمرے میں گھوم پھر کر اپنی چیزیں برابر کر رہا تھا اور اب دروازے طرف بڑھتے اس کے بازو پر اپنے صاف کپڑے، تولیہ اور جوتے تھے۔

"تم کھانا کھا کر سو جانا۔ کنڈی بھی اندر سے لگا لو۔ میں نہانے کے بعد تمہارے لیے ایک صاف ڈریس لے آؤں گا۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔" وہ عجلت میں ناشتہ کرتی لاپروائی سے سر ہلا رہی تھی۔ وہ جو کہتا اور کرتا تھا۔ ٹھیک ہی ہوتا تھا ویملا کے حق میں۔ اسے فکر مند ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

"کنڈی لگانا مت بھولنا۔ آس پڑوس کی عورتیں آکر بلاوجہ تم سے سوال کریں گی۔"

"ہوں۔" وہ کھانے میں شدت سے مصروف بس سر ہلانے کی فرصت نکال رہی تھی۔ رافع نے مسکرا کر دیکھا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جمنا موسی اس کی ماں کی دوست تھی اور ان کی پڑوسن بھی۔ اس کے سوا اس بڑھیا سے رافع کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ موسی کے گھر اس کے علاوہ اس کی بیوہ بہو اور ایک چھوٹا لڑکا رہتے تھے۔ بڑے لڑکے جوائے کو ٹائیگر نے پھاڑ کھایا تھا۔ سننے میں آتا تھا کہ وہ باگھوں کو زندہ پکڑ کر مہنگے داموں بیچنے کا کام کرتا تھا۔ گھر پہ کم رہتا، زیادہ تر جنگلوں میں بھٹکتا رہتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر کسی باگھ کے حملے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ رافع نے تالاب پہ نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور واپس آکر جمنا موسی کی بہو ردی سے کہا کہ وہ ایک صاف کپڑوں کا جوڑا ویملا کو پہنچا دے اور وہ خود گھاٹ کی طرف چل دیا۔ تالاب کے راستے میں دھنی اور الفت سے سامنا ہوا۔ ساتھ ساتھ موجود یہ

چند دیہات ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی پر مشتمل تھے۔ یہاں کچھ پرانے مندر بھی تھے اور سادہ کچی مسجدیں بھی۔ زیادہ تر لوگ مچھلی پکڑنے کے کام سے وابستہ تھے۔ کچھ کی اپنی زمینیں تھیں، زیادہ تر یہاں چاول کی کاشت کی جاتی۔

رافع کا باپ مشائق محمد ٹائیگرز کا شکار کرنے کے علاوہ مسافر بوٹ چلانے کا کام کرتا تھا۔ گھر کا گزارا جیسے تیسے ہو ہی رہا تھا۔ شرن کھولا کی آبادی سے کچھ ہٹ کر یہ مزید چھوٹا گاؤں تھا، سندر بن سے تھوڑا اور قریب۔

شائق کی ٹانگ کٹ جانے کے باعث رافع کو یہ دونوں کام سنبھالنا پڑے اور عمر سے کچھ زیادہ ہی جلدی۔۔۔ وہ بڑے کم عرصے میں خوب ماہر نشانہ باز بن گیا تھا۔ باگھ کو بستیوں سے دور رکھنے اور معصوم لوگوں کو اس کے جان لیوا حملوں سے بچانے کے لیے کئی اچھے اقدامات کی بدولت علاقے میں اس کی خوب قدر ومنزلت تھی۔

جن لوگوں کی اس نے زندگیاں بچائیں وہ بطور خاص اس کے ممنون احسان تھے۔ سوائے چند ایک کو چھوڑ کر اپنے گاؤں سمیت آس پڑوس کے علاقوں میں بھی رافع محمد شہرت پانے لگا تھا۔ وہ انسانوں کے ساتھ ساتھ باگھوں کی زندگی کا بھی ضامن بن جاتا۔ لوگوں کے لیے اس کی حیثیت کسی دیوتا سے کم نہ تھی۔ رافع کا ٹائیگرز کو محکمہ وائلڈ لائف کے حوالے کرنا ایک بڑا ہی مستحسن عمل قرار دیا گیا۔

رافع محمد بے شمار سیدھے سادے لوگوں کا اگر ہیرو تھا تو کچھ عناصر یہاں ایسے بھی تھے جنہیں رافع محمد کے کار خیر خوب ہی چبھا کرتے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کی مدد سے سندر بن میں نایاب جانوروں کی اسمگلنگ کا کام انجام پاتا تھا۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ علاقہ وائلڈ لائف والوں کے خاص نشانے پر آئے۔ جن لوگوں کے کام میں رافع کی وجہ سے خلل پڑ رہا تھا انہیں یہ تبدیلی بہت چبھ رہی تھی۔ رافع کو گاؤں سے نکالنے کی سازشیں ہونے لگیں لیکن وہ ہرگز اپنے علاقے، اپنے لوگوں کو چھوڑ کر جانے پہ راضی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا اسے راہ سے ہٹانے کا وہ چھپا مقصد کون سا ہے۔ اس کے یہاں سے جاتے ہی یا تو باگھ کو اپنی ذات کے دفاع کی خاطر ہلاک کر دیا جاتا یا پھر اسمگل اور معاملہ صرف باگھوں تک ہی محدود کہاں تھا۔

ہرن کے گوشت اور اس کی کھال کے حصول کے لیے معصوم ہرن کا شکار بھی یہاں کا ایک بہت بڑا خفیہ دھندا تھا۔ بنا کسی پرمٹ کے لوگوں کو چند پیسوں کے عوض ہائیر کر کے حساس ایریاز میں داخل کر دیا جاتا اور ہرن، باگھوں، نایاب سانپوں اور پرندوں کو اسی طرح غیر قانونی طور پر اسمگل کر دیا جاتا ورنہ بازار میں بیچ دیا جاتا۔ نایاب پرندوں سانپوں اور مچھلیوں کی خرید فروخت کے بازار تو شہروں میں عام تھے۔

ایسے میں رافع کا باگھوں اور ہرنوں کو زندہ بحفاظت سینک چوری پہنچانا، انہیں بچانا ہاشم جیسے عناصر کو کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ رافع جب گھنے جنگل میں انسانوں کے ہاتھوں معصوم ہرن کی چیر پھاڑ یا اُس چیر پھاڑ کے بچے کھچے نشانات دیکھتا تو اس کا بس نہ چلتا کہ وہ ایک ایک کر کے سارے ہرن اور ٹائیگر نیشنل پارک میں چھوڑ آئے۔ لیکن قدرت کے اس شفاف زندگی سے بھرپور قطعہ زمین پر جہاں جنگلی حیات کو آزادانہ گھومنے کا حق حاصل تھا یہ ممکن نہیں تھا کہ سب کو کسی مخصوص پارک میں ڈال دیا جاتا۔

ہاشم نصر اور اُس جیسے چند کرتا دھرتاؤں نے رافع کو جانوروں کا مسیحا بنتے دیکھا تو انہیں اپنا دھندا چوپٹ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ ہاشم نے ایک روز گھر بلا کر اُسے بار برداری کی لانچ میں نوکری کی نوید سنائی۔ رافع نے انکار کیا تو اُس نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے اسے سوچ بچار کا وقت دے دیا۔

اِدھر رافع بھی اچھی طرح جانتا تھا ہاشم کے پیچھے راجا بھیم اور گورودھن تھے۔ دونوں ہی ٹائیگر اور ہرن اسمگلنگ میں عرصے سے ملوث تھے۔ گھر آ کر بھی رافع الجھا الجھا سا رہا۔ اسے ہر قیمت یہیں رہنا تھا۔

اس نے اگلے روز ہی جا کر صاف جواب دے دیا۔ لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی، دو ہی دنوں بعد جبکہ علاقے میں شدید باڑھ آئی ہوئی تھی۔ ساون کی طوفانی بارشوں نے بچی کھچی خشکی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور چند ایک دیہات باقی رہ گئے تو رافع کو گھاٹ پر پہلے اپنی کشتی جلی ہوئی ملی۔ گھر واپس آیا تو ادھ جلا مکان بھی پانی کے ڈول پھینک پھینک کر بجھایا جا رہا تھا۔

وہ اور اس کی ماں ابھی اس صدمے سے باہر بھی نہ آئے تھے کہ باگھ کے حملے میں اُس رات شمبھو کی جان جاتے جاتے بچی۔ شام ڈھلنے کے بعد گھاٹ پہ ناؤ باندھ کر وہ معمول کے مطابق گھر واپس آ رہا تھا کہ جھاڑیوں کے پیچھے باگھ کی دھاڑ نے سرپٹ بھاگنے پر مجبور ہو گیا حالانکہ باگھ ایسے تیز ردعمل پر مزید تاؤ کھا جاتا ہے لیکن گھبرایا ہوا انسان بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہوتا۔ اس نے قریبی درخت پر پناہ لی۔

سناٹے میں دور تک گونجتی شمبھو کی چیخوں نے رافع کی وہاں تک رہنمائی کی۔ ٹائیگر ابھی بھی درخت کے اردگرد چکر کاٹ رہا تھا۔ رافع نے اپنی محتاط حکمت عملی اپناتے باگھ کو زخمی کر کے دور ہٹنے پر مجبور کیا اور شمبھو کی جان بچالی۔ زخمی ٹائیگر کو راتوں رات نصیر کی لانچ میں نیشنل پارک کی ایک قریبی برانچ میں وہ خود پہنچانے گیا۔ ٹائیگر کچھ زیادہ ہی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے مکمل ٹھیک ہونے تک رافع اُس کے آس پاس ہی موجود رہا۔

گھر واپس آتے رافع کو کچھ دو دن لگ گئے اور جب وہ واپس آیا تو اس کی ماں سامان باندھے ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑنے کی نیت سے تیار بیٹھی تھی۔

''تم جانتی ہو اماں! میں کبھی گاؤں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تو گلا گھونٹ دو میرا۔ بھوکوں مرنے سے تو ایک بار جان دینا ٹھیک رہے گا۔'' وہ چلا ہی اُٹھی۔ رافع کا شرم سے سر جھک گیا۔ باگھ کو بچانے کی تگ و دو میں وہ ماں کو تو بھول ہی گیا تھا۔ گھر میں دو روز سے واقعی کچھ کھانے کو نہ تھا۔

''ارے جب ایک بھلا آدمی اچھی نوکری دلا رہا ہے تو کیوں گھٹ گھٹ کر جینا چاہتے ہو۔ آخری عمر میں اِس غریب بڑھیا کو بھی چین کی کچھ گھڑیاں جی لینے دو، کیا ایسے حالاتوں میں سومیہ کو بیاہ لاؤ گے اور......'' وہ بولتے بولتے کھانسنے لگی تھی۔

''اچھا بس۔'' رافع نے آگے بڑھ کر ماں کو ساتھ لگایا۔ ''ٹھیک ہے ہم چلیں گے یہاں سے۔ کچھ وقت تو دے دو کہ......''

''ناں۔'' وہ گھبرا اُٹھی۔ ''جانا ہے تو پھر دیر نہیں۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔'' وہ اپنے آنسو چھپاتی اندر کمرے میں چلی گئی۔ رافع کی عدم موجودگی میں پیچھے دو دن میں اس نے جو جھیلا تھا، وہ اس کی بھنک بھی رافع کو پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

ناؤ اور مکان جلنے کے واقعہ کی اگلی شام ہی گھر کے دروازے پر منہ چادروں سے چھپائے کچھ آدمی آئے تھے کہ......

''اگر وہ اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو چوبیس گھنٹوں کے اندر بیٹے سمیت یہ گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے۔ ورنہ جس طرح کشتی اور مکان جلے تھے، آگ کے اگلے نشانے پر اس کا بیٹا ہوگا۔''

اُس غریب کے لیے وہی ایک دھمکی ہی کافی تھی۔ سوچنے کے لیے جو ایک پوری رات میسر آئی تو اس نے طے کیا کہ وہ رافع کو دھمکی وغیرہ سے آگاہ کیے بنا ہی کسی طرح یہاں سے لے جائے گی۔ رافع دھمکیوں سے دبنے کے بجائے اور شیر دل بننے کی کوشش کرتا، وہ جانتی تھی اس کی طبیعت کو، اس لیے غربت کو آڑ بناتے اسے نئی نوکری کی طرف مائل کیا۔ لیکن اگر وہ جانتی کہ نوکری کی آفر کرنے والے ہی دراصل اس کے بیٹے کی جان کے درپے ہیں تو شاید وہ رافع کو لیے بنگلہ دیش ہی چھوڑ جاتی اور آج یہ اُسی بے خبری کا نتیجہ تھا کہ رافع ویملا کو ساتھ لیے بے جھجک اپنے گاؤں آن پہنچا تھا۔ وہی گاؤں، وہی

لوگ، وہی گھر اور صد افسوس کہ وہی دشمن آج بھی اس کے استقبال کو وہاں موجود تھا۔ لیکن یہ بات رافع کے گمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔ اس کے نزدیک تو محض ایک رات کے قیام کی بات تھی۔ اور اس ایک رات کے آرام کے لیے گھر سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے۔

وہ گھاٹ سے نہا کر گھر واپس آیا تو ویملا کہیں نہیں تھی۔ بھائیں بھائیں کرتے گھر کو دیکھ کر وہ واپس دوڑا۔ جانے ویملا کہاں گئی تھی اور بھلا وہ کہاں جاسکتی تھی۔

وہ پاگلوں کے انداز میں گھر کے چاروں اطراف چکر کاٹ کر اب گھاٹ کی طرف بھاگا تھا کہ شاید وہ کشتی کی طرف گئی ہو...... لیکن...... چند قدم پہ جا کر ہی اسے بریک لگ گئی۔ ردی بھابی کے ساتھ ساتھ چلتی پیلی ساڑھی میں الجھتی وہ کہیں سے نہا کر واپس آرہی تھی۔ بھابی کے دیے کپڑوں میں عجیب اوٹ پٹانگ سی لگ رہی تھی۔ جانے اب یہ ویملا کے نئے حلیہ کی وجہ تھی یا اچانک اسے سامنے پا کر اندر تک اترتے سکون کا اثر کہ رافع بے ساختہ ہنس کر رخ پھیر گیا تھا۔ ویملا نے تنک کر دیکھا۔

''تمہارے علاوہ بھی یہاں کسی کو ہندی آتی ہے۔ نہانے کی بات سمجھانے میں میری پوری دوپہر نکل گئی۔'' وہ سخت برا منہ بناتے آگے چلتی ردی بھابی کو گھور رہی تھی۔

''اچھا۔ اب تم گھر چل کر آرام کرو، مجھے اور بھی کچھ کام ہیں۔''

وہ اسے اندر بھیج کر واپس مڑتے دُور کھیتوں تک نکل گیا تھا۔ دُور دُور تک نگاہ ڈالتے ذہن میں چند ایک خدشات بھی پل رہے تھے۔ ابوصالح کے آدمیوں نے اس کے فون سے متعلق ضرور ابوصالح کو آگاہ کر دیا ہوگا۔ یا اگر نہ بھی بتایا ہو تو وہ خود ضرور ویملا کی تلاش میں بکھر رہے ہوں گے۔

اُسے ابوصالح کو اس کے آدمیوں کی بدنیتی اور ویملا کی اپنے پاس موجودگی سے متعلق بتا دینا چاہیے۔ بلاوجہ وہ ویملا کی گمشدگی سے پریشان ہو رہا ہوگا۔ رافع نے ابوصالح کی نیت، اس کی بدلتی پالیسیوں سے قطعی بے خبر محض اپنی نیک نیتی کی بنا پر اسے اطلاع دینے کا ارادہ کرتے موبائل نکالا۔

ابوصالح نے تحمل سے رافع کی پوری بات سُن کر اس کے گاؤں آنے کے فیصلے کی تعریف کی۔ اعظم اور تمیزل کی ٹھیک ٹھاک خبر لینے کا ارادہ ظاہر کیا اور مزید یہ ہدایت کی کہ اب وہ چاہے تو خشکی کے راستے ویملا کو اُس تک پہنچا سکتا ہے۔

رافع نے دل میں کسی قدر اطمینان محسوس کرتے موبائل آف کر کے گھر کی راہ لی۔ ویملا کو یہ خوش خبری سنانے کا فیصلہ بھی کیا کہ اب وہ بہت جلد اپنے کلکتہ میں ہوگی اِس بات سے قطعاً لاعلم کہ گھاٹ پر ہی جھاڑیوں میں چھپا اُس کا دشمن اُس کی ہر حرکت سے واقف و آگاہ تھا۔

☆☆☆

ویملا کا جی تو شام سے ہی گھبرا رہا تھا۔ رات ہوتے سینے میں تیز جلن اُٹھی۔۔۔ اور اب اُسے لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت زور کی قے آنے والی ہے۔ وہ کمرے کے اندر بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ صبح ڈٹ کر ناشتہ کر لینے کے بعد اُس نے سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ شام سے ذرا پہلے رافع کہیں سے کھانا لے آیا تب تک اس کی بھوک چمک اُٹھی تھی۔ پہلے نوالے پر ہی اگرچہ اسے احساس ہوا کہ ذائقہ بالکل نیا اور الگ سا ہے لیکن وہ ذائقہ مزے دار اتنا تھا کہ وہ ڈش کا نام وام پوچھے بنا رغبت سے کھاتی گئی۔ دو ایک مرتبہ شک ضرور ہوا کہ شاید وہ مچھلی سے بنا کوئی سالن تھا اور ماس مچھی سے وہ زندگی بھر دور رہی تھی۔ لیکن بھلا مسافرت میں ایسے ناز نخرے کہاں چلتے ہیں۔ وہ بھی بحث میں پڑنے کے بجائے پیٹ بھر کر کھا گئی اور اب اس کا معدہ ہرگز اس نئی خوراک کو قبول کرنے کی حالت میں دکھائی نہ دیتا تھا۔

ایک جی میں آیا کہ رافع کو اُٹھا کر اپنی حالت سے مطلع کر دے لیکن کھڑکی سے دیکھا تو وہ آج بھی باہر کھاٹ ڈالے بے سُدھ سویا تھا۔ وہ اُلٹے لیٹے رافع کی گردن پہ پڑے بالوں کے گول لچھوں کو

مسکرا کر دیکھتے واپس پلٹ رہی تھی کہ بانس کی حد بندی سے پیچھے کچھ سایے لہراتے نظر آئے۔ بانس کی یہ حد بندیاں لمبے افقی اور عمودی ڈنڈوں کو جوڑ کو چیک کی صورت بنائی جاتیں اور بڑے بڑے یہ چوکھٹے جہاں جی چاہا لگا لیے جاتے۔ ٹائیگر سے بچنے کے لیے یہاں یہ حد بندی ویملا نے کئی مکانوں کے آگے دیکھی تھی۔ اِس کے آر پار بھی صاف دیکھا جاسکتا تھا کیونکہ ڈنڈوں کا چیک اپنے درمیاں قریب ایک ایک فٹ جتنا فاصلہ رکھتا تھا۔

پہلی نظر میں یوں لگا کہ کچھ لوگ سامنے سے گزر کر جارہے ہیں۔

اب یہ تو بظاہر معمول کی بات ہوسکتی تھی لیکن وہ لوگ چادروں اور ڈھاٹوں سے منہ کیوں چھپائے ہوئے ہیں یہ بات اچنبھے کی تھی۔ ویملا نے بغور ان کی حرکت پہ نظر رکھتے ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ چاندنی روشنی اتنی ضرور تھی کہ سب سہولت سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا۔ اُن کے ہاتھوں میں چمکتے بھالے اور بندوقیں تھیں۔

گاؤں میں شاید ڈاکو گھس آئے تھے۔ خوف سے ویملا کی آنکھیں پھیلیں اور گلے میں کچھ پھنسا، اُسے رافع کو اُٹھانا تھا۔ وہ جو عین ان کے نشانے پر تھا۔ وہ گلے سے آواز نکالنا چاہتی تھی پر ناکام رہی۔ طبیعت کچھ اور بگڑنے لگی، ویملا کو لگا اندر آگ سی لگی ہے۔ وہ سر جھٹک کر سامنے متوجہ ہوئی

''ہے بھگوان! یہ لوگ سامنے سے ہٹ کیوں نہیں جاتے۔ یہاں کیا ملے گا انہیں۔''

اور...... اور بڑبڑاہٹ اس کے منہ میں ہی دبی رہ گئی۔ ایک شخص نے بندوق سیدھی کرتے دوسروں کو اشارہ کیا انہوں نے اپنے بھالے فضا میں اٹھائے۔ سب کا رخ یک لخت رافع کی جانب ہوا۔ وہ چونکہ کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اس لیے کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔

''رافع!'' وہ ہذیانی انداز میں چیختے دروازے کی طرف بھاگی اور رافع نے ہڑبڑا کر اٹھتے چاروں طرف دیکھا۔ ڈاکو اس اچانک افتاد پر ایسے بوکھلائے کہ ایک بھی اپنا ہاتھ نہ چلا سکا اور رافع کو بھاگ کر اندر آنے کا موقع مل گیا۔

''کیا ہوا ویملا!'' وہ قریب آتے گھبرا کر ویملا سے مخاطب ہوا۔

''میں ٹھیک ہوں رافع!'' ویملا نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے ہاتھوں میں لے کر کہا تو نیند کے جھٹکے سے باہر آکر رافع بھی اب کچھ سمجھنے کے لائق ہوا۔ ویملا نے آگے بڑھ کر کمرے کی کنڈی اندر سے بند کی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا رافع! باہر کچھ مشکوک لوگ تم پر ہتھیار تانے ہوئے تھے۔ وہ دیکھو۔'' ویملا نے کھڑکی کے کونے سے جھانکا، رافع نے عین اس کی پشت کے پیچھے سے دیکھا پر اب کوئی دکھائی نہیں دیا۔

''کہاں؟'' وہ بھی اب سرگوشی کے انداز میں بول رہا تھا۔

''میں نے خود دیکھا ہے انہیں۔ منہ چھپائے ہوئے تھے سب کے سب اور ہاتھوں میں بھالے اور بندوقیں تھیں۔ اُنہوں نے تمہارا نشانہ لیا لیکن میں نے چیخ ماری تو سب رُک گئے اور اب شاید چھپ گئے۔''

''کتنے لوگ تھے؟'' رافع کی کشادہ روشن پیشانی شکنوں سے پُر ہوگئی۔

''شاید تین۔ ایک کے پاس بندوق تھی دو کے پاس بھالے۔'' رافع نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانکا۔ پر اب کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ کچھ پوچھنے کے لیے پلٹا پر ویملا کمرے کے کونے میں ایک ہاتھ دیوار پہ رکھے سر نیچے کیے آدھی جھکی سی کھڑی تھی۔ وہ ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے نیچے بیٹھتے زور سے قے کردی۔

''اوہ۔'' رافع بھاگ کر قریب آیا پر تب تک وہ اُٹھ چکی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا تو لبوں پہ ہنسی تھی۔ فرش چونکہ کچا تھا اس نے پیر سے مٹی قے پر ڈالی۔ دوپٹے سے آنکھیں اور چہرا صاف کرتے وہ اس کی طرف مُڑی۔

''اب کچھ سُدھار آیا ہے حالت میں۔
اُف...... '' کچھ دیر پہلے تک مرنے والی حالت تھی۔
''تمہیں خوف سے؟'' رافع کنفیوز تھا۔ ویملا نے ہنس کرنفی میں سر ہلاتے اب تک کی اپنی کیفیت کا حال بیان کیا
''اب ٹھیک ہو؟''
''ارے۔ ایسی ویسی۔'' وہ ہنستے ہوئے کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ رافع اُسے دھیان سے دیکھ رہا تھا اور بالکل بے دھیانی میں، وہ بے دھیانی جس نے ہمارے باطن سے خود ہم ہی کو بے خبر رکھا ہوتا ہے، اِس میں بھی کچھ قصور ہماری کم نگاہی اور کم آگاہی کا ہی نکلتا ہے۔
''سوری۔ کھانے میں ایک سالن شاید مچھی کا تھا۔ میں نے ساودھانی نہیں برتی اور۔''
''کوئی بات نہیں۔ میں بھی بجائے سبجی (سبزی) کے وہی کھاتی چلی گئی۔ پر......'' وہ ایک خیال سے چونکی۔
''یہ کون تھے رافع؟ کیا تم لوگوں کے گاؤں میں ڈاکو بھی آتے ہیں۔''
''ہرگز نہیں۔ کون سا یہاں خزانے دفن ہیں کہ ڈاکو آئیں گے۔''
''تو...... تمہارے کوئی دشمن؟''
''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔'' رافع اس کے نزدیک کھاٹ کی پائینتی کی طرف بیٹھا نچلا لب دباتے کچھ دن پہلے کی ایک بات پر غور کررہا تھا۔
''کہیں وہ تمہارا پتی نہ ہو ویملا؟''
''ہیں؟'' دوپٹے کے گولے سے چہرا تھپتھپاتے وہ ٹھٹھک کررُکی۔ ''کون؟''
''وہ جو باہر تھا بندوق والا اور اس کے دو ساتھی۔''
رافع کو یاد آیا ابوصالح نے کہا تھا اس کا پتی دو آدمیوں کو ساتھ لیے ہوئے ہے اور اُسے کسی نے بتادیا تھا کہ اس کی بیوی کسی رافع محمد کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔
''نہیں ہوسکتا۔'' وہ نظریں چرانے لگی۔
''ارے وہی ہوگا ہنڈرڈ پرسنٹ۔'' رافع جوش سے سمجھاتے اس کے اور قریب ہوا۔ ''میں تو کہتا ہوں اُسے فون ملاکر سمجھاؤ کہ تم سُرکھشت ہو اور...... اور صرف اُسی کی ہو۔ وہ مجھے شاید غلط سمجھ رہا ہے۔ اس کا شک دُور کردو تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
رافع نے موبائل نکال کر کی پیڈ کھولا۔ اُسے اپنے شبے کے صحیح ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ اب مشورے کے انداز میں کچھ بولنے کے بجائے اسے بتا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ویملا اُس کی مصروفیت کو محویت سے دیکھتے ہلکا ہلکا مسکرائے جارہی تھی۔
''ہاں۔ اب شاید سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی پر رافع نے دھیان نہیں دیا۔
''لو، اس کا نمبر ملاکر خود بات کرو۔'' اُس نے موبائل ویملا کے سامنے کیا جسے رافع کے ہاتھ سمیت اُس نے دُور کردیا۔
''دنیا میں اس سے کوئی بھی پرش میرا پتی نہیں ہے رافع! کیونکہ میں کنواری ہوں اور یہ...... منگل سوتر۔'' ویملا نے گلے میں پڑی مالا سامنے نکالتے اپنی ہتھیلی پہ رکھی۔ ''یہ میری ماں کی چند آخری نشانیوں میں سے ایک ہے۔''
''تم......'' وہ حیرت کے سمندر سے اُبھرا۔
''تمہاری شادی نہیں ہوئی؟'' ویملا نے سر نفی میں ہلایا۔
''تم نے صحیح کہا تھا، میں نے وہ جھوٹ واقعی اپنی اِجت بچانے کے لیے بولا تھا۔ مانتی ہوں کہ اِجت کے دشمن ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ پر جن میں مان مریادا ہو ان کے لیے یہی بہت ہوتا ہے۔ سمے سمے کی بات ہے رافع!'' وہ ایک آہ بھرتے کھاٹ سے اُٹھ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ ''کمزور پلوں میں وچار بدلتے اچھے بھلے منش برائی کر بیٹھتے ہیں۔ ایسوں کو واپس اچھائی کی راہ پر ڈالنے کے لیے ذرا سی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پر تم اتنے اچھے ہو رافع کہ شیطان تمہارے لیے برائی کے جتنے راستے سوجھا دے، تمہیں بھٹکا نہیں پاتا تم۔''
''تم نے خود کا اپہارن (اغوا) کیوں کروایا ویملا؟'' رافع کا دھیان کسی اور سمت میں سفر کررہا تھا۔ ویملا کے دل میں امنگوں کا جلتا وہ ننھا دیپک لو

دینے سے پہلے ہی بجھنے لگا۔

''اپہارن (اغوا)۔'' وہ دبے دبے چیخی۔ ''میں اپنا اپہارن کیوں کرواؤں گی؟''

''اُن پیسوں کے لیے جو ابوصالح تاوان میں تمہارے باپ سے لینے والا ہے یا شاید لے چکا ہو۔'' رافع کے بتانے میں ایسی سہولت تھی کہ ویملا کو اپنا آپ ایک دم بے کار، بالکل خاک لگا۔ وہ جسے دیوتا سمجھ رہی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا۔

''میں گھر سے ضرور بھاگی تھی رافع! پر میں نے اپنا اپہارن نہیں کروایا۔ تمہیں کوئی غلط گمان۔''

''تو گھر سے بھاگنا بڑی اچھی بات ہے۔'' وہ تنک کر بول گیا۔ ''گمان ہونا تو برابر ہے۔ اب کوئی کچھ بھی سمجھ لے، فرق تو تمہیں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔''

''لیکن میں نے اپنا اپہارن انہیں کروایا۔ وہ...... وہ بھی پیسوں کی خاطر اور یہ ابوصالح کون ہے؟'' وہ جھنجھلا اُٹھی۔

''تم گھر سے کیوں بھاگی تھیں؟'' رافع پھر اسے نہیں سن رہا تھا۔

''میں گھر کے حالات سے تنگ تھی۔ سوتیلی ماں، اس کے بچوں سے پریشان تھی، مجھے شانتی کی تلاش تھی اس لیے میں نے ایک آشرم والوں سے بات کی۔ ورشا دیدی اور رام جی کیشو گرو ہیں وہاں کے۔ وہ مجھے اپنا ایڈریس سمجھانے لگے پر میری بدھی میں کچھ سما نہیں رہا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں موسی کے گھر کچھ دنوں کے لیے حسن آباد جا رہی ہوں۔ دیدی نے کہا بٹیا! آپ آرام سے حسن آباد آ جائیں۔ ہمارا آشرم سندر بن کے پاس ہے۔ ہم وہاں سے آپ کو لے لیں گے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے بابو جی اس نرنئے سے خوش نہیں ہوں گے کیونکہ وہ جبردستی میرا بیاہ کروانا چاہتے ہیں۔ دیدی بہت آرام سے میری بات سنتی رہی تھیں۔

میں نے نکلنے سے پہلے انہیں ایک بار پھر کال کر کے اپنے روانہ ہونے کا بتایا، پر راستے میں مجھے خیال آیا کہ اگر میں موسی کے گھر پہنچ کر وہاں سے آشرم کے لیے بھاگی تو بابو جی موسی بے چاری کا جینا حرام کریں گے۔ میں نے حسن آباد سے تھوڑا پہلے ہی گاڑی سے نکل کر بس اسٹینڈ اور وہاں سے سندر بن جانے کا ارادہ کیا تب ہی ایک کار میں کچھ آدمی آئے اور مجھے بے ہوش کر کے ایک ڈاڑھی والے کے سامنے پہنچا دیا۔''

''وہی ابوصالح ہے۔'' رافع نے اسے اطلاع بہم پہنچا کر آگے کا راستہ آسان کیا۔

''میں نے دیکھتے ہی اُن سے سوال جواب شروع کر دیے کہ آپ رام جی کیشو ہیں۔ میں نے بڑھ کر اُن کے چرن چھوئے، ان کا حلیہ ویسے مجھے گرو جی جیسا نہیں لگا پر میں نے سوچا یہ شاید گروکل (ہندو دھرم کا مدرسہ) کے ٹیچر ہوں گے۔''

''اور تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ تمہیں بے ہوش کر کے زبردستی کیوں اٹھا لائے؟''

''میری تو مت ماری گئی تھی۔'' ویملا اب خود کو کوس رہی تھی۔ ''مجھے لگا انہیں جو بابو جی کی مخالفت کا بتا بیٹھی ہوں وہ شاید میرے کسی بھلے کے لیے ایسا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔''

''ہوں اور ابوصالح نے کیا کچھ کہا؟''

''مجھے یاد پڑتا ہے اس نے کچھ مزید سوال کر کے مجھ سے میرے بارے میں جان کاری لی۔ میں بھی سیدھے سبھاؤ سب بتاتی گئی۔ اس نے کہا کہ پانی کے راستے آپ کو آشرم پہنچانے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ ورشا دیدی وہیں آشرم میں آپ کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ پر یہ سب...... وہ اب کسی امید پر رافع کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''یہ سب کیا ہے رافع! اور میرے اپہارن کا کیا معاملہ ہے۔ کون ہے ابوصالح اور تت...... تم......'' وہ دل پہ ایک چوٹ سی محسوس کرتی ایک دم وہیں رُک گئی تھی۔

رافع نے اپنی سیاہ کالی گہری آنکھیں ذرا سا اونچی کر کے ویملا کی جانب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کسی بھٹکی ہوئی ہرنی جیسی مضطرب و متحیر دکھائی دیتی تھی۔

''جانتی ہو ویملا! تم اس وقت کہاں ہو؟'' وہ

گمبھیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔
''سندر بن......'' ویملا کی آواز ڈوبی ڈوبی سی تھی۔
''یہ سُندر بن بنگلہ دیش ہے ویملا! تم پانچ روز سے اپنے دیش کی سیما سے باہر ہو۔''
''بنگلہ...... دیش......'' بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ تو اتنے دنوں سے یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ سندر بن انڈیا میں ہے۔ بے آف بنگال پہ واقع اس حسین سرسبز جنگل کا چالیس فیصد اگر انڈیا میں تھا تو ساٹھ فیصد بنگلہ دیش میں آتا تھا اور دونوں ہی سندر بن کہلاتے تھے۔ وہ گھبرائی نظروں سے چُپ چاپ رافع کو دیکھے گئی۔
''ابوصالح نے تمہارے بابوجی سے کوئی دشمنی نکالنے کے لیے تمہیں کڈنیپ کروایا ہے۔ اور مجھ سے اس نے کہا کہ لڑکی اپنی مرضی سے ایسا کر رہی ہے کیونکہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اِدھر تم نے اپنے منہ سے سُویکار کرلیا کہ ہاں میں گھر سے بھاگی تھی اُوپر سے اپنی شادی کا جھوٹ بول کر میرا رہا سہا شک بھی دُور کر دیا۔ مجھے لگا تم نے بھاگ کر شادی تو کرلی اب گھر چلانے کے لیے تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔
''بابوجی کیا سوچتے ہوں گے اور وہ مجھے ڈھونڈ بھی رہے ہوں گے اور......'' وہ اب دیوانوں کی طرح بڑبڑاتی جارہی تھی۔
رافع منہ پہ ہتھیلی جمائے ابوصالح کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے بیک وقت اُن دونوں سے کھیل کھیلا تھا اور ابھی کتنا کچھ ایسا باقی تھا جس سے پردہ اُٹھنے کی ضرورت تھی۔ وہ اب ان تین آدمیوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے وہاں آئے تھے۔ اگر وہ اسے مارنے کی نیت پر تھے تو کس کے حکم سے؟ اور اگر ان کا مقصد ویملا کو کوئی نقصان پہنچانا تھا تو کیوں اور...... کمرے میں ویملا کی سسکیوں کی آواز سنائی دی تو رافع کچھ قدم چل کر اس کے پیچھے آیا۔ ہلکا سا اس کے کندھے کو چھوا اور وہ پلٹ کر اس کے شانے سے آلگی۔ اب وہ زاروزار رو رہی تھی۔
''مجھے اپنے بارے میں اور کچھ نہ بتانا رافع! میں کیول اپنے بل پہ گھر سے نکلی تھی، پر اب سوائے تمہارے ہر سچائی جھوٹ ہے۔ میرا وشواس نہ ٹوٹے۔ اب ایسا کچھ مت بولنا۔'' وہ دیوانوں سا اپنا ماتھا اس کے کندھے پہ رگڑ رہی تھی۔
''ایسا کچھ نہیں ہے ویملا!'' وہ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپتھپا رہا تھا۔ ''نہ اِس اپہارن میں میرا کچھ ہاتھ ہے، نہ آگے کی کہانی میں میرا کچھ رول تھا۔ میں ابوصالح کے دوست صمیم کی لانچ چلاتا ہوں۔ سیما (سرحد) پر پشوؤں (مویشیوں) کی لیگل سپلائی کا کام کرتا ہوں۔ تمہیں آئی لینڈ پہنچانے کا کام اس لیے ابوصالح نے مجھے سونپا کہ سندر بن کے راستوں سے جان کاری رکھتا ہوں، برسوں یہاں گائیڈ کے طور پہ کام کرچکا ہوں۔ یا پھر اتنا کہ اس کے آدمیوں کی نسبت ایک مہیلا کی جمہ داری اچھے سے نبھا سکتا ہوں۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میرے پاس تمہیں حیران کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ میں خود بڑا چینتیت ہوں۔ خود کو سنبھالو تاکہ مجھے بھی حوصلہ ملے۔'' وہ غیر محسوس طور اپنا آپ چھڑا کر کھڑکی کے قریب چلا گیا۔
''ہٹو وہاں سے۔'' ویملا نے تڑپ کر اسے کھڑکی سے دُور کیا۔ جانے وہ دشمن کہیں دُور گیا بھی تھا یا وہیں کہیں چھپا تھا۔
''میں تو باہر جاکر دیکھنا چاہتا ہوں اور تم ہو کہ......''
''بھگوان کے لیے ایسا مت کرنا۔ میں تمہیں کہیں جانے نہ دوں گی۔'' وہ دروازے کے آگے آگئی۔ رافع نے تاسف سے سر ہلایا۔
''اچھا ٹھیک ہے، کہیں نہیں جارہا۔ بیٹھ جاؤ وہاں۔'' وہ موبائل پہ ایک نمبر ملا کر بنگالی میں کسی سے بات کرنے لگا۔ ویملا بادلِ نخواستہ دور جا کر بیٹھ گئی۔
''تم گھاٹ پہ ہو؟'' رافع نے شمبھو کا نمبر ملایا جو مسافر بوٹ کا ملاح بھی تھا اور اکثر بوٹ میں ہی پڑ کر سو رہتا تھا۔
''تمہاری گاؤں آمد کا سنا تھا رافع! خیریت

تھی؟'' وہ کسی قدر تشویش زدہ سا لگا۔ ''ساتھ میں موشی بھی ہے؟''

''ماں نہیں ہے ساتھ۔ کسی اور مہمان کے ساتھ ہوں لیکن اب لگتا ہے کچھ خطرے میں ہوں۔ تمہاری مدد درکار ہے۔''

''کیا ہوا رافع؟ کیسا خطرہ اور وہ مہمان کون ہے۔''

ایک لڑکی کو بحفاظت کہیں پہنچانا تھا۔ مجبوراً گاؤں کی طرف آنا پڑا، پر لگتا ہے کوئی پیچھا کرتا ہوا آن نکلا ہے۔ مجھے اب کسی طرح اپنے گھر سے گھاٹ تک جانا ہے۔''

''کیا خبر وہ پیچھا کرتے نہ آئے ہوں بلکہ یہیں اپنے گاؤں سے ہوں۔'' شمو کے شک میں یقین سا جھلکتا محسوس ہوا۔

''مطلب؟'' رافع بے طرح چونکا۔ ''ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''موسی کو تمہارے گاؤں آنے کی خبر ہے رافع؟'' اس بار شمو نے نرمی و سنجیدگی سے استفسار کیا تو رافع کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''نہیں۔ ماں کو بتا کر نہیں آیا، لیکن تم یہ کیسی پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔''

''موسی کو بتاتے تو وہ کبھی کسی قیمت پر تمہیں یہاں نہ آنے دیتی اور اب تو مجھے پورا یقین ہے رافع تمہارا دشمن اسی گاؤں سے ہے۔ تمہیں یہاں بلا سوچے سمجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اچھا تم گھر سے مت نکلو۔۔ میں کسی طرح وہاں تک آتا ہوں۔''

''لیکن مجھے بتاؤ تو سہی.....''

''ابھی نہیں۔'' شمو نے موبائل آف کر دیا اور رافع نے ایک گہرا سانس بھرتے تھکی تھکی نگاہ دور بیٹھی دیملا پر ڈالی۔ قدرت بھی کہاں کہاں کے راہی کہاں ملا دیتی ہے۔ اب تک کے مصائب کو اگرچہ وہ دیملا کی مہربانی سمجھ رہا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں تھا پر آج وہ بے چاری شاید اس کی وجہ سے کسی مصیبت کا شکار ہو سکتی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اپنی شفاف نگاہیں اس پر کسی امید افزا خبر کے انتظار میں ڈالے بیٹھی تھی۔ وہ رسان سے مسکرایا۔

''ہمیں شاید ابھی گاؤں سے نکلنا پڑے۔''

''صبح کا انتظار بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ کسی خطرے کے احساس سے سہم سی گئی۔

دن کی روشنی میں ایک مثبت طاقت ہے، کئی منفی قوتیں کمزور پڑ کر ہمت کھو بیٹھتی ہیں۔ سورج کی راہ تکنا بذات خود اپنے اندر ایک تسلی رکھتا تھا۔ لیکن نفرتیں جب چاند سورج کی حدوں کو پھلانگ جائیں تو ایسے روشنی اور اندھیروں کے سہارے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ رافع نے نظر چرا لی۔ شمو کی تنبیہ اس لمحے کم از کم کچھ ایسا ہی کہتی نظر آئی تھی۔

''کب نکلنا ہے؟'' وہ اس کے تسلی سے کھڑا ہونے پر حیران تھی۔

''ایک دوست کا انتظار ہے۔''

''تمہارے وشواس کا تو ہے ناں؟'' وہ جانے کیوں رافع کا چہرا پڑھتے کسی خطرے کو اپنے بہت قریب محسوس کر رہی تھی۔

''دوست'' کہا ہے، وشواس بھی کرنا ہی پڑے گا۔''

''وہ کون تھے رافع! جو ابھی یہاں آئے تھے۔'' وہ اس کے بالکل پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہر سچ جان لینا چاہتی تھی۔

''کوئی میرے پیچھے ہے، میری جان کا دشمن۔'' وہ مزید چھپا نہیں سکا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا رافع!'' دیملا کے لہجے میں اگرچہ اعتماد تھا پر اس کی بھنورا کالی آنکھوں میں ستارے سا موتی چمکا تھا۔ رافع مسکرا دیا۔

''تمہیں بھی کشٹ میں ڈال دیا۔ کاش میں تمہیں یہاں نہ.....'' دیملا نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہاتھ آگے کر کے اُسے روک دیا۔

''تم مجھے بھی کچھ نہیں ہونے دے سکتے۔ یہ میرا وشواس ہے۔''

''میں بھی انسان ہوں دیملا، دیوتا سمجھنے کی

بھول نہ کرو۔"

"جس آدمی نے گزرے پانچ دنوں میں مجھے کسی امانت کی طرح سنبھالا، میں اسے دیوتا سمجھنے کی "بھول" نہیں کرسکتی۔ نہ خود کو اس کی امانت سمجھنے سے روک پائی۔ ہم جسے دل میں جگہ دیتے ہیں وہ ہمارے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں ہوتا۔"

"چلنے کی تیاری کرو ویملا!" وہ ان سنی کر کے پلٹنے لگا جب کلائی پکڑ کر ویملا نے روک دیا۔ رافع نے چونک کر اس کی سوئی سوئی نگاہ میں دیکھا تو پھر ہٹا نہیں پایا۔

"جیون کا تو یوں بھی پل بھر کا بھروسا نہیں اور جن حالات میں ہم بھاگ رہے ہیں موت، شاید سایے کی طرح ساتھ لگی ہے۔ آج چپ رہی تو میری آتما کو مرتیو کے بعد بھی چین نہیں ملے گا۔ آج کہنے دو رافع کہ ویملا نے جس سپنوں کے ساتھی کی برسوں پرستش کی ہے، وہ سوائے رافع محمد کے اور کوئی نہیں تھا۔ میرا نے شیام کی خاطر جوگ لیا تو میرے شیام کی تلاش بھی مجھے ان جنگلوں میں یونہی نہیں لے آئی۔ تم وہ ہو رافع کی جس کی خاطر عمر بھر کا جوگ لیا جاسکتا ہے، میں اپنے دل کو سمجھا نہ پانے پر خوش ہوں کیونکہ......"

"رافع!" پچھلی کھڑکی پر انگلی کی ٹک ٹک کے ساتھ سرگوشی میں اُسے اپنا نام سنائی دیا۔ کلائی ابھی تک ویملا کی گرفت میں تھی۔ وہ نرمی سے ہاتھ چھڑا کر کھڑکی کے قریب گیا۔ بنا کچھ بولے محض اندر کی طرف سے جوابی ٹک ٹک کی۔

"میں شمبھو!" آگے سے فوراً کہا گیا اور اِس بار رافع نے کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ یہ کھڑکی پیچھے کی دیوار میں تھی۔ پٹ کھولتے ہی شمبھو کا چہرا دکھائی دیا۔

"میں نے چاروں طرف دیکھ لیا ہے۔ ابھی تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ شاید تمہارے دشمن گھاٹ پر تمہارا انتظار کررہے ہوں۔ تمہارے لیے پیچھے کی ندی پر چھوٹی بوٹ کا انتظام کیا ہے۔ جلدی چلو۔"

"سامان وغیرہ ہے کچھ؟" رافع نے سوالیہ نظر ویملا کی طرف اٹھائی جس نے فی الفور سر نفی میں ہلایا۔ اپنے دُھلے کپڑے اس نے سوکھنے کے بعد دوبارہ پہن لیے تھے۔ ردی بھابی کا سوٹ وہ وہیں رکھے جارہی تھی۔ رافع نے کھڑکی پھلانگنے کے بعد ہاتھ پکڑ کر اسے بھی باہر آنے میں مدد دی۔ شمبھو نے کسی بھی قسم کی روشنی کرنے سے منع کیا تھا۔ وہ تینوں اندھیرے میں ہی ہلکی چاند کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ پچھلی ندی گھر سے نسبتاً کم فاصلے پر تھی۔ دشمن یقیناً سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی کشتی چھوڑ کر کسی اور راستے سے نکل جائے گا۔

"موسی نے ہمیں قسم دی تھی رافع کہ گاؤں سے ہمیشہ کے لیے جانے کی وجہ ہم کبھی بھی تمہیں معلوم نہ ہونے دیں، ورنہ تم یہاں سے جاؤ گے نہیں۔"

گھاٹ کے نزدیک پہنچ کر درختوں کے جھنڈ تلے وہ شمبھو سے اس کا الوداعی مکالمہ تھا۔

"ناؤ اور گھر کو جلادینے کے بعد دشمنوں نے موسی کو دھمکایا تھا کہ اگر وہ راتوں رات تمہیں لے کر یہاں سے چلی نہ گئی تو اگلی باری رافع کی ہوگی اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ناؤ اور گھر جلانے کے واقعے میں دھنی اور اُلفت ملوث تھے۔ آج بھی ان ہی کی زبانی میں نے جانا کہ تم گاؤں واپس آئے ہو۔ پر ان دونوں کے پیچھے بھی کوئی ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ بس ابھی کے لیے تم جاؤ رافع۔ یہی صحیح ہے۔"

وہ رافع کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ رافع نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور وہ اس کی پیٹھ تھپک کر تیز قدموں سے ناؤ کی طرف بڑھا۔

"اب جلدی سے نکل چلو۔ معافی چاہتا ہوں کہ کسی اچھی ناؤ کا بندوبست نہیں کرسکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" رافع نے اس کا کندھا تھپکا۔ "تمہارا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔"

"اور میں تمہارے لیے جتنا کچھ بھی کرلوں کم ہے۔ زندگی بچانے والا ہمارے ہاں بھگوان سے کم نہیں ہوتا۔" شمبھو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے اسے اس کا احسان یاد دلانا نہیں بھولا۔ کچھ دیر پہلے ویملا نے بھی

کچھ ایسے ہی ملتے جلتے الفاظ کہے تھے۔

لہروں کی روانی پر بوٹ کی موٹر آن کرتے وہ ساحل سے دُور ہوتے اب لمبی نم جھاڑیوں کی پشت پر چلے گئے تھے۔ندی یہاں بل کھا کر بائیں ہاتھ کو مڑتی تھی،اب گھاٹ سے ان کی کشتی کے درمیان پورا گھنا جنگل حائل ہوگیا تھا۔دل پہ ہاتھ رکھے گھبرا کر ساحل کو دیکھتی ویملا نے ایک سکون بھرا گہرا سانس چھوڑا۔ اب اگر دشمن گھاٹ پر آ بھی جاتا تو وہ ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو چکے تھے۔

ناؤ بہت چھوٹی سی تھی۔موٹر والے حصے میں رافع کھڑا تھا اور دوسرے کونے کے اُونچے تختے پر وہ بیٹھی تھی۔کشتی کے کناروں پر دوفٹ اونچی لکڑی کی حد بندی بنی تھی۔ویملا کے بالکل سامنے کچھ فاصلہ چھوڑ کر ایک اور تختہ بھی تھا۔وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ کھڑے کھڑے وہ تھک جائے گا،بیٹھ کر ناؤ چلا لے۔لیکن کہنے کے لیے جو ہمت درکار تھی وہ کچھ دیر پہلے کے اظہار نے ایسے چھینی تھی کہ اب وہ خود سے بھی نظریں چرائے ہوئے تھی۔دل کہتا اب یہ وقت رافع کے بولنے کا ہے۔اپنے حصے کی جرأت دکھا چکنے کے بعد اب وہ مقابل کے خیالات جاننے کی مشتاق تھی۔

مقابل جو اس کی طرف پشت کیے لہروں سے نبرد آزما جانے کیا سوچ رہا تھا۔ویملا کی نسوانیت اس سے زیادہ حوصلے کی اپنے اندر تاب نہ رکھتی تھی۔ عورت کی زندگی زیادہ تر ''جواب'' ہی کے دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔مثبت ردِعمل،جوابی کارروائی اور حوصلہ افزا رسپانس مِل جائیں تو اظہار کی تکمیل ہوجاتی ہے اور اگر نہ ملے تو وہ انا کی جنگ میں جیتنے کا عزم لے کر دل کو خود اپنے ہاتھوں مار دیتی ہے۔

اور ویملا کی جانب پشت کیے دُور اُفق میں تاروں بھری رات کو تکتے وہ آنے والے پلوں کے حوالے سے تذبذب کا شکار نظر آتا تھا۔اپنے گاؤں سے افراتفری کے عالم میں نکلتے اب اس کا رُخ کوٹکا بیچ کی طرف تھا۔ابوصالح سے کوئی رابطہ نہ کرنے کا تہیہ کرتے اب وہی ایک ایسی جگہ بچی تھی جہاں سے ر افع جدید طرز کی کوئی لانچ کرائے پر لے کہ جلد از جلد ویملا کو بارڈر پار کروا سکتا تھا۔

وہ جو سراسر اپنی بے وقوفی اور نادانی کے ہاتھوں یہاں آن پھنسی تھی،اس کے علاوہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔رافع کے مدنظر اب صرف اُسے بحفاظت اس کے ملک پہنچانا تھا۔اُس نے سوچ لیا تھا کہ کوٹکا سے لانچ کرائے پر لیتے ہی وہ کھلے سمندر کے راستے سیدھا انڈین بارڈر کے نزدیک پہنچتے تھوڑا سا اندر سندر بن میں داخل ہو کر کسی ویران جگہ سے ویملا کو دوسری طرف بھیج دے گا۔

ایک بار ویملا اس پار چلی جائے۔ابوصالح وغیرہ سے بعد میں اکیلے نمٹنا قدرے آسان تھا۔فی الحال اُسے صرف ایک پریشانی تھی کہ آیا اِس بوٹ کا ایندھن انہیں کوٹکا تک پہنچا پائے گا یا نہیں۔دریائے بھولا سے وہ بتمور گنگ کے راستے کوٹکا پہنچنا چاہتا تھا۔اس بار بجائے تنگ گنجلک ندیوں کے اُس نے سیدھا صاف راستہ اپنایا تھا تاکہ ایندھن بچایا جاسکے۔خطرہ صرف پولیس بوٹ سے تھا لیکن بہرحال رسک اُٹھائے بنا چارہ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

''کیا کر رہے ہیں تمہارے لوگ۔'' ابوصالح نے بے تابی سے گھڑی سامنے کی۔رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔اُس کے کان صبح سے ہاشم کی گھنٹی پر لگے تھے کہ کب وہ کال کر کے یہ خوش خبری سنائے کہ رافع کا کام تمام ہوگیا اور ویملا کو مونگلا روانہ کردیا گیا ہے لیکن کہاں صبح سے دوپہر،شام اور پھر رات آگئی۔ تنگ آکر ابوصالح نے خود ہی ہاشم کو فون ملا دیا۔

''کام ذمے لگا دیا ہے،فکر نہ کرو صالح! سب ہوجائے گا۔'' ہاشم جانے کس سلسلے میں بے زار، اُکتایا سا بیٹھا تھا۔ابوصالح کو اور پتنگے لگے۔

''تڑکے جب وہ گاؤں کی حدود سے باہر نکل جائے گا تب کچھ کریں گے تمہارے آدمی۔''

''اُفوہ۔کہا نہ کام ہوجائے گا۔آدمی گھاٹ پہ پہرا دے رہے ہیں۔جس وقت بھی وہ روانہ ہونے

کے لیے وہاں پہنچے گا، وہ اس کا کام تمام کرکے لڑکی تمہارے پاس لے آئیں گے۔"

"وہ بہت ہوشیار ہے ہاشم۔ اگر اُسے بھنک بھی پڑ گئی کہ کوئی اُس کی جان کے درپے ہے تو وہ کچھ اور سوچ لے گا۔"

"تم تو یوں گھبرا رہے ہو صالح جیسے رافع کوئی جن بھوت ہو۔" ہاشم نے اس کا مضحکہ اُڑایا۔ "اب ناؤ لیے بنا کیسے نکلے گا گاؤں سے۔"

"میں بس یہ چاہتا ہوں کہ صبح کا انتظار کرنے کے بجائے اسے اس کے گھر میں ہی ختم کردو۔"

"ہاں ہاں ایسا کر لیتے ہیں۔" ہاشم جواباً اسے بتا نہیں سکا کہ گھر میں مارنے کی کوشش پہلے ہی ناکام ہو چکی ہے۔ وارخطا جانے کی بات بتا کر وہ ابو صالح کے غصے اور مذاق کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ البتہ کال بند ہونے کے بعد اپنے آدمیوں کو تنبیہہ کرنا نہیں بھولا کہ وہ گھاٹ پر انتظار کرنے کے بجائے گھر پر حملے کی ایک اور کوشش ضرور کریں۔

☆☆☆

گہری کالی نہایت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی اُس پُرفسوں رات کا رُعب رافع کی پیشانی اور تنے اعصاب سے بخوبی جانا جا سکتا تھا۔ اندر کی اکھاڑ پچھاڑ اور اعصابی تناؤ نے اس کی زبان گنگ کر رکھی تھی۔ ویملا کچھ دیر پہلے تک جس خاموشی کو اس کی بے رخی سے تعبیر کر رہی تھی اب اُسے بری طرح پریشان و مضطرب کرنے لگی تھی۔ رافع کی غایت درجہ سنجیدگی قابلِ تشویش تھی۔ وہ اب اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے نزدیک جانے کی ہمت مجتمع کرتے کچھ کہنے کو الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔

"ویملا! نیچے جھک جاؤ۔ بالکل گٹھڑی سی ہو کے۔" رافع کی گھبرائی، قدرے حواس باختہ سی آواز کانوں سے ٹکرائی اور ناؤ کا رُخ اُس نے کنارے کی طرف موڑ دیا۔ بوٹ کے خشکی سے ٹکراتے ہی اُس نے تیزی سے نیچے اُتر کر ویملا کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ ایک دم گھبرائی ہوئی نیچے اُتری لیکن رافع نے بنا جواب دیے کشتی کو خشکی پر کھینچ کر جھاڑیوں کے پیچھے کیا اور اُسی تیزی سے ویملا کی کلائی تھام کر اندر جھنڈ کے حصے میں آیا۔ ویملا کو مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

خاموشی کی مہین چادر کو ایک لانچ کی آواز نے چاک کیا تھا۔ ویملا کو حیرت ہوئی کہ اُسے کیوں پہلے یہ آواز سنائی نہ دی تھی۔ رافع شاید اُس کی نسبت زیادہ چوکنا تھا۔ لانچ کا رُخ بھی یقیناً اُسی طرف تھا جہاں وہ دونوں چھپے ہوئے تھے۔ آواز لحظہ لحظہ قریب آنے لگی۔ ویملا کے قدم بے اختیار ہی مزید پیچھے ہونے لگے۔ لیکن رافع نے دفعتاً کندھے سے دبوچ کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور دونوں بازوؤں کے گھیرے میں بھر لیا۔

"درختوں کے قریب مت جاؤ ویملا!" سرگوشی سے بھی نیچی آواز ویملا کے کان کے انتہائی قریب سرسرائی اور وہ اپنے دھڑکتے بے قابو دل کو اپنے روئیں روئیں میں محسوس کرنے لگی۔

"یہاں چپے چپے پہ سانپ اور زہریلے حشرات ہیں جو رات کے وقت خصوصاً اپنے بلوں سے باہر آجاتے ہیں۔ شاخ پہ لپٹے سبز سانپ تو شاخ ہی کا انگ محسوس ہوتے ہیں۔ خوب قریب سے دیکھنے پر بھی پہچاننا مشکل ہے۔"

وہ دھیمے دھیمے وضاحت کر رہا تھا اور ویملا کی زبان اس کے خشک تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ رافع کو نہایت ایمرجنسی میں جس خطرناک علاقے میں اترنا پڑ گیا تھا۔ اس کی سنگینی و خطرناکی سے واقفیت کی بنا پر وہ ایک حصار بن کر ویملا پر چھایا تھا۔ اُن لمحوں میں سوائے اپنے اور ویملا کے دفاع کے کچھ اس کے ذہن میں کچھ نہ تھا۔ لانچ قریب آتے آتے بالآخر اُن کے پاس سے گزر گئی تھی۔ وہ نیلے رنگ کی ایک لمبی پولیس بوٹ تھی جو غالباً معمول کے گشت پر تھی۔ رافع نے بروقت خود کو چھپا کر ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات پائی تھی۔ رات کے وقت ان علاقوں میں ہر قسم

کا سفر ممنوع تھا۔ ایسے میں تنہا ایک لڑکی کے ساتھ پایا جانا۔ اُن کی صبح تو سیدھے پولیس اسٹیشن میں ہونا تھی۔

''اُف......'' بوٹ کے مڑ کر غائب ہوتے ہی رافع نے گہری لمبی سانس چھوڑ کے ہنس کر اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے غیر ارادی اک نگاہ ویملا پر ڈالی۔ سبز دوپٹے کو پھیلا کر خود کو سمیٹتی وہ نظریں چُرائے ایک دم حواس باختہ سی نظر آئی۔ لب بھینچ کر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہوتے رافع کو پہلی بار کچھ دیر پہلے کی صورت حال کا ادراک ہوا اُس وقت جبکہ وہ مکمل طور پر بوٹ کی آگے آتی آواز، جھولتے درختوں کی شاخوں اور نیچے پیر میں کسی چیز کے اچانک آجانے کے خدشے سے نبرد آزما تھا۔ ہرگز اُس نازک ریشمی ڈور میں نہیں اُلجھ پایا تھا جس کے خفیف اثرات اب بھی ویملا کے چہرے پر صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

''چلو۔'' وہ خود ہی کشتی کی طرف بڑھ گیا۔

''اگر وہ گشت کرتے دوبارہ......''

''بہت مشکل ہے۔'' رافع کشتی کو دھکا دے کے پانی میں ڈالنے لگا۔ ''گشت کرنے والوں کے پاس ایریا اتنا بڑا ہے کہ بار بار ایک ہی جگہ چکر کاٹنا سوائے کسی سندے (شُبے) یا خاص اطلاع کے بالکل ممکن نہیں۔ ویسے بھی ہم تو دوسری سمت میں جارہے ہیں۔'' وہ بوٹ پر سوار ہوتے اب اُسے پھر سے اسٹارٹ کر چکا تھا۔

''ہم اب جا کہاں رہے ہیں؟'' ویملا کے لیے حیران کن باتیں بھی اب معمول کی بات ہوگئی تھیں۔ رافع نے معلوم نہیں کیوں ایک سرد آہ کھینچی۔ ویملا کو یہ خلافِ توقع ردِعمل جانے کیوں تشویش ناک سا لگا۔

''کوئی پریشانی ہے؟'' وہ پیچھے سے اُٹھ کر درمیانی تختے پر قدرے نزدیک آ بیٹھی۔

''یہاں کے راستوں میں، رات کا سفر بہت رسکی بلکہ صاف کہوں تو جان لیوا ہے ویملا! ہلکا سا رُخ موڑ کر ویملا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ اب دھیرے دھیرے اپنی پریشانی کی وضاحت کرنے لگا۔ ''میرے پلان میں پہلے دن سے ایک بھی ایسا سفر نہیں تھا جسے میں رات کو انجام دوں، کچھ بھی کر کے رات کو میں ہر صورت آرام کا ٹھکانا ڈھونڈتا۔ لیکن یہ بڑی بیڈلک ہے ہم دونوں کی کہ لگاتار شاید چوتھی یا پانچویں رات ہے کہ ہمیں اندھیروں میں نکلنا پڑ رہا ہے اور ابھی جس جگہ ہم جارہے ہیں، وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے لیکن بوٹ کا ایندھن شاید وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوجائے اور ویسے بھی ان خطرناک پانیوں پر رات کے وقت چھوٹی سی بوٹ کا سفر بہت خطرناک ہے۔ مگرمچھ کا ایک دھکا ہمیں ناؤ سمیت پانی میں ڈبو سکتا ہے۔''

''اوہ۔'' ویملا نے پریشانی سے لب کاٹے۔ رافع کی تشویش اب پہلی بار ٹھیک ٹھیک سمجھ میں آرہی تھی۔ اِس سے پہلے وہ لوگ مسلسل لانچ سے سفر کررہے تھے۔ جو ہر لحاظ سے نہ صرف محفوظ تھی بلکہ جدید اور تیز بھی تھی۔ اُوپر سے رات کا سفر۔ شرن کھولا سے ایک بار پھر وہ سندر بن میں گھس آئے تھے۔ منزل تو ویملا کو اب بھی معلوم نہ تھی، پر رافع پر ہر دن، ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا بھروسا کسی وہم میں مبتلا ہی نہ ہونے دیتا۔

''تو پھر؟ خطرناک پانی میں لگاتار ناؤ چلانے کے علاوہ کیا تھا اس کے دماغ میں۔'' ویملا نے اپنی سوالیہ نگاہ اُس کے پُرسوچ چہرے پر جمائی۔

''ہے ایک جگہ ذہن میں۔'' وہ دھیان کسی انجان سمت میں لگائے آہستہ سے بڑبڑایا۔ ویملا اپنی سہمی، گھبرائی سی نگاہیں چاروں اور گھماتے لہروں کے ارتعاش پر جمائے ہوئے تھی۔

''تھینکس گاڈ۔'' رافع ایک بھرپور سانس کھینچ کر مسکرایا تو ویملا نے چونک کر سر اٹھایا۔ رافع مسکراتے ہوئے کسی خاص جگہ پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ویملا نے نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو سوائے درختوں کے جھنڈ کے کچھ نظر نہیں آیا۔ دریا سے اب وہ ایک بار پھر بل کھاتے ایک اور ذیلی

راستے کی طرف مُڑ گئے تھے۔
''او.....'' ویملا بھی ایک خوش گوار حیرت محسوس کرتے ہوئے مسکرادی۔ جھنڈ کے پار اب ایک واچ ٹاور صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ ایسی جگہ جہاں پانی اور خشکی دونوں ہی خطرناک ہوں، واچ ٹاور جیسی کسی جگہ پہ پناہ لینا انتہائی محفوظ تھا۔ صبح ہونے میں ابھی چونکہ بہت وقت پڑا تھا اس لیے کہیں رُکنا بہت ضروری تھا۔ ایسے دریا جن میں سانپ آزادی سے لہراتے پھریں اور خشکی ایسی...... جہاں چوکنا ہوکر پوری رات بیٹھا تو جاسکتا ہو پر آرام کے بارے میں سوچا بھی نہ جاسکے، واچ ٹاور کی موجودگی زندگی بن کر وجود میں لہراتی محسوس ہوئی۔
''وہاں کوئی ہوگا تو نہیں؟''
''سمجھاونا تو نہیں ہے۔'' رافع نے اپنی بوٹ ایک مرتبہ پھر جھاڑیوں کے پیچھے چھپادی تاکہ دریا سے کسی کا گزر ہو تو اُنہیں کسی کی یہاں موجودگی کا شک نہ ہونے پائے۔
''آؤ۔ دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ آگے روانہ ہوا۔
خشک راستے کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں لیکن درمیان میں کچا اور چوڑا ایک طویل راستہ تھا۔ سیاحوں کو اِن علاقوں میں سیر کرانے والی کشتیاں ایسے مقامات پر ضرور رُکتیں۔ اِن واچ ٹاورز سے سندر بن کی خوب صورتی کو اونچائی سے باآسانی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا تھا۔ سیمنٹ سے بنا یہ بالکل سادہ پرانے طرز کا واچ ٹاور میونسپل کارپوریشن کی پانی والی اونچی ٹینکی سے مشابہ تھا۔ قریب چھ ضرب چھ کی چوڑائی اور پینتس سے چالیس فٹ اونچائی والے اُس ٹاور کی چار منزلیں تھیں۔ ہر منزل پر جانے کے لیے لوہے کی سیڑھیاں بنی تھیں۔
قریب پہنچنے پر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تو رافع نے اطمینان سے پاؤں سیڑھی پر رکھ دیے۔ ویملا نے بھی پیش قدمی کی۔ ویملا کے لیے کسی واچ ٹاور پر آنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہر منزل پر سیمنٹ کا پکا فرش اور لوہے کا جنگلہ لگا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے سب سے اوپری منزل پر آئے جس کی تکونی چھت تھی۔ ویملا تھک کر لکڑی کے فرش پر بیٹھ گئی۔
''بھگوان بھلا کرے بنانے والوں کا۔'' اُس نے باقاعدہ آلتی پالتی مار کر حد بندی سے ٹیک لگائی۔
رافع ہنس پڑا۔
''بالکل۔'' وہ بھی عین اس کے سامنے اسی کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ''سوچا نہیں تھا کبھی واچ ٹاور پہ بھی گھر جیسا سکون مل سکتا ہے۔''
''ہاہاہا...... ویملا کا قہقہہ بے اختیار تھا۔ ''ایسا ویسا۔ مجھے تو سچی ممی کی گود یاد آرہی ہے۔''
''تمہاری ممی۔'' رافع مسکراتے ہوئے رُکا۔
''یاد آرہی ہے اُن کی، پر وہ تو سنا ہے۔'' وہ دانستہ رُکا۔
''ہاں۔ گزر گئیں۔ بہت پہلے۔'' ویملا نے ایک آہ کھینچی۔ ''لیکن۔ سُنا ہے کا کیا مطلب؟ تم نے کہاں سے سنا ہے۔'' وہ ازحد حیران تھی۔
''اور کہاں سے۔ ابوصالح بتا رہا تھا کہ لڑکی اپنے گھر کے حالات سے تنگ ہے۔ باپ نے سوتیلی ماں سر پر بٹھادی وغیرہ وغیرہ۔''
''لوگوں کو کیسے خبر ہوجاتی ہے ایسی باتوں کی۔'' وہ بے یقین تھی۔
''دونمبر دھندے والوں کا پہلا کام ہی اگلے کی خبر رکھنا ہوتا ہے۔''
''تم اُس کے لیے کام کیوں کرتے ہو رافع۔''
''ایسے لوگوں کو ایک آدھ صاف ستھرا کام بھی شو کرنا پڑتا ہے۔ صرف اپنے بچاؤ اور دنیا کے دکھاوے کے لیے، میں بارڈر پر مال کی لیگل سپلائی کا کام کرتا ہوں۔ ماں نے تو دو سال پہلے غربت کے طعنے مار کر گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا لیکن......'' اصل کہانی ابھی کچھ دیر پہلے ہی شمبھو سے پتا چلی۔ رافع نے سر پیچھے لکڑی کے جنگلے سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ دونوں ہاتھ اُس نے سامنے اُٹھے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔
''اصل کہانی؟''

''ماں کو کچھ لوگوں نے دھمکایا تھا کہ اگر اپنے بیٹے کو لے کر جلد از جلد وہ گاؤں چھوڑ کر نہ گئی تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے، لیکن می نے مجھ سے یہ بات چھپائی۔''

''اُسے لگا ہوگا تم طیش میں آ کر بہادری دکھانے کی کوشش کرو گے۔'' ویملا نے مسکرا کر اندازہ لگایا، رافع نے ہنس کر تائید کی۔

''لیکن گاؤں والوں کو تم سے کیا بیر تھا؟''

''پورے گاؤں کو نہیں۔ بس صرف وہ لوگ جنہیں جانوروں سے میرا لگاؤ پسند نہیں تھا۔''

''مطلب؟''

''پیسے کی خاطر لوگ کیا نہیں کرتے ویملا۔ معصوم جانوروں کی اسمگلنگ کے کچھ معاملات تھے۔''

''ہوں۔'' ویملا نے تاسف سے لب دبائے۔ ایک نظر رافع کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرا دی۔ ''تمہیں نیند آرہی ہے رافع؟''

''تمہیں نہیں آرہی؟'' وہ ہنوز آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ ویملا نے جواب اپنے لبوں میں دبا لیا ورنہ کہنا چاہتی تھی۔ تمہاری نیند پہ رشک آتا ہے رافع۔ شاید ویملا وہ خوش نصیب نہیں جو رافع محمد کی نیند چرانے کا باعث بنے۔ اب سے کچھ گھنٹے پہلے اُس نے زندگی بھر کی ہمت جُٹا کر جن خوبصورت انمول الفاظ کا سہارا لیا تھا، رافع کی نظر میں وہ قطعی بے مول تھے۔ ویملا کو درد ہوا تھا اس ادراک سے۔ پر ایسا درد کہ جس کی چبھن کو شاید وہ کبھی اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''سو گئیں؟'' رافع کی آواز پر پہلے وہ چونکی پھر مسکرا دی۔

''نہیں۔ پر تم کیوں جاگ رہے ہو۔''

''تمہاری موجودگی میں مجھے نیند نہیں آتی۔''

عجیب سیدھا سادا وار تھا۔ ویملا کا چہرہ یک لخت دھواں دھواں ہوا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' دل ڈوب کر اب اُبھرنے کی سعی ناتمام میں مگن تھا۔

''ذمہ داری کا احساس مجھے کھل کر سکون نہیں لینے دیتا۔ اب چاہوں بھی تو سو نہیں پاؤں گا۔'' اُس نے خراب موڈ کے ساتھ مطلع کیا اور ویملا پھیکا سا ہنس دی۔

''بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ کہیں بھاگ تھوڑی جاؤں گی۔''

''اچھا؟'' اُس نے ذرا کی ذرا ایک آنکھ کھول کر ویملا کو دیکھا۔ ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اور اب کیوں نہیں بھاگتیں؟''

''نہیں بھاگ سکتی۔'' وہ بس آہستہ سے بڑبڑائی تھی۔ ''کہاں جاؤں گی بھلا۔''

''کیا سچ مچ تمہیں ایسا لگا تھا ویملا کہ آشرم جا کر تمہیں ساری پرابلمز سے مکتی مل جائے گی۔'' وہ ایک دم بیدار ہو کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ ویملا کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

''میں نے زیادہ وچار نہیں کیا تھا۔ بس مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ اور کچھ دن اس گھر میں رہی تو مانسک روگی بن جاؤں گی۔ ماں کی محبت سے تو گئی ہی تھی۔ باپ نے آنکھوں کے سامنے رہتے آنکھیں پھیر لی تھیں۔''

''جیون بڑا کٹھن ہے ویملا!''

''جیون میں کون ہے جو دُکھی نہیں ہے، نراش ہو کر بھاگ جانا تو کوئی اُپائے نہیں۔ انسان میں اتنی توسہن شکتی ہونی چاہیے کہ وہ پرابلم کو فیس کرے۔''

''تمہیں میری وجہ سے بہت تکلیف اُٹھانا پڑ رہی ہے ناں۔'' ویملا کو آخری جملہ جانے کیوں کانٹے سا چبھا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی اُس کی سنگت میں اور وہ......

وہ اِس سفر کی بے آرامی اور مشکلات پر بات کر رہا تھا اور رافع نے اپنی تقریر کے ایسے ردِ عمل پر ہنستے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لڑکیوں کو کچھ سمجھانے سے بہتر ہے بندہ دیواروں سے خطاب کر لے۔

''اب ہنسے کیوں؟'' وہ خفا ہو گئی۔

''مجھے نیند میں ہنسنے کی عادت ہے۔'' اُس نے اپنا رومال پورے منہ پہ ڈال لیا۔ ویملا برے برے منہ بناتی وہاں سے اُٹھ کر تھوڑا دور جا لیٹی۔

☆☆☆

''اے ویملا! اُٹھو۔ جلدی......'' وہ اس کا کندھا ہلاتے عجلت میں مخاطب تھا۔

''ہوں؟'' وہ آنکھیں چندھی کر کے اُسے غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔

''ارے بھئی روشنی ہونے والی ہے۔ کوئی بھی یہاں پہنچ جائے، اُس سے پہلے ہمیں نکلنا ہے۔'' وہ اُس وقت پوری طرح بیدار اور چست لگ رہا تھا، جانے کب جاگا تھا۔

''چلو شاباش۔'' وہ آگے آگے تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر گیا۔

''اب ہم نے کہاں جانا ہے اور تم کہہ رہے تھے ہماری بوٹ کا ایندھن ختم ہے۔'' وہ بھاگ بھاگ کر اس کے پیچھے آرہی تھی۔ رافع کے انداز میں عجلت ہی اتنی تھی۔

''بس تھوڑی دُور بیچ تک جانا ہے۔ اتنا ایندھن تو ابھی ہے۔'' وہ اپنے موبائل کو اونچا کر کے سگنل ڈھونڈ رہا تھا۔

''اور بیچ پہ کیا کریں گے؟''

''سمندر کی سیر۔'' رافع ابرو اٹھا کر تر چھا دیکھتے مسکرایا۔ ''تم نے اب تک کے سفر میں سمندر نہیں دیکھا ناں۔''

''کبھی تو کچھ سیدھا سیدھا بتایا کرو۔'' وہ جھلا گئی۔

''ہوں۔ ساحل آنے دو، بتاتا ہوں۔'' وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ ویملا کو خوشی کی وجہ جاننے کی جلدی ہوئی۔ رافع نے بوٹ اسٹارٹ کرلی تھی۔ ندی سے گھوم کر وہ بڑے دریا میں آئے اور وہ بڑا دریا چند منٹوں میں انہیں ایک وسیع و عریض سمندر میں لے آیا۔ لیکن رافع نے بجائے کھلے سمندر میں بوٹ ڈالنے کے وہیں اندر دریا کے بائیں طرف ریتیلے ساحل پر روک دی۔ ویملا کا منہ اور آنکھیں حقیقی حیرت سے کھل گئی تھیں۔

''بس۔ اتنے قریب۔ رات کو واچ ٹاور پر اندھیرے اور تھکاوٹ کی وجہ سے وہ آس پاس پہ بالکل دھیان نہیں دے پائی تھی۔ ورنہ ضرور یہ سمندر اسے اوپر سے بھی دکھائی دیتا۔

''ہاں۔'' رافع نے نیچے اُتر کر بوٹ کو بائیں ہاتھ پہ ریت پر چڑھا دیا۔ صاف کشادہ ساحل دُور تک خاموش، ویران پڑا تھا۔ رافع تسلی سے ریت پر بیٹھ گیا جیسے یہاں آیا ہی صبح کی ٹھنڈی نم ریت کو محسوس کرنے ہو۔ ویملا اپنے اُلجھے بالوں کو ہاتھ سے درست کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔

''تھوڑا اور انتظار کرلو پھر تمہیں نہانا، کھانا، کپڑے کنگھی سب نصیب ہونے والا ہے۔'' وہ کافی فریش موڈ میں پھر دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔

''اچھا۔'' وہ حیرت دباتی قریب ہی ریت پر آبیٹھی۔ ''کیا میرے گھر۔ انڈیا؟'' دل جانے کیوں ڈوب کر اُبھرا تھا۔

''نہیں۔'' ہاتھوں سے ریت جھاڑتے رافع سنجیدہ ہوا۔ ''وہاں سامنے دُور جو کنارا تمہیں دکھائی دے رہا ہے ناں۔'' رافع نے بالکل سامنے انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ اس وقت بیچ پر یوں بیٹھے تھے کہ سمندر کا بڑا اور وسیع حصہ ان کے بائیں ہاتھ پہ تھا اور جس دریا سے وہ ابھی ابھی نکل کر آئے تھے اس کے دوسرے دور کے کنارے کی طرف ان کا منہ تھا۔

''وہ کوئٹکا بیچ ہے۔ کل اپنے گاؤں سے نکلنے پر کوئٹکا بیچ ہی میری منزل تھا۔ وہاں میرے چند ساتھی ایسے ہیں جن سے میں ایک بڑھیا لانچ لے کر تمہیں سمندر کے راستے انڈین بارڈر پر لے جاسکتا ہوں۔ لیکن ہمیں ریسٹ کرنے کے لیے واچ ٹاور مل گیا تھا تو...... اِس لیے میں نے صبح اُس سے بات کی۔ وہ کہتا ہے یاٹ کا انتظام تو ہو جائے گا پر کل صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تو...... یہ پورا دن ہم یہیں رہیں گے۔''

''نہیں۔ یہاں پورا ایک دن اور ایک رات گزارنا تو ناممکن ہے۔ ہمیں یہاں سے ایک دوسرے گاؤں جانا پڑے گا۔ رزاق نے بتایا کہ ہماری لانچ پتھر گھاٹا سے آنی ہے۔ وہ یہاں سمندر سے بائیں ہاتھ کافی آگے جا کر ہے۔''

''لیکن ہماری بوٹ تو؟''

''ہاں ہم اس میں نہیں جا رہے۔ یہ بوٹ بھی رزاق کا ایک آدمی آکر لے جائے گا۔ پھر تمہیں چھو

کر واپس آکے یہ میں شمبھو تک کسی طرح واپس پہنچادوں گا۔ ہم ایک مسافر بوٹ میں جارہے ہیں۔ کونکا سے ابھی ایک سیاحوں کی بوٹ پتھر گھاٹا جارہی ہے اور وہ یہیں سے گزرنے والی ہے۔ ہم پتھر گھاٹا تو نہیں جارہے، کیونکہ وہ کافی دور ہے۔ اُس سے تھوڑا پہلے ہرین گھاٹا آتا ہے۔ وہاں میرے ماما کا گھر ہے۔ ہم ایک دن وہاں رہیں گے۔"

"او......" ویملا کی سمجھ میں اب سارا معاملہ آیا تھا۔ "تو اسی لیے تم گھر کے آرام اور کھانے پینے کا کہہ رہے تھے اور تم اتنا خوش بھی اسی لیے ہو رہے ہو کہ ماماجی سے ملاقات ہوگی۔"

"ہوں۔" رافع اپنی ہنسی چھپاتے دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"کون کون ہے ماما کے گھر؟" ویملا کی چھٹی حس جانے کیوں کچھ عجیب سے اشارے دے رہی تھی۔

"ماما، مامی، اُن کی تین بیٹیاں۔" رافع نے آرام سے اطلاع دی، تین بیٹیوں کے ذکر پر ویملا نے چونک کر سر اٹھایا لیکن اس سے پہلے ہی رافع اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بوٹ آرہی ہے۔ آجاؤ۔" وہ کپڑوں سے ریت جھاڑتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ کسی قدر بجھے دل کے ساتھ ویملا بھی پیچھے ہولی۔ مسافر بوٹ میں اس وقت بہت کم لوگ تھے۔ ویملا اور رافع خاموشی سے کونے کے ایک بنچ پر ٹک گئے۔

"آشا تو ہے کہ چیکنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔" رافع نے ذرا سا اس کے قریب کھسکتے ہوئے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

"لیکن اگر کوئی آئی ڈی کارڈ دکھانے کا کہے تو جھٹ ہو کر بول دینا، گھر پہ بھول گیا ہے۔ اپنا اصل نام نہ بتانا کوئی اور نام سوچ لو جیسے......" رافع رُک کر غور کرنے لگا۔

"شرینہ کہہ دو۔" اُس نے سر اُٹھایا۔ ویملا جو بڑے دھیان سے اُسے سن رہی تھی۔ فوراً ہاں میں سر ہلایا۔

"کبھی کبھار کسی شک کے کارن دو لوگوں کو الگ الگ لے جا کر جان کاری لی جاتی ہے۔ خود کو ایشوری پور بنگلہ دیش کا بتانا اور میری بیوی ظاہر کرنا۔" آخری جملہ نظریں چُرا کر بولا۔ ویملا کے لب مسکرانے لگے۔ دوسری جانب دیکھتے رافع کو اُس گھڑی ویملا نے بڑے انہماک سے دیکھا تھا۔

"کاش......" وہ محض آہ بھر کے رہ گئی۔

"لانچ نے ایک نئی منزل کی طرف لہروں پہ بھاگنا شروع کیا اور رافع نے جنگلے پہ بازو لمبا کر کے اس پہ ٹھوڑی ٹکاتے دُور تک نظر آتے نیلے پانی کو دیکھا۔ ماماجی کی تین بیٹیوں میں سے دوسرے نمبر والی سومیہ وہ تھی جس سے رافع کا بچپن سے رشتہ طے تھا۔ اُبھرتے سورج کی ٹھنڈی مدھم روشنی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی منگیتر کو سوچ کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ہرین گھاٹا پہنچے تو صبح کا اُجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ شکیبہ نے کہا تھا، ماماجی اور مامی اس کے نئے کام کی وجہ سے ناخوش ہیں حتیٰ کہ انہوں نے سومیہ کے لیے کوئی اور رشتہ تک دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ جانے رافع کی اپنے ہاں موجودگی پر وہ کیسا ردِعمل ظاہر کرتے۔ وہ کچھ نروس سا ماماجی کے گھر آیا تھا کیونکہ بجائے اپنے رویے اور عمل سے ان کی کدورت مٹانے کے، وہ تو ویملا کی صورت ان کے شکوک وشبہات کو کچھ اور تقویت دینے آگیا تھا۔ فی الحال ویملا کو وہ گھاٹ پر ہی انتظار کرنے کے لیے بٹھا آیا تھا۔

اپنے استقبال کے حوالے سے ملے جلے خیالات لیے وہ جب ماماجی کے ہاں پہنچا تو پریشانی خود بخود کچھ زائل ہوتی سی محسوس ہوئی۔ وہاں تو مامی جی کی بہن کی رسم مہندی کے سلسلے میں تیاریاں جاری تھیں۔ مامی کا میکہ بالکل پاس میں ہی تھا۔ ماما جی کے گھر کا صحن بڑا اور پختہ ہونے کی وجہ سے شام کا پروگرام وہیں ترتیب دیا جارہا تھا۔ مصروف سے ماما جی بظاہر تو تپاک سے ہی ملے تھے اور مامی جی بہن کی شادی میں مدعو نہ کر سکنے پر جھینپی جھینپی سی دکھائی دیں۔ کمرے سے اچانک برآمد ہوتی سومیہ حیرت

سے منہ کھولے اپنی جگہ پہ جم گئی۔ نشاد نے ٹھوکا مارا تو گرتے گرتے بچی۔ رافع نے ہنس کر چڑایا تو مصنوعی غصے سے گھورتے خود بھی ہنس پڑی۔

''بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔ مجھے تو ہار سنگھار ہی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔'' نشاد سے چائے کی ٹرے لے کر وہ بابا کی نظر بچاتے کچھ دیر بعد خود ہی اندر چلی آئی۔ رافع اب وہاں اکیلا بیٹھا تھا۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' رافع نے مسکرا کر چائے لیتے اس کے بگڑے حلیے پر تبصرہ کیا۔ شاید وہ پچھلی رات کے کسی فنکشن والے کپڑے پہنے ہوئے تھی جو اب گھر کی صفائی کے دوران گندا سا ہو گیا تھا۔

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے تعریف سننے کی۔ شام تک انتظار کر لو تم بھی۔'' وہ ہنس پڑی۔

''اچھا؟'' رافع نے کھسیا کر سر کھجایا۔ ''میں تو سمجھا آج شام کی تیاری ہے۔''

''ہاں اور اِسے کہتے ہیں جھوٹی تعریف۔'' وہ ایک ادا سے اٹھلائی، پھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''سنو!'' رافع نے روکنے کے لیے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سومیہ شرما کر پلٹتے اب معنی خیزی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ رافع نے سخت گڑبڑا کر ہاتھ چھوڑا۔

''وہ..... مجھے کہنا تھا کہ رات کے فنکشن پر میرا انتظار نہ کرنا۔''

''ارے۔۔کیوں۔۔؟'' وہ اُلجھی اُلجھی سی واپس بیٹھ گئی۔ ''اب یہ نہ کہنا رافع کہ ابھی واپس جانا ہے۔''

''وہ بات نہیں ہے۔'' رافع کچھ متذبذب ہوا۔ ''دراصل میرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں اور......''

''کپڑوں کی فکر تم مت کرو۔ میں بندوبست کر دوں گی۔'' وہ لاپروائی سے اُٹھی۔

''میرے ساتھ اور بھی کوئی ہے۔'' رافع نے بعجلت کہہ ہی ڈالا۔ سومیہ چونک کر مڑی تو آنکھوں میں تعجب کے ساتھ ساتھ ہلکی تشویش کے ڈورے تھے۔

''کوئی اور؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو رافع؟'' وہ بری طرح اُلجھ گئی۔

''کوئی پہیلی نہیں ہے۔ میں تو معمول کے ایک کام سے گاؤں آ رہا تھا، پیچھے جنگل میں ایک لڑکی بے ہوش پڑی ملی۔ کسی زہریلے جانور نے کاٹا تھا۔ بہت بری حالت میں تھی۔ بس اس کو ساتھ لانا پڑا۔''

''لڑکی؟'' سومیہ نے اضطراب سے نچلا لب کاٹا۔ ''تو کہاں ہے وہ؟ تم تو اکیلے آئے ہو۔''

''وہ ابھی گھاٹ پر ہے۔ پہلے سے اس کی طبیعت اب بہتر ہے۔ مجھے آج یہاں رہتے چھوٹے موٹے کچھ کام ہیں۔''

''لڑکی کو کب تک وہاں بٹھائے رکھو گے۔ یہیں لے آؤ۔ جانے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔''

''ہاں۔'' رافع اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''لانا تو چاہتا ہوں، پر ماما جی سے اجازت لے لوں۔''

''رہنے دو رافع!'' سومیہ نے دبے دبے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''شادی والا گھر ہے اور بھی کئی مہمان آ، جا رہے ہیں۔ بابا کو پتا بھی نہیں چلے گا تم کہ کسی لڑکی کو لائے ہو۔'' سومیہ تدبر سے سمجھا رہی تھی اور رافع اِس دُور کی سوچ کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ ماما جی پہلے ہی اس کے نئے کام کو لے کر ناراض سے تھے۔ بیچ میں کسی لڑکی کے معاملے پر تو اور بھی مشکوک ہو جاتے اور ظاہر ہے سومیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بابا اور منگیتر کے آپس کے تعلقات بگڑیں۔ رافع بھی اس صلاح پر تائید میں سر ہلاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ساتھ چلوں؟''

''کیا ضرورت ہے۔ میں اُسے لے کر ابھی واپس آ رہا ہوں۔'' رافع نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن سومیہ کے دل میں کانٹا سا چبھا تھا۔ رافع کہاں معلوم تھیں یہ عورت کی عورت سے متعلق بیدا ہوئی، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اضافی حسیں۔ مزید سوال جواب میں پڑے باہر نکل گیا اور ویملا ساتھ لے کر واپس آتے جب وہ ماما جی کے مکان کے قریب پہنچا تو سومیہ دروازے میں ہی منتظر ملی۔

''یہاں سب سے یہی کہنا کہ تم مجھے جنگل میں پڑی ملی تھیں۔ اپنی کہانی تم خود جانو۔'' وہ دھیرے سے ویملا کے کان میں پھونکتا اس سے پہلے ہی اندر کی طرف بڑھ گیا۔ سومیہ اور نشاد وغیرہ ہندی بھی جانتی تھیں۔ ہوشیار کرنا ضروری تھا۔

''رافع کی گھر دوبارہ آمد شام سے کچھ پہلے ہوئی۔ یہاں بھی اُس کے بہت سارے دوست تھے۔ ان سب سے مل کر واپس آیا تو ماما جی کے گھر فنکشن کے آثار بیدار ہو چکے تھے۔ مامی جی نے اسے تیار ہونے کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کی متلاشی نگاہیں البتہ ویملا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن بجائے اس کے سومیہ سامنے آ گئی۔

''تیار نہیں ہوئے ابھی تک تم؟'' وہ خود تیار ہو کر سرخ کپڑوں میں اب خوب ہی لشکارے مار رہی تھی۔

''ہاں جا رہا ہوں۔'' وہ اس کی پشت پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہ.....لڑکی کہاں ہے۔'' اس نے ویملا کہتے کہتے خود کو روکا۔ جنگل میں بے ہوش لڑکی کی فرضی کہانی سنا کر اب نام لے کر بے تکلفی سے پکارنا کچھ عجیب محسوس ہوتا۔

''وہ تیار ہو رہی ہے۔''

''اسے کیا ضرورت ہے تیار ہونے کی۔ کون سا وہ یہاں انوائٹڈ ہے۔ اسے تو کسی کمرے میں آرام کرنے بھیج دیتیں۔'' رافع نے بلاوجہ نکتہ اٹھایا۔

''ارے، وہ ہمارے ہاں کی شادی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہت دُکھی ہے بے چاری، چپ رہو تم۔''

''اچھا؟'' رافع نے موبائل سائیڈ جیب میں رکھتے ہاتھ سینے پر باندھے۔ ''اور کیا دُکھ ہے بے چاری کو؟'' جاننے کی خواہش شدید تھی کہ یہ بھلا میڈم نے اپنے حق میں ایسی کون سی کہانی گھڑی تھی۔

''بچہ نہیں ہوتا بے چاری کو۔ ساس نے چھوٹے دو بیٹوں کی مدد سے بے ہوش کر کے جنگل میں لا پھینکا۔ اب وہ اس کے شوہر کی دوسری شادی کروائیں گے۔''

''اوہو۔'' رافع نے کن اکھیوں سے سومیہ کے کندھے کے پار دیکھا، جہاں دروازے میں اب وہ ''بے چاری'' خوب ہی معصومیت و مظلومیت کا تاثر لیے آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ رافع نے زبردستی اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں تیار ہونے جا رہا ہوں۔'' ایک خاموش تنبیہی نظر ویملا کی طرف اُٹھا کر ہر معاملے میں محتاط رہنے کا اشارہ دیا۔ اب جانے وہ کچھ سمجھی بھی یا نہیں۔ آنکھوں میں تو فی الفور وہاں سے بھاگنے کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مسکراتے لبوں پہ شادی دیکھنے کا دبا دبا سا جوش بھی نظر آتا تھا۔ رافع کسی پر بھی اپنی بات کا اثر نہ پاتے بڑبڑاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''ندیدی کہیں کی۔ سب جانتا ہوں، سارا ڈھونگ کھانا کھانے کے لیے رچایا ہے۔''

☆☆☆

''رافع لڑکی کو لے کر آرام سے گاؤں چھوڑ گیا تھا۔ ہاشم کے آدمی بڑے ہی بے کار اور بے فائدہ نکلے تھے۔ ابوصالح کا بس نہیں چل رہا تھا اس بار خود گھر سے نکل پڑتا۔ دھرمیشور نے واقعی اب تک کے قصے میں اس کا نام نہیں لیا تھا۔ اور اس کی اسی مہربانی کو دیکھتے ابوصالح چاہتا تھا کہ ویملا کو کسی طرح واپس انڈیا پہنچا دے۔

مسائل تو اگرچہ اس کی راہ میں بھی کم نہ تھے۔ سب سے پہلے تو لڑکی خود اپنے باپ سے یہ کہہ سکتی تھی کہ اُسے ابوصالح نے اغوا کروایا تھا۔ ایسی صورت میں تو ایک ہی حل ابوصالح کی سمجھ میں آتا تھا کہ لڑکی کے قابو میں آتے ہی وہ کسی طرح اُسے چپ رہنے پر مجبور کرے۔ وہ اُسے بحفاظت گھر پہنچانے کے لیے یہ شرط عائد کر سکتا تھا کہ باپ کے سامنے وہ اپنی زبان نہیں کھولے گی اور اگر اُس نے ایسا کیا تو ایک بار پھر مشکل میں پڑ سکتی ہے اور اتنا تو اب تک لڑکی کو بھی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ابوصالح کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔

''لیکن ابوصالح کے لیے پہلا بڑا مسئلہ لڑکی کا حصول تھا۔ اور یہ رافع۔ لگتا تھا جان جائے بنا تو

ویملا کو چھوڑنے والا نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے رافع محمد! پھر جان سے جاؤ۔"

موبائل اسکرین آن کر کے ابوصالح نے یوسف کا نمبر ملایا اور کچھ نئی ہدایات دینا شروع کیں۔

☆☆☆

گھر کے سامنے والے کھلے حصے کو بانس کے ڈنڈوں اور سجاوٹ کے کپڑوں سے سجا کر ایک احاطہ سا بنا لیا گیا تھا۔ کنارے کنارے کھاٹیں بچھا کر مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے لیے اسی ایک احاطے میں درمیانی شامیانہ لگا کر پورشن بنا دیا گیا تھا۔ ماماجی کے تین کھلے کمروں میں سے کسی ایک میں دُلہن تھی اور باقی دو میں بھی عورتیں بھری تھیں۔ سومیہ نے سفید شرٹ اور گرے دھوتی لا کر دی تو رافع نے حیرت سے دیکھا۔

"یہ......؟"

"تمہارے لیے ہی بنا رکھی تھی کب سے۔ پر کوئی آیا گیا ہی نہیں۔"

"اور...... وہ...... کہاں ہے؟" رافع نام لیتے جھجک گیا۔

"اُسے تم چھوڑو ناں۔ جاؤ مردوں کی طرف کام میں ہاتھ بٹاؤ۔" سومیہ صاف طرح دے گئی۔ رافع کندھے اُچکا کر واپس مُڑ گیا۔

"کام تو اُس نے یہاں کیا کرنے تھے۔ مہمانوں کی طرح جا کر بیٹھ گیا۔ شادی وادی اٹینڈ کرنے میں کہاں اسے کچھ دلچسپی تھی۔ آگے کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا تھا پر نقطہ آغاز ہی دکھائی اور سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی ویملا کچھ سمجھنے کو تیار نظر آتی تھی۔

دولہا دُلہن کو ایک ساتھ بٹھانے کے موقع پر درمیانی پارٹیشن اٹھالی گئی۔ اب عورتوں اور مردوں کا پورشن ایک ہو گیا تھا۔ داہنے ہاتھ کے اسٹیج پر دولہا کے پہلو میں دُلہن کو لا کر بٹھا دیا گیا۔

رافع کی بے چین نگاہیں ویملا کو دیکھ لینے کے لیے چاروں جانب گھوم آئیں۔ جانے کہاں چھپی تھی۔ شام سے ہی وہ دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ اُسے زیادہ دیر تک آنکھوں سے اوجھل رکھنے کی عادت نہیں رہی تھی شاید۔ رافع کو عجیب سا اضطراب گھیرنے لگتا تھا۔ عورتیں ڈھول سامنے رکھے گیت گا رہی تھیں۔ ڈھول کی پراثر دھم دھم سیدھا دل پہ اثر کر رہی تھی۔ لڑکیاں ٹولیوں کی صورت ناچ ناچ کر دُلہن کے قریب جا رہی تھیں۔ شاید کچھ رسوم انجام پا رہی تھیں۔

برسوں پہلے رافع کے لیے بھی اِن سب ہی باتوں میں بڑی کشش، بڑی دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ پر یہ وقت۔ اُس نے سر جھٹک کر موبائل پہ نظریں جھکائیں۔ کوئی میسج اور کال نہ پا کر دوبارہ سر اٹھایا۔ یہاں کی شادیوں میں ایک یہ بڑا نیک شگون مانا جاتا تھا کہ ایک جوڑے کی شادی کے دوران کسی دوسرے جوڑے کا رشتہ طے پا جائے اور اگر ایسا ہو جاتا تو اسے نئے شادی شدہ جوڑے کی لمبی خوش حال ازدواجی زندگی کی علامت تصور کیا جاتا۔ تب ہی اب ایک شادی کے موقع پر اکثر باقی ماندہ گھروں میں نئے رشتے کی کھسر پھسر پہلے ہی جاری ہو جایا کرتی۔ اُوپر سے دولہا یا دُلہن کی تیاری میں سے کوئی چھوٹی موٹی چیز کسی کنواری لڑکی یا لڑکے کے ہاتھ لگ جاتی تو نئے رشتے کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کو بھی نیک شگون خیال کیا جاتا۔ لڑکیوں کی ٹولیوں کا دُلہن کے اردگرد ناچنا بھی کچھ اسی زمرے میں آتا تھا۔ دُلہن کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے وہ سجاوٹ کی کوئی بھی چیز حاصل کر لینا چاہتی تھیں۔

رافع نے موبائل میں جمال بابا کے بیٹے ربیع کا نمبر نکالا اور کال ملاتے ایک طرف کو چلا گیا۔ اگلی صبح اسے کسی طرح بابا کی کشتی واپس پہنچانی تھی جو وہ اپنے گاؤں کے گھاٹ پر چھوڑ کر خود شمبھو کی کشتی میں یہاں آ گیا تھا۔ جمال بابا کی کشتی سنبھالنے کا کام بھی اس نے شمبھو کے ذمے لگایا تھا۔ ربیع شاید خود اگلے روز گاؤں جا کر اپنی کشتی لے لیتا۔

"یہ سفید لڑکی کون ہے، پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" دھیمی آواز میں بولتا وہ رقیب تھا جو پاس بیٹھے شوردے سے مخاطب تھا۔

پیچھے کھڑے رافع نے موبائل کان سے ہٹاتے چونک کر دوبارہ لڑکیوں کے گروپ کی طرف دیکھا۔ نارنجی کپڑوں میں بلاشک وشبہ ویملا تھی۔ جسے اب سے پہلے رافع نے نہ تو دیکھا تھا نہ ہی پہچانا۔ لڑکیوں کے گروپ پر دو ایک بار سرسری نگاہ ڈالتے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ویملا بھی ان کے ساتھ ناچ رہی ہوگی۔ اورنج دوپٹے کو پن کے ساتھ سر پر ٹکائے مانگ کے بیچوں بیچ بندیا لٹکائے، شوخ سا میک اپ کیے وہ پہلی نظر میں بالکل بھی پہچاننے میں نہیں آ رہی تھی۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دو قدم آگے دو قدم پیچھے کو جا کر ڈھول کے ساتھ ساتھ رقص کرتی وہ اتنی خوش، اتنی مگن تھی کہ خود پر ٹکی بے شمار نگاہوں کا اسے احساس تک نہیں تھا۔ اور ان بے شمار آنکھوں میں فقط دو آنکھیں ایسی تھیں جو غصے کی تاب نہ لاتے۔ اب گلابی سے سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔

رافع کا بس نہ چلتا تھا آگے بڑھ کر اسے کلائی سے کھینچ کر وہاں سے کہیں بہت دور ویرانے میں جا پٹختا جہاں نہ وہ کسی کی پہنچ میں ہوتی اور نہ ایسی بے ہودہ نگاہیں اس پر پڑتیں۔ بے اختیار میں وہ چند قدم آگے آیا کہ لڑکیاں خود ہی رقص ختم کرتے یہاں وہاں بکھر گئیں۔ ویملا بھی ہنستے ہوئے کسی کمرے میں چلی گئی تھی۔

رافع واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ لڑکیاں اب شربت کے گلاس ٹرے میں لیے سب کو پیش کر رہی تھیں۔ رافع نے بنا نظر اٹھائے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نظریں ایک مرتبہ پھر موبائل پہ ٹکی تھیں۔ گلاس ہاتھوں میں آ چکا تھا اس نے موبائل پر آیا میسج پڑھتے ہوئے شربت کا گھونٹ بھرا کہ گود میں کچھ گرا۔ رافع نے چونک کر نظر ڈالی۔

مہندی اور گولڈن رنگ کا وہ گوٹے اور تار سے بنا ایک پتلا کنگن تھا۔ رافع نے نظر اٹھائی تو ویملا چور نظروں سے مسکرا کر دیکھتی آگے بڑھ گئی تھی۔ رافع نے دوسری نظر کچھ فاصلے پر بیٹھے دولہا دلہن پر ڈالی۔ اُسے پہلے ہی شک ہوا تھا کہ یہ کنگن اس نے وہیں دیکھا تھا۔ دولہا کی کلائی میں ہی اس نے یہ مہندی اور گولڈن آرائشی کنگن دیکھے تھے اور دولہا دلہن کی اِن آرائشی چیزوں کا لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ آ جانا کیا معنی رکھتا تھا، رافع اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید ویملا بے خبر تھی۔

رافع نے چپکے سے کنگن کے اوپر پہلے اپنا ہاتھ رکھ کر اسے دوسروں سے چھپایا اور پھر نظر بچا کر اپنی سائیڈ جیب میں چھپا لیا، بنا یہ جانے کے دُور کمرے کی کھڑکی سے سومیہ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ ویملا کی حرکت سے زیادہ اسے رافع پر غصہ تھا جس نے اس تحفے کو جیب میں ڈال کر قبولیت کی سند بھی دے ڈالی تھی۔

''تمہیں یہاں کے رسم و رواج کا پتا نہیں ہے۔ یہ کہیں واپس ڈال دو۔'' خالی گلاس میز کے پاس لے جا کر اس نے ساتھ کھڑی ویملا کو چپکے سے مخاطب کیا اور جیب سے کنگن نکال کر اس کی طرف بڑھایا، ویملا نے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا پر گلاس کی جگہ کنگن دیکھ کر بے ساختہ اپنی مٹھی بند کر لی اور کنگن اس سٹپٹاہٹ میں نیچے گر گیا۔

''واپس نہیں لے سکتی رافع!'' وہ اب سنجیدگی سے کہتے ہوئے نیچے جھکی تھی۔ رافع کی نظر بھی نیچے گرے کنگن پر تھی جو اُس کے قدموں سے ذرا ہی دُور تھا۔ ویملا نے جھک کر کنگن ہاتھ میں لیتے رافع کے بوٹوں میں قید پیروں کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے مس کرتے اپنی مانگ بھر لی۔ رافع کا دل بے طرح دھڑکا تھا اس حرکت پر۔ بے ساختہ اُس نے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے۔ ویملا مسکرا کر سیدھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے معلوم ہے بدھو، تمہیں کچھ نہیں پتا۔'' اُس نے زور دے کر کنگن اس کے ہاتھ پہ دھرا اور مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

''بے وقوف لڑکی!'' رافع نے غصے سے اس کی پشت کو دیکھا۔ کنگن لامحالہ اسے پھر سے اپنی جیب میں رکھنا پڑ گیا تھا۔

''یہاں سے نکلو کسی بہانے۔ پیچھے درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہیں پہنچ جاؤ۔'' وہ اس وقت جن دو عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

رافع کو معلوم تھا سوائے بنگالی کے انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ رافع نے لہجہ نارمل اور سپاٹ رکھتے ویملا کو پیغام دیا اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔

ویملا نے دائیں بائیں دیکھ کر سومیہ وغیرہ کے نہ ہونے کی تسلی کی۔ کھانا کھانے کا وقت تھا شاید۔ سب عورتیں وہیں اُمڈی پڑی تھیں۔ مردوں والا حصہ پہلے ہی خالی پڑا تھا۔ دولہا کو لیے وہ سب باہر جا چکے تھے۔ رافع کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہ بھی راستہ تبدیل کرتے ہوئے پیچھے اندھیرے والی اُس جگہ پر آگئی۔ جہاں کلائی کی گھڑی پر بے چینی سے نظر ڈالتا وہ اُسی کی آمد کا منتظر تھا۔

''دسکھی سمبندھوں کے لیے تمہارا کلکتہ کافی نہیں تھا، جو یہاں ہاتھ پاؤں پسار رہی ہو۔'' منہ اندھیرے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ مزید کسی سے باتیں بگھارنے اور گھلنے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' رافع نے لتے لینے میں لمحہ تاخیر نہیں کی۔ وہ جواباً پیارا سا ہنس پڑی۔

''تمہاری طرح مورکھ تھوڑی ہوں۔ اپنے ہی گاؤں پریوار میں ایسے بیٹھے ہو جیسے کوئی بھولے بھٹکے کسی انجان بستی میں نکل آیا ہو۔''

''تو تم کیوں یوں ان سب سے مل رہی ہو جیسے جنموں کی بچھڑی ہوئی تھیں۔'' جواباً وہ پھر کاٹنے کو دوڑا۔

''اِسی لیے بلایا تھا؟'' وہ سامنے ہاتھ باندھے بغور اسے شرارت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پرسکون رویہ رافع کو مزید سلگا رہا تھا۔

''اور یہ ناچ گانا کس کی اجازت سے شروع کر دیا۔ دلہن کی سگی والی ہو کہ دولہا کی؟''

''اچھا؟'' وہ کھلکھلائی اور ''اجازت'' تم سے لیتی تھی؟ وہ جانے پوچھ رہی تھی کہ جتا...... ! رافع لاجواب ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

''میں رات کو اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہر رہا ہوں۔ صبح پانچ بجے تیار رہنا۔ کل ہم نے یہاں سے سیدھے بارڈر کی طرف جانا ہے، بنا کہیں رکے۔

''رافع......!'' ویملا نے اس کی اتنی لمبی بات ان سنی کرتے آگے بڑھ کر اس کی مضبوط کلائی اپنے ہاتھ میں لی جس پر از حد تعجب سے رافع نے سر موڑا۔

''دولہا کے کنگن کو جس نیت سے لڑکیاں اپنے محبوب کو دیا کرتی ہیں۔ میں نے اسی کارن تمہاری گود میں ڈالا تھا۔ دولہا دلہن کا سکھی ودواہت جیون اگر کسی نئے سمبندھ کے بننے پہ نربھئے کرتا ہے تو میری دعا ہے کہ وہ نیا سمبندھ سوا میرے اور رافع محمد کے کسی کا نہ ہو۔''

ویملا نے کلائی چھوڑ دی اور رخ پھیر کر واپس اس راستے پر بھاگ گئی جہاں سے آئی تھی۔ اس کی پلکیں بات کے اختتام تک نم ہوتے برسنا شروع ہو گئی تھیں۔ رافع حیرت کی تصویر بنا ساکت و صامت کھڑا رہ گیا تھا۔

حیرت کے جھٹکے سے باہر نکلتے اس نے سائیڈ جیب سے کنگن نکال کر ہتھیلی پہ رکھا۔ اپنے گاؤں والے گھر میں اُسے دیوتا کہہ کر جس ہلکی سی پسندیدگی کا اس نے اشارہ دیا تھا، رافع نے اُسے چند روزہ ساتھ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اُنسیت سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ پر اب...... ویملا کا بے خود ہو کر سرمستی اور خوشی سے ناچنا، اسے معنی خیز شرارت سے دیکھتے ہوئے کنگن اس کی گود میں ڈالنا اور پھر یہ باتیں۔

وہ ابھی بھی بھاگتی دکھائی دے رہی تھی۔ جوگیا رنگ میں پشت پر بال بکھرائے وہ جوگن، جاتے جاتے پلٹ کر دیکھنا نہیں بھولی تھی۔

''میں رافع......'' کی دلربا پکار کے ساتھ مسکرا کر اس کی بانہوں میں بے ہوش ہوتے وہ کتنی پرسکون لگی تھی۔ وہ سکون آج بھی اس کے حسین رُخ پر ثبت نظر آتا تھا لیکن یہ رافع جانتا تھا کہ ویملا کا سکون دراصل اس کی بے خبری ہے۔ سومیہ اور اُس کے رشتے سے باخبری ویملا کا یہ موجودہ سکون یقیناً تہس نہس کرنے والی تھی۔ جس کنگن کو وہ اپنے اور رافع کے نئے رشتے کا آغاز سمجھ رہی تھی وہ پہلے ہی سومیہ کی کلائی میں سج چکا تھا رافع کے نام سے۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نیرّ فہیم خان

تجھے اپنے رنگ میں رنگ دوں

"امی! سچ سچ بتائیں یہ ہانی کی بچی کو واقعی آپ نے کچرا کنڈی سے اٹھایا تھا۔ یا اسپتال میں کسی بدسلیقہ خاتون سے بدل گئی ہے۔" وہ بھناتی ہوئی آئی تھی۔

امی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مہابھارت شروع"

''سچ بتائیں! ایسی کاہل اور بدسلیقہ پھوہڑ لڑکی دیکھی ہے آپ نے۔ مجال ہے جو ایک کام بھی ڈھنگ سے کرلے۔ تولیہ اسٹینڈ پر ٹانگنا اس کی توہین، کسی چیز ٹھکانے پر رکھ دینا اس کی بےعزتی اور تو اور محترمہ سے کسی چیز کا ڈھکن بھی نہیں لگتا۔ حتیٰ کہ مارکر اور پین کے ڈھکن بھی میں جمع کر کے دیتی ہوں، وہ کلستی ہوئی بولی۔

''امی! میں رکھتی تو ہوں۔'' ہانی منمنائی

''بس رہنے دو! جو رکھتی ہو، اس کا بھی پتا ہے اور جس طرح رکھتی ہو، وہ بھی پتا ہے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''بچی ہے بیٹا۔''

''معاف کیجیے گا امی! نفاست اور سلیقہ مندی کا تعلق عمر سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے اور جوان محترمہ کے پاس بمشکل پایا جاتا ہے۔''

''ابھی کیا ہوا۔'' امی نے معاملہ سمیٹنا چاہا۔

''آپ کی لاڈلی صاحبہ کو تاکید کے ساتھ دودھ کے پاس کھڑا کر کے آئی تھی کہ دھیان رکھنا۔ ابل نہ جائے۔ تھوڑی دیر بعد جا کر دیکھتی ہوں تو دودھ ابل ابل کر چولہے کو چومتا فرش سے بغل گیر ہوا جا رہا تھا اور ان محترمہ کا پورا دھیان کینڈی کرش پر تھا۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اس کا بھیجا کرش کر دوں۔''

جرم تو واقعی ناقابل معافی تھا (فلک کی عدالت میں)

''امی! میں نے پورا دھیان رکھا تھا بس ذرا سی دیر موبائل اٹھایا ہی تھا کہ فوراً گر گیا۔ اسے بھی مجھ سے دشمنی ہے۔'' ہانی موٹے موٹے آنسو بھر لائی۔

''دشمن تو تم ہو میری...... میرے سکون کی۔ ابھی کچن صاف کر کے ڈھنگ سے کمر بھی سیدھی نہ کی تھی کہ تجریدی آرٹ کا نمونہ بنا دیا کچن کو۔ میری مت ماری گئی تھی جو تم سے کام کو کہا۔''

وہ بڑبڑاتی نکل گئی۔ ہانی روہانسی ہوگئی۔ امی نے سکون کا سانس لیا۔ ان کے لیے یہ کون سی نئی بات تھی۔

☆☆☆

''اتنی گرمی میں شادی نہ بابا......'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ہاں تم تو جیسے اسکردو کی رہائشی ہو۔ حیدرآباد جاتے ہی موم کی طرح پگھل جاؤ گی۔'' رامین نے گھورا۔

''میں نہ بھی پگھلوں تو میرا دماغ ضرور پگھل جائے گا۔ اتنی لوڈشیڈنگ، گرمی، اور حبس کی ماری شادی تمہیں مبارک ہو۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''ولیمہ کراچی میں ہے میں یہیں سے شریک ہو جاؤں گی۔''

''چلو نا یار! سچ تمہارے بنا مزہ نہیں آئے گا۔'' رامین نے اصرار کیا۔

''اور جو میں ساتھ جا کر تمہیں بے مزہ کروں گی۔ تم خود پناہ مانگو گی...... اس نے ڈراوا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ دفع ہو جاؤ۔''

''دیکھو تم جانتی ہو زبردستی کر کے تم مجھے لے تو جاؤ گی مگر میری بک بک تمہارا دماغ خراب کر دے گی۔ جس بات پر دل نہ مانے۔ دماغ بھی بگڑا رہتا ہے۔'' فلک کے لہجے میں نرمی در آئی۔

رامین نے اک نظر دیکھا ''اچھا...... اوکے'' انداز میں بے دلی نمایاں تھی۔

☆☆☆

رامین شادی میں اکیلے ہی روانہ ہوگئی۔ ولیمہ کراچی میں تھا۔ رامین نے اسے دیکھا تو فوراً آئی۔

''فلک کیسی ہو؟ یار اتنا مزہ آیا کہ حد نہیں تمہیں بہت مس کیا۔ نہ گرمی تھی نہ حبس۔ لوڈشیڈنگ کا مسئلہ بھی نہ تھا۔ یو پی ایس اور جنریٹر نے پتا بھی نہ لگنے دیا۔ اتنا انجوائے کیا کہ بس'' وہ بہت ایکسائٹڈ تھی۔

''چلو شکر ہے۔ تمہیں مزہ آیا۔ میں بھی یہی دعائیں کر رہی تھی کہ تم بور نہ ہو۔ ورنہ تم نے آ کر میرا

گلا دبا دینا تھا۔" اچھا چلو' تمہیں میری خالہ سے ملواؤں۔" وہ ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"کون سی خالہ؟" فلک بوکھلائی۔

"میری کوئی درجن بھر خالائیں نہیں۔ وہی امبرین آنٹی۔ مما کی بڑی بہن...... پہلے لاہور میں تھیں' اب کراچی شفٹ ہوئی ہیں پچھلے ماہ۔"

"اچھا ملواؤ۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

بہت نام سنا تھا۔ وہ دونوں پہنچیں تو امی پہلے ہی علیک سلیک کررہی تھیں' فلک کو دیکھتے ہی بولیں۔

"لو...... میری بیٹی آگئی۔ یہ فلک ہے۔"

"ماشاء اللہ بڑی ہوگئی ہے۔ بالکل تم پر گئی ہے۔ یاد ہے کالج لائف میں تم بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔" امبرین آنٹی نے محبت بھرے انداز میں فلک کا ہاتھ تھاما۔

"ہاں کتنا اچھا دور تھا ناں وہ بھی۔ خیر تم گھر آؤ ناں کبھی......"

"ضرور کیوں نہیں۔ اب اس شہر میں ہیں تو سب سے ملنا ملانا لگا رہے گا۔ تم بھی بچوں کو لے کر آنا۔"

"بالکل آؤں گی۔" امی نے خوش دلی سے کہا۔

"اور بیٹا! تم بھی اپنی مما کے ساتھ ضرور آنا۔"

"جی آنٹی! ضرور۔" فلک کو سوبر سی نرم مزاج سادہ سی مسکراہٹ والی امبرین آنٹی بے حد پسند آئی تھیں۔ اتنے میں ایک نوجوان آن کھڑا ہوا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔"

رامین نے جوش سے ہاتھ ہلایا۔ "حیدر بھائی! یہ میری دوست فلک ہے۔ وہی......"

"جن کے قلابے تم زمین وفلک میں ملاتی رہتی ہو۔" اس نے بات اچک لی۔

"ہاں تو یہ ہے ہی اتنی پیاری دیکھیں۔"

رامین نے جوش میں اسے آگے کیا جیسے کوئی سائنس دان کسی ایجاد کو دکھاتے ہوئے کہے دیکھیے حاضرین یہ ہے میری فخریہ پیش کش!

"اف یہ رامین بھی......" اچانک بالکل مقابل کھڑا کرنے پر فلک کچھ جزبز ہوئی۔ نوجوان زیرلب مسکرایا' کہا کچھ نہیں' ایک گہری نگاہ ضرور ڈالی تھی۔

"آنٹی! وہ مشعل بھی آئی ہے ہم مل کر آتے ہیں" رامین کو کوئی اور نظر آگیا۔ وہ —— آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

"امی! کون آرہا ہے؟" رامین نے حیرانی سے پوچھا۔ گھر میں ہلچل سی تھی۔ امی کچن میں مصروف' ہانی بھی صفائی کرنے میں ہلکان اور تو اور جناب ٹیپو بھی بانس پکڑے جالے صاف کررہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی جمپ لگائی' اسٹول ان کی شرارت کا ساتھ نہ دے سکا اور وہ زمین بوس۔ "ہائے......!" صدا ابھری! دکھ بھری' کراہتی ہوئی۔

"الٰہی خیر!" امی دہل کر باہر نکلیں۔ ٹیپو نے اوورایکٹنگ میں جونی لیور کو بھی مات دے دی تھی۔

"لو اب اتنے سے اسٹول سے گر کر ابھی تک زمین پر پڑے ہو۔ کھڑے ہوجاؤ۔" وہ ماں تھیں جانتی تھیں لعل کتنا بڑا ایکٹر ہے۔

فلک وہیں کھڑی رہی۔ ہانی نے گردن اٹھا کر دیکھا اور پھر سے گلاس ڈور صاف کرنے لگی۔ یعنی کوئی بھی صدا بے کراں سے متاثر نہ ہوا۔

"میں تو اس گھر میں اقلیت ہوں ناں! کوئی میری نہیں سنتا ہے' لوگوں کے گھر اکلوتے بیٹوں کو سر پر بٹھایا جاتا ہے۔ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں۔ میں تو اکلوتا ہو کر بھی خوار ہی رہا۔" اس نے آہ وبکا کرکے آسمان ہلا دیا۔

"او! مردوں کی مینا کماری کام کرو۔ دس منٹ میں لاؤنج صاف نہ کیا تو ایک ہفتے تک بائیک کی چابی نہیں ملے گی...... منہ بالکل بند ہونا چاہیے۔"

"جی امی!" دھمکی خاصی تگڑی تھی۔ وہ فوراً اسٹول سیدھا کرکے دوبارہ چڑھ گیا۔ اب ہاتھوں میں تیزی تھی۔ امی مسکراتے ہوئے واپس

پلٹیں۔

''میرا سوال تو وہیں رہ گیا آ کون رہا ہے۔''
وہ کچن میں چلی آئی۔

''ارے بیٹا ویسے تو کوئی خاص بات نہیں۔ ٹیپو کا آج آف تھا۔ سوچا لاؤنج صاف کرالوں تمہارا بھی پریکٹیکل تھا۔ مجھے پتا تھا دیر سے آؤ گی تو کچن میں چلی آئی۔ ویسے امبرین نے کہا تھا' شام کو آئے گی۔ اس کے آنے میں تو کافی ٹائم ہے۔'' امی نے تفصیل بتایا۔

''اوہ اچھا...... آپ چلیں میں دیکھ لیتی ہوں۔''

''ارے نہیں بیٹا ابھی تو کالج سے آئی ہو۔ سب کام ہوگیا ہے بس یہ دونوں نالائق اپنا کام سمیٹ لیں تو کھانا لگاتی ہوں'' انہوں نے پیار سے کہا تو وہ ان سے ماتھے پر پیار کر کے نکل گئی۔

☆☆☆

''تمہاری امی اور میری دوستی کی بنیاد نفاست پسندی پر مبنی تھی۔ ہم دونوں ہی سلیقہ مند اور تہذیب و ترتیب کے دلدادہ تھے۔ دور کی رشتہ داری تو تھی۔ مگر دوستی خاصی گہری ہوگئی۔ کہتے ہیں ناں ایک جیسی فطرت انسان کو قریب لے آتی ہے۔ بس ہمیں بھر اسی خوبی نے قریب کر دیا...... ہمارے نوٹس ہمارے یونیفارم اور اسائنمنٹ ضرب المثل تھے۔ پھر شادی ہوئی اور میں لاہور آ گئی۔ تو ملنا جلنا ختم ہوگیا۔ اب صاحبزادے کی پوسٹنگ کراچی ہوئی تو بوریا بستر سمیٹا اور رخت سفر باندھ لیا۔'' امبرین آنٹی کا لہجہ بہت میٹھا اور نرم سا تھا۔

''آپ کی فطرت امی جیسی ہے تو کیا آپ بھی چھٹی کے دن بانس پر جھاڑو لگوا کر حیدر بھائی سے جالے صاف کراتی ہیں۔'' ٹیپو منہ پھاڑ کر بولا۔

چائے پیتے حیدر کو اچھو لگ گیا۔ امبرین ہنس پڑیں۔ امی نے کڑی نظروں سے گھورا مگر وہ معصوم چہرہ لیے امبرین کے جواب کا منتظر تھا۔

''نہ صرف جالے بلکہ پنکھے' فانوس بلب بھی صاف کراتی ہوں۔''

''ہیں......'' ٹیپو کا منہ لٹک گیا۔

''ہاں یار! میں نے بھی بہت مکڑیوں کو بے گھر کیا ہے اب یہ کام چھوٹے ارسل کا ہے۔''

''اوہ اچھا......'' اس کی آواز میں مردنی تھی۔

''صفائی پر کوئی سمجھوتا نہیں۔ بچپن سے ہی بچوں کو ایسی تربیت دی کہ وہ توازن کے ساتھ خوبصورتی کو قائم رکھیں۔ بے ترتیبی اور گندگی مجھ سے برداشت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں نہیں دیں تو کیا ہوا۔ میرے بیٹوں نے بیٹی کی طرح ذمہ داری سے گھر کو سنبھالا ہے۔ کبھی بازار سے میرے گھر کھانا نہیں آیا۔ میں بیمار ہوتی تو حیدر کے بابا کھانا تک بنا لیتے تھے۔ چائے' ناشتہ' لنچ سب کی ذمہ داری خود اٹھا لیتے تھے۔'' ان کے لہجے میں شوہر کے لیے فخر اور محبت تھی۔

''واؤ؟'' فلک بے حد متاثر ہوئی اور گھور کر ٹیپو کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''دیکھو ایسے بھی لوگ ہیں دنیا میں۔'' حیدر مسکرا دیا تھا۔

''پھر تو آپ بالکل آپی کی ڈپلیکیٹ ہیں ان کو بھی صفائی کا مراق ہے۔ ایک تولیہ تک نہیں پھینکنے دیتیں ادھر ادھر' اتنی باتیں سناتی ہیں کہ حد نہیں۔ بندہ سوچے خودکشی کر کے مر جائے مگر غلطی سے بھی تولیہ اسٹینڈ سے نہ ہٹائے۔'' ہانی نے بھی راز افشا کیے۔

امبرین پھر ہنس پڑیں۔

''ہانی!'' امی نے گھورا۔

''رہنے دو نورا تمہارے بچے بھی تمہاری طرح ہی سچے اور سادہ ہیں۔ اور یہ ان کی خوبصورتی ہے سچ مجھے ان سے مل کر بہت مزہ آیا۔ تم لے کر آؤ ناں انہیں گھر۔''

''ہیں اچھا'' ہانی سیدھی ہو بیٹھی۔ ٹیپو نے بھی فخر سے گردن اکڑا لی۔ اور فاتحانہ نگاہوں سے فلک کو دیکھا۔

''مگر امی صرف ایک بچے کو لے کر جاتی ہیں۔ جہاں بھی جاتی ہیں۔''

ہانی نے وضاحت کی۔
''نہیں نورا میرے گھر تم سب لوگ آؤ گے کوئی بہانا نہیں چلے گا سب کو لانا۔'' انہوں نے پیار سے پاس بیٹھی ہانی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔'' امی کا خون کھول رہا تھا۔ مگر مسکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد آنٹی بہت تاکید کے ساتھ آنے کی دعوت دے کر گئیں۔

☆☆☆

آنٹی امبرین کا گھر تو زمین پر فلک کے خوابوں کی جنت تھا۔ اتنا سجا سنورا۔ صاف ستھرا اور کشادہ۔ فلک نے فوراً دس میں سے دس نمبر دے دیے حالانکہ وہ کبھی اپنے گھر کو اتنے نمبر نہ دے پائی تھی۔ وجہ ٹیپو اور ہانی تھے۔ جو اس کے پرفیکٹ کام میں بھی اس خوبی سے غلطی کرتے تھے کہ وہ کلس کر رہ جاتی۔ سونے پر سہاگہ اگر رامین بھی ساتھ مل جاتی تو الامان الحفیظ' مونگ پھلی کے چھلکے' چاکلیٹ کے ریپر ہر اس جگہ سے ملتے جہاں گمان بھی نہ جاتا تھا۔
امبرین آنٹی کی سیڑھیوں پر رکھے پتوں پر بھی مٹی کا شائبہ نہ تھا۔ صاف ستھرے گڈائی ہوئے گملے اور ان پر ہرے بھرے پودے۔ نظر جدھر جاتی خوش ہو کر پلٹ آتی تھی۔ امبرین آنٹی کی مہمان نوازی نے دل جیت لیا تھا۔
ارسل سے مل کر ٹیپو بڑا متاثر ہوا۔ بالکل کسی ماہر کی طرح ٹیبل سیٹ کی اور کھانا لگوانے میں مدد دی۔ اور ذرا ہائے وائے نہ کی۔ جیسے اس کے روز کا معمول ہو۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔
''فلک بیٹی! گھر کیسا لگا۔'' انہوں نے پوچھا۔
''بہت بہت خوبصورت اور حسین۔'' اس نے دل سے کہا تھا۔
''سچ آپی میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ ہم ٹیپو کو ارسل سے بدل لیں۔'' ہانی نے سرگوشی کی۔
''ٹیپو کو ارسل سے بدلنے سے بہتر ہے کہ تم لوگ اپنی عادتیں بدل لو۔'' اس نے گھر کا تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

''میری تو کوئی ویلیو ہی نہیں! ہر بات پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ چھوٹا ہونا بھی کتنی بڑی مصیبت ہے۔'' اس نے دل گرفتی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ سکون سے سو رہی تھی۔ کسی نے اسپرے کیا۔ اس کی فوراً آنکھ کھلی۔ سامنے ہی رامین کا چہرہ تھا۔ ٹیپو اور ہانی دانت نکالے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ خود رامین کی مسکراہٹ مغرب سے مشرق پھیلی ہوئی تھی۔
''کیا ہوا ہے؟'' اس نے چہرہ صاف کرتے ہوئے ناسمجھی سے دیکھا۔
'' آپ قید ہونے والی ہیں اور ہم آزاد...... یاہو'' ہانی کا نعرہ مستانہ تھا۔
''ہیں......'' اس نے بغور دیکھا' ''پاگل تو نہیں ہو گئے تم لوگ!''
'' خوشی جب حد سے بڑھے تو ہو ہی جاتے ہیں' تم گھر سے جاؤ گی' تبدیلی آئے گی۔ ہم خوب ناچیں گے بھئی واہ...... بھئی واہ!'' ٹیپو نے ادھم ڈال دیا۔
''کیا بکواس ہے۔'' اسے غصہ آ گیا۔ ایک تو میٹھی نیند سے جگایا وہ بھی پانی کی بوچھاڑ سے' پھر نعرے اور یہ دھمال۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
''یہ گلیاں یہ چوبارہ
یہاں آنا نہ دوبارہ
اب تم تو ہوئیں پردیسی کہ
تیرا یہاں کوئی نہیں...... کہ تیرا یہاں کوئی نہیں۔''
''چپ کرو میراثیوں! کوئی آسان زبان میں سمجھائے گا۔ یہ اعصاب پر فضول گانوں کے ڈرون حملے کیوں ہو رہے ہیں۔''
''میں سمجھاتا ہوں۔'' میری فلک! بنے گی دلہن اور پھول کھلیں گے دل کے
ارے میری بھی شادی ہو جائے دعا کرو سب مل کے۔ ہائے......''
یہ ہائے گانے میں شامل نہ تھا بلکہ اس

دھمو کے کا اثر تھا جو امی نے آتے ہی جڑا تھا۔ وہ کمر سہلاتا کھڑا ہوا۔

''مجھے پتا تھا تم لوگ یہ نوٹنکی ہی کررہے ہو گے۔ صبر تو ہے ہی نہیں، کوئی بات پیٹ میں رہ ہی نہیں سکتی۔'' امی نے حیران پریشان فلک کو ساتھ لگایا۔ تینوں سیدھے ہو گئے۔

''امی! یہ سب کیا ہے!''

''بیٹا تم سے سکون سے بات کرنا تھی مگر یہ لوگ بھی ناں! اصل میں امبرین نے حیدر کے لیے تمہارا رشتہ دیا ہے۔''

''کیا؟'' اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ تینوں کی باچھیں چرنے کا مقصد سمجھ میں آ گیا تھا۔

''میں نے سوچا' تم سے رائے لے لوں'۔

''اس سے کیا رائے لینی ہے یہ تو امبرین آنٹی کا گھر دیکھ کر ہی فوت ہو گئی تھی۔ چہرہ دیکھ کر سمجھ لیں کہ لڑکی راضی ہے۔ اب کیا بچی کی جان لیں گی۔'' رامین کی شرارت عروج پر تھی۔

فلک کے لبوں پر مسکراہٹ دمک اٹھی تھی۔ چہرہ سنہری سا ہو گیا تھا۔ ماں کی نظر کو اطمینان مل گیا تھا۔

''تم سوچ لینا۔'' انہوں نے ٹائم دیا۔ مگر جواب تو اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اب تم لوگ دھمال ڈالو۔''

''یاہو.....!'' تینوں نے مل کر جو شور مچایا۔ فلک کو کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

☆☆☆

باقی کے تمام مراحل بہت آسانی کے ساتھ طے ہوئے۔ چھوٹی سی تقریب میں فلک کو حیدر سے منسوب کر دیا گیا اور جلد ہی شادی کی تاریخ دے دی۔ امی سلیقہ مند تھیں۔ بہت سے کام انہوں نے پہلے سے کر رکھے تھے شاید بیٹیوں کی مائیں ان کے جنم سے ہی کچھ جوڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ زیور، کراکری کافی حد تک جمع تھی۔ پھر بھی کافی کام تھے۔ امی بازار میں پائی جاتیں۔

شادی سے پہلے شادی کی تیاریوں کا بھی اپنا ہی مزہ اور لطف تھا اور وہ سب ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆

''اف ٹیپو! کب بڑے ہو گے تم.....؟'' باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھتے ہی فلک کا دماغ گھوم گیا۔ صابن دانی زمین پر۔ شیمپو کا ڈھکن کھلا ہوا۔ گیلا تولیہ میلے کپڑوں کے ساتھ زمین پر ڈھیروں ڈھیر پانی۔

''یار!.....تم نکلو میں صاف کر لوں گا۔ تم بھی نیب کی طرح اچانک چھاپا مارتی ہو۔'' ٹیپو نے اسے بازو سے پکڑا۔ ''تم'' ..... ''میری بہنا..... تم نے عمر عزیز کے پورے اٹھارہ سال مجھ کو سدھارنے میں گزار دیے..... میں سدھرا..... نہیں ناں..... اب چند دن جو بچے ہیں ان کو سکون سے گزار لو۔ اب تو تم مہمان ہو ہماری۔'' وہ کچھ جذباتی ہوا۔ فلک ڈھیلی پڑ گئی۔

نجانے کیوں بات بات پر آنسو آ جاتے تھے۔ شاید شادی کے قریب کے دنوں میں ہر لڑکی کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اپنا گھر ہی پرایا سا لگنے لگتا ہے۔ جس گھر میں بچپن گزرا ہو وہ ہی گھر اجنبی سا لگتا ہے۔

''اب ہم لوگ خود کو سدھارنے کی کوشش کریں گے کیونکہ تم تو چلی جاؤ گی ناں.....'' ٹیپو کا لہجہ گلوگیر ہوا۔

''ٹیپو! میرے بھائی!'' اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''تم فکر نہ کرو۔ اس گھر کو تمہاری کمی بالکل محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ میں اور ہانی بھرپور کوشش کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر ناکام رہے تو اس کا بھی حل ہے میرے پاس.....''

''اچھا..... وہ کیا؟'' ..... ''وہ..... پھر میں امی کی بہو لے آؤں گا۔'' فلک ہنس پڑی۔

''بہت بدمعاش ہو گئے ہو۔ شناختی کارڈ بنا نہیں اور نکاح نامے کی فکر ہو رہی ہے۔''

''کیوں تو کیا ہوا؟..... وہ بھی بن جائے گا۔

بہنوں کو تو بڑی فکر ہوتی ہے۔ بھائیوں کی، تمہیں اپنی اکلوتی بھابھی نہیں چاہیے۔ وہ کچھ روٹھا روٹھا لگا۔

''اچھا جناب! تو کیسی لڑکی چاہیے۔''

''کیسی بھی ہو؟ امیر غریب، فیشن ایبل یا سادہ، پڑھی لکھی یا ان پڑھ، کیسی بھی ہو چلے گی۔'' وہ شرمایا۔

''اوہو! الفاظ ضد کا ڈھیر بتا رہا ہے کہ بس ایک مخلوق ہو جس کو لڑکی کہیں اور کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔''

''نہیں ایک ڈیمانڈ ہے بس......''

''اچھا! وہ کیا......؟'' وہ متجسس ہوئی۔

''وہ لڑکی......'' وہ رکا۔

''ہاں...... ہاں'' فلک کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

''بس تمہاری طرح صفائی کا کیڑا نہ ہو۔''

فلک کا سارا پیار اور اشتیاق اڑن چھو ہو گیا۔ آنکھوں میں امڈے جذبات بخارات بن کر اڑ گئے ان کی جگہ جلال نے لے لی۔

''مطلب!'' تیور کڑے تھے۔

''مطلب یہ ہے۔ اللہ اللہ کر کے ہزاروں منتوں مرادوں کے بعد تو تم سے چھٹکارا مل رہا ہے۔ میرا سارا بچپن تمہاری ڈانٹوں سے بھرا ہے۔ یہ کرو...... وہ نہ کرو...... میں تو بہت خوش ہوں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ مجھے قید با مشقت سے نجات ملے گی۔ اور تم جیسا ہی پیس مل جائے تو میرے لیے تو عمر قید کی سزا ہوئی ناں......'' اس نے صاف انداز میں کہا۔

''فٹے منہ تمہارا...... اللہ کرے تمہیں عمر قید کی ہی سزا ملے تمہاری بیوی مجھ سے دو قدم آگے ہی ہو۔ بھاڑ میں جاؤ، کمرے کو کچرا کونڈی بنا کر رہو۔'' وہ غصے میں بھری کمرے سے نکل گئی۔ وہ مزے سے سیٹی بجاتا۔ بال بنانے لگا۔

☆☆☆

آخر شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ تمام تر شوخیوں ہنگاموں اور شور شرابے کے ساتھ فلک رخصت ہو کر چلی گئی۔ نئی زندگی کی شروعات بے حد دل فریب تھیں۔ دونوں ہنی مون پر گئے۔ من پسند ہمسفر ساتھ ہو تو لطف ہی دوبالا ہوتا ہے۔ فلک تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ ہنی مون سے واپسی پر گھر گئی تو امی نے روک لیا۔ حیدر کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر امی کے اصرار پر رکنے کی اجازت دے دی تھی۔ خود اس کا بھی دل چاہ رہا تھا۔ وہ سب کو بہت مس کر رہی تھی۔

''امی! اب آپ ٹیپو کے بارے میں بھی سوچ ہی لیں۔''

''اسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ کیا بنے گا۔ اس لڑکے کا۔ ایف ایس سی کا رزلٹ آئے تو پتا چلے کیا تیر مارا ہے۔''

''امی میں تو پیپر دینے گیا تھا تیر اندازی کرنے نہیں''۔ بہت بھولپن سے بتایا گیا۔ ''رزلٹ کا کیا ہے آ ہی جائے گا۔ شناختی کارڈ بھی بن ہی جائے گا آپ ٹیپو کے لیے لڑکی دیکھیں''......

''لڑکی اور اس کے لیے!'' انہیں جھٹکا لگا۔

''شیمپو کی بوتل کا ڈھکن تو بند کرنا آیا نہیں۔ لڑکی دیکھوں تم بھی کمال کرتی ہو فلک۔''

''امی گوری ہو یا کالی! اچھی ہو یا بری کوئی فرق نہیں پڑتا بس لڑکی ہو۔'' کیوں بھیا!'' اس نے نہایت لاڈ سے کہا۔

''اکلوتی بہو ہو گی تو دیکھ بھال کر ہی لاؤں گی۔ کا جر مولی تھوڑا ہی ہے کہ خراب نکل گئی تو دوسری لے لیں۔''

''آپ کے لاڈلے کو ارمان سوجھ رہے ہیں۔'' اس نے بھانڈا پھوڑا۔

''فلک! کون سی دشمنی نکال رہی ہو۔'' امی کی نگاہوں میں جلال کی تپش دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔

''کوئی دشمنی نہیں نکال رہی میرے بھیا! تمہارا کام آسان کر رہی ہوں۔'' اس کی نگاہوں میں شرارت اور لہجے میں بھولپن تھا۔

''کام آسان کر رہی ہو یا زندگی تنگ...... امی یہ ایسے ہی مذاق کر رہی ہیں۔ باخدا میں نے کچھ نہیں

کہا۔ ٹیپو کی حالت بری ہونے لگی۔"
"پھر تم کہہ کر تو دیکھو...... کچھ کہنے کے قابل نہیں رہو گے۔" امی کا جلال، جلال الدین اکبر کو شرمانے لگا۔
"ارے امی! آپ کو بہو لانے کا شوق نہیں ہے کیا؟ ماؤں کو تو بہت ارمان ہوتا ہے اپنی بہو لانے کا۔" اس نے مزید آگ لگائی۔ "اور ہاں! خیال رکھیے گا۔ لڑکی پھوہڑ ہو۔ سلیقہ مندی چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ گندی سندی رہنے والی بھی چلے گی۔
"توبہ! ایسی لڑکی تو میں ماسی نہ رکھوں تم بہو لانے کا کہہ رہی ہو۔ لڑکی یہ مشورہ دے رہی ہو یا انتقام لے رہی ہو۔" امی نے تصور میں جھرجھری لی۔
"آپ کے بیٹے کی پسند بتا رہی ہوں۔" ٹیپو سے مزید نہ سہا گیا اس نے ٹل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کی دبی دبی مسکراہٹ دیکھ کر امی بھی اس کی شرارت سمجھ گئیں۔
"فلک تم بھی ناں...... ڈرا کر رکھ دیا کیسا خوفناک نقشہ کھینچا تھا تم نے۔ ٹیپو کو دیکھا تھا بے چارے کا حال برا ہو گیا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔
"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بھی اس کا ہونق گھبرایا چہرہ تصور میں لا کر مسکرا دی۔

☆☆☆

"کیا حال ہے جناب کا؟" اس نے بڑے ناز سے پوچھا۔ "تمہارے بنا کیسا ہوگا؟" جواباً شکوہ آیا۔
"اے کیا ہوا؟"
"بور ہو رہا ہوں یار......" اس نے بے بسی سے کہا۔
"مگر میں تو مزے میں ہوں۔"
اس نے شرارت سے کہا۔
"ہاں جناب! آپ کو ہماری کیا پروا یہ تو ہم ہی ہیں جو دیدہ و دل وا کیے بیٹھے ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔
"کیا بات ہے؟ واقعی اداس ہیں۔"
"ہاں یار اصل میں اکیلا ہوں"
کیوں کہ! امی لاہور گئی ہیں۔ کسی رشتہ دار کی فوتگی میں۔ ارسل بھی ساتھ گیا ہے اور میں کل رات سے یونہی بور ہو رہا ہوں۔ آفس کی بھی چھٹی ہے ہفتہ ہے ناں!
"اور آپ مجھے اب بتا رہے ہیں سارا دن گزار کر مجھے فون کر دیتے میں آ جاتی" اسے فکر ہونے لگی۔ اور آنٹی بھی کیا سوچیں گی کیسی بہو ہے پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔"
"آپ کی ساسو ماں نے ہی منع کیا تھا۔ بچی شادی کے بعد اپنے گھر گئی ہے سکون سے رہنے دو۔ تو میڈم اس لیے نہیں بتایا۔"
"اوکے فائن! آپ فوراً آ جائیں میں گھر آ رہی ہوں۔" اس نے فیصلہ سنایا۔
"سچ! وہ بے طرح خوش ہوا" مگر تمہاری امی...... وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔" انہیں میں بتا دوں گی آپ بس جلدی سے آ جائیں۔" وہ متفکر تھی۔
"اوکے ابھی آ رہا ہوں میں۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹی۔ ٹیپو کینہ توز نظروں سے کھڑا گھور رہا تھا۔
"شادی کے بعد لڑکیوں کو عقل آتی ہے تم تو رہی سہی عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہو۔"
"ارے مذاق تھا یار"
"واہ! کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری۔ امی سچ سمجھ کر اپنا زنانہ ہتھیار مردانہ وار اس معصوم پر برسا دیتیں تو......"
اس کا غصہ کم ہونے سے میں نہ آ رہا تھا۔
"ہاں تو...... بہت دن ہو گئے تم نے مار نہیں کھائی ذرا سین ہو جاتا تو ہم بھی تماشا دیکھ لیتے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "فلک اللہ کرے...... اللہ کرے......" مارے غصے کے اسے کوئی بددعا بھی نہ سوجھی۔
"سوچو...... سوچو...... شاید کچھ یاد آ جائے۔ پھوہڑ لڑکی کے ہونے والے احمق شوہر" اس نے چڑایا۔

''مجھے پھوہڑ لڑکی ملے نہ ملے۔ اللہ کرے تمہیں پھوہڑ شوہر مل جائے بلکہ شوہر تو مل گیا ہے۔ اللہ کرے وہ اندر سے پھوہڑ نکل آئے۔

''اسے سوجھ ہی گیا۔''

''اچھا...... وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔'' اچھا میرا پیارا بھائی ناراض ہو گیا۔ ارے مذاق کر رہی ہوں۔ چلو غصہ تھوک دو۔ امی کا انداز جارحانہ ہوتا ناں تو ان کے سامنے آکر مار کھا لیتی مگر تم پر آنچ نہ آنے دیتی۔'' اس نے پیار سے ماتھا چوما۔'' اب ایک ہی تو بھائی ہو۔ تم کو تنگ نہ کروں تو کس کو کروں۔'' اس نے بازو حمائل کر کے ساتھ لگا لیا۔

''اچھا......'' وہ فوراً پگھل گیا۔'' سوری یار! غصے میں کچھ بولا تمہیں برا لگا تو......'' ارے یہ کیا سین ہے۔ یہ مودی قمر صاحب کو کیسے لگے لگائے ہوئے ہے۔'' ام ہانی نے اچانک آکر دیکھا تو بولے بغیر نہ رہ سکی۔ ''یہ مودی کیسے کہا'' دونوں نے بیک وقت غصے سے گھورا۔ ہانی بے چاری سٹ پٹا گئی اس کی ہونق شکل دیکھ کر فلک کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میری جان! چڑیا سا دل ہے۔''

کیا بات ہے بڑا پیار آرہا ہے۔'' ہانی سے ہضم نہ ہو پا رہا تھا۔

''جا رہی ہوں'' نہیں یار...... کیوں...... ابھی تو دن ہیں۔'' ہانی کو جھٹکا لگا۔ '' آنٹی کو اچانک لاہور جانا پڑا ہے۔ حیدر اکیلے ہیں۔ اس لیے''۔

''افوہ!'' دونوں کے منہ لٹک گئے۔ ''پھر آجاؤں گی!'' اس نے تسلی دی۔ مگر دونوں کے منہ لٹکے ہی رہے۔

☆☆☆

امی کو بتایا تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ حیدر کچھ دیر میں آگیا۔ واپسی پر فلک نے اس کی خوشی واضح محسوس کی۔ وہ گنگنا رہا تھا۔ ''ہانی بہت افسردہ تھی'' فلک نے بات شروع کی۔

ان کے ساتھ اتنا عرصہ گزرا ہے اب الگ ہو گئی ہو تو اداس ہونا فطری ہے۔ اب مجھے دیکھو صرف تین ہفتے ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔ پہلے امی جاتی تھیں اکیلا رہتا تھا مگر اب تو تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔''

''مجھے مس کر رہے تھے۔''

''بہت بہت زیادہ۔''

اس نے شدت سے کہا۔ فلک اس کی محبت محسوس کر کے مسکرا دی۔

☆☆☆

گھر میں قدم رکھتے ہی ایک سکون بھرا احساس اس کے رگ و پے کو چھو گیا تھا۔ ابھی اس گھر سے رشتہ جڑے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا مگر مکان نے مکین کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ ماشاء اللہ کہتی گھر میں داخل ہونے کی دعا پڑھتی اندر آگئی۔ خوبصورت لان' صاف ستھرے پودے' ہری بھری گھاس نے دل خوش کر دیا تھا۔

''حیدر آپ کمرے میں چلیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' اس نے محبت سے کہا۔

کچن کا دروازہ کھولتے ہی حیرت کا کوہ ہمالیہ اس کے سر پر گر پڑا۔ سنک میں برتنوں کا انبار،

چولہے پر آئل کی بھرمار۔ پتا نہیں کچھ جلایا گیا تھا یا تیرایا گیا تھا۔ سلیب پر مالٹے کے چھلکے۔ آنٹی ہوتیں تو بے ہوش ہو جاتیں۔

''اکیلے تھے ہوسکتا ہے طبیعت خراب ہو گئی ہو''۔ اس نے دل کو تسلی دی۔ وہ فوراً ایپرن پہن کر کام میں لگ گئی۔ ذرا سی محنت سے کچن چمک اٹھا۔ چائے کے ساتھ نگٹس فرائی کر کے کمرے میں آئی تو جم کر رہ گئی۔ حیدر مزے سے بیڈ پر دراز تھا۔ الماری کے پٹ وا تھے۔ جوتے ایک دوسرے سے جدا مختلف سمتوں میں پڑے دہائی دے رہے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر خالی کپ، چپس کے ریپرز کا ڈھیر تھا۔ سب سے حیران کن بات اتنے کباڑ میں مزے سے حیدر کا براجمان ہونا تھا۔

''حیدر...... یہ سب ......''اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

''آؤ ناں! اس نے اٹھ کر ٹرے تھام لی اور فلک کا ہاتھ پکڑ کر سامنے لے آیا۔

''چائے پیو پھر بتاتا ہوں۔'' فلک کے حلق میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔''اتنی حیران کیوں ہو......'' اس نے بغور دیکھا۔

اور وہ حیران کیوں نہ ہوتی۔ اس رشتے سے جڑی سب سے بڑی خوبی ہی اس گھر کی نفاست اور سلیقہ مندی تھی۔ جو اس کمرے میں دور دور تک نظر نہ آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کہ وہ کسی اور جگہ آگئی ہو۔

''وہ......کچن اور یہ......یہ سب کیا ہے۔''

''بھئی' بات دراصل یہ ہے کہ امی کی صفائی پسندی نے ہمیں بھی نفیس بنا دیا تھا۔ ذرا سی گندگی وہ برداشت نہ کرتیں' خود کام کرنے کھڑی ہو جاتیں۔ نتیجتاً آئے دن بیمار رہتیں۔ اس لیے میں نے اور ارسل نے گھر کے کام سنبھال لیے۔ مگر دل کے اندر ایک چھوٹا سا شرارتی بچہ ضرور رہتا تھا۔ جس کا دل سامان بکھیرنے کو چاہتا۔ وہ شرارتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر امی......ان کی محبت میں وہ بچہ ہمیشہ قید رہا۔

امی نے جب تمہارے بارے میں بتایا تو تمہاری عادتیں امی سے ملتی جلتی تھیں۔ میں نے سوچا تم امی کے معیار پر پوری اترو گی اور ان کو گھر کی طرف سے بے فکری ہو جائے گی۔ اور میری برسوں کی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔ میرا بھی دل چاہتا ہے۔ میں سامان بکھیروں کوئی سمیٹے۔ میں کچرا پھیلاؤں کوئی صفائی کرے۔ میں چیزیں بے ترتیب کروں' کوئی غصہ کیے بغیر وہ ترتیب سے رکھے۔ کوئی گیلا تولیہ کمرے میں پھینکنے پر ناراض نہ ہو۔ میرے اندر مقید وہ شرارتی بچہ جو برسوں سے اپنے ارمان پورے کرنے کی خواہش لیے تھا۔ اب باہر آگیا ہے اور تمہیں اس کا مان رکھنا ہے۔''

''جی؟؟''فلک تو مرتے مرتے بچی

''جی! میری خواہش تھی کہ میری بیوی امی جیسی سلیقہ مند ہوتا کہ وہ میرے سلیقہ کا پردہ رکھ لے۔ اور تم بالکل ویسی ہو فلک! تمہارا ساتھ پا کر میں واقعی بے حد خوش ہوں۔'' وہ اپنی رو میں ہنستا فلک کا فق چہرہ نہ دیکھ پایا تھا۔

''اور مجھے امید ہے تم میرے اس رنگ کو اپنا کر میرے رنگ میں رنگ جاؤ گی۔ ہے ناں'' وہ شرارت سے چپس کا ریپر اس کو مارتے ہوئے بولا۔ فلک کیا بولتی اس کے ہاتھوں کے توتے، کبوتر، کوّے چیل' چڑیاں سارے پرندے ایک ساتھ اڑ رہے تھے۔

وہاں ٹیپو اور ہانی کو ڈانٹ ڈپٹ تو کر لیا کرتی تھی۔ یہاں......

میاں جی نے فرمائش داغی بھی تو کیا......بہتر تھا۔ غوری میزائل داغ دیتے۔ ٹیپو کی بددعا بہت جلد پوری ہوئی تھی۔ اس کے سلیقہ مند دکھائی دینے والے شوہر میں پھوہڑ انسان نکل آیا تھا۔ اور یہ ساتھ عمر بھر کا تھا۔ راہِ فرار کہیں نہ تھی۔

☆

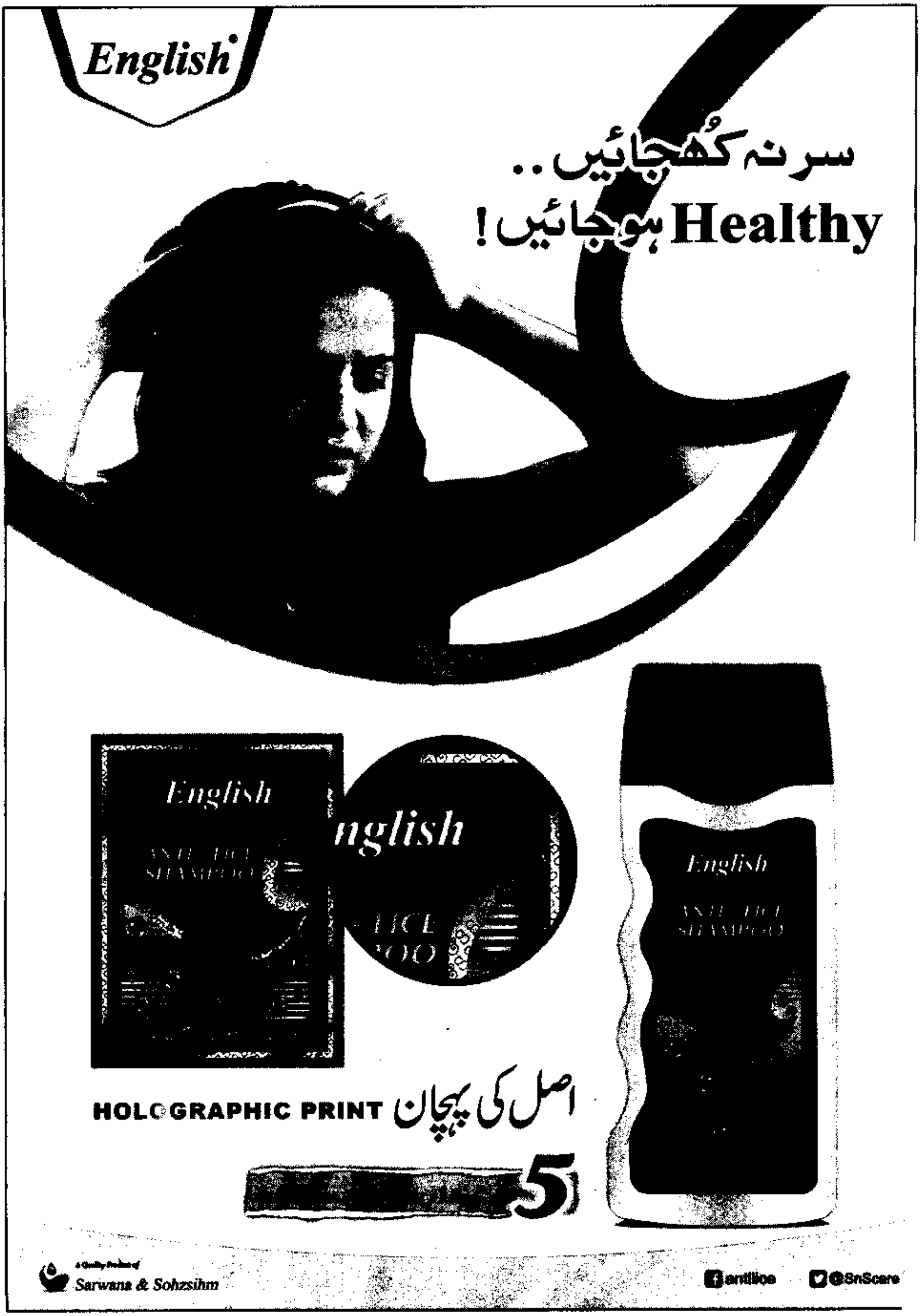
English
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہوجائیں!
English
nglish
English
اصل کی پہچان HOLOGRAPHIC PRINT
5
Sarwana & Sohzsihm
antilice
@SnScare

نادیہ احمد

تیری اک نگاہ کے اسیر

"اندر نہیں چلیں گے صاحب؟" بلند دروازے کی سیاہ محراب کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر سامنے نظر آتی، اس پُرشکوہ اور بلند و بالا عمارت کو دیکھا جس کے لاتعداد دروازوں اور ان گنت جھروکوں سے جھانکتی انا اور سفاکی آج اتنے برسوں بعد بھی قائم و دائم تھی۔ گزرے ماہ و سال کا کوئی بھی خسارہ اس کو کم نہیں کر پایا تھا۔ اس کے رکنے پہ ساتھ چلتا ملازم بھی احتراماً وہیں رک گیا۔

اس نے ایک نظر فلک شیر کو دیکھا جس کی کنپٹیوں سے جھانکتی سفیدی اس کی وفاداری کی عمر کا پتا دے رہی تھی۔ ایک تلخ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا اور بنا کچھ کہے وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ فلک شیر دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا کہ اس مقام سے آگے اس کے پر جلتے تھے۔

"میں صدقے، میں واری! برسوں بعد مجھ کرم جلی کو میرے چھوٹے شہزادے کا دیدار نصیب ہوا۔" ہال میں داخل ہوتے ہی گھر کی پرانی ملازمہ قدسیہ بوا نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

"میں تو سمجھی تھی جیتے جی شاید اب آپ سے ملنا نصیب ہی نہ ہو"۔ اپنی آنکھوں کی نمی کو دوپٹے کے کونے سے صاف کرتے وہ مزید بولیں تو اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے ان کے جھرّیوں بھرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھو کے تسلی

مکمل ناول

دی تھی۔ قدسیہ کی عمر ساٹھ سے اوپر کی تھی۔ وہ اس گھر میں اس کی پیدائش کے وقت آئی تھیں اور ہمیشہ سے ہی تبریز کے بہت قریب تھیں۔

''بابا کیسے ہیں؟'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

''بستر پکڑ لیا سائیں نے تو، ایک ہفتہ ہو گیا۔ روز ڈاکٹر آتا ہے، نسخہ بدل کر یہ جا وہ جا۔'' قدسیہ بوا نے ایک گہرا سانس لیتے دکھی لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''کچھ بتایا نہیں، انہیں ہوا کیا ہے۔'' اس نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ارے میرا بچہ! ہم غلام ابن غلاموں کو بھلا کوئی کیا بتائے گا۔ تم آ گئے ہو تو خود ہی معلوم کر لو۔ میں نگوڑ ماری تو اٹھتے بیٹھتے اس گھر کی خوشیوں کی دعائیں کرتی ہوں۔ پتا نہیں کس کی منحوس نظر کھا گئی اس آشیانے کو۔'' قدسیہ بوا ماضی میں کھوئی جذباتی ہوئی تھیں۔

وہ ماضی جس کی اذیت سے بچنے کی خاطر وہ سالوں سے جلاوطنی کاٹ رہا تھا۔ قدسیہ بوا اپنے ہی دھیان میں مگن گزرے ہوئے واقعات دہرانے لگیں۔ وہ لب کاٹتا خاموش کھڑا انہیں ٹوک بھی نہ پایا۔ اسی وقت ساتھ والے کمرے سے نکل کر ایک لڑکی ہال میں داخل ہوئی تھی۔

اجلی رنگت، سیاہ آنکھیں...... بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی اس کا حلیہ بے حد عام سا تھا۔ اسے قدسیہ کے ساتھ کمرے میں موجود پا کر وہ ایک پل کو ٹھٹکی۔ آنکھوں میں تحیر ابھرا تھا۔ بس ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جگنو ٹمٹمائے تھے، پر اسے حیرت سے اپنی جانب متوجہ پا کر آن کی آن میں وہ دیے بجھ گئے۔ سر جھکائے وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''قدسیہ بوا! یہ لڑکی......؟''

''پہچانے نہیں...... بیوی ہے آپ کی۔'' قدسیہ بوا کی آواز اس کی سماعت پہ بم بن کر گری تھی۔ وہ گنگ کھڑا رہ گیا۔ زندگی سے دور، بے جان اور تھکا ہوا چہرہ اور وہ آنکھیں جو چیخ چیخ کر شکوہ کرتی ایک ہی پل میں اسے پاتال میں دھکیل گئی تھیں۔ وہ زبان سے ایک بھی لفظ کہہ نہیں پایا۔

جواب نہ پا کر قدسیہ بوا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اس کے پیچھے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

''ہائے اور بّا! لڑکی، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' روزینہ بیگم نے اسے دیکھ کر ماتھا پیٹ لیا۔

''کیوں اچھی نہیں لگ رہی کیا؟'' دیوار پہ لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عکس پہ نگاہیں جمائے صلہ نے خود پہ تنقیدی نگاہ ڈالی۔ مقیش کے کام والا سرخ شیفون کا کرتا اور اسی کی ہم رنگ ڈھیروں سرخ کانچ کی چوڑیوں سے دونوں کلائیاں بھری ہوئی تھیں، پر اماں نے جو چیز دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی، وہ تھی اس کے لبوں پہ تہ بہ تہ جمی لال لپ اسٹک۔

''سسرال جا رہی ہو جو اتنا سنگھار کیے گھوم رہی ہو۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ تنک کر بولیں۔

''تو پھر آپ کیوں ایسا سنگھار نہیں کرتیں۔ سادہ سے حلیے میں بیٹھی سارا دن نوکروں پہ حکم چلاتی رہتی ہیں حالانکہ آپ تو برسوں سے سسرال میں ہی بیٹھی ہیں''۔ شرارت سے نچلا لب دبائے اس نے اماں کو چھیڑا تو وہ قدرے جھینپ سی گئیں۔ ناک سے مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولیں۔

''ارے ہٹو...... اب میری کون سی عمر ہے ان چونچلوں کی بھلا۔''

صلہ نے بے اختیار لاڈ سے دونوں بانہیں ان کی گردن میں ڈال دیں۔ ''عمر تو خیر آپ کی بھی

کوئی زیادہ نہیں، پر مجھے چونچلے کرنے سے کیوں روکتی ہیں اماں بی"۔ اس نے شوخ انداز میں ناراضی جتائی۔

"ہم نہیں روکتے، شادی کے بعد جو چاہو شوق پورے کر لینا مگر کنواری لڑکیوں کو ایسے سنگھار نہیں کرنا چاہئیں میری لاڈو۔ شادی پہ روپ نہیں آتا۔" اس کے سیاہ لمبے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے روزینہ بیگم نے پیار سے سمجھایا۔

وہی برسوں پرانی باتیں جو سینہ بہ سینہ چلتی روایتوں کا حصہ بن چکی تھیں۔ روزینہ بیگم کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ گو بیٹی سے محبت بھی شدید تھی، اتنی کہ کوئی بات ٹالی نہ جاتی تھی پر تربیت کا انداز ان کا سخت تھا۔ صلہ کو صبح شام یہ ٹوکا ٹاکی سننا پڑتی۔

یوں کیوں چل رہی ہو، لڑکیوں کو دھیمی چال چلنی چاہیے۔ ارے دوپٹا ٹھیک سے اوڑھو بڑی ہوگئی ہو۔ یوں منہ کھول کر ہنسنا منع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"تو بس ٹھیک ہے۔ پھر آپ میری شادی کر دیں۔" اس کی معصومانہ بات پہ اماں بی بے اختیار ہنس دی تھیں۔ صلہ ان کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھی۔ ایسی تمام نصیحتوں کے بعد ان کی تان شادی پہ آ کر ٹوٹتی تھی مشکل سے حالانکہ وہ ابھی چودہ سال کی تھی۔

"لو بھلا تو وہ میٹرک کے بعد کالج جانے کا پروگرام ختم ہوگیا جس کے لیے ابا جان سے سفارشیں کرائی جا رہی تھیں۔ اچھا بھئی ہمیں کیا کر دیتے ہیں اپنی لاڈو کا بیاہ۔" کل دو ہی تو اولادیں تھیں ان کی۔ اس گھر کی ساری رونق ان ہی کے دم سے تھی۔ جہاں بیٹھیں محفل کشت و زعفران ہو جاتی۔

"آپ کو تو پتا ہے، مجھے لال رنگ کتنا پسند ہے لیکن آپ ہمیشہ ٹوک دیتی ہیں۔ اب اگر لپ اسٹک لگانے کی یہی شرط ہے تو پھر ٹھیک ہے کر دیجیے میرا بیاہ۔" کمال بے نیازی سے کہتے ہوئے اس نے گردن اکڑا کے کہا تھا۔ اسی وقت ثمر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے سجے سنورے روپ نے بے اختیار دھڑکنوں کو تیز کیا۔

"سرخ لپ اسٹک کی خاطر یہ بندی اپنی تعلیم کی قربانی دے دے گی اماں بی!" اس کی آمد سے بے خبر وہ اپنی ہی شوخیوں میں مصروف تھی۔ اماں بی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
[illegible]	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
[illegible]	فرحت اشتیاق	500/-
دل دا دیس	ثمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
وہ پگلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	180/-
امر بیل	عمیرہ احمد	450/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	300/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	120/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-

[redacted]

نے ہلکی سی چپت سر کے پچھلے حصے میں رسید کی تو وہ گرنے کے سے انداز میں ان کی گود میں ڈھیر ہو گئی۔

''یہاں دروازے میں کیوں کھڑے ہیں؟'' پیچھے سے آتی فارینہ نے ثمر کو وہاں رکا دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔ وہ یوں چونکا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ اسی وقت اماں بی اور صلہ دونوں کی نظر ایک ساتھ ثمر اور فارینہ پہ پڑی۔

''ارے بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ۔'' اماں بی کے محبت سے بلانے پہ فارینہ، ثمر کو خفگی سے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی، پیچھے زیرِ لب مسکراتا ثمر ہال میں داخل ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم ممانی جان!'' فارینہ نے سلام کیا تو روزینہ بیگم نے اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ماتھے ہوئے پہ بوسہ دیا۔ وہ سلام کر کے ان کے پاس ہی تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔

''یوں اچانک کیسے آنا ہوا میرے بچوں کا؟'' اماں بی نے محبت سے پوچھا۔

''ثمر بھائی کی ٹریننگ شروع ہو رہی ہے نا ممانی جان تو آپ سے ملنے آئے تھے۔'' فارینہ نے بتایا کیا تو روزینہ بیگم دعائیں دینے لگیں۔

''اچھا اچھا، ماشاء اللہ! خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔''

''ارے واہ! اس کا مطلب اگلی بار ثمر بھائی اپنی یونیفارم میں ملنے آئیں گے۔ سچی مجھے تو بہت پسند ہے پولیس کی یونیفارم۔'' پاس بیٹھی صلہ نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ثمر اسی یونیفارم میں موجود تھا۔ ثمر کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا تھا۔

''بس اسی لیے تو پہنیں گے یونیفارم۔'' صلہ کے ساتھ بیٹھی فارینہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کیا مطلب؟'' صلہ اس سرگوشی کا مفہوم نا سمجھتے ہوئے حیرت سے بولی تو ثمر نے کھا جانے والی نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' مسکرا کر بھائی کو آنکھ مارتے ہوئے فارینہ نے صلہ کو تسلی دی۔ وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھی تھی۔ سر ہلا کے خاموش ہو گئی۔

''صلہ! اگلے ہفتے تمہاری سالگرہ ہے نا تو میں یہ گفٹ تمہارے لیے لایا تھا۔ میں تو یہاں ہوں گا نہیں۔ سوچا جانے سے پہلے تمہیں دیتا جاؤں''۔ ثمر نے ہاتھ میں پکڑا ایک خوبصورت بیگ صلہ کی طرف بڑھایا جسے اس نے جلدی سے پکڑا اور کھولنے لگی۔ اندر کچھ قیمتی تحائف تھے جنہیں دیکھ کر صلہ نے بے تحاشہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''ارے واہ ثمر بھائی! آپ کتنے اچھے ہیں۔ آپ کو میری سالگرہ کا دن ہمیشہ یاد رہتا ہے''۔ ثمر اس اظہارِ تشکر پہ ممانی جان کی موجودگی میں مسکرانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

☆☆☆

سفید کلف زدہ کرتے کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھے اپنے مہنگے کلون سے خود پہ اسپرے کیا۔ آن کی آن میں تیز مہک پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ ڈریسنگ پہ رکھی گھڑی اٹھا کر کلائی میں پہنتے شیشے میں خود پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے، وہ احساسِ تفاخر سے مسکرایا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''رکیں۔۔ میری بات سنیں''۔ وہ کوریڈور میں تھا جب پیچھے سے آتی آواز پہ اس کے قدم رک گئے۔ وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''اُف، کیا مصیبت ہے۔ کتنی بار کہنا پڑے گا کہ گھر سے نکلتے وقت پیچھے سے آواز مت دیا کرو۔ بدشگونی ہوتی ہے۔'' اس نے اکھڑے لہجے میں کہتے ہوئے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

''آپ اس وقت کہاں جارہے ہیں؟'' اپنی مہندی لگی ہتھیلیوں کو مسلتے، وہ ڈرتے ڈرتے بولی تھی پراس کے شوہر کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہوئی تھیں۔

''کیوں؟ کیا اس وقت گھر کے باہر کرفیو لگا ہے؟'' انداز ڈپٹنے کا سا تھا کہ اس کا خون ہی خشک ہوگیا پھر بھی ہمت کرکے پوچھ ہی بیٹھی۔

''اتنی رات کو......'' اس کی گھورتی نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔

''مردوں کو سو کام ہوتے ہیں۔ اب کیا ہر بار گھر سے نکلتے ہوئے تمہیں تفصیلی رپورٹ پیش کرکے اجازت لینی ہوگی مجھے۔'' وہ باقاعدہ چڑ کر بولا تھا۔ وہ لب کاٹتے خاموش رہی۔ کہنے کو بچا ہی کیا تھا۔

''جا کر سو جاؤ اور آئندہ خوامخواہ پیچھے سے مت پکارنا۔'' سر جھکائے اس کے قدموں کی آواز کوریڈور سے باہر نکلتے سنی تو۔ آنسوؤں کی چند بوندیں صبر کے بند توڑ کر آنکھوں سے بہنے لگیں۔ فقط چند روز ہی تو ہوئے تھے اس کی شادی کو پر آج تک اس نے اپنی بیوی کے سجے سنورے روپ کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ خاموشی سے آنسو بہاتی وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر موسلا دھار مینہ برستا اس کے ارمانوں پہ ماتم کررہا تھا۔

وہ جانتی تھی، آج بھی اس کے شوہر کی واپسی صبح ہی ہوگی۔

☆☆☆

کمرے میں بچھے جہازی سائز بیڈ پہ پڑے اس نحیف وجود میں اسے دیکھ کر حرکت ہوئی تھی۔ تبریز نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے مضبوط بازوؤں کی مدد سے سہارا دیتے ہوئے انہیں اٹھنے میں مدد دی۔ بیڈ کراؤن سے پشت ٹکائے انہوں نے بے اختیار اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ دھیما سا مسکرایا اور ان کے پاس بیڈ پہ ہی بیٹھ گیا۔ ان بوڑھی بے جان آنکھوں میں بھری وحشت آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی۔ خوشی کا احساس ان کے ہر انداز سے صاف ظاہر تھا۔

''آخر تم نے اپنی قسم توڑ ہی دی''۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی اور اس کوشش میں انہیں کھانسی کا زبردست دورہ پڑا تھا۔

تبریز نے پاس پڑی میز پہ پانی کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں پانی موجود نہیں تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بلند آواز میں پانی کے لیے پکارا۔ وہ اب اپنے دائیں ہاتھ سے ان کی کمر کو تھپتھپاتا انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ چند ثانیے بعد کمرے کے دروازے پہ دھیمی سی دستک ہوئی۔ اجازت ملتے ہی ہاتھوں میں پانی سے بھرا جگ اور گلاس تھامے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ میز پہ دونوں چیزیں رکھ کر اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے عقب میں کھڑے اس وجود کو دیکھا۔ سر تا پا سیاہ لباس میں ملبوس وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ نگاہیں جھکائے اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی نظروں کو خود پہ مرکوز پا کر اس نے بے اختیار اپنا نچلا لب کاٹا۔

''پانی۔'' ان کی کھانسی نے اس ارتکاز کو توڑا تھا۔ آگے بڑھ کر گلاس تیزی سے تھامتے تبریز کی انگلیاں ان نازک ہاتھوں سے ٹکرائیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی۔ تبریز نے اس کے تاثرات واضح محسوس کیے، پر اس پہ توجہ دیے بغیر وہ اب ایک ہاتھ بوڑھے باپ کی کمر پہ ٹکائے دوسرے ہاتھ سے گلاس ان کے لبوں سے لگائے انہیں پانی پلا رہا تھا۔

اسے لگا کمرے میں اب اس کی موجودگی بے

معنی ہے۔ وہ الٹے پیروں واپس لوٹ گئی پر دروازے پہ پہنچ کر اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا۔ تبریز کی پشت تھی اور وہ اب بھی اپنے بوڑھے باپ کی طرف متوجہ تھا۔ برسوں بعد وہ اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سیاہی مائل بھورے بال نفیس انداز میں ترشے ہوئے تھے جو اس کی صاف رنگت پہ اچھے لگ رہے تھے۔ وہ دراز قد اور بلاشبہ ایک وجیہہ مرد تھا' جس پہ کوئی بھی لڑکی دل و جان سے فدا ہو سکتی تھی کہ دل کو باندھ لینے کی اس میں صلاحیت تھی۔ پر افسوس وہ اس کا ہو کر بھی اس کا کچھ نہیں تھا۔ اس کے وجود سے غافل، لاتعلق اس کا دھیان وہیں تھا جن کی خاطر وہ سالوں بعد واپس آیا تھا۔ وہ برسوں پہلے بھی اس گھر اور اس کی زندگی میں بے حیثیت و بے توقیر تھی، اس کا مقام آج بھی نہیں بدلا تھا۔

اچانک تبریز نے گردن گھما کر اس کی کمرے میں موجودگی کی تصدیق کی۔ وہ جو اپنی بدقسمتی کے ماہ و سال گنتی ہوئی اپنے ہی دھیان میں گم تھی، اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر گھبرا گئی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اتنے سالوں بعد جو تبریز گھر واپس آیا تو یہ ناممکن تھا کہ اس سے ملاقات نہ ہوتی۔ باپ سے مل کر وہ سیدھا اسی کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ اجازت ملنے پہ وہ اندر پہنچا تو وہ اس وقت تبریز ہی کی منتظر تھی۔ وہ جس کی التجا پہ اسے واپس لوٹنا پڑا تھا۔

"تو تم آ ہی گئے۔" سنجیدہ چہرے اور مسکراتی آنکھوں سے سوال کرتے ہوئے وہ اسے بہت عجیب لگی تھی۔ شاید عجیب سے بھی کچھ زیادہ...... وہ سامنے رکھے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ یقیناً وہ اس پل اسی کی منتظر تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" سالوں بعد ملنے پر بھی اس کے پاس اس سے کہنے سننے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ لفظوں کا کاسہ خالی تھا یا وہ خود کھوکھلا ہو چکا تھا پر کب تک یونہی خاموش بیٹھا رہتا۔ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ اس کے سوال پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ نے رانیہ کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" بے اختیار اس کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ گزرے ماہ و سال کا شائبہ بھی نہ تھا یا شاید وقت نے اسے پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ وہ معصومیت جو اس کے حسن کو چار چاند لگاتی تھی، ہنوز اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

"سوال کے جواب میں سوال نہیں ہوتا۔" اچانک تبریز کو اپنی نظروں کی گستاخی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا۔

"زندہ ہوں۔" اس بار جواب دھیمے لہجے میں آیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ جانتا تھا، اس زندگی کے معنی کیا ہوں گے۔

"تم کہو، ہم سے دور جا کر خوش تو رہے نا۔" اس بار شکوہ کیا گیا تھا۔

"خوشی تو انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے، وہاں نہ ملے تو ادھر ادھر بھٹکنے سے کب حاصل ہوتی ہے۔" وہ زہر خند انداز میں مسکرایا۔

"تو کیا حاصل ہوا پھر اس جلاوطنی سے' جب ہم خوش رہے نہ تم۔" دوسرے لفظوں میں اسے حقیقت سے فرار کا طعنہ مارا گیا تھا اور یہ طعنہ تو ہر روز اسے اس کا ضمیر بھی مارا رہا تھا۔ پر اس کی زبان کی چوٹ شدید تر تھی۔

"بہت تھک گیا ہوں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ زندگی سے بھاگتے بھاگتے تھک چکا ہوں۔ رک کر اس تھکن زدہ وجود کو آرام دینا چاہتا ہوں۔ کسی کی آہ ہے جو سالوں سے

پیچھا کرتی عاجز کر رہی ہے۔ ضمیر کو کچوکے دے رہی ہے۔ پر وہ کچھ بھی کہہ نہیں پایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تمہارا کمرہ صاف کروا دیا تھا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو قدسیہ بوا یا کسی دوسرے ملازم سے کہہ دینا۔'' اسے صوفے سے اٹھتا دیکھ کر رانیہ بھی الوداعی انداز میں بولتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

اس کی بات پہ سر ہلاتا وہ متانت سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی تبریز نے دروازے کی ناب کو تھاما، دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک بار پھر وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ چند لمحے آ کر گزر گئے اور وہ دونوں ہی اپنی جگہ سُن سے کھڑے رہے اور پھر اس کی کشمکش کو آسان کرتے ہوئے وہ راستے سے ہٹ گیا تو وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

''تم کیا کر رہی ہو، میرے کمرے میں؟''

اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتا، رانیہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز پہ چونک کر اس نے پیچھے دیکھا تھا۔

''قدسیہ بوا نے کہا تھا کہ آپ کا کمرہ صاف کر دوں۔'' وہ نظریں جھکائے ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی میرے کمرے میں بھول کر بھی قدم رکھا تو کتوں کے آگے ڈلوا دوں گی۔'' وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ چاہ کر بھی تبریز قدم آگے نہیں بڑھا پایا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس وقت اس صورت حال میں کیا کرے۔ جانے کیوں اسے رانیہ کا یہ انداز تکلیف دے رہا تھا پر خاموش رہنا اس کی مجبوری تھی کہ وہ اسے جھوٹی امید دلانا نہیں چاہتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ اس کے پاس سے گزری تو بے اختیار تبریز نے نظریں چراتے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

پیچھے رانیہ غصے سے بے قابو انگلیاں چٹخا رہی تھی جیسے اس کی برداشت جواب دے چکی ہو۔

''یہ قدسیہ بوا بھی نا...... کتنی بار کہا ہے مجھے اس کی شکل نظر نہیں آنی چاہیے مگر ہر بار اسی کو بہانے سے میرے پاس بھیج دیتی ہیں جیسے اس گھر کے سارے ملازم مر گئے ہیں۔'' رانیہ کی بڑبڑاہٹ اور ناگواری کمرے سے باہر نکلنے پر بھی تبریز کو صاف اور واضح سنائی دی تھی۔

☆☆☆

رفیق احمد صدیقی کا تعلق کھاتے پیتے متموّل گھرانے سے تھا۔ گھر میں دولت کی چکاچوند نہ سہی پر اچھی زمین داری تھی۔ اچھی بیوی اور اولاد کی صورت قدرت نے انہیں اپنی ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔ وضع داری وراثت میں ملی تھی تو اپنے اعلا اخلاق کی بدولت انہوں نے خاندان اور معاشرے میں اپنا وقار قائم رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج برسوں بعد بھی بہن بھائیوں میں تعلقات بہترین تھے۔ اپنے ان ہی تعلقات کو مزید بہتر اور مستحکم بنانے کے لیے رفیق احمد نے اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کی بیٹی فارینہ کو اپنے بڑے بیٹے فیروز کے لیے مانگ رکھا تھا تو دوسری طرف ذکیہ بیگم بھی اپنے بیٹے ثمر کی خواہش پہ اکلوتی بھتیجی صلہ کو دل و جان سے بہو بنانے کی خواہش رکھتی تھیں۔

گو رفیق احمد کا گھرانہ بہت زیادہ تعلیمی رجحان نہیں رکھتا تھا شاید اسی لیے رفیق احمد کی طرح فیروز نے بھی بس میٹرک کے بعد زمین داری سنبھال لی تھی، البتہ صلہ کو جنون کی حد تک آگے پڑھنے کا شوق تھا اور اپنی اس خواہش کے پیش نظر وہ رفیق احمد سے آگے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ذکیہ بیگم کے دونوں ہی بچے لائق فائق تھے۔ ثمر نے حال ہی میں مقابلے کا امتحان پاس کیا تھا اور اب اپنی پولیس ٹریننگ کے سلسلے میں

لاہور اکیڈمی جا رہا تھا جبکہ فارینہ بھی مقامی کالج سے انٹر کر رہی تھی۔ ثمر کے برعکس فارینہ کو ماموں کا گھرانہ کچھ خاص پسند نہیں تھا اور اس کی واحد وجہ فارینہ کا فیروز سے جڑا رشتہ تھا۔ ہر لڑکی کی طرح فارینہ کے دل میں بھی اپنے شریکِ حیات کا ایک تصور تھا لیکن شومئی قسمت فیروز اس پہ کسی طور پورا نہیں اترتا تھا۔ فیروز میں بظاہر تو کوئی عیب نہ تھا پر فارینہ کو اس کی تعلیم کی کمی ہی سب سے بڑا عیب دکھائی دیتی تھی۔ دوسرے وہ بلا کا جذباتی اور کسی حد تک احمق تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ شدید ردعمل ظاہر کرنا اس کی عادت تھی تو بے حد معمولی باتوں پہ جھگڑا کرنا اس کا معمول۔ جبکہ فارینہ ایک حساس طبیعت کی نازک مزاج لڑکی تھی۔ ادب، شاعری اور رنگوں سے دل بہلانے والی۔

پہلی بار جب اس نے فیروز کے پاس ایک بے حد قیمتی ریوالور دیکھا تھا تو وہ بے تحاشا ڈر گئی تھی۔ جسے وہ بڑی شان سے ثمر کو دکھا رہا تھا۔ پھر ایک دن فیروز نے فارینہ کی آنکھوں کے سامنے اسی ریوالور سے رکھوالی والے کتے کو مار ڈالا۔ اس وقت تو فارینہ کو فیروز سے نفرت ہی ہوگئی تھی گو بعد میں پتا چلا کہ وہ کتا پاگل ہو کر اپنے ہی لوگوں کو کاٹنے لگا تھا پر فارینہ کا دل فیروز سے کھٹا ہو چکا تھا۔ وہ اسے بچپن سے جانتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ فیروز سے جڑے رشتے کو اس نے کبھی بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

آج بھی وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی پر ثمر کی درخواست پہ اسے یہاں آنا ہی پڑا اور پھر یہ تو ممکن ہی نہیں تھا وہ یہاں آئی اور اس کا سامنا فیروز سے نہ ہوتا۔ کچھ دیر روزینہ ممانی اور صلہ سے گپیں لگا کر وہ اب ثمر کی راہ دیکھ رہی تھی جو بیٹھک میں رفیق احمد کے ساتھ محوِ گفتگو تھا کہ اچانک باہر سے فیروز کو آتا دیکھ کر اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا۔

''کیا بات ہے محترمہ! مزاج کچھ برہم نظر آتے ہیں''۔ فارینہ کو دیکھ کر تو جیسے اس کی روح تک سیراب ہوگئی تھی۔ وہ لپک کر اس تک پہنچا تھا پر فارینہ نے اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''تم سے مطلب...... اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ ہٹو میرے راستے سے۔'' فیروز اس پہ جتنی جان چھڑکتا تھا، فارینہ اتنا ہی اسے دھتکارتی تھی۔

''راستہ ہی نہیں تمہاری تو منزل بھی ہم ہی ہیں مائی ڈیئر۔ یقین نہ آئے تو کل ابا جی کو بھیج دوں پھوپھو کے پاس شادی کی تاریخ فائنل کرنے؟'' وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا جس پہ کبھی فارینہ کی ملامت کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر سائیڈ سے نکلنے لگی تھی کہ اس نے فارینہ کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ فارینہ کا دماغ گھوم گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی گلفشانی کرتی' فیروز نے ہنستے ہوئے ایک دم اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''تم جیسے جاہل اور بے وقوف انسان سے شادی کرنے سے تو اچھا ہے میں ساری عمر کنواری رہوں فیروز۔'' اپنی کلائی کو رگڑ کے اس نے درد کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ جانتی تھی یہ سب لفاظی ہے۔ ہوگا وہی جو بڑوں کا فیصلہ ہے کیونکہ ذکیہ بیگم کبھی بھائی کو ناراض نہیں کریں گی۔

''زندگی تو تمہیں میرے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ ہنس کر یا رو کر، فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ جو شے فیروز کے نام سے منسوب ہو وہ اس سے کبھی دست بردار نہیں ہوتا۔'' فیروز نے انگلی کی پوروں سے اس کی تھوڑی اپنی طرف موڑتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو وہ اندر تک سلگ گئی۔

''میں کوئی چیز نہیں' ایک جیتی جاگتی انسان ہوں اور میری بھی کچھ خواہشات ہیں۔ مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرنے کا پورا اختیار

ہے اور میں تمہیں اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔" غصے سے پیر پٹختی وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

"جتنا مرضی پھڑ پھڑا لو میری جان! آنا تو آخر تمہیں اس شکاری کے جال میں ہی ہے۔" فیروز قہقہہ لگاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس پہ فارینہ کی تلخی کا چنداں اثر نہیں تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا فاری! یہ منہ کیوں اتنا پھلا رکھا ہے؟"

فیروز کی حرکتوں پہ منہ بسورتی' وہ اپنی انگلیاں مروڑتی' رو دینے کو تھی کہ ثمر وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی بہن کے بگڑے تیور محسوس کر لیے تھے۔ فیروز کی ان ہی باتوں کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آتی تھی اور آج پھر اس نے اپنے رویے سے فارینہ کو نا صرف مایوس کیا تھا بلکہ اس رشتے کو لے کر دل میں پڑی گرہ مزید مضبوط کر دی تھی۔ اسے تو اپنی قسمت پہ رونا آتا تھا کہ کیا دیکھ کر ماں نے اس کا رشتہ ایسے گنوار انسان سے طے کر دیا ہے' جسے تمیز چھو کر بھی نہیں گزری لیکن یہ باتیں وہ بس سوچ ہی سکتی تھی کیونکہ ابھی ان کے گھرانے اتنے ماڈرن نہیں ہوئے تھے کہ بیٹیوں کی خواہش پہ رشتے طے کیے جاتے۔ اس کے لیے تو یہی غنیمت تھا کہ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو کالج جا رہی تھی۔ پر آج فیروز سے ہوئی منہ ماری کے بعد اس نے طے کر لیا تھا وہ گھر جا کر ماں سے اس رشتے کو ختم کرنے کی درخواست ضرور کرے گی۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے ثمر بھائی۔ صلہ کے چکر میں آئے دن آپ یہاں پہنچ جاتے ہیں اور ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیتے ہیں"۔ اب اسے یہ تو بتا نہیں سکتی تھی کہ فیروز اس کے ساتھ کیسی باتیں کر کے گیا ہے۔ ایک تو بھائی سے حیا کا معاملہ دوسرے کچھ بھی تھا' ثمر بھی جوان اور گرم خون تھا اس پہ نئی نئی پولیس میں بھرتی۔ مبادا اس چکر میں کوئی بڑا جھگڑا ہی نہ ہو جائے۔ اس نے شکایت تو کی پر اندر کی بات گول کر گئی تھی۔

"یار! وہ تمہاری ہونے والی بھابھی ہے۔ اتنا تو میری خاطر کر ہی سکتی ہو تم۔" ثمر نے بہن کو منانے کی کوشش میں دایاں بازو دوستانہ انداز میں اس کے گرد حمائل کر دیا۔ فارینہ نے خفگی سے اسے دیکھا اور پھر اس کا بازو جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

"بہت فضول انسان ہیں آپ۔ اور اس سے بھی پوچھا ہے کبھی' وہ کیا چاہتی ہے یا بس خود ہی طے کر چکے ہیں کہ اسے میری بھابھی بنانا ہے"۔ ثمر بھی اس کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔

"وہ تو ابھی بالکل بچی ہے۔ اسے ان سب باتوں کی کیا خبر۔ ویسے ماموں جان کو مجھ سے بڑھ کر شاندار داماد کہاں ملے گا"۔ ثمر نے قمیص کا کالر اونچا کرتے اسٹائل مارا تو فارینہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اچھا اب اگر آپ کا خیالی پلاؤ پک چکا ہو تو گھر چلیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس گھر میں آ کر شدید الجھن ہوتی ہے۔" وہ دونوں اب گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔

"اچھا اب غصہ نہ کرو، گھر ہی جا رہے ہیں۔" ثمر نے مصالحتی انداز میں ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ جیسے جیسے گاڑی اس گھر سے دور جا رہی تھی، اس کا موڈ بھی نارمل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

"بوا! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ کوئی اور کام تو نہیں۔"

اپنی سیاہ چادر سے گیلے ہاتھ پونچھتے اس نے کچن کا تنقیدی جائزہ لیا۔ جب سے قدسیہ بوا کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا وہ کم ہی کسی کام کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ خود اسے بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ

ایک عمر رسیدہ عورت اتنی تکلیف کے ساتھ گھر کے کام کاج کرے۔ گھر میں چند دوسرے ملازم بھی تھے مگر کچن سالوں سے قدسیہ بوا کے ہاتھ میں تھا اور اب قدسیہ بوا نے اسے بھی باقاعدہ ماہر کر دیا تھا۔ جس دن اس کی جگہ کھانا قدسیہ بوا پکاتیں تو لازمی اعتراض اٹھایا جاتا پر — کبھی اس کے لیے تعریفی کلمہ کسی کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔

''اور تو کوئی کام نہیں بس یہ دودھ کا گلاس تبریز کے کمرے میں رکھنا ہے۔''

قدسیہ بوا نے دودھ کی پتیلی فریج میں رکھتے ہوئے کچن کاؤنٹر پہ رکھے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔

''بوا! میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں۔'' نگاہیں جھکائے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

یوں تو صبح سے متعدد بار اس سے سامنا ہو چکا تھا۔ وہ تو اپنے روز کے کاموں میں مصروف تھی اور اس دوران کبھی میز پہ کھانا لگاتے تو کبھی جھاڑ پونچھ کرتے اس پہ نگاہ پڑ جاتی تھی۔ اپنے باپ کی طبیعت کے پیشِ نظر وہ آج زیادہ وقت ان کے کمرے میں ہی رہا تھا اور جب سے ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی، ان کی دیکھ بھال اور کام کاج کی اضافی ذمہ داری بھی اس پہ ہی آ پڑی تھی۔

یہ الگ بات کہ اپنی بیماری کے باعث وہ اتنے چڑچڑے ہو گئے تھے کہ پہلے سے بھی زیادہ ڈانٹ پھٹکار اور نفرت زدہ الفاظ اس کی طرف اچھالتے رہتے تھے۔ تبریز کی موجودگی میں بھی آج کئی بار انہوں نے اسے دھتکارا تھا۔ جس طرح وہ باپ کے پاس چپ سادھے بیٹھا اس کی بے عزتی ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر اسے اور بھی تکلیف ہوئی تھی پر تکلیف تو جیسے اب سانسوں کی طرح زندگی میں شامل تھی۔

''کیوں بٹیا! تمہارے وہاں جانے پہ کوئی پابندی لگی ہے کیا۔ سارے گھر کا کام کرتی ہو تو وہاں کیوں نہیں جا سکتیں۔'' قدسیہ بوا کا لہجہ عام سا تھا۔

''ان کو پتا چل گیا تو......'' اس کا اشارہ رانیہ کی طرف تھا۔ سب سے زیادہ خوف تو اسی کا تھا۔ وہ قدسیہ سے اپنے خدشے کا اظہار کیے بنا نہیں رہ پائی تھی۔

''نیند کی دوا لے کر سو چکی ہیں۔ سو تم ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اتنے برسوں بعد وہ گھر لوٹا ہے میری بچی! کیا پتا اسی بہانے تیری سوئی ہوئی تقدیر جاگ جائے۔''

اسے قدسیہ بوا کی خوش خیالی پہ ہنسی آئی تھی۔ اس گھر میں بس ایک قدسیہ بوا ہی تھیں جنہیں اس سے دلی ہمدردی تھی۔ پہلی بار سب کی نفرت اور غصے سے خوف زدہ ہو کر اس نے قدسیہ بوا کے پیچھے ہی پناہ لی تھی۔ قدسیہ بوا کو اس پہ ترس بھی آتا تھا۔ جس طرح اسے گھر کا فرد ہوتے ہوئے بھی ملازموں سے بدتر جگہ رکھا گیا تھا، ہر کوئی اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا تھا، اس پہ یہ ظلم کہ شوہر بھی اسے قبول کیے بغیر گھر سے جا چکا تھا۔ ان حالات میں قدسیہ بوا کا دل اس کی حالت دیکھ کر کٹتا تھا۔ انسان کی تخلیق تو رب کائنات نے اسی مقصد کے تحت کی ہے کہ دوسرے کا درد سمجھے، یہ الگ بات یہاں اکثر لوگ درد دینے کی وجہ بن جاتے ہیں۔

اس گھر میں قدسیہ بوا کا وجود تنکا ہی سہی پر اس کے لیے بہت بڑا آسرا تھا۔ وہ جانتی تھی یہاں اگر کوئی اس کا خیر خواہ ہے تو بس ایک یہی بوڑھی عورت ہے پر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے حال پہ صبر کر چکی تھی۔

''میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں بوا! زندگی جیسے گزر رہی ہے اسے یوں ہی گزر جانے دیں۔ ایک بار بدلی تھی تو سیلاب آ گیا

تھا جس میں میرے سارے ارمان، ساری خوشیاں بہہ گئے تھے۔ اب کوئی تبدیلی سہہ نہیں پاؤں گی کیونکہ کھونے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔'' کچن کاؤنٹر کے ماربل پہ ناخن سے لکیریں بناتے وہ بے بسی سے بولی اور اپنی چادر کا پلو سر پہ ٹکاتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی۔

''اللہ تیرے حال پہ رحم کرے میری بچی! پتا نہیں کیسے سفاک لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ہی اولاد کی بلی چڑھا دیتے ہیں۔'' پیچھے قدسیہ بوا نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھاکے اس کے لیے خیر کی دعا کی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت دنوں سے اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اتفاق سے موقع ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ جب بھی فون کرتا' کبھی ممانی جان فون اٹھاتیں تو کبھی فیروز، ایسے میں وہ خود سے صلہ سے بات کرنے کی فرمائش کرتا ہوا جھجک رہا تھا پر آج یہ موقع قدرت نے اسے دیا تھا۔ اس پہ قسمت کی کرم نوازی ہوئی کہ فون اٹھایا بھی صلہ نے ہی تھا۔

''کیسی ہو صلہ؟'' اس کی آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں ثمر بھائی! آپ بتائیں' کیسی جا رہی ہے آپ کی ٹریننگ؟'' دوسری طرف وہ بھی اسے پہچان کر خوش ہوگئی تھی۔

''ٹریننگ زبردست چل رہی ہے اور اس وقت تو میں نے تمہیں مبارک باد دینے کے لیے کال کی ہے۔ تمہارا داخلہ کالج میں جو ہو گیا ہے۔'' ثمر نے مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد دی تھی۔

''سچ!! مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ اب میں بھی روز فاری آپا کی طرح کالج جایا کروں گی۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی اور اس کی خوشی ثمر کو سکون دے رہی تھی۔

''اچھا سنو، کیا تم مجھے یاد کرتی ہو۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کو تو ہم سب ہر روز یاد کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی ابا جی' پھوپھو سے کہہ رہے تھے کہ اب جلد ہی فیروز بھائی اور فاری آپا کی شادی کر دیں گے۔''

صلہ اس کا اشارہ اب بھی نہیں سمجھی تھی۔ ایک پل کو تو اس کا دل کیا اپنا سر پیٹ ڈالے۔ خیر اب یہ مسئلہ بھی جلد ہی حل ہونے والا تھا۔ ماں سے تو وہ پہلے ہی بات کر چکا تھا۔ ان کا بھی یہی ارادہ تھا کہ فارینہ کی رخصتی کے بعد ہی وہ صلہ کا رشتہ مانگیں گی۔ پھر جب صلہ کا کالج مکمل ہوگا تو رخصتی ہو جائے گی۔ پر اس سے پہلے وہ اب صلہ کے دل کو ٹٹولنا چاہتا تھا کہ آخر وہ اس کے متعلق کیا سوچتی ہے۔

''میں سب کی نہیں، تمہاری بات کر رہا ہوں صلہ! کیا تم مجھے مس کرتی ہو۔'' اس نے ایک بار پھر اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

''مس کیوں نہیں کروں گی۔ پتا ہے میں نے اپنی سب فرینڈز کو بتایا ہے کہ میرے ثمر بھائی پولیس آفیسر بن رہے ہیں۔ جب واپس آئیں گے تو کس شان سے یونیفارم پہنی ہوگی۔ جانتے ہیں وہ مجھ سے اتنی امپریس ہوئیں کہ مت پوچھیں۔'' صلہ نان اسٹاپ شروع ہوگئی تھی۔ اس میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کئی گنا زیادہ بچپنا تھا یہ تو ثمر بخوبی جانتا تھا لیکن اس کی اتنی صاف بات وہ نہیں سمجھے گی ایسی تو بہر حال اسے امید نہ تھی۔ صلہ کو روزینہ بیگم نے بالکل بچہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔

''اچھا یہ لیں، اماں بی سے بات کریں اور میری طرف سے اللہ حافظ۔''

اچانک سامنے سے آتی روزینہ بیگم کو دیکھ کر اس نے جھٹ فون انہیں تھمایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ثمر اب ممانی جان سے معمول کی باتیں کرتا

ہوا بدمزا ہو رہا تھا۔
ممانی جان نے بھی پورے شہر کا حال دریافت کر کے ہی فون بند کیا تھا اور اس وقت تک ثمر بھول چکا تھا کہ اس نے وہاں فون کیا کیوں تھا۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ مقفل کر کے اس نے اپنی سیاہ چادر اتار کر کرسی پہ رکھی اور پھر گرنے کے سے انداز میں چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔ آج کا دن سب دنوں سے الگ تو نہیں تھا پر نجانے کیوں اس کے اعصاب بوجھل ہو رہے تھے۔ سالوں سے اس گھر میں نوکروں کی طرح ہڈیاں گھساتے اس نے کبھی خود کو اتنا تھکا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر آج کیوں اپنا وجود چٹختا ہوا لگ رہا تھا۔ یا شاید یہ ماضی کی کرچیاں تھیں جو برسوں سے روح میں چبھی آج ناسور بن چکی تھیں۔ دھیان بار بار اسی طرف جا رہا تھا جس کے متعلق وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اپنی سوچ پہ دو حرف بھیجتے 'وہ چارپائی سے اٹھی اور کمرے میں رکھی لکڑی کی بوسیدہ الماری کو کھولا۔ اندر کتابوں کا ایک ڈھیر تھا جو اتنے سالوں میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی واحد پونجی جو اس نے کئی سالوں میں جمع کی تھی۔ یہ سب قدسیہ بوا کی مہربانی تھی جو گھر والوں سے چھپ چھپا کر اسے فلک شیر کے ذریعے یہ کتابیں منگا دیتی تھیں۔ یہ کتابیں نہیں اس کی دنیا تھی جہاں وہ کچھ دیر کو ہی سہی اپنی زندگی کی تلخی اور غم بھلانے کی خاطر چلی جاتی تھی۔ خود پہ ہوئے ظلم پہ آنسو بہاتے بہاتے جب تھک گئی تو یہ کتابیں ہی تھیں جنہوں نے اسے آسرا اور پناہ دی تھی۔

الماری سے ایک کتاب نکال کر وہ واپس چارپائی پہ آکر بیٹھ گئی۔ کل رات اس نے صفحے کا کونہ موڑ کر نشانی لگائی تھی۔ آج کتاب اسی صفحہ سے کھولی اور سیاہ حروف پہ نگاہیں جما دیں۔ اچانک نگاہ منتشر ہوئی تھی، دھیان بھٹکا تھا۔ کل تک یہ کتاب اسے اب تک پڑھی جانے والی ہر کتاب سے زیادہ دلچسپ محسوس ہو رہی تھی لیکن اس وقت اسے کتاب میں لکھا کوئی بھی لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جھنجھلا کر اس نے کتاب بند کر دی اور پاس رکھی میز پہ پٹخ دی۔ تکیہ درست کرتی وہ اب چارپائی پہ لیٹ چکی تھی۔ دایاں بازو آنکھوں پہ رکھ کے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اس کی شبیہ نگاہوں کے سامنے نمودار ہوئی تھی۔ صبیح پیشانی، کنپٹیوں سے جھلکتے چند سفید بال، سنجیدہ نگاہیں اور...... ان آنکھوں میں اس کے لیے بے تحاشا اجنبیت۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کتنا لاتعلق اور بے پرواہ ہے وہ مجھ سے۔''
اس کے کانپتے لبوں نے شکوہ کیا تھا۔

''بھابھی نے مجھے اس کے سامنے کتنا ذلیل کیا مگر اس نے تو......'' نگاہوں میں اس وقت وہ منظر گھوم گیا تھا جب اس کی عزت افزائی پہ سر اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ اس گھر میں تو وہ روز ہی ایسے جملوں کا سامنا کرتی تھی جن میں اس کے لیے نفرت اور تحقیر ہوتی لیکن آج یہ ذلت اس کی موجودگی میں ہوئی تھی' شاید اسی لیے اپنا وجود بڑا چھوٹا اور کمتر محسوس ہو رہا تھا۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے۔

آج سے پہلے اپنے دل میں تبریز کے لیے اسے اتنی نفرت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

فارینہ اور فیروز کی شادی طے پا چکی تھی۔ ثمر شادی سے دو دن پہلے گھر پہنچا تھا۔ فارینہ سے ملنے گیا تو اس کا شکایتی دفتر کھل چکا تھا۔

''آپ نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا ثمر بھائی۔''

رفیق احمد نے جب شادی کی بات کی تو

فارینہ نے ماں سے کہنے کے بجائے ثمر کو کال کرکے رشتہ ختم کرنے کی بات کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس اسٹیج پہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اب بھلا سالوں پرانا طے پایا رشتہ ماں یوں ہی بس بیٹی کی ضد پہ تو توڑنے سے رہی۔ ثمر ان دونوں کے رشتے کی حساسیت سے باخبر تھا۔ پھر اس کی اپنی رائے فیروز کے متعلق اتنی بری نہیں تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والا انسان تھا۔ تعلیم کی کمی البتہ اس کا منفی پہلو تھا۔ فارینہ کا دل رکھنے کو اس نے ہامی بھر تو لی تھی پر ماں سے جو بات دبے دبے لفظوں میں ہوئی اس کا ذکیہ بیگم پہ الٹا ہی اثر ہوا تھا۔ انہوں نے دوٹوک اسے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے سے منع کر دیا تھا۔

''تم جانتی ہو، امی' ماموں کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتیں فاری۔ پھر میرے خیال میں وہ اتنا برا بھی نہیں جتنا تم نے اس کا امیج بنا رکھا ہے۔ مجھے امید ہے، وہ تمہارا پورا خیال رکھے گا اور ماموں ممانی بھی تو تم پہ جان چھڑکتے ہیں نا۔''

اس نے بہن کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اسے اس رشتے کے روشن پہلو دکھائے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا فارینہ بھرے دل اور منفی جذبات لیے اپنی آنے والی زندگی کی شروعات کرے۔ فارینہ نے اس کی بات سمجھی تھی یا نہیں پر وہ خاموش ہوگئی تھی۔

گھر میں شادی کی رونقیں شروع ہو چکی تھیں۔ دونوں گھروں میں ہی مہمانوں کا شور تھا۔ پورے علاقے میں جشن کا سماں تھا۔ رفیق احمد نے اکلوتے بیٹے کی خوشیوں پہ دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔ مہندی کی رات سب لوگ ایک ہی جگہ موجود تھے کہ برادری تو بہرحال ایک ہی تھی لہٰذا بڑے سے پنڈال میں دولہا اور دلہن کی مہندی کی رسم ادا کی گئی۔

نارنجی اور پیلے شرارے میں صلہ بنی سنوری یہاں سے وہاں بھاگتی پھر رہی تھی۔ دولہا کی اکلوتی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ آخر وہ اس گھر کی اکلوتی بیٹی بھی تو تھی۔ روزینہ بیگم نے اسے بھی دسیوں کام دے رکھے تھے۔ ثمر سے اس کا سامنا اسی بھاگ دوڑ کے دوران ہوا جب وہ پھولوں اور مٹھائی کی ٹوکریاں ملازموں سے اندر منگوا رہی تھی۔ آج چند ماہ بعد اس نے صلہ کو دیکھا تو وہ اسے بدلی بدلی اور کچھ بڑی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہ کالج جانے کا اثر تھا یا شاید ثمر ہی اس کے ہجر میں زیادہ سوچنے لگا تھا۔ بہرحال یہ سچ تھا کہ وہ آج بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔

''ایک پل کو رکو تو جناب۔'' وہ اپنی نگرانی میں سامان اٹھوا کر اب ملازم کے پیچھے پیچھے تیز قدموں سے چلتی اپنا شرارہ سنبھالے ثمر کے پاس سے یوں گزری جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ثمر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے وہیں روک لیا۔

''ثمر بھائی آپ؟'' اس طرح اچانک روکے جانے پہ وہ اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ اس نے واقعی ثمر کو نہیں دیکھا تھا۔ سینے پہ ہاتھ رکھے اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں کیا۔ کچھ تو شادی کے ہنگامے باقی یکدم ثمر کا اس کا راستہ روک لینا۔

''بندہ دائیں بائیں دیکھ کر چلتا ہے، کیا پتا کوئی پرانا شناسا راہ میں کھڑا مل جائے۔'' اسے شرارت سے چھیڑتے ہوئے ثمر نے نچلا لب دبائے اپنی ہنسی کو روکا۔ صلہ کا دایاں ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ دونوں پنڈال کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے اور لوگوں کی توجہ اس وقت اسٹیج پہ تھی جہاں دولہا دلہن کے ساتھ ان کی فیملی موجود تھی۔

''ایک سے ایک نکما بھرا پڑا ہے اس گھر میں۔ مجال ہے جو کوئی کام بنا کہے ہو جائے۔ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ایسے میں دھیان ہی کہاں رہتا ہے، کون کس راستے پہ کھڑا ہے۔'' وہ بڑی

بیبیوں کی طرح اپنی کارکردگی سناتے یوں بولی جیسے اس کے سوا کوئی کام کرنے والا ہے نہ ہی ذمہ دار۔ انداز ایسا تھا کہ ثمر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک نامحسوس سے انداز میں صلہ نے اپنا ہاتھ اس کی دسترس سے آزاد کرالیا تھا۔ ثمر یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں پنڈال کی روشنیوں کا عکس اس کے چہرے کو روشن کرر ہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اسے اتنی یکسوئی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر صلہ کچھ بے چین ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے ثمر کی نظروں میں مچلتے جذبات پریشان کرنے لگے تھے۔ بے اختیار اس نے نظریں جھکائے اپنا کندھے پہ لہراتا دوپٹا درست کیا تھا۔

''تم بہت بدل گئی ہو صلہ! دوسرے لفظوں میں پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہو۔''

صلہ کے چہرے پہ نظریں ٹکائے وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور صلہ جو ابھی کچھ دیر پہلے اپنی ذات میں مگن، ہر سوچ سے لاپرواہ، زندگی کے رنگوں اور بھائی کی شادی کو انجوائے کر رہی تھی اچانک ثمر کی نگاہوں کے طلسم میں الجھی ایک نئی کیفیت سے آشنا ہوئی تھی۔ گھبرا کر اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ اب اس کے اندر کی بے چینی چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ گالوں کی حدت لالی بن کر نمایاں ہو رہی تھی پر ثمر نے اپنا ہاتھ آگے کر کے اس کا راستہ روک دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی کہ مبادا ثمر سے ٹکرا نہ جائے۔

''اس دن میں نے تم سے پوچھا تھا، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو؟ اتنی...... کہ میں دن رات، صبح شام......تمام عمر تمہیں اپنے سامنے بٹھائے بلاتکان تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہاری ہر بات، ایک ایک لفظ، آنے والے ہر دن، سننے کی تمنا رکھتا ہوں۔''

صلہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سرتاپا کانپ کر رہ گئی۔

''ثمر بھائی! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ چند قدم پیچھے ہوتی، ثمر سے کچھ اور فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی۔ ماضی میں ہوئی ذومعنی باتوں اور اس کی بے پناہ توجہ کے پیچھے چھپی اس کی سوچ صلہ پہ پہلی بار آشکار ہو رہی تھی۔

''یہی کہ میں بس تمہیں پڑھائی میں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا ورنہ دل تو کچھ ایسی بغاوت پہ اترا ہے کہ تم سے ایک دن بھی دور رہنا منظور نہیں۔ پھر بھی میری ٹریننگ ختم ہونے کے بعد امی ہمارے رشتے کی بات ماموں سے کریں گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا نا صلہ؟''

صلہ نے نچلا لب کاٹتے ہوئے بے یقینی سے ثمر کو دیکھا۔ وہ اب بھی گہری نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک صلہ نے نگاہیں جھکالیں اور نفی میں گردن ہلاتی بھاگتی ہوئی اسٹیج کی طرف چلی گئی۔ پیچھے ثمر مسرور سا اسے دیکھتا رہا۔

اس کا ارادہ آج ہی یہ خوش خبری فارینہ کو سنانے کا تھا۔

☆☆☆

اس کی روح شل اور ذہن بوجھل تھا۔

اس پر اب نیند کی گولیاں بھی اثر کرنا چھوڑ چکی تھیں۔ صبح ہونے تک اس کے اعصاب اتنی بری طرح چیخ رہے تھے کہ لگتا تھا، دم گھٹ جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ علی الصباح ڈاکٹر کے پاس چل پڑی تھی۔

''کہاں چلنا ہے بی بی؟'' سیاہ شیشوں والی گاڑی سے کمر ٹکائے فلک شیر نے اسے بلند دروازے سے نکلتے دیکھا تو مستعدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ رانیہ بلاتوقف گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ڈاکٹر کے پاس چلو۔'' سر سے پاؤں تک خود کو ایک بہت بڑی سفید چادر میں لپیٹے اسے وہ کوئی زندہ لاش محسوس ہوتی تھی۔ فلک شیر نے خاموشی سے گاڑی چلا دی کہ وہ اب منزل سے واقف تھا پر اتنا تو وہ بھی جانتا تھا جس مرض کی دوا لینے وہ جا رہی ہے، اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔

☆☆☆

''یہ بھابھی کہاں گئی ہیں؟'' تبریز نے ناشتے کی میز پہ رانیہ کو نہ پا کر سوال کیا۔

''ڈاکٹر سے دوا لینے گئی ہیں۔'' قدسیہ بوا نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا تو اسے تعجب ہوا کیونکہ کل تک تو بظاہر وہ ٹھیک ہی تھی۔

''کیا ہوا ان کی طبیعت کو؟'' چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس بار لہجے میں تشویش تھی۔

''جوانی کی بیوگی کیا کوئی کم روگ ہوتا ہے بیٹا۔'' قدسیہ بوا نے ایک لمبی سرد آہ بھرتے کہا۔ تبریز لب بھینچے خاموش رہا۔

''جی اچھا نہیں تھا بہو کا کل سے۔ دوا لے آئے گی تو سکون آ جائے گا۔'' اسے خاموش پا کر قدسیہ بوا نے مزید کہا اور واپس باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ پیچھے تبریز گہری سوچ میں ڈوبا قدسیہ بوا کی بات کا مفہوم جان چکا تھا۔ زندہ درگور ہونے کی اذیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ تھا اسے۔ شاید اسی لیے وہ کل رانیہ کے اس تحقیر آمیز سلوک کے باوجود اسے ٹوک نہیں پایا تھا۔ سمجھا نہیں سکا تھا کہ اس کا غم بہرحال کم نہ تھا۔

رانیہ کی روح کے زخم محسوس کرنے کے بعد اس سے دوسرا لقمہ نہیں اٹھایا گیا تھا۔ وہ ناشتا یوں ہی چھوڑ کر ڈیرے کی طرف نکل آیا جہاں بہت دنوں بعد اس کے والد سردار محسن علی براجمان تھے۔ اس کی آمد کا اثر تھا یا پھر ڈاکٹری دواؤں کا کرشمہ ان کی طبیعت اب بہتر تھی۔ بہت سے کام ان کی بیماری کی وجہ سے موخر تھے لہٰذا آج وہ صبح ہی ڈیرے پہ نکل آئے تھے۔ یہ ڈیرہ دراصل ان کے بڑے سے گھر کے احاطہ میں ہی بنا ہوا تھا مگر مرکزی حصے سے کچھ فاصلے پر۔ تبریز بھی ان کے پاس وہیں آ گیا تھا۔

لوگوں کی آمد و رفت ہمیشہ کی طرح آج بھی جاری تھی۔ وہ بیٹھے حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ تبریز کو وہاں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اس نے انہیں اچھے موڈ میں دیکھا تو کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''بابا! ایک بات کہوں؟'' انہوں نے مسکرا کر سر ہلاتے اجازت دی تو تبریز ذہن میں وہ لفظ ترتیب دینے لگا جن سے ان کے سامنے اسے اپنا مدعا بیان کرنا تھا۔ ان کے سامنے ان کے مزاج کے خلاف بات کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس بار وہ انہیں موم کر پائے۔ ان ماہ و سال کی جدائی اور ڈھلتی عمر نے ان کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر ہی دی ہو۔

''باپ کو چھوڑ کے جانے کے سوا کچھ بھی کہہ دو شہزادے۔'' انہوں نے اسے اپنا کل والا وعدہ یاد دلایا تھا کہ وہ اب گھر چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا۔ انہیں اس عمر میں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ تبریز نے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یقین دہانی کرائی۔ ان کی اس بات کے بعد تبریز کے لیے اب ان سے اپنے دل کی بات کہنا آسان ہو رہا تھا۔

''آپ کو نہیں لگتا ہمیں رانیہ بھابھی کی شادی کر دینا چاہیے؟'' بہت سوچ کر اس نے بالآخر کہہ ڈالا تھا۔ سردار صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''فضول باتیں مت کرو تبریز!'' اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے انہوں نے دھیمے لہجے میں

اسے ٹوکا۔ وہ تلخ نہیں ہونا چاہتے تھے کہ اب اسے ناراض کر کے خود سے دور کرنا تکلیف دہ تھا۔ یہ تو وہ خود چلا آیا ورنہ تو انا کے پہاڑ پہ چڑھے محسن علی نے بیٹے کو ایک بار بھی واپس آنے کو نہیں کہا تھا۔ ہاں اسے سامنے دیکھ کر ان کا دل پگھل گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے برجستہ اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔

"بابا! اس میں فضول کیا ہے۔ یہ ان کا شرعی حق ہے۔ دین بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ اور پھر ان کی عمر ہی کیا ہے۔" اس کا انداز التجائیہ تھا۔

سردار صاحب کے گھٹنے پہ دھرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر اس نے جیسے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی پر انہوں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مجھے دین مت سکھاؤ۔ رسم و رواج اور خاندانی تقدس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں دوسری شادیاں نہیں کرتیں۔ اس عمر میں سردار محسن علی کا منہ کالا کروانے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ملا تمہیں۔" وہ حد درجہ سنجیدہ شکایت بھرے لہجے میں بولے۔

ابھی کچھ دیر پہلے والا لاڈ پیار ختم ہو چکا تھا اور ایک بار پھر سردار محسن علی اس کے سامنے اپنے پورے تفاخر سے کھڑے تھے جن کے اپنے تراشیدہ اصول اور ضابطے تھے۔ جن کی سوچ فقط ان کی اپنی ذات تھی اور اس ذات نے کبھی اپنے سے منسلک لوگوں کی خوشیوں کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ تبریز کو گہرا رنج ہوا۔

"یہ کیسے رواج ہیں بابا جو ایک انسان کا استحصال کرنا تو جانتے ہیں لیکن اسے جینے کا حق نہیں دیتے۔ کیا آپ جانتے ہیں رانیہ بھابھی ایک عرصہ سے اینٹی ڈپریسنٹ لے رہی ہیں۔ اپنی صحت برباد کر لی ہے انہوں نے بابا اور آپ......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

اب ایسا تو نہیں تھا سردار صاحب خود ان باتوں سے بے خبر ہوتے آخر اسے دو دن میں یہ سب معلوم ہو چکا تھا تو وہ تو اتنے سالوں سے ان کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی تھی۔ پھر کیا اس کے ادھورے پن کی خبر انہیں نہیں تھی۔

"کس چیز کی کمی ہے رانیہ کو اس گھر میں۔ اچھے برے کا کل اختیار اس کے پاس ہے۔ عیش سے رہتی ہے، حق سے جیتی ہے۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے وہ اس گھر کی ملازمہ ہے۔"

سردار صاحب کا لہجہ اس بار سنجیدہ تھا پر وہ غصے میں نہیں تھے۔ شاید وہ اپنے رویے سے تبریز کو ایک بار پھر بدگمان نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے مناسب انداز میں اس کا دھیان ان مثبت پہلوؤں کی طرف دلایا۔ اچانک تبریز کا ذہن ان کے جملے کے آخری لفظوں میں اٹک گیا تھا۔ "گھر کی ملازمہ"۔

وہیں بیٹھے بیٹھے ذہن کے پردے پہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک بے تاثر اور خاموش چہرہ نمودار ہوا تھا جس کی سیاہ آنکھیں اس پل چیخ چیخ کر ایک ہی سوال کر رہی تھیں کہ غاصب کی زبان سے حق کی بات اچھی نہیں لگا کرتی۔ مٹھیاں بھینچے وہ یکدم وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ سردار صاحب سے مزید کیا بات کرے اس لیے بنا کچھ کہے خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"اتنی عمر ہو گئی لیکن اس کا جذباتی انداز نہیں بدلا۔ اسے رانیہ کا استحصال نظر آ رہا ہے۔ عقل کا اندھا یہ نہیں دیکھ رہا دو سو مربعے اور شمشیر کے نام کی آدھی جائیداد رانیہ کی ہے۔ اسے بیاہ کر خود کنگال ہو جاؤں۔ ہونہہ۔" سردار صاحب سر جھکائے رجسٹر کھولے ایک بار پھر حساب کتاب دیکھنے لگے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی فلک شیر نے ان کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ وہ ابھی رانیہ کو ڈاکٹر کے پاس

سے لے کر واپس لوٹا تھا۔ لب بھینچے اس نے تاسف سے سر جھٹکتے اس دنیا کی سب سے کنگال عورت کے حال پہ افسوس کیا تھا کہ جس کے اپنے ہی اس کی زندگی میں موجود عذاب کا موجب تھے۔

☆☆☆

سردار محسن علی نہ صرف علاقے کی مشہور شخصیت تھے بلکہ نہایت بااختیار جاگیردار بھی تھے۔ میلوں پھیلی زمینیں اور علاقے کے لوگوں کی ان کے سامنے جھکی گردنیں ان کے اونچے حسب نسب کی چغلی کھاتی تھیں۔ سردار صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا شمشیر جس کی شادی ابھی چند روز پہلے سردار صاحب نے اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی کم سن بیٹی رانیہ سے کی تھی۔ مزاج کا تیز اور آوارہ طبیعت کا حامل تھا۔ اس کا زیادہ وقت عیش ونشاط میں گزرتا۔ شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں وہ فی الحال اس لیے بھی پڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ایک تو اسے ابھی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھانی تھی دوسرے رانیہ میں اسے رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ کچھ عمر بھی اس کی زیادہ نہیں تھی' اس پہ وہ ایک شریف النفس اور سادہ مزاج کی خاندانی لڑکی تھی جبکہ شمشیر کا دل بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے ناز وادا کی طرف مائل تھا ایسے میں اسے بس سردار صاحب کا حکم مان کر رانیہ کو اپنے شریک حیات کے روپ میں قبول کرنا پڑا تھا کیونکہ اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

سردار محسن علی کا رعب ودبدبہ اولاد پہ بھی اپنی چھایا جیسا تھا البتہ وہ ان کی عیاشیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ رانیہ کی شمشیر سے شادی ان کا فیصلہ تھا جس میں کسی صورت ردوبدل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سردار صاحب کو بھتیجی سے زیادہ اس کی لمبی چوڑی جائیداد میں دلچسپی تھی جو اس کی تھیں اور شادی کی صورت میں خاندان سے باہر چلی جاتی' اسی لیے تو سردار صاحب نے یتیم بھتیجی کو بہو بنا کر دنیا کی نظروں میں احسان عظیم کیا تھا پر یہ تو وہی جانتے تھے اس احسان کے پیچھے ان کا کون سا لالچ چھپا ہوا تھا۔

"سردار صاحب! میں تو کہتا ہوں اس بار آپ بھی الیکشن میں کھڑے ہو ہی جائیں۔" وہ حسب معمول اس وقت اپنے ڈیرے پہ بیٹھے تھے۔ چاپلوس اور چمچہ گیروں کا پورا گروہ ان کے گن گانے میں مصروف تھا۔

"نیت تو میری بھی بہت تھی کمال دین۔ اب دیکھو نا علاقے میں پچھلے دنوں اتنے کام کروائے، یتیم خانہ بنوایا، غریب لڑکیوں کی شادی پہ جہیز کا بندوبست کیا، پانی کا مسئلہ حل کرایا۔ اب ان سارے کمی کمینوں کے لیے اتنا کچھ کیا تو کیا ووٹ نہیں ڈالیں گے مجھے۔" ان کے لہجے میں کھلی حقارت اور تحقیر تھی۔ اردگرد بیٹھے لوگوں کی گردنیں مزید جھکی تھیں۔

"تو پھر سردار صاحب مسئلہ کیا ہے۔" کمال دین نے سردار محسن علی کے پیر دباتے ہوئے سوال کیا۔

"یار! یہ بی اے پاس والی شرط رکھ کر میری تو امیدوں پہ ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہے۔ چلو کوئی نہیں' میں نہ سہی میرا تبریز تو کھڑا ہو سکتا ہے نا الیکشن میں"۔ سردار صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ تبریز کے ذکر پہ ہمیشہ ہی ان کے لہجے میں فخر نمودار ہو جاتا تھا۔

"کیوں نہیں سردار صاحب! اپنا تبریز باؤ تو ایم اے پاس ہے۔ اسمبلی میں کیا ہی گردن اکڑا کے جائے گا۔ بس آپ اپنی پارٹی بنا ہی ڈالیں۔ سپورٹر اکٹھے کرنا ہمارا کام"۔ کمال دین نے سردار صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں' اس کے متعلق بھی فیصلہ کرتے ہیں"۔ سردار صاحب نے سر ہلا کے تائید کی۔ اسی وقت تبریز ڈیرے میں داخل ہوا تو

اسے دیکھ کر سردار صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔

''آؤ میرے شیر، ابھی یہاں تمہاری ہی بات چل رہی تھی''۔ سردار صاحب نے اپنے نزدیک جگہ بنا کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بابا! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے''۔ تبریز نے ڈیرے میں موجود لوگوں پہ نگاہ ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اچھا!'' اس کی سنجیدگی نے سردار صاحب کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک دم ہی انہوں نے سب کو ڈیرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔

''اوئے کمال دین! چلو تم سب باہر جا کر بیٹھو، میں ذرا تبریز پتر کی ضروری بات سن لوں''۔ سردار صاحب کی آواز سنتے ہی کمال دین سمیت سب لوگ سر جھکائے فرشی سلام کرتے باہر نکل گئے تھے۔

''ہاں بھئی بول' کیا ضروری بات ہے۔ پیسے ویسے چاہئیں ہیں کیا؟'' سردار صاحب نے پاس بیٹھے تبریز کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے پوچھا۔

شمشیر کی نسبت ان کا چھوٹا بیٹا تبریز قدرے مختلف اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کی وجہ سے وہ کافی عرصے سے شہر میں رہتا تھا۔ اس کی عادات واطوار شمشیر ہی نہیں خود سردار صاحب سے بھی یکسر مختلف تھیں جس کی بنیادی وجہ اس کا تعلیم کی طرف رجحان تھا۔ اس کی سوچ اور شخصیت کی بدولت سردار محسن علی کو اس سے الگ سی انسیت تھی اور انہیں امید تھی کہ مستقبل میں وہ ان کا درست جانشین ثابت ہوگا۔

''بابا! مجھے آپ سے شمشیر بھائی کے بارے میں بات کرنی ہے''۔ تبریز خاصا الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا شمشیر کو؟'' وہ چونکے۔

''شمشیر بھائی کی حرکتیں دن بہ دن مشکوک ہوتی جارہی ہیں بابا! رانیہ بھابھی کی بھی انہیں کوئی پروا نہیں۔ رات رات بھر وہ گھر سے غائب رہتے ہیں اور بھابھی ان کے انتظار میں پوری پوری رات روتی رہتی ہیں۔''

وہ ان دنوں گھر آیا ہوا تھا اور شمشیر کے معمولات سے نیا نیا واقف ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے شمشیر کی حرکتوں کی خبریں اس کے لیے سنی سنائی تھیں پر اب جو کچھ اتنے دنوں سے چل رہا تھا وہ اسے یکسر نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔ وہ بھی ایسے وقت میں جب اس کی شادی کو محض چند روز ہوئے تھے۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھلا۔ دوستوں یاروں میں بیٹھے وقت کا پتا ہی کہاں چلتا ہے۔''

سردار صاحب اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس کی توقع کے برخلاف انہوں نے اس بات پہ انتہائی ہلکا ردعمل ظاہر کیا تھا۔ وہ حیران پریشان باپ کی شکل دیکھنے لگا۔

''اوہ بیٹا جی! تم پریشان مت ہو، اس عمر میں بھی ایسا ہی تھا۔'' اسے اپنی طرف حیرت سے دیکھتا پا کر سردار محسن علی ہنستے ہوئے بولے۔

تبریز کو ان کی ایسی سوچ نے تکلیف دی تھی۔ اس کا تو خیال تھا سردار صاحب بھتیجی کے حق کی خاطر بیٹے کو سرزنش کریں گے پر یہاں تو سب الٹ ہو گیا تھا۔

''بابا! رانیہ بھابھی سے ہمارا ایک اور بھی رشتہ ہے۔ ان کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے آپ کو اس پہ شمشیر بھائی کو منع کرنا چاہیے الٹا آپ ان کی غلط حرکتوں کو جسٹی فائی کر رہے ہیں۔''

اپنی ناامیدی کا اظہار کیے بنا نہیں رہ پایا۔ سردار صاحب نے اس کی بات کو سرے سے کوئی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔

تبریز بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے واپس

شہر لوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

گھر کا ماحول بدلا تھا نہ رانیہ کی زندگی۔ شمشیر کے ساتھ تو وہ جیسے مسکرانا ہی بھول گئی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی ایک رات ایسی نہیں آئی تھی جب اس کا شوہر اس کے ساتھ ہو۔ وہ راتیں جاگتی، تنہا اس ویران کمرے کی چھت کو تکتی، شمشیر کی راہ دیکھتی۔

وہ دن چڑھے اس کی آنکھوں کی لالی کو نظر انداز کرتا کمرے میں لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں رکھتا اور پھر سو جاتا۔ رانیہ کی ماں تھی نہ ساس، بہن تھی نہ نند...... وہ اپنا حال دل کسے سناتی۔ اپنی تشنگی کسے بتاتی کہ سہاگن ہو کر بھی اس کی زندگی بیواؤں سے بدتر تھی۔ پھر بھی ہر دن ایک امید لیے شروع ہوتا کہ شاید آج اس کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھے اور وہ اپنے شوہر کی نظروں میں سرخرو ہو پائے۔ پر ایسی صبح شمشیر کی زندگی میں رانیہ کے لیے کبھی نہیں آسکی۔

سردار صاحب کی شدید ترین خواہش کے باوجود بھی تبریز نے الیکشن میں ان کی جگہ کھڑے ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا رجحان کبھی بھی سیاست کی طرف نہیں تھا نہ ہی وہ سردار صاحب کا مہرہ بن کر ان کی نمائندگی کرنا چاہتا تھا۔ سردار صاحب جو اپنے تئیں سیاست میں اینٹری ارنے کے سارے انتظامات مکمل کر چکے تھے، تبریز کے انکار پر شدید برہم ہو گئے۔ دوسری طرف تبریز نے امتحانات کے بعد شہر ہی میں ایک مقامی اکیڈمی بں پڑھانا شروع کر دیا۔ آنے والے دنوں میں سے پوری امید تھی کہ اسے کالج میں لیکچرر شپ مل بائے گی۔ اس حرکت نے سردار صاحب کے غصے لو دگنا کر دیا اور انہوں نے تبریز کو واضح تنبیہہ لرتے ہوئے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کی ہمکی دے دی پر ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ا کہ سردار صاحب کی ساری توجہ تبریز سے ہٹ کر دوسری طرف منتقل ہو گئی۔

اسمبلی ممبران کے لیے بی اے پاس ہونے کی شرط ختم کر دی گئی تھی اور سردار صاحب بطور آزاد امیدوار اپنے علاقے کے لیے الیکشن ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہر طرف بڑے زور و شور سے الیکشن کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور سردار صاحب کو قوی امید تھی کہ وہ یہ نشست لازمی جیت جائیں گے۔

☆☆☆

صلہ نے فیروز کی تلاش میں کالج کے گیٹ سے سر باہر نکالا اور پھر کلائی پہ بندھی اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ آج تو تقریباً سارا کالج ہی خالی ہو چکا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا سفید دوپٹہ سلیقے سے سر پہ اوڑھا اور کالج کے گیٹ سے باہر چلی آئی۔ گیٹ کیپر کو اپنے بھائی کے لیے پیغام دے کر وہ تیز قدموں سے چلتی سڑک پر آ پہنچی تاکہ وہاں سے کوئی بس یا رکشہ لے کر گھر چلی جائے۔

جب سے فارینہ کی شادی ہوئی تھی صلہ اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ ویسے تو وہ اس سے سینئر تھی مگر چھٹی کا وقت تو ایک ہی تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورت حال ہوتی تو وہ فارینہ کے ساتھ چلی جاتی۔ لیکن اب تو مجبوری تھی، دل بڑا کر کے نکل ہی آئی۔

''ارے وہ دیکھ! کیا زبردست آئٹم ـــــ ہے۔'' لڑکیوں کے کالج کے باہر وہ دونوں اپنی جیپ میں بیٹھے وہاں سے گزرتی لڑکیوں پہ آوازیں کس رہے تھے۔ ان دنوں یہ ان کا من پسند شغل تھا۔ ۔ صلہ کو تنہا سڑک پار کرتے دیکھ کر شمشیر جیپ اس کے پیچھے لے آیا تھا۔

''چھوڑ یار! یہ تو بچی ہے۔'' یاور کچھ بدمزا ہوا تھا۔

''ان دو نمبر لڑکیوں میں وہ بات

کہاں جو اس ظالم حسینہ میں ہے۔" ہاتھ پہ ہاتھ مارتے' اس نے چھچھورے انداز میں ساتھ بیٹھے یاور سے کہا تو اس کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

"دل لے گئی...... ہائے دل لے گئی۔" صلہ کے نزدیک پہنچ کر شمشیر اب جیپ انتہائی کم رفتار پہ چلاتا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بے ہودہ گانے الاپتا اس کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

"شٹ اپ۔ راستہ چھوڑو میرا ورنہ ابھی سب کو اکٹھا کر کے تمہیں جوتے پڑواؤں گی۔" صلہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی جو ان اوچھی حرکتوں پہ ڈر جاتی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے سڑک پہ پڑا پتھر اٹھا لیا تھا۔

"تیور بھی شعلے اگل رہے ہیں روپ کی طرح۔ بھئی ہم تو اک نگاہ یار سے ہی جل کر بھسم ہو گئے۔" شمشیر یکدم جیپ روک کر نیچے اتر آیا۔ صلہ تو اسے سڑک چھاپ غنڈہ سمجھ رہی تھی پر وہ آوارہ اور کھاگ تھا' اس کے لیے اس کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ کمال اعتماد سے اس نے ایک جھٹکے سے صلہ کے ہاتھ سے پتھر پکڑ کر نیچے پھینکا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"ہاتھ چھوڑو میرا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں" ۔وہ غصے سے تلملاتی چلائی۔ ساتھ ہی اردگرد نگاہ ڈالی جہاں دوپہر کے اس پل بس اکا دکا لوگ ہی موجود تھے۔ زندگی میں پہلی بار تھا کہ وہ اکیلی باہر نکلی تھی اور اس پہ یہ افتاد، اس کا دل اب پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ دیر ہو جانے کے باعث کالج کی سب ہی لڑکیاں جا چکی تھیں۔

"شمشیر جب کسی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا"۔ شمشیر نے اسے خود سے قریب کرتے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"بدتمیز، جانور......! تہذیب تو تمہیں چھو کر نہیں گزری' میں کہتی ہوں......" صلہ نے اسے پرے دھکیلنا چاہا پر شمشیر اس سے بھی پہلے اسے جیپ میں ڈال چکا تھا۔ یاور نے دوسری طرف سے اس کے ہاتھ پکڑے۔ شمشیر اچک کر جیپ میں بیٹھا لیکن اسی وقت فیروز کی گاڑی وہاں آ کر رکی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن کو ہاتھ لگانے کی۔" غصے میں آگ بگولا ہوتا فیروز' شمشیر کی طرف لپکا اور آن کی آن میں اسے گریبان سے پکڑ کر جیپ سے نیچے کھینچ لیا۔ صلہ جو چیخ وپکار کرتی مدد کی طلب گار تھی' فیروز کو وہاں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی لیکن اب بھی وہ یاور کی گرفت میں تھی۔

"ارے واہ...... ہیرو!" شمشیر دونوں ہاتھ جھاڑتا فیروز کی طرف بڑھا اور اسے ایک زوردار مکا جڑ دیا۔ فیروز تیورا کر نیچے گرا تھا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑ کمینے، ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔" تیزی سے اٹھتے ہوئے اب وہ جیپ میں بیٹھے یاور کی طرف بڑھا تھا جس کی گرفت میں صلہ مچل رہی تھی۔ یاور کے سر پہ اپنا سر مارتے اس نے ایک ہی وار میں یاور کو بے حال کر دیا تھا۔ صلہ جلدی سے جیپ سے اتری اور فیروز کی اوٹ میں جا پہنچی۔

"مر گئے شمشیر کو دھمکانے والے۔ تو چوزہ مارے گا مجھے۔" شمشیر نے اس پہ گرفت مضبوط کی پر اچانک فیروز نے اپنا ریوالور نکالا اور شمشیر پہ تان لیا۔ شمشیر کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ فیروز کی آنکھیں اس پل شعلے اگل رہی تھیں۔ ریوالور فیروز کے ہاتھ میں دیکھ کر یاور تو اسی وقت بھاگ گیا تھا اور خود شمشیر کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ اب رفتہ رفتہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شمشیر کے سر پہ پہنچ کر فیروز نے ٹریگر دبایا۔ اور گولی چلنے کی آواز سے فضا گونج اٹھی

تھی۔

"فیروز بھائی......" صلہ سڑک پہ بے ہوش ہوکر گرنے سے قبل حلق کے بل چلائی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

سڑک کے بیچوں بیچ ہوئے اس جھگڑے میں فیروز کے پستول نکال لینے کی وجہ سے ہاتھا پائی خوں ریزی میں بدل گئی تھی۔ ریوالور سے نکلنے والی تینوں گولیاں شمشیر کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور زخموں کی تاب نہ لاکر وہ موقع پہ ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ صلہ اس واقعے کی چشم دید گواہ تھی تو جھگڑے کی بنیادی وجہ بھی وہی تھی۔ دونوں گھروں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔

سردار محسن علی اکلوتے بیٹے کی لاش کو گلے سے لگائے روئے تھے تو رفیق احمد اکلوتے بیٹے کے ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑی دیکھ کر سینہ پیٹ رہے تھے۔ محسن علی اب فقط جاگیردار نہ تھے بلکہ ایک سیاسی شخصیت بن چکے تھے۔ ان کے غم گساروں اور آگ میں تیل ڈالنے والوں کی تعداد زیادہ تھی کہ نقصان تو بہر حال ان کا ہوا تھا۔

رانیہ تو جیسے بت بنی اپنی تباہی پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اردگرد بیٹھی عورتوں نے اس کی چوڑیاں اتارتے ہوئے شمشیر کے کردار کی دھجیاں اُڑائیں۔

وہ ہرگز ایک اچھا شوہر نہیں تھا بلکہ شاید وہ تو ایک اچھا انسان بھی نہیں تھا لیکن رانیہ کو اس کی موت سے تکلیف ہوئی تھی۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اس کے دل میں اپنے لیے محبت کی دعا مانگا کرتی تھی کہ کسی نہ کسی دن قدرت کو اس کے حال پہ رحم آجائے گا اور پھر اپنی اس دعا کی طاقت کے بل بوتے پر رات تک شمشیر کی بے حسی جھیلا کرتی تھی پر آج کے بعد وہ صبح پھر کبھی نہیں آنی تھی جس میں رانیہ کے اندر شوہر سے محبت کی خواہش دعا بن کر لبوں پہ آتی۔

☆☆☆

"ہمیں تم سے پوری ہمدردی ہے سردار محسن علی! لیکن بات اگر عدالتوں تک پہنچی تو بدنامی تمہارے حصے میں بھی آئے گی۔"

اکبر خان، شمشیر کی تعزیت کرنے آئے تو ایک نئی داستان چھیڑ بیٹھے۔ سردار محسن بھڑ بیٹھے تھے تو دوسری طرف رفیق احمد سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ فیروز کو سزا سے بچالیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے کیونکہ روزینہ بیگم نے بیٹے کے غم میں زمین آسمان ایک کر رکھا تھا۔

اکبر خان، سردار صاحب کا پرانا دوست تھا اور ان کا ہم پلہ بھی۔ رفیق احمد نے اس سلسلے میں اکبر خان کو بیچ میں ڈالا تاکہ وہ سردار کے غصے کو کم کرکے ان کے بیٹے کو موت کی سزا سے بچالے۔

"تو کیا اس خوف سے میں اپنے جوان بیٹے کا خون معاف کردوں؟" سردار صاحب ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔

"معاملہ ان کے بھی اکلوتے جوان بیٹے کا ہے سردار۔ اور تمہارا بیٹا ان کی بیٹی سے زیادتی کر رہا تھا۔ غیرت میں آکر فیروز نے یہ قتل کیا ہے۔ اختیارات ان کے بھی کچھ کم نہیں۔ پھر عدالتوں میں ایسے کیس سالوں چلتے ہیں، ہاتھ کسی کے کچھ نہیں آتا۔" اکبر خان ذہنی طور پہ اس ردِعمل کے لیے تیار تھے۔ ان کی پیٹھ تھپتھپاتے تسلی دیتے انہوں نے آئینے کا دوسرا رخ دکھایا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو اکبر خان! کھل کے بات کرو۔"

"دیکھو، میں تمہارا دوست ہوں اور تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میری تو یہی خواہش ہے تمہارا بھلا ہوجائے۔" اکبر خان نے ان کے ہاتھ پہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پراسرار انداز میں کہا تو سردار محسن علی کے ماتھے کے بل

گھرے ہوئے۔

''اور وہ کیسے؟'' انداز گوا کھڑا ہوا اور کچھ کچھ طنزیہ تھا پر سردار محسن علی کو بھی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر اکبر خان کون سی تجویز لے کر ان کے پاس آیا ہے۔

''اسی لڑکی سے تمہاری شادی کرا دیتے ہیں۔ مشکل سے پندرہ سولہ سال عمر ہوگی۔ ساتھ میں کئی سو مربعے جہیز میں لائے گی۔ اسے کہتے ہیں چپڑی اور دو دو۔ ارے بھئی وہی تو تھی نا فساد کی جڑ۔'' اکبر خان نے بے ہودہ ہنسی ہنستے ہوئے پاس بیٹھے سردار صاحب کی کمر میں ٹہوکا مارا۔ دراصل یہ تجویز اکبر خان کی تھی۔

رفیق احمد کو تو ہر حال میں بیٹا قانون کی گرفت سے باہر چاہیے تھا۔ انہوں نے اکبر خان کا دامن پکڑ لیا جس پہ اکبر خان نے انہیں ونی کی صورت اس مشکل سے نکلنے کی راہ دکھائی تھی۔ گو امر تکلیف دہ تھا کہ رفیق احمد کو بیٹی بھی بے حد عزیز تھی لیکن جوان بیٹے سے بڑھ کر نہیں۔ پھر شادی تو کر رہے تھے، کون سا اسے فیروز کی طرح قبر میں اتار رہا تھا۔ یہی سوچ کر انہوں نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ وارث کھو کر خود کو جیتے جی مارنے کی سکت نہیں تھی ان میں ہاں۔ بیٹی کو اس کے متبادل زندہ درگور کیا جا سکتا تھا۔

''ارے یار! اس عمر میں شادی کر کے میں کیا کروں گا۔ ویسے بھی تمہیں تو معلوم ہے، میں الیکشن لڑنے والا ہوں۔ ان حالات میں ایک بچی سے شادی والا معاملہ...... بات کچھ جچی نہیں۔'' سردار محسن علی کھسیانی ہنسی ہنستے یوں شرمائے جیسے وہ واقعی دولہا ہوں، سیاست میں ایسی باتیں ان کی پوزیشن پہ منفی اثرات ڈال سکتی تھیں تو یہاں وہ مجبور تھے لیکن زمین کا ذکر سن کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

''اچھا تو پھر تبریز سے شادی کرا دیتے ہیں۔ جائیداد تو تمہارے ہاتھ ہی آئے گی نا۔ کہو کیا خیال ہے؟'' اکبر خان نے کچھ سوچتے ہوئے مشورہ دیا۔

سردار محسن علی کا مان جانا اکبر کی جیت تھی۔ آخر وہ بھی تو رفیق احمد کو زبان دے کر آئے تھے۔

''ہاں اس کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ ویسے وہ ونی کے لیے مانے گا نہیں۔ یہ آج کل کے بچوں کا پڑھائی لکھائی نے دماغ خراب کر دیا ہے۔''

تبریز کو منانا آسان نہ تھا اور یہ بات سردار محسن کو اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی۔

''میں نے تمہارے فائدے کی بات کی ہے۔ اب تبریز کو راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ دیکھو! لڑکی کو بھیڑ بکری بنا کر کہیں بھی ڈال دینا۔'' اکبر خان نے مکاری سے کہا اور سردار صاحب کے چہرے پہ پرسوچ خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے۔

''چلو، سوچتا ہوں اس بارے میں۔'' سوچنا تو تھا ہی انہیں۔ اب شمشیر کے قتل ہونے کی وجہ سامنے آنے کی صورت ان کی عزت کا جنازہ تو پہلے ہی نکل چکا تھا، رہی سہی کسر عدالتوں میں کیس چلنے سے پوری ہو جاتی۔ اس سب میں یہ الیکشن تو ویسے بھی ان کے ہاتھوں سے نکل ہی رہا تھا۔

بہر حال انہیں کسی نہ کسی طرح تبریز کو اس شادی کے لیے راضی کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

''ان لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ فیروز کے گناہ بخشوانے کے لیے یہ صلہ کی زندگی کو بھینٹ چڑھائیں گے۔'' ثمر وہیں بیٹھے بیٹھے پھنکارا تھا۔ اس نے موجودہ صورت حال جاننے کی خاطر گھر فون کیا تھا جب ذکیہ بیگم نے اسے یہ تازہ خبر سنائی۔ اس کا خون کھولنے لگا تھا یہ بات سننے کے بعد۔ وہ بھی اس صورت جب وہ صلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

''میں کرتا ہوں بات ماموں جان سے بلکہ میں خود وہاں آ رہا ہوں۔ بھاڑ میں جائے

ٹریننگ۔" اس نے فوری فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ تو دن گن گن کر گزار رہا تھا کہ کب یہ ٹریننگ پوری ہو اور ماں کو صلہ کا ہاتھ مانگنے بھیجے۔ پر یہاں تو اس سے پہلے ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔

روزینہ بیگم جہاں بیٹے کے لیے مری جا رہی تھیں تو بیٹی کا سوچ کر بھی دل ہول رہا تھا پر یہاں قدرت نے اپنا کرم اس طرح کر دیا کہ بوڑھے سردار محسن علی کے بجائے ان کے پڑھے لکھے خوبرو اور جوان بیٹے سے شادی کی جا رہی تھی۔ دشمنی کی بھینٹ معصوم بیٹی کو چڑھائے جانے کا قلق کچھ تو کم ہوا تھا لیکن ثمر کے دماغ میں تو دھماکے ہو رہے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں اپنی ٹریننگ کے دوران یہاں واپس آنے کی۔ جو جیسے چل رہا ہے اسے ویسے ہی چلنے دو۔" ماں کی بات پہ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ ان کا لہجہ بے حد نارمل تھا جیسے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہو ہی نا۔

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ بھول گئیں کہ میں صلہ سے......؟" اسے شاک لگا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا اس بات کے بعد اس کی طرح ماں بھی کرب سے گزر رہی ہوگی۔ آخر وہ روزِ اول سے بیٹے کی تمنا جانتی تھیں پھر خود وہ بھی تو دل و جان سے صلہ کو بہو بنانے کی تمنائی تھیں۔ کیسے وہ اس کے ارمانوں کا خون ہونے دیتیں۔

"بھول تو تم رہے ہو کہ فارینہ تمہاری بہن ہے اور فیروز اس کا شوہر۔ فیروز کو اگر کچھ ہو گیا تو فارینہ کا کیا ہوگا، یہ سوچا ہے تم نے اور پھر جو کچھ ہوا صلہ کی وجہ سے ہی ہوا۔ فیروز نے تو بس وہ کیا جو کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسے وقت میں کر گزرتا۔"

اسے ماں کی خود غرضی سے دکھ پہنچا تھا۔ جب اس کے اپنے والدین اس معصوم پہ بیٹے کو ترجیح دے رہے تھے تو وہ بھلا پھوپھی ہو کر کیوں اسے بچاتیں۔

"پر اس سب میں صلہ کا کیا قصور ہے امی؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ پایا۔

"ایسے معاملے یک طرفہ نہیں ہوا کرتے ثمر! فارینہ بھی تو چار سال سے کالج جا رہی ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی دیکھا نہ سنا کہ کالج کے باہر کوئی واقعہ ہوا ہو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اس لڑکی کو کالج جاتے اور اس کے عاشق بن گئے۔ تو اب بھگتے اپنی کرنی کو۔"

اس سے پہلے اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ماں کی سوچ اتنی گری ہوئی ہو سکتی ہے۔

"صلہ ایسی لڑکی نہیں ہے امی! وہ تو بہت معصوم ہے۔ ان سب باتوں کے مفہوم بھی نہیں جانتی۔" اس نے فی الفور صلہ کا دفاع کیا۔

"کون کیسا ہے، کیسا نہیں۔ تمہیں ابھی اس کی کیا پہچان۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور تم یہ صلہ کی طرف داری بند کرو۔ ابھی کوئی تعلق نہیں بنا تو ماں کو باتیں سنا رہے ہو، کل کو بیاہ ہو جاتا تو مجھے تو نکال باہر کرنا تھا تم نے اس کے چکر میں۔ اب تو میں کسی صورت اس لڑکی کو بہو بنانے کا تصور نہیں کر سکتی۔"

وہ تیز لہجے میں کہتیں اسے شرمندہ کر گئی تھیں۔ اس کا دل عجب مخمصے کا شکار ہوا تھا۔ ایک طرف ماں کا حکم تھا تو دوسری طرف دل۔ ایک طرف حق تھا تو دوسری طرف رشتے اور پھر رشتے جیت گئے تھے۔

"اور ہاں وہ۔ لوگ جلد ہی صلہ کا نکاح کر رہے ہیں۔ اس دوران تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ راضی نامہ تو ہو چکا ہے بس اب اللہ کرے فیروز جلد گھر لوٹ آئے۔ میری بچی کا تو رو رو کے بُرا حال ہو گیا ہے۔"

اس خبر کے ساتھ اپنا حکم دوٹوک انداز میں سناتے ہوئے انہوں نے لائن کاٹ دی تھی۔

ثمر نے چپ چاپ فون میز پہ رکھتے ہوئے

اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

☆☆☆

شمشیر کی موت کی خبر تبریز کے لیے بھی بے حد تکلیف دہ تھی۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ اس کی عادات سے تبریز کو اختلاف ضرور تھا پر وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی موت کی وجہ سے بھی بہر حال وہ واقف تھا اور اس بات کا اسے بے حد رنج تھا لیکن اس سب کے باوجود وہ فیروز کو سزا دلوانا چاہتا تھا۔ اس کیس کی پیروی وہی کر رہا تھا لیکن اچانک اسے سردار محسن علی نے اس معاملے کو ختم کرنے کا حکم دیا تو وہ حیرت زدہ ان کی صورت دیکھنے لگا۔ پر جب اصل بات سامنے آئی تو وہ ہوش ہی کھو بیٹھا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بابا؟ اپنے بھائی کے خونِ ناحق کے بدلے ان کی نابالغ بیٹی سے شادی کرلوں کیونکہ اس کے بدلے وہاں سے کئی سو مربعے جہیز میں ملیں گے۔ آپ نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟ اور پھر ہمیں کس چیز کی کمی ہے جو ہم زمین و جائیداد کے لیے یہ سب کریں۔"

تبریز کا ردِعمل وہی تھا جو سردار صاحب پہلے سے سوچ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"اوہ بیٹا جی! ہولے ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہیں۔ ان عدالتوں میں انصاف ملتا نہیں بلکہ بکتا ہے۔ فیروز کو پھانسی لگ بھی گئی تو شمشیر نے واپس نہیں آجانا۔" محسن علی کے لہجے میں چھپا اطمینان اسے حیران کر رہا تھا۔

"الیکشن ہونے والے ہیں تبریز! ان حالات میں شمشیر کے کردار کے بخیے اُدھیڑے گئے تو اس کے چھینٹے مجھ تک بھی پہنچیں گے۔ بیٹا تو چلا گیا اب تم کیا چاہتے ہو رہی سہی عزت بھی چلی جائے۔" رکھائی سے کہتے ہوئے انہوں نے سرد نگاہوں سے تبریز کی طرف دیکھا۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب اس میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہ تھی۔

"لیکن میں یہ شادی نہیں کروں گا"۔ تبریز نے احتجاج کیا۔

بہر حال یہ اس کا حق تھا پھر دیتے پھریں سردار صاحب دشمنوں کو معافی لیکن وہ ہرگز ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا جس کے بعد خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ رہتا۔

"تو مت کرو۔ بھائی کی قبر پہ مٹی ڈالنے تو آ گئے تھے۔ باپ کے جنازے کو کندھا دینے مت آنا۔ تمہارے لیے اصول اہم ہیں نا تو سردار محسن علی کو اپنی زبان، اپنا وعدہ عزیز ہے۔ میں معافی نامہ اکبر خان کو دے چکا ہوں لہٰذا وہ لڑکی اس گھر میں بیاہ کر آئے گی۔ تم نہیں کرو گے یہ شادی تو میں کرلوں گا۔" سردار محسن علی نے اپنے ترکش سے وہ آخری تیر نکالا تھا جس کے ذریعے انہیں تبریز سے یہ جنگ جیتنی تھی۔ جتنا وہ تبریز کو سمجھتے تھے وہ جن اصولوں کے پیچھے لگ کر اس رشتے سے انکار کر رہا ہے ان میں سب سے پہلے انسانیت تھی۔ وہ باپ کو کبھی ایک کم سن لڑکی کی زندگی برباد کرنے نہیں دے گا۔

تبریز واقعی ہل گیا تھا۔

☆☆☆

والدین کی جذباتی بلیک میلنگ میں ہمیشہ اولاد کے اصول ہار جاتے ہیں سو وہ بھی ہار گیا تھا۔ اس کے ضمیر کو یہ سب گوارہ نہیں تھا۔ ایک بڑی زیادتی سے بچانے کی خاطر اس نے صلہ سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ ذہنی طور پہ اس رشتے کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا نہ ہی اس صورتحال میں صلہ سے کوئی تعلق قائم رکھ سکتا تھا۔ پھر یہ بھی سردار صاحب کا فیصلہ تھا کہ وہ لڑکی اس گھر میں رانیہ کے مقام پہ نہیں رہ سکتی۔

اتنے بہت سے مسائل میں تبریز کو فقط ایک حل نظر آتا تھا اور وہ تھا اس ساری صورت حال سے

فرار۔ نکاح کے فوراً بعد وہ شہر چلا گیا تھا کبھی نہ لوٹ کے آنے کے لیے مگر تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ پچھلے دنوں موسم میں تبدیلی کا اثر تھا یا شاید بڑھتی عمر کا تقاضا، سردار محسن علی کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ رانیہ انہیں اس طرح بستر پہ پڑا دیکھ کر شدید پریشان ہوگئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں روتے ہوئے اسے فون کر دیا۔

برسوں بعد گھر سے بلاوا آیا تو وہ بھی باپ کی تکلیف کا سن کر جذباتی ہوگیا تھا۔ گھر میں کبھی دوبارہ پیر نہ رکھنے کے سب دعوے رانیہ کی درخواست اور آنسوؤں میں بہہ گئے تھے۔ بالآخر وہ لوٹ آیا پر جس ایک بات کو بھلانے کے لیے اس نے اتنے سالوں کا بن باس کاٹا تھا یہاں پہنچ کر وہ حقیقت کی صورت جوں کی توں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بیوی جسے اس نے کبھی ذہن و دل سے قبول نہیں کیا تھا، آج بھی اس گھر میں موجود تھی۔ مگر کس حیثیت سے؟

وہ جب سے آیا تھا اسے ایک ملازمہ کی طرح کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ پھر رانیہ اور سردار صاحب کا اس کے ساتھ ذلت آمیز رویّہ جو اس گھر میں کسی عام ملازم کے ساتھ بھی نہیں تھا تو فقط اس لیے کہ وہ شمشیر کے قاتل کی بہن تھی۔ رانیہ کو اسے دیکھ کر ہر لمحہ اپنی تہی دامنی یاد آتی تھی۔ اپنا خسارہ وہ اس لیے بھی بھول نہیں پاتی تھی کیونکہ صلہ اس گھر میں موجود تھی۔ کچھ یہی وجوہات تھیں جو وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شہر میں کئی بار اس نے سوچا کہ اس اذیت اور تنہائی سے نجات پانے کی خاطر اسے اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں جذبات سے بڑھ کر ضرورت آڑے آجاتی ہے۔ اسے بھی اپنے گھر، جیون ساتھی اور اولاد کی ضرورت تھی جن سے وہ اپنی تنہائی بانٹ پاتا۔ پھر اسے تو سردار صاحب نے اس شادی سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس کی بیوی کو وہ سارے حقوق اور احترام ملیں گے جو اس خاندان کی بہو کا حق ہے لیکن وہ ہر بار یہ فیصلہ کرنے میں ناکام رہا۔ ایک احساسِ ندامت تھا جو ہر بار راستے میں آجاتا۔

اس وقت بھی رانیہ کو بھول کر وہ صلہ کے متعلق سوچنے لگا تھا جو اپنوں کی بے رحمی کا شکار ہو کر یہ اذیت ناک وقت گزار رہی تھی۔ ماضی کی ان ہی تلخ سوچوں میں گھرا وہ اپنے ہی دھیان میں مگن لان میں چہل قدمی کرتا گھر کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ یہاں قطار در قطار ملازموں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے باہر سیمنٹ کا چبوترہ بنا تھا جہاں ایک دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا اور گھر کے اس حصے میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ درمیان میں ایک کچا احاطہ تھا جس میں موسمی سبزیاں اور چند پھلوں، پھولوں کے درخت تھے۔ وہیں ملازموں کے بچے بچیاں کھیل رہے تھے۔

اچانک اسے اپنے عالی شان گھر کے سناٹے کا خیال آیا جہاں کسی کو سانس بھی اپنی مرضی سے لینے کی اجازت تھی نہ ہی مسکرانے کی۔ اس کے برعکس ان عام سے لوگوں کے چہروں پہ نظر آتا ہر تاثر کتنا فطری تھا۔ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ لان کے کونے میں کھڑا بچوں کی شرارتیں دیکھتا رہا۔ اسی وقت سامنے کے ایک کمرے سے صلہ نکل کر سیمنٹ والے چبوترے پہ آکر بیٹھ گئی۔ وہی کل والا سیاہ لباس جو کثرت استعمال سے چمک بھی کھو چکا تھا۔ سر پہ سیاہ دوپٹہ اوڑھے جس سے خود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بچے بھاگ کر اس کے پاس چلے آئے۔ صلہ نے ہاتھ میں ایک ٹوکری پکڑی ہوئی تھی۔ ایک بچی وہ

پلاسٹک کی ٹوکری لے کر کیاری کی طرف چلی گئی اور وہاں لگے موتیا کے پودوں سے پھول چن چن کر ٹوکری میں بھرنے لگی۔ باقی اپنے کمرے سے قاعدہ اٹھا لائے اور صلہ سے پڑھنے بیٹھ گئے۔ تبریز چاہ کر بھی واپس نہ لوٹ پایا۔ بچی پھولوں سے بھری ٹوکری صلہ کے پاس رکھ کر اب خود بھی اپنا سبق اسے سنانے لگی تھی۔ صلہ نے ٹوکری میں رکھے پھولوں کو دھاگے میں پرو کر بڑی نفاست سے گجرے بنائے۔ اس دوران وہ سب بچوں کو پڑھا بھی رہی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب تبریز نے اسے پورے دھیان سے دیکھا۔ اس کی دودھیا رنگت سورج کی کرنوں میں سنہری دکھائی دے رہی تھی۔ اس معمولی لباس میں بھی اس کا روپ متوجہ کرتا تھا۔ گو کپڑے سستے تھے پر وہ بقیہ ملازمین کے برعکس صاف ستھری تھی۔ کچھ دیر تک پڑھائی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اس دوران ٹوکری کے سارے پھول لڑیوں کی صورت پروئے جا چکے تھے۔ بچے اٹھنے لگے تو صلہ نے وہ سارے گجرے ان میں بانٹ دیے اور خود مسکراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر کمرے میں جاتے اچانک اس کی نگاہ لان کی طرف کھڑے تبریز پہ پڑی تو وہ ٹھٹک گئی۔

وہ جو ارد گرد سے بے نیاز گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' اچانک اسے اپنی طرف متوجہ پا کر خجل ہوا۔ صلہ کے چہرے کی مسکراہٹ تو اسے دیکھتے ہی سمٹ چکی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے سر سے کھسکتا دوپٹہ درست کیا اور سر جھکائے کمرے کے اندر چلی گئی۔

تبریز چند منٹ وہیں سر جھکائے خالی ذہن کے ساتھ کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا واپس گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

صبح کی طرح رات کے کھانے پر بھی رانیہ ان کے ساتھ موجود نہیں تھی' البتہ سردار صاحب آج بہت دن بعد اپنے کمرے کے بجائے ڈائننگ روم میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے لیے صلہ نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پرہیزی کھانا الگ سے تیار کیا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیبل پہ کھانا رکھ کر اب باورچی خانے سے میٹھے کی ڈش اٹھانے گئی تھی۔ تبریز نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے ایک نگاہ اس پہ ڈالی۔ صلہ دیکھ کر بھی بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہی۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ شاید اسے واپس آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہاں تو بس احساسِ ندامت تھا پر یہاں تو جیتے جاگتے مظالم آنکھوں کے سامنے تھے۔ صلہ کے ساتھ ہو رہی زیادتی ہی کیا کم تھی جو رانیہ پہ نہ دکھائی دینے والا جبر سوچ کر اسے اس وقت اپنے آپ سے بھی نفرت ہو رہی تھی کہ وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"میں نے بہت سوچا، میرا خیال ہے تمہاری بات درست ہے۔ مجھے رانیہ کی شادی کر دینا چاہیے۔" سردار صاحب نے سوپ کا پیالہ ختم کر کے اسے پرے کھسکایا۔ تبریز نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کھانا کھاتے رک گیا تھا۔

"سچ بابا؟"

اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ اپنی ناراضی وضد جتا کر ان سے اپنی کوئی بات منوا نہیں سکا تھا۔ تو کیا ان کے اندر بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ شاید ایک بیٹا کھو کر دوسرے بیٹے کی طویل جدائی نے انہیں پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہنے دیا اسی لیے تو وہ اس کی بات مان گئے۔

"آپ واقعی ان کی شادی کر دیں گے؟" تبریز نے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی

تھی۔ جواب میں انہوں نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے سر ہلایا اور پھر اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگے۔ تبریز اب بھی ان کو دیکھتا' ان کی اگلی بات کا منتظر تھا۔

''رانیہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے۔ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ شمشیر سے اس کی شادی تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔ شمشیر کا ذکر اس پل کرب بن کر چہرے پہ نمودار ہوا تھا۔

''خیر، تم نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی اور خوشیوں پہ اس کا بھی پورا حق ہے۔'' ایک گہری سانس لیتے انہوں نے سلسلۂ کلام ایک بار پھر شروع کیا اور تبریز کے اندر ابھی کچھ دیر پہلی والی پشیمانی دم توڑنے لگی۔

رانیہ سے اس کا دہرا رشتہ تھا۔ تمام عمر وہ لوگ ایک ہی گھر میں رہے۔ پھر اس کی شادی بھی یہیں ہوگئی تو جیسے رشتہ مزید گہرا ہوگیا۔ رانیہ اور تبریز ہم عمر تھے پر وہ اسے شمشیر سے رشتے کی وجہ سے آج بھی بھابھی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور دل سے اس کی خوشیوں کا تمنائی تھا۔ وہ گواہ تھا کہ رانیہ نے شادی کے بعد کتنی تکالیف اٹھائی ہیں اور وہ سلسلہ اب بھی کہاں ختم ہوا تھا کہ گھٹ گھٹ کر جیے جانا زندگی تو نہیں ہوتی۔

''تھینک گاڈ، آپ کی سمجھ میں میری بات آگئی۔ ویسے کوئی اچھا رشتہ ہے آپ کی نظر میں۔'' وہ ایک دم بے حد خوش ہوگیا تھا۔ کھانے کا نوالہ منہ میں ڈالتے اس نے صلہ کے ہاتھ کا ذائقہ محسوس کیا۔ اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

''رشتے کے لیے کہیں باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر کی بات ہے، گھر میں ہی رہنی چاہیے۔'' اس کے برعکس سردار صاحب کے چہرے پہ معنی خیز سنجیدگی تھی۔

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں بابا! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

تبریز نے ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے ان تمام تر ممکنات کے متعلق سوچا تھا۔ ان کی برادری، دور نزدیک کے رشتے داروں میں سے کون ایسا ہوسکتا تھا جو ان کے گھر کا فرد تھا یا جسے اس کے بابا گھر کا سمجھتے تھے۔ ماتھا کھجاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ اسی وقت سامنے باورچی خانے سے صلہ کھیر کا پیالہ تھامے باہر آئی۔ تبریز کی نگاہ اپنے آپ اس پہ جا ٹھہری۔

''میں چاہتا ہوں، رانیہ سے تم شادی کرلو۔''

کھیر کا پیالہ صلہ کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوگیا تھا۔ تبریز بے یقینی سے سردار صاحب کا منہ دیکھنے لگا پر وہ خوں خوار نگاہوں سے صلہ کی طرف متوجہ تھے جو افراتفری میں اب کانچ کے ٹکڑے سمیٹ رہی تھی۔

''اے لڑکی! تو یہاں کیا کررہی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے......'' سردار صاحب کی آواز سے خوف زدہ ہوکر وہ بری طرح کانپ گئی اور فرش پہ پڑے کانچ کی کرچیاں اس کے ہاتھ کو لہولہان کرگئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنگِ مرمر کے فرش پہ گری کھیر کا دودھیا رنگ سرخ ہونے لگا تھا۔ صلہ آنکھوں میں خوف لیے سردار صاحب کی آواز سن کر الٹے پاؤں باورچی خانے کی طرف واپس لوٹ گئی۔ تبریز نے دیکھا فرش پہ اس کے قدموں کے ساتھ انگلیوں سے ٹپکتے لہو کی لکیر بن چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تاسف سے اس نے آنکھیں بند کیں' لب کاٹا اور پھر بے حد رکھائی سے سردار صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بابا! میں ان سے شادی کیسے کرسکتا ہوں؟'' وہ بے ادب بھی نہیں تھا پر ہاں تلخ ضرور ہوا تھا۔

''کیوں نہیں کرسکتے تم شادی رانیہ سے؟''

سردار صاحب معمول کے انداز میں کھانے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ سب اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

''میں انہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ انہیں اس نگاہ سے دیکھنے کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ میں نے۔'' اس نے دفاعی انداز اختیار کیا۔

یوں بھی رانیہ کی دوسری شادی کی بات کرتے ہوئے اس نے وہی سوچا تھا جو اس کا سگا بھائی سوچتا۔ پھر یہ اس کا حق بھی تھا پر ایسا تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ بابا یہ ڈھول اسی کے گلے میں ڈال دیں گے۔

''اس وقت تو مجھے بڑی شرع سکھائی جا رہی تھی۔ رانیہ کو دوسری شادی کا حق مذہب نے دیا ہے تو کیا مذہب نے یہ نہیں کہا کہ بھائی فقط وہ ہوتا ہے جس سے خون کا تعلق ہو اور تمہارا رانیہ سے ایسا کوئی تعلق نہیں۔ اس سے تمہارا نکاح بالکل جائز ہے۔'' بڑے دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے وہ اسے اسی کی دلیل سے مات دے رہے تھے۔ تبریز کا دماغ گھوم گیا تھا۔

''بابا! میں شادی شدہ ہوں۔'' اور یہ لفظ کہتے خود اس کا اپنا لہجہ اتنا مدہم تھا کہ بمشکل ہی اپنی کہی بات سن پایا۔ وہ جسے برسوں سے کبھی آنکھ بھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کے وجود سے وہ اتنا لاپرواہ تھا کہ اس کی کوئی شبیہہ بھی ذہن کے پردوں پہ نہ تھی۔ اس دن اگر قدسیہ بوا اس کا تعارف نہ کروائیں تو وہ اسے اپنے گھر کی کوئی ملازمہ ہی سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر یہاں حیثیت ہی کیا تھی صلہ کی۔ جس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا' اس سے نام جڑنا یاد آ گیا تھا۔

''اس شادی کو میں مانتا ہوں نہ ہی تم نے دل سے قبول کیا ہے۔ اس کی اوقات وہ ہے جس پہ اتنے سالوں سے اسے رکھا ہوا ہے اس لیے بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی شادی ہوئی ہے اور جو میں کہہ رہا ہوں اس پہ دھیان دو۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے تو عزت بھی بچی رہے گی اور جائیداد بھی۔''

سردار صاحب تیز لہجے میں کہتے ہوئے اپنا مدعا بمع نئے حکم نامے کے سنا چکے تھے اور تبریز جان گیا تھا انہیں رانیہ کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ رانیہ کے نام کی کروڑوں کی جائیداد سے ہے جو اس کی شادی کی صورت اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ یہ دوسری بار تھا کہ اسے محسن علی کو اپنا باپ سوچ کر شرمندگی ہوئی تھی۔ پہلی بار جب انہوں نے ایک کم سن لڑکی سے خود شادی کرنے کی بات کی تھی۔

سردار صاحب اٹھ کر جا چکے تھے۔ تبریز دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اس نئی مصیبت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سامنے فرش پہ صلہ کے خون کے قطرے جم کر سیاہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

صلہ نے سنک کے سرد پانی تلے زخمی انگلیاں رکھ دیں۔ آن کی آن میں سنک ٹب میں بے رنگ پانی گلابی ہونے لگا۔ سردار صاحب کی آواز اب تک اس کے کانوں میں گرم سیسے کی طرح انگارے اگل رہی تھی۔ وہ کتنے بے رحم اور سفاک تھے۔ یہ تو صلہ ان گزرے سالوں میں جان ہی چکی تھی پر ابھی ان کے ظلم کی حد باقی تھی، یہ نہیں سوچا تھا۔ نل بند کر کے وہ اب دونوں ہاتھوں سے سنک تھامے سر جھکائے بری طرح رو رہی تھی۔

تبریز سے تو اسے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے دل میں اس رشتے کی بھلا کیا اہمیت تھی۔ خود صلہ بھی کہاں اپنے آپ کو تبریز کے حوالے سے پہچانتی تھی۔ وہ واقف تھی اپنی حیثیت سے، اسے پتا تھا اس گھر میں اپنا مقام۔ پھر بھی جانے کیوں ایسا لگا جیسے ایک ہی پل میں سب ختم ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں بچا۔ وہ نہیں جانتی تھی، تبریز نے باپ کو کیا جواب دیا پر اسے معلوم تھا سردار محسن علی کو انکار سننے

کی عادت نہیں ہے۔ اگر وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں تو جلد یا بدیر تبریز کو رانیہ سے شادی کرنی پڑے گی اور پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟

ایک نئی اذیت کا سامنا کرنا ہوگا صلہ کو......

اپنے شوہر کو اس کی دوسری بیوی کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھنا۔ آج تک رانیہ اس سے اپنے شوہر کے قاتل کی بہن کے روپ میں نفرت کرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کا لہجہ زہر اگلنے لگتا تھا پر یہ رشتہ جڑنے کے بعد وہ صلہ سے سوتن بن کر انتقام لے گی۔

''اف......'' سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہونے لگا کہ اچانک کسی کے زور سے گرنے کی آواز آئی تھی۔ گھر میں اس وقت موت سی خاموشی تھی کہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ صلہ گھبرا کر اوپری منزل کی طرف بھاگی کہ یہ آواز اوپر کے حصے سے ہی آئی تھی اور پھر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ رانیہ فرش پہ بے سدھ اوندھے منہ پڑی تھی۔

''رانیہ بھابھی! اٹھیں۔'' صلہ نے جلدی سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے گال تھپتھپانا شروع کیے۔ یقیناً یہ ان مسکن دواؤں کا اثر تھا جو رانیہ بے دریغ استعمال کر رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار وہ یوں ہی چکرا کر گر چکی تھی لیکن وہ یہ گولیاں کھانے سے باز نہیں آتی تھی۔ صلہ اس کے کمرے سے پانی کا گلاس لے آئی۔ چند چھینٹے اس کے منہ پر مارے اور پھر ہوش میں آنے پہ گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ رانیہ نے سارا پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ صلہ جانتی تھی وہ رات سے بھوکی بھی ہے کیونکہ کھانے کے لیے اس نے منع کر دیا تھا۔

''تم......؟'' وہ اب ہوش میں تھی۔ صلہ کی گود میں سر رکھے بمشکل آنکھیں کھولے وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں میں۔'' صلہ نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اس پل وہ اسے بے حد قابلِ رحم محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے والے احساسات غائب ہو چکے تھے۔ نہ وہ شمشیر کی بیوہ تھی، نہ ہونے والی سوتن۔ وہ تو بس ایک عورت تھی۔ اس کی طرح بے بس۔ مجبور۔ لاچار۔ جس کا فقط استحصال ہو رہا تھا۔

''آپ شاید نیند میں تھیں۔ لائیں میں دوا لگا دوں۔'' اس کے گال پہ گرنے کے باعث چوٹ لگی تھی۔ رانیہ آہستہ سے اٹھ گئی۔ صلہ نے اسے ہاتھ کا سہارا دے کر بیٹھنے میں مدد کی۔ وہ دونوں اب وہیں آمنے سامنے فرش پہ بیٹھی تھیں۔

سفید بیش قیمت اور نفیس جوڑے میں ملبوس اس گھر کی بڑی بہو رانیہ اور سیاہ بوسیدہ اور سستا سا لباس پہنے اس گھر کی چھوٹی بہو صلہ...... لباس کی قیمت اور رنگ میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود ان دونوں کے چہرے اور آنکھیں ایک سی تھیں۔ وہی وحشت جو رانیہ کی آنکھوں میں تھی، اتنا ہی درد صلہ کی نگاہوں میں تھا۔ رانیہ ایک ٹک صلہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ بے اختیار صلہ کو نظریں جھکانا پڑیں۔

''تمہیں پتا ہے، اکیلے ہونے کا عذاب کیا ہوتا ہے۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تو صلہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ صلہ خاموش رہی پر وجود کے ہر حصے سے ایک ہی جواب آیا تھا۔

''ہاں میں واقف ہوں اس درد سے۔ ہجوم میں تنہا رہنا کیسا ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے اس کی اذیت۔''

''تم تو جانتی ہوگی۔ تم بھی تو بھگت رہی ہو۔'' ایک توقف کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے رانیہ نے خود ہی جواب دیا تھا۔

صلہ اب بھی خاموش رہی۔ اس کے ہاتھ میں

اب شدید درد ہو رہا تھا۔ رانیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری۔ صلہ کو یہ بے موقع ہنسی عجیب لگی تھی۔

"لیکن جانتی ہو، میں اس جہنم میں کیوں ہوں صلہ؟" صلہ کے سر پہ ٹکے دوپٹے پہ ہاتھ پھیرتے رانیہ نے کچھ انداز میں سوال کیا کہ صلہ کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یک ٹک کسی مجسمے کی طرح بیٹھی رانیہ کو تک رہی تھی پر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک انچ اپنی جگہ سے کھسک جائے۔

"تمہاری وجہ سے......" اچانک رانیہ کا لہجہ بدل گیا۔ وہ نرمی والا تاثر اب نفرت میں ڈھل چکا تھا۔ ساتھ ہی صلہ کے سر پہ ٹکے اس کے ہاتھ نے صلہ کے بالوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا یوں کہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ بری طرح اس کے بالوں کو جکڑے اب دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ نوچ رہی تھی۔

"تم اگر ہماری زندگی میں نہ آتیں تو میں یہ موت سے بدتر زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔" رانیہ نے بے تحاشہ اسے مارنا شروع کر دیا۔ صلہ فرش پہ گری تڑپ رہی تھی اور رانیہ اسے ٹھڈے مار رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"رانیہ بھابھی، چھوڑیں اسے۔" اچانک تبریز اوپری منزل میں آ پہنچا اور اس نے رانیہ کو ایک جھٹکے سے پرے کیا۔ نیچے فرش پہ صلہ لہولہان نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔

"ہٹ جاؤ تبریز! میں اسے جان سے مار دوں گی۔" وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اس نے تبریز کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ایک بار پھر صلہ کو پاؤں مارا۔

"بس کریں۔ بہت ہو گیا تماشا۔" تبریز نے اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر سختی سے جھنجوڑا۔ رانیہ جیسے ہوش میں لوٹی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے تبریز کو دیکھ رہی تھی جو چہرے پہ شدید غصہ اور ناپسندیدہ تاثر لیے اسے گھور رہا تھا۔ رانیہ کے بازوؤں پہ اب بھی تبریز کی مضبوط گرفت تھی۔ اچانک اس نے اپنے بازوؤں پہ نگاہ ڈالی۔ تبریز نے آہستہ سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ رانیہ تیزی سے واپس پلٹی اور زور سے دروازہ بند کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تبریز نے فرش پہ پڑی صلہ کو دیکھا جو اب اردگرد سے بے خبر بے ہوش تھی۔

☆☆☆

تکلیف کا شدید احساس تھا جو اس کے پورے وجود پہ حاوی تھا پر سب سے زیادہ درد اس وقت اسے اپنے سر اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا، رانیہ نے اس کا سر کئی بار سنگِ مرمر کے پختہ فرش پہ پٹخا تھا۔ اس کا ماتھا زخمی ہو گیا تھا جہاں سے اس وقت خون بھی بہنے لگا تھا پر وہ اس قابل نہ تھی کہ مزاحمت کر پاتی۔ پھر شاید تبریز آیا تھا وہاں۔ اس نے رانیہ کو روکا تھا لیکن صلہ کی حسیات جواب دینے لگی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی، وہ سن نہیں سکی تھی اور آہستہ آہستہ اس کا دماغ ایک تاریک سرنگ میں اتر گیا تھا اور اب جانے کتنی دیر کی بے ہوشی کے بعد اپنے زخموں سے اٹھتی ٹیسوں کے باعث آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے اردگرد مدہم سی روشنی تھی۔ اتنی کہ وہ اپنے اردگرد ہر شے کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔

اچانک اسے اس اجنبی جگہ پہ اپنی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لیٹی رہو۔" تبریز نے دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ صلہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ دائیں طرف رکھے صوفہ پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا اسی کی طرف متوجہ تھا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ تبریز کا کمرہ تھا۔ اسی کا بستر تھا۔ وہ سالوں سے اس کمرے کی صفائی کرنے بارہا یہاں آچکی تھی۔ اس وقت تبریز یہاں موجود نہیں ہوتا تھا لیکن آج پہلی بار...... اس نے ایک بار پھر بے یقینی سے تبریز کو دیکھا۔ وہ اب صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آچکا تھا اور بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک صلہ کو احساس ہوا اس کی چادر اس کے پاس نہیں ہے۔

''میں یہاں کیسے؟'' نگاہیں جھکائے اس نے اپنے اردگرد چادر تلاش کی۔

''تمہارے سر کا زخم گہرا ہے۔ ڈاکٹر نے احتیاط کرنے کو کہا ہے۔'' اس کے ہاتھ میں چادر تھماتے ہوئے تبریز اب اس کے پاس ہی بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گیا تھا۔ صلہ نے جلدی سے چادر لپیٹ لی۔ اس مار پیٹ کے باعث اس کے بال بھی منتشر تھے۔ صلہ کو حیرت ہوئی تھی۔ تو کیا اس کی خاطر ڈاکٹر بلایا گیا تھا؟

''اتنا بھی گہرا نہیں۔ ایسی چوٹیں تو لگتی ہی رہتی ہیں۔'' اس نے چہرہ دوسری طرف کیا تو تبریز نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''تو کیا اس سے پہلے بھی تمہیں......'' وہ جیسے شاک میں تھا۔

''انہیں ڈپریشن کے یہ دورے آئے دن پڑتے ہی رہتے ہیں، ایسے میں ان کے ہاتھ میں جو آتا ہے وہ اسے میری طرف اچھال دیتی ہیں۔'' صلہ بے بسی سے مسکرائی۔ وہ اس معمول کی عادی ہوچکی تھی اور اب تو یہ سب اسے تکلیف نہیں دیتا تھا۔ قدسیہ بوا کبھی اس کے زخم پہ ہلدی لگا دیتیں تو کبھی یوں ہی چند روز تڑپ کر چوٹیں مندمل ہوجاتیں۔ نہ کوئی ڈاکٹر بلاتا تھا نہ دوا لگتی تھی۔ ایک وہ وقت تھا جب اس کی معمولی سے معمولی بیماری اس کے ماں باپ کو رات رات بھر جگائے رکھتی تھی۔ اس کے ایک وقت بھوکا رہنے پہ اس کی ماں کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی تھی۔ اور پھر اسی ماں نے اسے اس دوزخ میں دھکیل دیا جہاں اسے شدید سے شدید تکلیف میں بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

''بھابھی کی طرف سے میں معذرت چاہتا ہوں۔ ان کے حالات......'' تبریز لب بھینچے بے انتہا شرمندگی سے بولا۔ صلہ نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا کہ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''جانتی ہوں۔ بارہا سن چکی ہوں۔'' صلہ نے مزید کچھ کہنے کے بجائے اپنا لباس درست کیا اور کمبل کھینچ کر سائیڈ پہ کرتی بیڈ کے دوسری طرف سے اترنے لگی۔

''تم یہیں رکو۔'' تبریز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ میرا مقام نہیں۔'' اس نے پلٹ کر تبریز کے ہاتھ میں پکڑی کلائی کو دیکھا اور پھر دوسرے ہاتھ سے اسے پیچھے کرتی اس بار کچھ تیزی سے بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔

''ایک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ جب میں کہہ رہا ہوں، تمہیں اس کمرے میں رکنا ہے تو سنتیں کیوں نہیں۔'' تبریز بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز حکمیہ اور آواز بلند تھی۔ پہلی بار صلہ نے اسے اتنے سخت لہجے میں بولتے دیکھا تھا کہ گزرے چند دنوں میں وہ اسے بہت کم گو اور دھیمے مزاج کا انسان معلوم ہوا تھا۔

''کیوں رکوں میں یہاں اور کس حیثیت سے۔ اس گھر کا ہر شخص مجھے دن رات میری اوقات بتاتا ہے۔ ونی ہوں میں اور ونی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔'' صلہ کو جانے کیا ہوا تھا کہ بجائے اس کے غصے سے خوف کھانے کے وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ اسی کی طرح بلند اور دوٹوک انداز میں کہتی وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"تو اس سب میں میرا کیا قصور ہے بولو؟ یہ غصہ جو مجھے دکھا رہی ہو، اپنے ماں باپ کو کیوں نہیں دکھایا جنہوں نے تمہیں یہاں پھینک دیا۔ اس بھائی کو کیوں نہیں دکھایا یہ غصہ جس نے اپنی جان بچانے کی خاطر بہن کی زندگی برباد کر دی۔ تمہارے لیے قتل کر سکتا تھا تو کیا سولی نہیں چڑھ سکتا۔ بس ہتھیار چلانے تک تھی اس کی غیرت؟" جواب ترکی بہ ترکی آیا تھا۔ دونوں بازوؤں سے جھنجوڑتے اس نے ایک بار پھر اسی تلخ اور بلند آواز میں کہا تھا۔

صلہ کے اندر پلتا شکوہ جو ابھی چند لمحوں پہلے تبریز کے آگے لاوا بن کر ابلا تھا ایک دم سرد پڑ گیا۔ وہ کیا غلط کہہ رہا تھا؟ قصور تو اس کے اپنوں کا تھا پھر وہ کس طرح تبریز سے شکایت کر سکتی تھی۔ کس حق سے وہ تبریز سے نفرت کر رہی تھی کہ یہ سب اس کی وجہ سے نہیں وہ اپنے ماں جائے کی بدولت بھگت رہی تھی جس نے غیرت میں آ کر گولی تو چلا دی پر اس کی سزا کا پھندا بہن کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا تبریز۔ اچانک اس کا وجود ڈھیلا پڑنے لگا۔ سبکی و اہانت کا احساس چند پل پہلے وجود میں اٹھتے مان پہ حاوی ہو چکا تھا۔ صلہ نے بے اختیار گردن جھکا دی۔

"مجھے باتیں دہرانے کی عادت نہیں۔ آج سے تم یہیں رہو گی۔ اس سرونٹ کوارٹر میں نہیں۔ اب جاؤ جا کر آرام کرو۔" تبریز کی گرفت اب بھی اس کے بازوؤں پہ اتنی ہی مضبوط تھی کہ اس میں استحقاق شامل تھا اور پھر اس نے انگلی کے اشارے سے دوٹوک انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے صلہ کو اپنے کمرے میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ صلہ بس دیکھتی رہ گئی۔ تبریز متانت سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گیا۔

☆☆☆

صلہ اس وقت کہاں تھی یہ بات گھر میں صرف قدسیہ بوا جانتی تھیں۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھائے تبریز اپنے کمرے میں لے آیا تھا اور پھر اس نے قدسیہ بوا کو بلایا تھا ساتھ ہی فلک شیر کو ڈاکٹر لانے کا حکم دیا تھا۔

گھر میں ڈاکٹر آنے کی بابت سردار صاحب اور رانیہ کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ البتہ صلہ کے متعلق بھی وہ اب تک بے خبر تھے۔ جس طرح رانیہ نے اسے مارا تھا، ظاہری بات ہے وہ اب چند دن کام کاج کے قابل نہیں تھی تو یقیناً اپنے کوارٹر میں ہوتی۔ ان دونوں کو ہی اس میں دلچسپی نہ تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔

صلہ پوری رات تبریز کے کمرے میں رہی جبکہ وہ خود صوفے پہ بیٹھا اس کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے اندر احساسِ گناہ اور بڑھا تھا کہ کچھ بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی جو اس وقت زخمی حالت میں پڑی تھی تو اس کی وجہ فقط تبریز کی عدم توجہی تھی۔ وہ اگر اس کی طرف سے بے خبر نہ ہوتا تو آج شاید اس کے ساتھ اتنی زیادتی نہ ہو رہی ہوتی۔

صلہ کو تنبیہ کر کے وہ کمرے سے نکل آیا تھا مگر دروازہ احتیاطاً باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ تبریز کو اپنے سخت رویے پہ افسوس تھا پر اس وقت اسے روکنے کا اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ قدسیہ بوا کو صلہ کے کھانے پینے کے دھیان کی ہدایت کرتا وہ گھر سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

تبریز کی واپسی کچھ دیر بعد ہوئی تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر داخل ہوا تو صلہ ایک بار پھر سوئی ہوئی تھی لیکن اس کے اندر آتے ہی وہ چادر درست کرتی اٹھ بیٹھی۔ شاید دروازے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تکیے سے ٹیک

لگائے وہ سر جھکائے بیٹھی اپنی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں اب پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر تبریز کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کپڑے میں تمہارے لیے لایا تھا۔'' تبریز نے ہاتھ میں پکڑے بیگ کو اس کے پاس بیڈ پہ رکھتے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ وہ پہلے والی خفگی اور غصہ اب نہیں تھا۔

''مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے یہاں رنگ برنگے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں۔'' صلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ وہ بیگ سے جھانکتے کپڑوں کے دلکش رنگ دیکھ چکی تھی۔

''کس نے لگائی ہے یہ پابندی تم پہ؟'' تبریز کے سوال پر اس نے نگاہ اٹھائی۔

''رانیہ بھابھی نے۔'' رانیہ نے ہی اسے پہلی بار وہ کالا لباس دیا تھا۔ وہ اس وقت سمجھ نہیں سکی تھی یہ رنگوں سے دور رہنے کا حکم کیوں دیا جارہا ہے لیکن پھر وقت کے ساتھ اسے اندازہ ہوا تھا رانیہ اس کی زندگی سے رنگ نہیں خوشیاں نکال چکی ہے۔ وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ اب اس کی زندگی اس سیاہ رنگ میں ماتم کرتے گزرے گی۔

''پر میری طرف سے تم پہ ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم جو رنگ چاہو پہن سکتی ہو، اب تمہیں رانیہ بھابھی سے بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے پاس بیڈ کے کونے پہ بیٹھتے اس نے عام سے انداز میں کہا۔

صلہ اس بدلے ہوئے تبریز کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ اگر ایسا ہی تھا تو اب تک کہاں تھا۔ اچانک اسے صلہ سے یہ ہمدردی کیوں ہونے لگی تھی۔

سالوں بعد اسے صلہ کا خیال کس لیے آیا تھا۔

''تو پھر میں ان ہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں کیونکہ اب مجھے اسی سیاہ رنگ کی عادت ہوچکی ہے۔ رنگ دیکھ کر آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں''۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخن کھرچ رہی تھی۔ تبریز اس سے کچھ فاصلے پہ بیٹھا سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا، تم اتنی ضدی لڑکی ہو۔''

صلہ کو اس کا طنز اچھا نہیں لگا تھا۔ بھلا وہ کہاں ضد کرنے کی سکت رکھتی تھی۔ اسے تو ٹھوکروں کی عادت تھی۔ تبریز بیڈ سائیڈ ٹیبل ٹٹول رہا تھا۔ ایک اسٹرپ میں سے دو گولیاں نکال کر اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پھر دونوں چیزیں صلہ کی طرف بڑھا دیں۔ صلہ نے ہاتھ بڑھا کر چپ چاپ دوا اور گلاس پکڑا اور ٹیبلٹس نگل لیں، بعد میں خود ہی گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ تبریز اب وہاں سے ایک ٹیوب اٹھائے اس پہ لکھی ہدایات پڑھ رہا تھا۔ ٹیوب کھول کر اس نے انگلی کی پور پہ دوا نکالی اور صلہ کے ماتھے پہ لگے زخم پہ لگانے لگا۔

''میں خود لگالوں گی۔'' وہ تلملا کر پیچھے ہٹی پر پیچھے بیڈ کراؤن تھا۔ تبریز سے دور جانا ممکن نہ تھا۔

''ہاں! تم تو لگا ہی لوگی۔'' صلہ کی مزاحمت کی پرواہ کیے بغیر وہ دوا لگاتا رہا اور پھر سر جھٹک کر ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

اس کا ذہن سوچوں کی گرفت میں تھا۔ کل رات بھی اسی صوفے پہ سوتی جاگتی کیفیت میں گزری تھی اور اب بھی نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی البتہ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ سامنے اس کے بستر پہ صلہ لیٹی تھی۔ شاید وہ بھی جاگ رہی تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے تو آیا تھا لیکن اب تک اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا

اچانک اور غیر دانستہ تھا کہ اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس پہ فلک شیر سے ہوئی گفتگو اسے مزید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رہی تھی۔

فلک شیر نے کہا تھا۔

''محبت ظاہر سے نہیں باطن سے کی جاتی ہے۔ دل کی باتیں ''میں'' سے نہیں ''ہم'' سے شروع ہوتی ہیں۔ خود سے بڑھ کر کسی دوسرے کی چاہ، اس کا خیال رکھنا محبت ہے۔ اس کی تکلیف پہ چوٹ اپنی روح پہ محسوس کرنا محبت ہے اور ان دیکھے کی محبت تو عبادت ہے۔''

تبریز سوچ رہا تھا آخر فلک شیر جیسا سادہ اور عام سا شخص محبت جیسے نازک جذبے کی اتنی حسین تفسیر کیوں کر پیش کر سکتا ہے۔ اس کے پوچھنے پر کہ کیا وہ بھی اس کیفیت سے گزرا ہے فلک شیر ہنس دیا تھا پر اس کی ہنسی آنکھوں تک نہیں پہنچی تھی۔

تبریز کو لگا جیسے کچھ ایسا تھا جو وہ تبریز سے چھپا رہا تھا ۔ وہ خود اس وقت بہت ڈسٹرب تھا۔ کسی سے دل کا حال کہہ کر خود کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ سردار صاحب کی نئی بات نے تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔ جائیداد بچانے کی خاطر وہ اسے رانیہ سے شادی کا کہہ رہے تھے پر یہ تو طے تھا، تبریز ان کا حکم کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن بات تو یہ تھی وہ فقط اپنا دامن بچانے کی سوچ رہا تھا۔ اس سب سے رانیہ کا کیا بھلا ہو پاتا۔ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہو رہا تھا اور شاید اسی لیے وہ فلک شیر سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھا۔ صلہ کے لیے شاپنگ کرنے وہ فلک شیر کے ساتھ ہی گیا تھا جب راستے میں اس نے اپنا مسئلہ فلک شیر کو سنایا۔

فلک شیر ان کا بہت پرانا ملازم تھا گو وہ ملازم نہیں تھا پر حالات نے اسے سردار صاحب کے در پہ لا پٹخا تھا۔ تبریز جانتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے خاندانی ہونے اور شرافت کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے اتنے سالوں میں کبھی ان کے گھر کے اندر جھانکا تک نہیں تھا۔

تبریز نے جب فلک شیر کو سردار صاحب کے فیصلے کے متعلق سنایا تو ایک شدید کرب تھا جو اسے فلک شیر کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس سے محبت کے متعلق پوچھ بیٹھا تھا۔ جس کے جواب میں فلک شیر نے جو کچھ کہا، لفظ بہ لفظ تبریز کے دل پہ لگا تھا۔ جانے اسے کیوں یہ احساس ہوا تھا کہ فلک شیر کی باتیں بے سبب نہیں ہیں اس کا ذہن انہیں رانیہ کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا چلا جاتا تھا۔

اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر وہ کمرے سے باہر ٹیرس پہ آیا تو ایک دم ٹھٹھک کر وہیں رک گیا۔ سامنے صلہ ریلنگ پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔ پتا نہیں کب وہ بستر سے اٹھ کر باہر چلی آئی۔ اچھی خاصی سردی تھی اور اس نے شال اوڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے بھی وہ بدل چکی تھی۔ تبریز سگریٹ جلائے بنا آواز اس کی سمت بڑھا اور اس سے نسبتاً فاصلے پہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ صلہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ تبریز نے بھی اسی وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ وہاں کھڑی رو رہی تھی۔ صلہ نے جلدی سے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور کمرے کی طرف جانے لگی کہ تبریز نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ بے اختیار اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔

''رونے کی وجہ؟'' اس کی پلکوں پہ ٹکا آنسو کا قطرہ انگلی کی پور سے صاف کرتے اس نے سوال کیا تھا۔ اس کا بازو اب بھی صلہ کی کمر پہ تھا اور اس کی تھوڑی تبریز کے سینے پہ ٹکی تھی۔ صلہ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی پر تبریز کی گرفت مضبوط تھی۔

''کوئی ایک وجہ تھوڑی ہے۔'' وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی پر ناکام رہی۔

''ایک وجہ تو میں ہوں اور اس کے علاوہ؟'' وہ مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا صلہ کا دل جل کر خاک ۔ ہو گیا تھا۔

''خود کو یوسف ثانی سمجھتے ہیں جو میں ان کی خاطر آنسو بہاؤں۔ ہونہہ۔'' لب کاٹتے ہوئے اس نے فقط جل کر سوچا تھا۔ تبریز نے انگوٹھے کی مدد سے اس کے ہونٹ کو دانتوں کے ستم سے آزاد کرایا۔

''بڑی بری عادت ہے تمہاری' جب جواب نہیں دے پاتیں تو اپنے ہونٹوں پہ ستم ڈھانے لگتی ہو۔ ویسے میں جانتا ہوں میں تمہارے لیے اتنا اہم نہیں جس کی خاطر تم آنسو بہاؤ لیکن تمہارے ساتھ ہوئی زیادتی میں سب سے زیادہ قصور میرا ہی ہے۔''

صلہ نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ یہ انسان کیسے اس کی سوچ پڑھ رہا تھا جبکہ اس سے تو احساس کا رشتہ بھی نہیں جڑا تھا اور یہ اس نے مجھے اتنے غور سے کب دیکھا جو اسے میری اس عادت کا علم ہو گیا۔ اس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' اس کی التجا پہ معنی خیز انداز میں مسکراتے تبریز نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ الٹے پیروں تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور پھر چند پل اپنی پھولی ہوئی سانسوں اور بے ترتیب دھڑکنوں کو پرسکون کر کے پیچھے دیکھا۔ تبریز اندر نہیں آیا تھا۔ صلہ نے جلدی سے بیڈ پہ چھلانگ لگائی اور کمبل کو زرہ بکتر کی طرح اوڑھ کر لیٹ گئی اس کا دھیان اب بھی تبریز کی طرف ہی تھا۔ بہت دیر بعد اس کے قدموں کی چاپ کمرے کے اندر سنائی دی تھی۔ صلہ کی ساری حسیات کان بنی تبریز کے قدموں کو محسوس کر رہی تھیں۔ پھر کمرے کے سناٹے میں صوفہ پہ اس کے لیٹنے کی آواز آئی۔ صلہ کو حوصلہ ہوا تھا۔ نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ پہلی بار اسے تبریز سے شدید خوف آ رہا تھا۔

☆☆☆

گھر کے داخلی دروازے سے فلک شیر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر تہمینہ کے چہرے پہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ ابھری جس میں ایک ماں کی محبت اور بہنوں سی شفقت شامل تھی۔ اس نے بھی مسکرا کر سلام کرتے خیریت دریافت کی اور اس کے پاس ہی چوکی پہ بیٹھ گیا۔

''بڑے اچھے وقت پہ آئے ہو شیرو، کھانا بس تیار ہی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی روٹی توے پہ ڈالتے اس سے کہا۔ فلک شیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ تہمینہ اب چمٹے سے روٹی پلٹ رہی تھی۔ فلک شیر انگلی سے ـــــــ فرش پہ نہ دکھائی دینے والی لکیریں بنانے لگا پر اس وقت اس کے ذہن میں اچھی خاصی کھلبلی مچی تھی۔ پتا نہیں اسے یہ سب تہمینہ سے کہنا چاہیے یا نہیں۔ جانے وہ اس کے دل کا حال جاننے کے بعد اس کے متعلق کیا سوچے۔

''کیا سوچ رہے ہو شیرو؟'' اس کی الجھن تہمینہ سے چھپی نہ رہ سکی۔

''سردار صاحب کے متعلق سوچ رہا تھا۔'' تہمینہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''نام مت لو اس ظالم کا میرے سامنے''۔ سالن کی پتیلی میں چمچہ گھماتے ہوئے اس نے غصے سے جواب دیا۔

''آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہیں خالہ۔'' وہ مسکرایا۔ تہمینہ کا موڈ ہنوز خراب تھا۔ سالن پلیٹ میں نکال کر اس نے گرما گرم روٹیاں فلک شیر کے سامنے رکھیں۔

''میں تو صرف جذباتی ہوں۔ پر تم احمق بھی ہو شیرو! کتنی بار کہا ہے تم سے چھوڑ دو اس ذلیل انسان کی چاکری اور شہر چلے جاؤ۔ تم اب صاحب جائیداد ہو۔'' اس کے بار بار کہنے کے باوجود فلک شیر آج تک سردار محسن علی کی ملازمت کر رہا تھا۔

اس کا دل دکھتا تھا یہ سب دیکھ کر کہ یہ اس کے معیار کا کام تو نہیں تھا۔

وہ اس سے عمر میں بہت زیادہ بڑی نہیں تھی پر اس کی سگی خالہ تھی۔ عمر کے اس کم فرق کی وجہ سے ان میں خالہ بھانجے سے زیادہ بہن بھائی والی قربت تھی۔ فلک شیر اس سے اپنی ہر بات کر لیتا تھا تو تہمینہ بھی اپنے مسئلے اسے سنا کر دل ہلکا کر لیتی تھی۔ ایک وہی تو بس اس کا میکہ تھا۔ فلک شیر کو اس کے پکائے کھانے میں اپنی ماں کے پکے کھانے کا ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔

''تمہارے باپ نے تم پر بڑا ظلم کیا۔ ظلم تو خیر اس نے میری بہن پر ہی توڑا۔ پر اپنی اولاد کے ساتھ بھی برا کیا۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے شیرو! جب آپا نے گھر گھر ملازمت کر کے کس مشقت کے ساتھ تمہاری پرورش کی، تمہیں تعلیم دلائی۔''

فلک شیر کا باپ سکندر اس علاقے کا چھوٹا موٹا زمین دار تھا، اچھا خاصا خوش حال تھا۔ پھر اس نے کاروبار شروع کر دیا تو کامیابی نے قدم چومے۔ دولت کی ریل پیل نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس نے دوسری شادی کر لی اور فہمیدہ کو طلاق دے دی۔ بیوی کے ساتھ اس نے بیٹے کو بھی زندگی سے نکال دیا۔

فلک شیر نے میٹرک کا امتحان دیا تھا، وہ تبریز کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔ زندگی جو پرسکون اور بے فکری سے گزر رہی تھی، یک دم کانٹوں سے بھر گئی۔

فہمیدہ کا میکہ تو بس ایک بہن تہمینہ ہی تھی۔ جس کی ان ہی دنوں نئی نئی شادی ہوئی تھی، اس کے حالات بہت اچھے نہیں تھے، فہمیدہ خود ان پڑھ تھی لیکن بیٹے کو پڑھانا چاہتی تھی، اس نے فلک شیر کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا۔

تبریز فلک شیر کا دوست تھا، وہ اس کے تمام حالات سے واقف تھا۔ اس نے فلک شیر کو سردار صاحب کے پاس ملازم رکھوا دیا، اس دوران وہ پڑھتا بھی رہا تھا۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ سردار صاحب کا خاص الخاص ملازم بن چکا تھا، جس پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے تھے۔

تین سال پہلے سکندر کو کینسر نے آ گھیرا تو اس کو بیٹے کی یاد ستائی۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ فلک شیر ماں پر ہوا ظلم بھولا نہیں تھا لیکن سکندر اس کا باپ تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا، سکندر کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا لیکن وہ جانے سے پہلے ساری جائیداد اور زمین فلک شیر کے نام کر گیا۔

لیکن فلک شیر نے ملازمت نہیں چھوڑی تھی، جب سے اس نے رانیہ کو دیکھا تھا، وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ وہاں صرف رانیہ کے لیے کام کرتا تھا۔

''شیرو کب تک غلامی کرتے رہو گے۔ اپنی زمینیں سنبھالو، گھر بساؤ، تم کسی سے کم نہیں ہو۔ تمہاری زمینیں سونا اگل رہی ہیں، تمہیں اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم یہ نوکری کیوں کر رہے ہو۔'' تہمینہ کو شدید حیرت ہو رہی تھی۔

''میں خود نہیں جانتا خالہ! بس اتنا جانتا ہوں جس کی خاطر یہ نوکری کر رہا ہوں، وہ کبھی نہیں ملے گی لیکن اس طرح کم سے کم وہ میری نگاہ کے سامنے تو رہے گی۔'' آخر وہ اسے حال دل سنا بیٹھا تھا۔

''کس کی بات کر رہے ہو شیرو؟'' اس نے ٹھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے حیرت سے پوچھا تو فلک شیر نے نگاہیں جھکا لیں۔

''رانیہ کی۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ تہمینہ کو کرنٹ لگا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، رانیہ سردار محسن علی کی بھتیجی اور اس کے مرحوم بیٹے کی بیوہ ہے۔

''تو کیا وہ بھی......'' وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔
''ہرگز نہیں خالہ! وہ تو اپنے ہی دکھوں میں گھری ایک معصوم روح ہے۔ یہ تو بس میرا دل ہے جو اس کے لیے بے اختیار ہے۔'' فلک شیر نے بے ساختہ اس کی بات کو رد کیا۔ یہ تو بس وہی تھا جو رانیہ کی شادی سے بھی پہلے سے اس کی چاہت دل میں دبائے خاموش تھا۔ جب رانیہ کی شادی شمشیر سے ہوئی تو اسے شدید دکھ ہوا تھا کیونکہ وہ شمشیر کی آوارگیوں سے واقف تھا۔ گو اس نے وہ سب کبھی نہیں چاہا تھا جو شمشیر کے ساتھ ہوگیا کہ اس نے ہمیشہ دل سے رانیہ کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔
''سردار کو پتا چلا تو جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے میرے بچے! مجھے تو ابھی سے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔'' وہ اس انجام کا سوچ کر گھبرا گئی تھی جو یہ بات کھلنے کی صورت میں محسن علی، فلک شیر کے ساتھ کر سکتا تھا۔
''مجھے اپنی پرواہ نہیں پر میں اسے اس جہنم سے نکالنے کے لیے مر بھی سکتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ اور دوٹوک لہجے میں بولا تھا۔

☆☆☆

''وہ لڑکی مر گئی کیا؟'' تیسرے دن سردار صاحب نے قدسیہ بوا سے پوچھ ہی لیا۔ قدسیہ نے کھانا میز پہ لگاتے' تبریز کی طرف دیکھا جو انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ وہ جو پاس بیٹھے ایک دوسرے کے اندر پل رہے درد سے ناآشنا تھے۔ انہیں کیا خبر گھر میں اس وقت کون کہاں ہے۔ صلہ کا تبریز کے کمرے میں ہونا بھی کچھ اسی طرح اب تک چھپا ہوا تھا لیکن شاید اب یہ بات مزید مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔
''وہ بہت بیمار ہے سردار صاحب۔'' قدسیہ نے سر جھکائے دھیمی آواز میں کہا۔
''حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ بہت ہوگیا آرام اب کام پہ واپس لگاؤ اسے'' قدسیہ بوا نے سر ہلایا۔ وہ تینوں اب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سب سے پہلے رانیہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف گئی۔ اس کے جاتے ہی سردار صاحب نے تبریز کو مخاطب کیا۔
''تو پھر کب نکاح رکھا جائے۔ تم اپنی مرضی بتا دو۔'' وہ یوں بولے جیسے باقی سب کچھ بھی اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے مطابق ہی کیا گیا ہو۔ تبریز نے پانی کا گلاس ہاتھ سے رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔
''میری مرضی سے تو آج تک آپ نے کبھی کچھ ہونے ہی نہیں دیا بابا۔ خیر...... جب آپ چاہیں نکاح کا وقت رکھ لیں۔ مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔'' کندھے اچکا کے وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا۔
''تو بس گھر کی بات ہے' پرسوں شام کو ہی اس فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔'' سردار صاحب نے اس کے انداز کو نظر انداز کر کے فقط جواب پہ دھیان دیا اور مطمئن سے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیچھے تبریز لب بھینچے پرسوچ انداز میں بیٹھا ان کے فیصلے کے نتائج کے متعلق سوچتا رہا۔

☆☆☆

فارینہ ہتھیلیوں پہ مہندی رچائے اس کے سوکھنے کی منتظر تھی۔ ابھی اسے پارلر بھی جانا تھا۔ گو کہ دل نہیں مان رہا تھا پر یہ ماں کی خواہش تھی اور ثمر کا بھی یہی کہنا تھا کہ اسے اپنی نئی زندگی کی شروعات اچھی امیدوں اور خوش گوار انداز میں کرنا چاہیے۔
ثمر لاؤنج میں داخل ہوا تو ماں اور بہن کو دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ذکیہ بیگم نے بیٹے کی اداس آنکھوں کو دیکھا اور پھر شکایت بھری نگاہ پاس بیٹھی بیٹی پہ ڈالی۔
''آخر کب تک یہ عشق کا جوگ لیے میری

جان جلاتا رہے گا؟ اس سے کہو فارینہ! اب اس کا سوگ ختم کردے۔ شادی کرلے۔ مجھ میں بیٹی کا غم دیکھنے کے بعد بیٹے کی اذیت سہنے کا حوصلہ نہیں بچا۔'' شاید وہ اس کے آنے سے پہلے اسی کے متعلق بات کر رہی تھیں۔ اب اسے دیکھ کر وہی شکوہ بے بسی سے دہرایا۔

جب سے فارینہ اور فیروز کا رشتہ ختم ہوا تھا ان کی زندگی سے خوشی اور سکون رخصت ہو گیا تھا، رہی سہی کسر بھائی سے ہمیشہ کے لیے تعلق ٹوٹ کر پوری ہو گئی تھی۔ لیکن چلو وہ تو اب اپنے گھر جا رہی تھی لیکن ثمر کی صورت جو مستقل سزا ان کا مقدر بن گئی تھی وہ انہیں عاجز کر رہی تھی۔

''میری شادی آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے امی! پھر کیوں ہر بار اسے ہمارے درمیان لے آتی ہیں۔ آپ کے کہنے پہ، فارینہ کی خاطر میں نے صلہ کو اس موت کے کنویں میں دھکیل دیا جہاں سے وہ کبھی باہر نہیں نکل سکتی تو پھر اب یہ زور زبردستی اور جذباتی بلیک میلنگ کس لیے؟'' وہ غصے میں نہیں تھا، نہ ہی ان سے بدتمیزی کر رہا تھا پر اس کا لہجہ مضبوط تھا جیسے وہ فیصلہ کر چکا ہے اور اب اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

''اتنے سال بعد بھی تمہیں صلہ کی فکر ہے ثمر! اپنی ماں کی نہیں؟'' وہ شکایتی انداز میں بولیں۔ فارینہ سے اب خاموش نہیں رہا گیا تھا۔

''بس کر دیں امی! آپ نے اپنی اولاد کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ میری شادی کے وقت آپ کو بھائی عزیز تھا پھر فیروز کو بچانے کے لیے آپ نے بھی ماموں کی طرح بے حسی اوڑھ لی۔ دو گھر برباد ہو گئے۔ میرا اور فیروز کا رشتہ بچا، نہ ہی میرا بھائی خوش رہ پایا اور آج بھی آپ کا رویہ وہی ہے۔''

جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ فراموش کر بھی دیتی پر صلہ کے ساتھ ہوئی زیادتی کے بعد تو جیسے اسے فیروز سے نفرت ہی ہو گئی تھی۔ کیا قصور تھا اس معصوم کا جسے ایسے فرسودہ رواج کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور پھر پلٹ کر کبھی اس کی خبر تک نہ لی۔ ایسے میں ثمر کی خالی زندگی اسے تڑپاتی۔ وہ جانتی تھی ثمر ایسا کبھی نہیں ہونے دیتا اگر فیروز اس کا شوہر نہ ہوتا۔ ماں کے حکم نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔

''فارینہ تم چپ رہو۔ امی کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بھی جو ہو چکا، اسے دہرانے سے کیا حاصل ہوگا۔'' ثمر نے اسے ٹوکتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا آج اس خوشی کے موقع پہ کسی کا بھی دل برا ہو۔

''امی پلیز...... یہ وقت میری شادی ڈسکس کرنے کا نہیں ہے۔ آپ فارینہ کے لیے دعا کریں بس۔ الطاف بہت اچھا آدمی ہے اور میرے اچھے دوستوں میں سے ایک ہے۔'' ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دیتے اس نے دھیمے انداز میں سمجھایا۔

''لیکن ثمر! مجھ سے وعدہ کرو، فارینہ کے نکاح کے بعد تم بھی شادی کر لو گے بیٹا۔ میں مرنے سے پہلے تمہارے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ التجائیہ بولیں تو ثمر کا انکار اس کے اندر ہی دم توڑ گیا۔ ماں کی حسرت بھری التجا پہ وہ فقط سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا کہ وہ بھی اس کے دل کی حالت نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ سر کے اشارے سے انہیں تسلی دیتے اس نے ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔

''اب تو سہرا پہننے کا رواج ہی نہیں رہا لیکن خیر...... اس بارے میں فارینہ کی شادی کے بعد بات ہوگی۔ ابھی تو آپ یہ بتائیں ماموں کی طرف کب جانا ہے؟'' اس کے جواب نے جہاں ذکیہ بیگم کو مطمئن کیا تھا وہیں اس آخری بات پہ وہ کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔

''ان حالات میں؟'' وہ تشویش سے بولیں۔
اب جب آج رات فارینہ کا نکاح تھا تو یہ خبر ان سب سے چھپی کہاں ہوگی۔ دلوں کی کڑواہٹ اور بھی بڑھ چکی ہوگی تو وہ کس طرح اس گھر میں قدم رکھتیں۔
''روزینہ ممانی بہت زیادہ بیمار ہیں امی! ان کی عیادت کو نہ جانا زیادتی ہوگی۔''
ثمر کے سمجھانے پہ سر ہلاتے انہوں نے فارینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ان کے کندھے کے گرد بازو ڈالتے سر اثبات میں ہلایا۔ بیٹی کی آنکھوں میں جھلکتا پیغام پڑھ کر ان کے دل کو اطمینان ہوا تھا۔ سچ ہے اللہ نے ان کی اولاد کو ان سے بڑھ کر ظرف دیا تھا جو اپنے درد کو بھول کر ان کی پریشانی پہ غمگین ہو رہے تھے۔

☆☆☆

''صرف ایک بار محسن علی...... اس کی ماں مرنے سے پہلے ایک بار اسے دیکھنا چاہتی ہے۔''
رفیق احمد بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ان کے ڈیرے پہ کھڑے تھے۔ بے حد مجبوری میں انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ ڈاکٹروں نے روزینہ بیگم کو جواب دے دیا تھا۔ صبح شام ان کے لبوں پہ ان دنوں بس ایک ہی فریاد تھی کہ وہ مرنے سے پہلے صلہ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔
''شاید تم ہماری شرط بھول گئے رفیق احمد! ہم نے اسی وقت کہا تھا تمہارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پھر کیا سوچ کر ہمارے دروازے پہ چلے آئے۔'' رعونت سے کہتے سردار صاحب نے اپنا انکار ان کے منہ پہ مارا تھا۔
''مجھے سب یاد ہے، اپنا وعدہ بھی اور اپنی معصوم بیٹی کے ساتھ ہوا ظلم بھی، پر کیا کروں، اس مرتی ہوئی عورت کی التجا مجھے تمہارے در پہ بھکاری بنا لائی ہے۔ میرے کاسے میں ہماری بیٹی سے ایک ملاقات بھیک کی صورت ڈال دو سردار۔''

التجائیہ کہتے وہ آبدیدہ ہوئے کہ انہیں کیا بتاتے انہیں تو اب ان کی برداشت سے بڑھ کر سزا مل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ محسن علی انہیں دھتکارتے یا ان پہ کوئی اور زہر بھرا جملہ پھینکتے تبریز بول پڑا۔
''صلہ آپ کے ساتھ ضرور جائے گی۔''
رفیق احمد کے آنے کی اطلاع پا کر وہ فوراً ڈیرے پہ پہنچا تھا۔ ساتھ فلک شیر بھی تھا۔ باپ کا جواب تو وہ دروازے پہ کھڑا سن چکا تھا۔ وہاں موجود کسی بھی شخص بشمول سردار محسن علی کے تاثرات کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر رفیق احمد کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔
''تبریز......!'' محسن علی غصے میں چلائے۔
تبریز نے پیچھے مڑ کر سنجیدہ نظروں سے ان کو دیکھا۔ وہ خاموش تھا پر انداز سردار صاحب کو بہت کچھ جتا گیا تھا۔
''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' رفیق احمد کے کندھے پہ ہاتھ رکھے وہ انہیں اپنے ساتھ باہر لے آیا پیچھے سردار صاحب مٹھیاں بھینچے تڑپ کر رہ گئے۔

☆☆☆

رفیق احمد کو نیچے بٹھا کر وہ اوپر کمرے میں چلا آیا۔ صلہ صوفے پہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ تبریز کو دیکھ کر اس نے ایک پل کو سر اٹھایا اور پھر دوبارہ نگاہیں کتاب پہ جھکا لیں۔ ایک وقت تھا کہ مصروفیت سارا دن سر نہیں اٹھانے دیتی تھی اور اب یہ عالم کہ فرصت کے باعث دل بیزار رہتا تھا۔ تبریز نے تو اسے ایک کمرے میں قید کر رکھا تھا جہاں سے نکل کر وہ بس ٹیرس تک ہی جا سکتی تھی۔ وہ باہر جاتا تو کمرہ مقفل کر جاتا۔ دن میں دو تین بار قدسیہ بوا ہی اسے کھلانے پلانے چلی آتیں۔ ان ہی سے صلہ نے اپنی کچھ کتابیں منگوا لی تھیں۔ گزرے چار دن اس نے اس بند کمرے میں گزار تو لیے تھے لیکن

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا آخر مزید اسے یہاں کب تک ایسے ہی رہنا ہوگا۔ یہ خوف بھی تھا کہ رانیہ یا سردار صاحب کو معلوم ہوگیا تو وہ یقیناً اسے جان سے ماردیں گے۔

''نیچے تمہارے والد آئے ہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے۔'' اس نے آتے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

''میرے ابا؟'' صلہ نے بے یقینی سے سوال کیا۔ یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی ورنہ وہ لوگ تو اسے بھول چکے تھے۔

''تمہاری امی کی طبیعت بہت خراب ہے' وہ ان لمحوں میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔'' تبریز نے بتایا۔ صلہ کو لگا ان لفظوں نے دل پہ کسی برچھی کا سا وار کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ تبریز خاموش سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

''ان سے اب میرا کیا رشتہ؟'' اچانک وہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''خون کے رشتے ایسے ہی ختم نہیں ہوجاتے صلہ۔ جاؤ، ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ پہلے ہی تکلیف میں ہیں' ان کی اذیت میں مزید اضافہ مت کرو۔'' اس کے پاس صوفے پہ بیٹھتے ہوئے تبریز نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ صلہ بس دیکھتی رہ گئی اس بار اس کی مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ دل ماں کی محبت میں بے قرار ہورہا تھا۔ بے اختیار چند آنسوؤں کی بوندیں چھلک کر تبریز کے ہاتھ کی پشت پہ آگریں۔

''چلو اب اٹھو۔'' اس نے ایک بار پھر کہا۔

صلہ نے کتاب سائیڈ پہ رکھ کر جلدی سے وہ گرم شال لپیٹی جو تبریز اس کے لیے لایا تھا اور اس کے کہنے پہ باہر چلی آئی۔ باہر کوریڈور میں تبریز کو دیکھ کر قدسیہ بوا اس کی طرف لپکیں یوں جیسے اسی کے پاس آرہی ہوں۔

''وہ سردار صاحب کہہ رہے ہیں قاضی صاحب کو بلاوہ بھیج دیا ہے۔ وہ وقت پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی تیار رہیے گا۔''

صلہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تبریز اس سے لاپروا قدسیہ بوا کی طرف متوجہ تھا۔ یعنی چند روز پہلے کیے جانے والے فیصلے پہ عمل کا وقت آچکا تھا۔

''میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ آپ بابا کو کہیں، وہ بے فکر ہوجائیں۔'' تبریز نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے صلہ کو دیکھا جو زرد چہرے کے ساتھ کھڑی ان دونوں کو بے یقینی سے تک رہی تھی۔ ایک دم وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ سوچ کر تبریز بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

قدسیہ بوا رانیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

یہاں اس نے اپنی زندگی کے سولہ سال گزارے تھے۔ اس کی ہنسی اور قہقہے اس گھر کی فضاؤں میں گونجا کرتے تھے۔ بچپن کی ناسمجھی سے شعور کی دہلیز تک کا سفر اسی آشیانے میں کٹا تھا اور پھر ایک دن ڈولی کے نام پر اس کا جنازہ اٹھا۔ وہ وقت جب ماں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے اس نکاح کی بابت بتایا تھا اور پھر اس کے بھائی کی خاطر یہ موت کا پیالہ پینے کی التجا کی تھی۔

بیٹیاں تو باپ کی عزت کے لیے جان دے دیتی ہیں، بہنیں اپنے بھائیوں پہ قربان ہوجاتی ہیں پھر وہ تو بس اس کی شادی کررہے ہیں۔

یہی کہا تھا اس دن صلہ سے روزینہ بیگم نے اور وہ بس بے یقینی سے ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ کیا سب حق بیٹوں سے ہی منسوب ہوتے ہیں۔

بیٹیوں کی خوشیاں، ان کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاکر وہ کمرے سے

چلی گئی تھیں۔ پھر اسے تبریز کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے انہوں نے اسے گلے لگانا چاہا تو اس کا جسم کسی لاش کی مانند سرد اور بے حس تھا۔ وہ روئی تھی نہ کوئی فریاد کی تھی۔ آج برسوں بعد اس نے دوبارہ اس گھر میں قدم رکھا تھا پر نہ وہ مانوس احساس تھا جو کبھی اس در و دیوار سے منسوب تھا اور نہ ہی رشتوں کی مہک۔

سر جھکائے وہ باپ کے ہمراہ ماں کے کمرے میں چلی آئی تھی اور چپ چاپ ان کے بستر کے سامنے رکھی کرسی پہ جا کر بیٹھ گئی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے پاس بلایا تو وہ اجنبیوں کی طرح ان کے پاس جا بیٹھی کہا کچھ نہیں۔

ذکیہ بیگم اسے سینے سے لگائے بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہیں مگر صلہ ایک لفظ نہ بولی۔ وہ اپنے حصے کے آنسو بہا چکی تھی۔ نڈھال سی روزینہ بیگم نے سر پیچھے تکیے پہ ٹکا دیا۔ صلہ نے دیکھا، وہ بے حد کمزور نظر آرہی تھیں۔ وہ خود بھی تو کتنی بدل چکی تھی۔ روزینہ بیگم ایک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔

وہ کس حال میں تھی، وہ نہیں جانتی تھیں لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں بیٹی کے ساتھ کیا ظلم چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس وقت صلہ کی آنکھوں سے جھانکتی حیرت اور بے یقینی آج بھی انہیں بھلائے نہ بھولتی تھی پر وہ مجبور تھیں۔ اس کی خاموشی نے اس وقت انہیں تکلیف پہنچائی تھی مگر پھر بیٹے کو صحیح سلامت گھر واپس دیکھ کر جیسے صلہ سے ہوئی ہر زیادتی کا ازالہ ہوا تو ملال بھی دل سے رخصت ہوا مگر یہ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ رفیق احمد نے یہ ساری تکلیف بیٹی کی جھولی میں فقط اس لیے ہی تو ڈالی تھی تاکہ انہیں اپنا وارث سلامت چاہیے تھا۔ آخر فیروز سے ہی تو ان کا خاندان ان کی نسل — آگے بڑھنی تھی۔

فیروز سے فارینہ کی شادی کے دو ڈھائی سال تک روزینہ بیگم گھر میں بچے کی قلقاریاں سننے کو ترستی رہیں۔ پوتا پوتی کی خوشی دیکھنے کی خواہش دن رات ان کے اندر کروٹیں بدلتی۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم بھی بیٹی کی خالی گود بھرنے کی آس دل میں لیے اسے اب تک کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکی تھیں۔ علاج کیا ہوتا کہ جب کوئی نقص ہی نہیں تھا۔ فارینہ کی زندگی سے روشنی وقت کے ساتھ ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ فیروز تو اسے ویسے بھی کبھی اچھا نہیں لگا تھا پھر بھی اس نے اپنے طور پر اس رشتے کو نبھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ حالانکہ صلہ کی شادی پہ اسے ان سب سے شکایت تھی کہ اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا پھر بھی ماں کے کہنے پہ وہ بھی بھائی کی طرح ہونٹوں پہ تالا لگائے رہی۔ خود روزینہ بیگم کی شکایت بھی ان کے رویے سے جھلک رہی تھی۔ آخر کب تک وہ اس کے خالی دامن کے ساتھ بندھے رہتے۔ فارینہ کی زندگی کا خالی پن بھی حد سے بڑھ چکا تھا۔

ان حالات میں فیروز اور فارینہ کے درمیان بڑھتی خلیج نے ایک دن ان دونوں کے رشتے کو بھی مٹا ڈالا۔ دو سال پہلے فیروز نے فارینہ کو طلاق دے دی تھی۔ ذکیہ بیگم تو پہلے ہی فارینہ کے حالات سے ادھ موئی ہو رہی تھیں، اب اس کا گھر آ بیٹھنا انہیں جیتے جی مار گیا تھا۔

دوسری طرف روزینہ بیگم نے اس بار بہو میکے سے لانے کا فیصلہ کیا اور اپنی بہن کی بیٹی سے فیروز کی شادی کر دی۔ ڈیڑھ سال بعد بھی حنا کی جھولی اولاد کی خوشی کو ترستی رہی تو مجبوراً بہت زور زبردستی اور تقریباً ہر ڈاکٹر کے تقاضے کے بعد فیروز نے اپنا معائنہ کروانے کی ہامی بھری۔

اس وقت آسمان ان سب کے سر پہ گرا تھا۔ جب پتا چلا کہ فیروز باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ دوسرے لفظوں میں رفیق احمد کا وارث ان کی نسل

آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ حنا اس خبر کے بعد میکے چلی گئی تھی اور پھر وہیں سے اس نے خلع کا کیس دائر کر دیا۔ گھر کی ویرانی روزینہ بیگم کو دن رات ادھ موا کر رہی تھی۔ رفیق احمد الگ ان سے نظریں نہیں ملا پاتے تھے اور فیروز تو جیسے دنیا کی ہر شے سے بے خبر ہو گیا تھا۔ تینوں کا احساسِ ندامت صلہ سے جڑا تھا۔

روزینہ بیگم اس کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ اپنی آپ بیتی سنا رہی تھیں۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ان کے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ کیا اسے افسوس کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا تھا۔ خود اس کی اپنی زندگی بھی تو اس سے بڑھ کر تکلیفوں سے آراستہ تھی۔

''تم خوش تو ہو نا صلہ؟'' روزینہ بیگم کو اب اس کا خیال آ ہی گیا تھا۔

خوشی؟ صلہ اس لفظ کا مطلب تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی، اس کی خوشیاں تو اس کے اپنوں نے چھین لی تھیں۔ اب تو بس زندگی تھی جو سانسوں کی مجبوری کے تحت گزر رہی تھی۔ ہاں چند روز پہلے اس کی زندگی میں ایک طوفان کی آمد ہوئی ہے۔ سرونٹ کوارٹر سے تبریز کے کمرے کا سفر طوفان سے کم تو نہیں۔ وہ اسے رحم سمجھے یا التفات، کرم سمجھے یا ظلم...... لیکن اس سے آگے یہ ریلا اب اسے کہاں بہا کر لے جانے والا تھا۔

گھر سے نکلتے وقت اس نے قدسیہ کی زبان سے جو باتیں سنیں اس کے بعد تو اب یقیناً اسے واپس اپنے کوارٹر میں ہی جانا ہوگا۔ صلہ کا ذہن گھڑی کی سوئیوں میں الجھ گیا تھا۔ روزینہ بیگم اب تک اس کے جواب کی منتظر تھیں۔

''صلہ'' اس کی خاموشی سے گھبرا کر انہوں نے اس کے گال کو چھوا۔

''خوش ہوں۔'' اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔ اس نے چونک کر ماں کو دیکھا اور پھر نظریں چرائے آہستہ سے کہا۔ روزینہ بیگم کو اس کے جواب نے مطمئن کیا تھا یا نہیں اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ ان کے پاس تقریباً چار گھنٹے رہی تھی۔ پھر رفیق احمد ہی اسے واپس چھوڑ آئے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکل رہی تھی جب ثمر، ذکیہ بیگم کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ان دونوں کو اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ خود ذکیہ بیگم بھی حیران تھیں۔ سب سے بڑھ کر تو حیرت رفیق احمد کو تھی جو بہن اور بھانجے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ فیروز اور فارینہ کی طلاق کے بعد ان بہن بھائی کے درمیان بھی تعلقات ختم ہو گئے تھے۔

الطاف، ثمر کے ساتھ ہی پولیس میں تھا اور اس کا اچھا دوست تھا۔ ایک حادثے میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر ڈیڑھ سال تھی۔ وہ بچے کی خاطر شادی کرنا چاہتا تھا۔ ثمر کو لگا اگر فارینہ کو اعتراض نہ ہو تو وہ الطاف سے اس سلسلے میں بات کر سکتا ہے۔ فارینہ جانتی تھی اس کی ماں کتنی پریشان ہے اس کی وجہ سے، یہی سوچ کر اس نے ایک بار پھر گھر بسانے کی ہامی بھر لی تھی۔

ثمر کے کہنے پر ذکیہ بیگم سب کچھ بھلا کر بھاوج کی آج خبر گیری کو پہنچ گئی تھیں۔ رفیق احمد انہیں لیے روزینہ بیگم کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ پیچھے لاؤنج میں ثمر اور صلہ تنہا تھے۔ وہ تو رخ موڑے کھڑی باپ کی منتظر تھی اور ثمر یک ٹک اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ برسوں سے وہ ایک لاحاصل انتظار میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے احساس کے ساتھ زندہ تھا اور آج وہ احساس خاموش تصویر کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی خیریت ہی دریافت کر لیتا۔ وہ چادر کا پلو مروڑتی اس کی

موجودگی سے پریشان تھی۔
''مجھے معاف کر دینا صلہ! میں مجبور تھا۔''
ثمر کی آواز پہ چونک کر صلہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی جذبہ تھا جو آج بھی اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا جب آخری بار ثمر کی صلہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ صلہ کے لیے وہ لمحے اب کہیں دور رہ گئے تھے۔ اس وقت وہ اگر اپنی کم سنی کے سبب ثمر کے احساسات کو سمجھ نہیں پائی تھی تو آج اس کا شعور اسے ان جذبوں سے نابلد رہنے کی تنبیہہ کر رہا تھا۔
''میں سب کو معاف کر چکی ہوں ثمر بھائی! اللہ نے میرے نصیب میں یہی لکھا تھا اور میں اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں۔'' صلہ انتہائی سنجیدگی سے بولی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی داخلی دروازے کی طرف چلی گئی۔ پیچھے ثمر چند پل اداس نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر روزینہ بیگم کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

فلک شیر کا نام تبریز کی زبان سے سن کر سردار صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ ایک معمولی ملازم سے وہ رانیہ کا نکاح کر رہا تھا اور انہیں عین وقت پہ اس بات کی اطلاع دی جا رہی تھی وہ بھی قاضی اور گواہان کی موجودگی میں۔
اہانت کے شدید ترین احساس کے زیرِ اثر سردار صاحب ہال سے نکل کر پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔ پیچھے تبریز نے ان لوگوں کو نکاح کی رسم مکمل کرنے کا کہا اور خود باپ کے پیچھے چلا آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنا ضبط کھو کر اسے برا بھلا کہنے لگے۔ انتہائی سنگین الفاظ میں انہوں نے اسے کچھ بہت برا ہو جانے کی دھمکی دی تھی۔ تبریز نے بڑے تحمل سے ان کی ہر بات سنی تھی اور پھر سنجیدہ مگر دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔
''میں نے آپ کو اپنا فیصلہ اسی دن سنا دیا تھا بابا! رانیہ بھابھی سے شادی میں کبھی نہیں کر سکتا۔ باقی آپ کا مجھ سے شکوہ بجا ہے کہ میں نے آپ کو اس فلک شیر کے متعلق پہلے آگاہ نہیں کیا۔ میں مجبور تھا کیونکہ اگر آپ جان لیتے تو یہ شادی نہ ہونے دیتے۔'' تبریز کا دھیما پن ان کے اشتعال کو کم نہیں کر پایا تھا۔
''رانیہ کی شادی والی بات تم نے ہی شروع کی تھی۔ اب اگر تم راضی نہیں تھے اس سے شادی کرنے کو تو کیا کسی بھی ایرے غیرے، اٹھائی گیرے سے اس کا نکاح کر دو گے؟ وہ دو کوڑی کا ملازم میرے خاندان سے رشتہ جوڑے گا۔'' ان کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ماتھے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ کمرے میں چکر لگاتے وہ اب زور زور سے سانس لے رہے تھے۔ ایک دم وہ بیڈ پہ بیٹھ گئے۔ تبریز بھاگ کر ان کے پاس آیا اور ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ انہوں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
''دور رہو مجھ سے...... سردار محسن علی ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اسے تم جیسے آستین کے سانپ کا سہارا لینا پڑے۔'' اس حالت میں بھی وہ پھنکارے تھے۔
''میں جانتا ہوں بابا! اس وقت آپ کو مجھ سے شدید نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کہیں گے تو میں آج ہی یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن بابا! خدا کے لیے اب یہ ظلم بند کر دیں۔ شاید اسی طرح ان گناہوں کا ازالہ ہو جائے۔''
چند روز پہلے ہی تبریز کو فلک شیر کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد اسے اس زیادتی کا علم ہوا تھا جو اس کے باپ نے فلک شیر کے ساتھ کی تھی۔ اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ کیا ان کے لالچ کی کوئی حد بھی تھی۔؟؟ پہلے رانیہ، پھر صلہ اور اب فلک شیر والا قصہ...... جانے ابھی اور کتنے لوگوں کی آہوں کا بوجھ تھا جو وہ اپنے سر پہ لادے پھر

رہے تھے۔

"تم ابھی کے ابھی اس نکاح کو رکواؤ ورنہ پھر انجام کی شکایت مجھ سے مت کرنا۔" وہ باقاعدہ اسے دھمکی دے رہے تھے۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، تبریز اس کام کے لیے فلک شیر کو چنے گا۔ خود تبریز بھی چند روز پہلے تک کہاں جانتا تھا کہ فلک شیر، رانیہ کو پسند کرتا ہے اور اس کی خاطر یہ غلامی کا طوق گلے میں ڈالے وقت گزار رہا ہے۔

فلک شیر کی باتوں سے اس کا ماتھا ٹھنکا تھا اور پھر جب اس نے ٹوہ لگائی تو بات کھل کر سامنے آ گئی۔ وہ رانیہ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا سو اس نے اس کی مرضی بھی پوچھ لی۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ پائی پر جب تبریز نے اسے سردار صاحب کے دماغ میں پلتی سوچ کے متعلق بتایا تو وہ مان گئی تھی۔

تبریز سے شادی والی بات اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ خود بھی یہ رشتہ نہیں چاہتی تھی پر اس گھر میں کسی کو اس کی مرضی جاننے کی پرواہ تھی بھی کہاں۔

رانیہ جانتی تھی تبریز راضی نہیں مگر ایسا سردار صاحب فقط اس کی جائیداد کے لیے کرنا چاہتے ہیں، یہ جان کر اسے تکلیف ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ وہ محسن علی کو اپنے باپ سے بڑھ کر سمجھتی تھی۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتنی زیادتی کر سکتے ہیں۔ ان کی خوشی کی خاطر وہ اپنی تمام عمر اس گھر میں زندہ لاش بن کر گزار سکتی تھی پر وہ اسے بیٹی تو سمجھتے۔

اس نے تبریز کو سردار صاحب کے خلاف جانے سے روکا تھا پر تبریز نے اسے سمجھایا کہ اب وقت آ چکا ہے ہر غلطی کو درست کرنے کا۔ فلک شیر کو اس کی چاہ ہے نہ کہ اس کے مال و دولت کی اور وہ اس کے خلوص کی قدر کرے۔ رانیہ نے ہاں کر دی تھی اور آج سردار محسن علی کے طے کردہ وقت پر رانیہ کا نکاح تبریز کے بجائے فلک شیر سے ہو رہا تھا۔ تبریز نے عین موقع پر یہ انکشاف کر کے سردار محسن علی کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ غصے میں آگ بگولا وہاں سے چلے گئے تھے

تبریز ان کا غصہ نظر انداز کر کے اور بنا جواب دیے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ ہال میں موجود ہر شخص کے چہرے پہ پریشانی تھی۔ فلک شیر نے اس کو دیکھا۔ اس نے نکاح خواں کو روک رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی وجہ سے تبریز پہ عتاب آئے۔

تبریز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فلک شیر کو تسلی دی۔ اگلے چند منٹوں میں ایجاب و قبول ہو چکا تھا۔ فلک شیر ابھی رانیہ کو لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ان کے ساتھ تبریز بھی تھا۔ شاید وہ ان دونوں کو سردار صاحب کی دسترس سے دور کسی محفوظ مقام پہ بھیجنا چاہتا تھا اسی لیے ان کو چھوڑنے اسٹیشن گیا تھا

تبریز کی یہ حرکت سردار صاحب کی روح کو بھسم کر رہی تھی۔ انہیں کسی طور سکون نہیں آ رہا تھا۔ اب وقت آ پہنچا تھا کہ سردار محسن علی اسے اپنا اصل روپ دکھائیں۔ ان کے فیصلے کے خلاف جانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے اور یہ کہ کل اختیارات فقط ان ہی کو حاصل ہیں، یہ اب تبریز کو باور کرانا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

صلہ نے جب گھر میں قدم رکھا تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ گھر کے در و دیوار پہ گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی تھی جو اس سے پہلے کبھی بھی اس نے یہاں محسوس نہیں کی تھی۔ لاؤنج کی سب لائٹیں بند تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے حتیٰ کہ ملازم بھی نہیں تھا۔ آخر سب کہاں جا سکتے تھے۔

اس نے قدم اوپر کی منزل کی طرف بڑھائے پر اچانک اسے قدسیہ بوا اور تبریز کی بات یاد آئی۔ آج تو تبریز اور رانیہ کا نکاح تھا۔ آج کے بعد زندگی اس پر اور بھی تنگ ہونے والی تھی۔

سر جھکائے وہ پچھلے احاطے میں آگئی۔ سردی کی وجہ سے یہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ سب دروازے بند تھے البتہ ایک زرد بلب کی مدھم سی روشنی وہاں کے اندھیرے میں دراڑ ڈالتی تھی۔

صلہ نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ وہی سیاہ دیواریں، وہی تنہائی، روشنی تو اس وقت تبریز کے کمرے میں ہوگی۔ رانیہ کے روپ کی روشنی......

اس کا ذہن بس اسی ایک نقطے پہ جا اٹکا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ اپنے بستر پہ بیٹھ گئی۔ درد کا شدید احساس تھا جو اس وقت آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔

وہ چند روز جو تبریز کے کمرے میں گزرے۔ اس کا صلہ کی طرف جھکاؤ، اس کی وہ مہربانیاں۔ ایک ایک پل صلہ کو یاد آنے لگا تھا۔ اگر راستے جدا تھے تو پھر اس کی طرف کیوں آیا تھا وہ؟

تکیے میں منہ دیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ ایک بار پھر یہ رونا ہی اس کا مقدر ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے سے وہ بستر پہ بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی آنکھوں اور دماغ کے سوا جسم کا ہر حصہ بے حرکت ہو چکا تھا۔ رانیہ اور فلک شیر کو قتل کروانے کا فیصلہ کرتے ہی سردار محسن علی نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ غصے اور اہانت سے اپنے بے قابو ہوتے اعصاب کے ساتھ انہوں نے نمبر ملایا پر تب تک ریسیور ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑائے اور اپنی پوری کوشش کے باوجود خود کو گرنے سے بچا نہ پائے۔

گھر کے ملازم نے انہیں سنبھالا اور پھر تبریز اور ڈاکٹر کو ایک ساتھ کال کر کے بلایا۔ رانیہ اس وقت فلک شیر کے ساتھ جا چکی تھی۔ تبریز بھاگم بھاگ گھر پہنچا اور ڈاکٹر کے ساتھ انہیں اسپتال لے آیا۔ سردار محسن علی کو شدید اعصابی تناؤ اور خطرناک حد تک بلڈ پریشر بڑھ جانے کے باعث فالج کا شدید ترین اٹیک ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ بے جان ہو گیا تھا۔

ڈاکٹروں نے تبریز کو کوئی امید نہیں دلائی تھی۔ اس وقت سے وہ مسلسل ان کے پاس ہی تھا۔ تبریز کو ان کی بے بسی تکلیف دے رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیجیے گا بابا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ روزِ حشر میرا باپ غاصب کہلائے۔'' بہت دیر ان کے پاس بیٹھا وہ ان سے معافی مانگتا رہا۔

انہیں چند روز بعد ڈسچارج کیا جانا تھا کہ ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور اس سے زیادہ ڈاکٹر ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اپنی بقیہ سانسیں انہیں اسی حالت میں بستر پر گزارنی تھیں۔

☆☆☆

جانے کتنے زمانوں بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ کتنی ساعتوں بعد اسے ہوش آیا تھا، خود اسے بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا وہ اپنے کمرے میں تھی جب اپنے حال پہ روتے روتے اور مستقبل کے خوف کے زیرِ اثر اسے شدید کپکپی محسوس ہوئی تھی۔ جسم آگ سا تپنے لگا تھا۔ گھر میں کوئی اس کی واپسی کے متعلق نہیں جانتا تھا سوائے چوکیدار کے جس نے اسے میں گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تھا۔

سب ملازم سردار صاحب کی وجہ سے پریشان تھے تو خود تبریز کون سا گھر پہ تھا۔ لیکن جب وہ گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ تھکن سے خود اس کا

اپنا برا حال تھا مگر صلہ کو کمرے میں نہ پا کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ قدسیہ بوا سے پوچھا تو انہوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تبریز کو شدید حیرت ہوئی تھی۔ تو کیا صلہ واپس نہیں آئی؟

اپنے شبہے کی تصدیق کرنے وہ اس کے کوارٹر کی طرف گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ بہت بار دستک کے باوجود جب نہ کھلا تو مجبوراً توڑنا پڑا۔ اندر وہ بخار میں پھنکتی بے ہوش پڑی تھی۔ ملازم بند دروازہ دیکھ کر یہی سمجھتے رہے کہ اندر کوئی نہیں ہے کیونکہ صلہ تو کئی روز سے وہاں تھی ہی نہیں۔

اس کی آنکھیں اب بھی بوجھل ہو رہی تھیں کہ پلکیں بمشکل اٹھائے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہی کمرہ، وہی بستر، پر وہ خود کہاں تھی؟ صلہ نے دائیں طرف پڑے خالی صوفے کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر سستی سے بائیں طرف کروٹ بدلی۔ اور جامد رہ گئی۔ آنکھوں پہ بازو ٹکائے تبریز اس سے کچھ فاصلے پہ لیٹا تھا۔ شاید وہ سو رہا تھا۔ صلہ نے کہنی کے بل اٹھنا چاہا۔ گو کوئی آہٹ نہیں ہوئی پر شاید وہ گہری نیند میں نہیں تھا اسی لیے چونک کر صلہ کو دیکھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا، اب تم وہاں نہیں بلکہ یہاں رہو گی۔ میرے کمرے میں۔''

کروٹ کے بل لیٹے اس نے غصے سے کہا تھا۔ اس کی آواز میں نیند کا بھی خمار تھا۔ وہ جو کہنی تکیے پہ ٹکائے اٹھنا چاہتی تھی، اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہیں کی وہیں رہ گئی۔

''پر یہ کمرہ تو آپ کی بیوی کا ہے۔'' خود اپنی آواز اسے کہیں دور سے سنائی دی تھی۔

''اسی لیے تو تمہیں یہاں رکنے کو کہا تھا۔'' وہ زچ ہوا۔ کب سے جاگ رہا تھا' اس پہ اسپتال اور بابا کی طبیعت کو لے کر پریشانی الگ۔ باقی کی کسر صلہ نے پوری کر دی تھی۔ ذہن شدید بوجھل تھا۔

''تو پھر رانیہ کہاں رہیں گی؟'' معصومیت سے کہتے ہوئے اس نے تبریز کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

''رانیہ میرے کمرے میں کیوں رہے گی صلہ وہ تو......'' بے ساختہ کہتے ہوئے وہ ایک دم رکا۔ صلہ کا مسئلہ اس کی سمجھ میں اب آیا تھا۔

''اف میرے اللہ! احمق لڑکی! کچھ بھی طے کرنے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لیا کرو۔''

''پرسوں نکاح تھا نا آپ دونوں کا۔'' صلہ انگلیاں مروڑتی دھیمی آواز میں بولی۔ وہ دونوں اب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''ایک بیوی سنبھالی نہیں گئی اور دوسری شادی کر لوں۔'' استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے اس نے صلہ کو دیکھا۔

اس کے برعکس وہ اب بھی سنجیدہ اور ڈری ہوئی تھی۔ تبریز نے اسے اول تا آخر سب کہہ سنایا۔ رانیہ اور فلک شیر کی شادی سے لے کر سردار محسن علی کی موجودہ حالت تک۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا، میری لاپروائی کے سبب ایک طویل عرصہ بڑی تکلیف میں گزارا ہے تم نے۔ بابا کے غلط فیصلوں نے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کو اذیت پہنچائی۔ قصور میرا بھی نہیں۔ لیکن اب میں اپنی ہر غلطی کا ازالہ کروں گا۔

صلہ نے اس کے سنجیدہ اور پُرسوچ چہرے کو دیکھا۔

''تمہیں یہ رشتہ کسی جبر کے تحت کیے گئے فیصلے کی بنا پر گزارنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوری عزت اور مان سے تمہارا حق تمہیں دے کر زندگی اپنی مرضی سے شروع کرنے کا اختیار دیتا ہوں۔ تم جانا چاہو تو......''

وہ بولتے بولتے رکا تھا۔ صلہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ اچانک اس کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

''اتنے سالوں سے یہاں ہوں۔ واپسی کا در بند تھا تو پر کٹے پرندے کی مانند آزادی کا تصور

اور چاہ بھی ختم ہوگئی۔ اب سوچتی ہوں، کہاں جاؤں گی۔" کچھ دیر سوچ کر لبوں پہ ابھرتی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی حالت کا تجزیہ کیا۔

کیا اس گھر میں واپس جاسکتی تھی جہاں اب کچھ بھی اپنا نہیں تھا۔ میکے کا وہ مان کہ کوئی ہے جو پیچھے اس کی راہ تکتا ہوگا یا پھر اس کی تکلیف پہ دوڑا چلا آئے گا۔ یہ احساس تو کبھی اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اب اتنے سالوں بعد ماں باپ سے مل کر، اس گھر میں واپس جا کر بھی اسے وہاں لوٹنے کی خواہش نہیں تھی۔

"تو مت جاؤ صلہ! مجھے ایک موقع دو ہمارے رشتے کو سدھارنے کا۔ اس رشتے سے آزادی کی چاہ اگر تم میں باقی نہیں تو یقین مانو، میرا وجود بھی اشعوری طور پہ اس تعلق میں جکڑا ہے۔ چاہے ان چاہے میں بھی خود کو تم سے جدا نہیں کر پایا ورنہ گئے نوں میں بارہا سوچا کہ کب تک یوں تنہا زندگی گزاروں گا۔ جب بھی شادی کے متعلق خیال آیا، ہمارا تصور میری سوچ پہ غالب آگیا۔"

تبریز نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ صلہ نے پہلی بار سے اتنا جذباتی ہوتے دیکھا تھا کہ اس کے ہاتھوں تپش روح تک سفر کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں ادیکھ رہا تھا۔ اس کے دل پہ دستک دے رہا تھا۔

"جب بھی کبھی میرا دل دکھتا تھا، مجھے تکلیف تی۔ میں دل میں آپ سے شکوہ کرتی اور ہر بار ے اپنے اندر نفرت کا احساس ابلتا محسوس ہوتا کہ ری ان تکالیف کا سرا آپ کی ذات سے جڑا تھا۔ پ کو ٹھیک سے دیکھا تھا نہ ہی کبھی بات ہوئی تھی قدسیہ بوا ہی اکثر آپ کے متعلق بتاتی تھیں۔ ن میرے ذہن کے پردوں پہ ابھرتا خاکہ آپ کی یت اور ان کی باتوں سے الگ تھا۔"

یہ وہ باتیں تھیں جو تنہائی میں وہ خود سے کیا تی تھی۔

"مجھ سے نفرت مت کرنا صلہ کہ میں خود محبت کے لیے ترس رہا ہوں۔" بے بسی التجا بن کر زباں پہ آگئی تھی۔ تبریز نے اس کے ہاتھ کی پشت کو لبوں سے لگاتے کہا تھا۔

"جس دن آپ نے پہلی بار میرے زخموں پہ مرہم رکھا، میں ماضی کی ہر تکلیف بھول گئی۔ دل نے سوچا آپ کا ساتھ ہو تو اس جہنم میں سو بار جلنا قبول ہے۔" صلہ کے لیے وہ چند دن ہی پوری زندگی سے بڑھ کر تھے۔ لاکھ کوشش کے باوجود دل اس کی طرف مائل تھا اور ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ جانے کب وہ راستہ بدل لے۔ رانیہ سے شادی کی تلوار تو اسی رات سے سر پہ لٹک رہی تھی۔

"اوّل تو میرے ہوتے ایسی نوبت نہیں آئے گی اور اگر تکلیف کا کوئی پل آیا بھی تو دونوں ساتھ مل کر اسے گزاریں گے۔ مجھ پہ یقین رکھنا صلہ"۔

"یہ دل کہتا ہے آپ پہ آنکھیں بند کر کے یقین کرلوں۔" تبریز نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"یہ گھر میں نے رانیہ کو دے دیا ہے۔ ہم شہر چلے جائیں گے بابا کے ساتھ۔ وہاں ان کا بہتر علاج ہوسکتا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"

صلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی ہر پریشانی میری پریشانی ہے۔ آپ اکیلے نہیں ہیں۔"

تبریز نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ صلہ کو لگا جیسے صدیوں کی تھکن اس ایک پل میں رخصت ہوئی تھی۔

حمیرا نوشین

خواہشوں کے حصار میں

مکمل ناول

رات میں جس وقت لوگ عموماً کھانے کی تیاری کرتے ہیں۔ اس وقت افتخار کے گھر میں رشتہ دیکھنے کے لیے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سجنے سنورنے کی شوقین مریم نے کافی دیر سے ایہا کو بوکھلا رکھا تھا۔

"یہ والا پرس ٹھیک رہے گا اس سوٹ کے ساتھ۔"

ایہا نے گلابی پھولوں والا چھوٹا سا پرس ما کے سامنے کیا تو انہوں نے ناک سکیڑتے ہو۔ اسے پیچھے کیا۔

"اے دفع کرو اس کو، اس میں آئے گا کیا۔ وہ والا بیگ نکال کے لاؤ جو میں اظفر کی شا میں لے کر گئی تھی۔"

ان کی بات سن کر جہاں صبا کا منہ کھلا تھا و

ایمہا نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔
''میری ماں! آپ کسی لمبے سفر پر نہیں جا رہی ہیں جو اتنا بڑا بیگ کندھے پر لٹکا کے جائیں گی۔ رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔ ہاتھ میں یہ چھوٹا سا پرس ہی مناسب رہے گا۔'' ایمہا نے زبردستی چھوٹا سا پرس ان کے ہاتھ میں پکڑایا۔
''اس میں میری چیزیں کیسے پوری آئیں گی۔ راستے میں لپ اسٹک چادر سے ادھر اُدھر ہو گئی تو کیسے ٹھیک کروں گی۔ یہ چھوٹا شیشہ بھی رکھ دو اس میں۔'' انہوں نے پاس پڑا چھوٹا سا آئینہ اس میں ٹھونسا۔ ذرا سا پرس پھول کے کپا ہو گیا۔
''سارا زمانہ بدل گیا، ہماری ماں نہیں بدلے گی۔ نہیں ہوتی خراب لپ اسٹک، ہو بھی گئی تو گاڑی کے آئینہ میں دیکھ کر ٹھیک کر لیجیے گا۔'' اس نے جلدی سے اس میں سے غیر ضروری چیزیں کھینچ کر نکالیں، ساتھ ہی ساتھ بڑبڑانے کا عمل بھی جاری رکھا۔
صبا نے جلدی سے ماں کو چادر دی اور خود بھی آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لے کر مطمئن سی ہو گئی۔
''چلو بھئی جلدی کرو، تم نے تو بہت وقت لگا دیا۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے، یوں کسی کو انتظار کی کوفت میں مبتلا کرنا اچھی بات نہیں۔''
افتخار جلدی کا شور مچاتے کمرے میں آئے تو چھوٹے فہیم نے ان کو بغور دیکھا۔
''واہ ابا! جچ رہے ہیں، میری بونینزا کی جرسی پہن کر، دھیان سے کھانا پینا کیجیے گا۔ میں اس پر کسی بھی قسم کا داغ ندامت برداشت نہیں کروں گا۔''
''داغ ندامت کے باپ، میں تو سمدھیانے کی چیزیں بعد میں چکھوں گا پہلے تُو میرے ہاتھ کا کرارا پن چکھ۔'' انہوں نے سچ مچ اس کی کمر پر اپنا ہاتھ مارا تو اس نے منہ بنالیا۔
''نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ سمجھا رہا تھا کہ چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بجائے اپنے کپڑوں کی صفائی کا خیال رکھنا، پر میری سنتا کون ہے۔''
وہ ناراضی کا اظہار کرتا ساتھ والے کمرے میں چلا گیا، جب ہی کی چین جھلاتا، لبوں پر مسکراہٹ سجائے آصف آ گیا۔
''ہیلو ایوری باڈی۔'' وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھا تھا۔
''سن رہی ہیں اماں! ابھی سے انگریزی کا استعمال بھی شروع ہو گیا۔ لڑکی ایم اے انگلش ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں اپنی مادری زبان بھول کر زنانی کی زبان بولنا شروع کر دو۔''
''بولنے دو، زنانی کی زبان، آخر کو سب بعد میں بھی تو بولتے ہیں تو ابھی سے بولنے میں کیا حرج ہے۔'' مریم خوشی سے چہکتے ہوئے بولیں۔
''ابھی ہم صرف لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں، یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ ان کو ہمارا لڑکا بھی پسند آتا ہے کہ نہیں۔ اس لیے خوش فہمی کی پٹیاں سب اپنی آنکھوں سے اتار کر ——— ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔''
صبا اپنے تراشیدہ بالوں کو جھٹکتی ان کو نصیحت کرنا نہ بھولی، اسٹیپس میں کٹے بال اس کے گول چہرے پر جھول کم لڑکھڑا زیادہ رہے تھے، وہ خود ہی سر مار مار کر انہیں ورزش کرانے میں مصروف تھی۔
''چلو اب اٹھو، نکلنے کی کرو۔ نو بج رہے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ بے چارے کہاں بار بار گرم کرتے پھریں گے۔''
مریم کی بات پر صبا اور ایمہا کی ہنسی تو چھوٹی ہی تھی، آصف بھی قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔
''واہ اماں! آپ نے تو خیالوں میں کھانے کا مینو بھی سوچ لیا ہوگا۔''
آصف کی بات سن کر مریم کھسیانی سی ہو گئیں۔
''زیادہ باتیں نہ بنا، جا کے اپنی سانولی رنگت

پر کسی چونے والے سے چونا پھروانے کا سوچ۔ تُو ہی بتا رہا تھا کہ ان کی لڑکی دودھ کی رنگت کی سی ہے اور تُو توے کی سیاہی۔'' دونوں ماں بیٹے کی نوک جھونک شروع ہو چکی تھی اس سے پہلے کہ معاملہ طول پکڑتا، افتخار مریم کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج سے باہر لے گئے۔ صبا نے بھی ان کی تقلید کی۔

آصف نے کھڑے ہو کر سامنے لگے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ سرمئی لائننگ والی شرٹ میں اس کا گندمی رنگ کھل رہا تھا۔ آنکھوں پر لگا چشمہ ذہانت کی گواہی دے رہا تھا، بالوں میں برش کرتا وہ گنگنانے لگا۔

''یہ اماں بھی ناں غصے میں اپنی اولاد کو بھی نہیں بخشتیں۔ اچھی بھلی شکل کو توے سے تشبیہہ دے دی۔ اولاد کے بارے میں یہ حال ہے تو آنے والی کو تو ناکوں چنے چبوائیں گی۔''

''بھائی! سچ کہہ رہی ہوں ایک دم ہیرو لگ رہے ہو۔ اماں کی باتوں کو دل پر نہ لینا، اعتماد سے بیٹھنا۔'' ایہا نے اس کی دل جوئی کی تو وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا۔

''یہ چابی تو لے جاؤ۔'' اس نے جلدی سے چابی آگے کی۔ ''چلو میں بھی چلتی ہوں ذرا گاڑی تو دیکھوں آپ کے دوست کی 'کیسی ہے؟'' وہ بھی اس کے ہمراہ باہر نکلنے لگی۔

''میری بھولی بہن! اس تنگ گلی میں رکشہ، موٹر سائیکل آجائے تو بھی بہت ہے۔ گاڑی باہر سڑک پر کھڑی ہے، اس لیے گیٹ بند کرکے مصلے پر بیٹھ جاؤ اور اپنے بھائی کے اچھے مستقبل کے لیے دعا کرو کہ رشتہ پکا ہو جائے۔ ویسے بارات کے ڈیزائنر سوٹ دلواؤں گا۔'' یہ سن کر ایہا کی باچھیں کھل گئیں۔

''اچھا سنو، اماں سے کہنا بوتل پیتے ہوئے گلے سے آوازیں نہ نکالیں، بچی بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔''

''او کے مائی ڈیئر سسٹر!'' اس نے گیٹ سے باہر قدم رکھے تو ایہا نے جھانک کر گلی کے کونے تک دیکھا۔

''ہاں بھئی آج تو چال ہی بدل گئی، بیٹے کی ماں بن کر رشتہ جو دیکھنے نکلی ہیں۔'' اماں کو دیکھ کر اس نے سوچا اور مسکراتے ہوئے گیٹ بند کر دیا۔

☆☆☆

''آپی! قسم سے کیا بتاؤں ان کا گھر تھا کہ محل، میں تو ایک ایک چیز کو دیکھتی رہ گئی۔ کبھی فرنیچر پر نظر ڈالتی تو کبھی دیواروں پر، ہر کمرے میں نئے ڈیزائن کا فرنیچر، کارپٹ میں پاؤں دھنسے چلے جاتے تھے۔ اماں کی تو آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں، میں کبھی کھنکھار کر اور کبھی ٹہوکا دے کر ہوش میں لاتی۔''

صبا جب سے لوٹی تھی ان کی امارت کے قصے سنا سنا کر ان کو خوب اشتیاق دلا رہی تھی۔

''سچی آصف کے ابا! میں نے تو اپنی زندگی میں ایسا گھر نہیں دیکھا۔ وہاں سے آنے کے بعد تو اپنا گھر جھونپڑی لگ رہا ہے۔''

''ایک بار آنکھیں تو میری بھی چندھیا گئی تھیں۔ پھر بھی پورے اعتماد سے لڑکی کے باپ سے بات چیت کی، اپنے آباؤ اجداد کی امارت کے قصے بیان کیے تو بڑے متاثر ہوئے۔ ارے ہم تو خاندانی رئیس ہیں، ان کے پاس تو نئی نئی دولت آئی ہے۔'' ابا

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں یہ چوبارے

فائزہ افتخار

قیمت -/400 روپے

اب بھی اپنا سینہ پھلائے بیٹھے تھے۔

"اچھا، خاندانی رئیس...... جب ہی بیٹے کے دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر گئے تھے، اپنی پراڈو کیا کرائے پر دے رکھی ہے۔" اماں نے ان کا مذاق اڑایا تو ابا خجل سے ہو گئے اور باقی سب ہنس دیے۔

"کاروبار میں تیزی مندی چلتی رہتی ہے، اللہ وہ وقت لائے گا جب پراڈو میں بیٹھ کر شاپنگ کے لیے نکلو گی۔"

"جوانی سے بڑھاپا آگیا، خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے۔ پتا نہیں کب کھانا نصیب ہوگا۔ میرا رشتہ لیتے ہوئے بھی یہی سبز باغ دکھائے تھے کہ جدی پشتی رئیس ہیں، یہ تو سسرال میں آ کر پتا چلا کہ سوائے سسر جی کے نام رئیس ہونے کے کنگلے خاندان سے واسطہ پڑا ہے۔" مریم نے ایک بار پھر طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"تمہاری قسمت ہی ایسی ہے کہ جب شادی ہوئی، سارے بزرگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، ورنہ پتا چلتا تمہیں ابا حنیف اور ابا شریف کوئی معمولی کاروباری نہیں تھے۔ انڈیا میں سیٹھ کے نام سے پہچانے جاتے تھے، نوابوں کی دعوت میں عزت و احترام سے مدعو کیا جاتا تھا۔"

ابا شروع ہو چکے تھے اماں نے استہزائیہ مسکراہٹ سے بچوں کو آنکھوں سے اشارہ کیا تو وہ بھی مسکرا دیے۔ ابا کا "حنیف شریف نامہ" پانامہ کی طرح انہیں ازبر ہو چکا تھا۔

"تم تو بس خواب دکھاتے رہو، میرے خواب تو میرا بچہ پورے کرے گا۔ دیکھا تھا آصف! گیراج میں دو دو لینڈ کروزر کیسے مغرور حسینہ کی طرح کھڑی تھیں۔ اب تو لینڈ کروزر میں، میں اپنے بیٹا بہو کے ساتھ ہی بیٹھوں گی۔" وہ کھلی جا رہی تھیں۔

"اماں! لینڈ کروزر میں تھوڑا سا اچک کر بیٹھنا پڑتا ہے، پہلے اپنے گھٹنے کے درد کا تو علاج کروا لیں۔" فہیم نے ہنسی روکتے ہوئے اماں کو چھیڑا۔

"بس یہ رشتہ ہو جائے، میرے تو سب کچھ درد اڑنچھو ہو جائیں گے اور سنا تھا آصف کے ابا! کیا کہہ رہا تھا اس کا سسر کہ لیموں زون (لیموزین) خریدنے کا ارادہ ہے ان کا۔ ہائے یہ بڑی لمبی سی ی...... گاڑی۔ اپنے سب بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر نکلا کرے گا میرا بچہ۔ چھوٹی سالی کو بھی ہمارے ساتھ بٹھانا ہو تو اسے بھی لے چلا کریں گے، کوئی بات نہیں آخر کو ان کا بھی حق ہوگا اس گاڑی پر۔"

"اماں! اب آپ ابا سے زیادہ خیالی پلاؤ پکا رہی ہیں۔ تھوڑا دم لیں، ان کی طرف سے کسی مثبت رویے کا انتظار کریں۔" آصف نے اماں کے خوابوں کے آگے بند باندھنا چاہا تو وہ بھی فکرمندی سے خاموش ہو گئیں۔

"بھائی! ویسے آپ کو دیکھ کر آپ کے سسر کے کیا تاثرات تھے، اچھے طریقے سے بات چیت کی تھی ناں انہوں نے آپ سے۔" ایہا نے پوچھا۔

"بات تو بہنا انہوں نے بہت اچھے طریقے سے کی، آؤ بھگت بھی خوب کی، میری جاب اور گفتگو سے بھی خوب متاثر ہوئے مگر بات وہی آ جاتی ہے ہم ان کے ہم پلہ تو ہرگز نہیں ہیں۔ خالی شرافت و نجابت دیکھ کر لوگ رشتہ نہیں کرتے اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔" آصف نے حقیقت پسندی سے بات کی تو سب کو اس کی بات میں وزن تو محسوس ہوا مگر کوئی بھی اس خیال بد کو اپنے ذہن کے قریب پھٹکنے نہیں دے رہا تھا کہ یہ رشتہ نہیں ہوگا۔

"چلو بھئی، اب سب سونے کی تیاری کرو۔ صبح اپنے کام دھندوں کے لیے بھی اٹھنا ہے۔" افتخار جمائی لیتے ہوئے اٹھے تو مریم نے اپنے پاؤں بیڈ پر پھیلا لیے۔

"پتا نہیں آج رات نیند کیسے آئے گی، میں تو کبھی لینڈ ٹراؤزر اور کبھی لیموں زون میں ہی سفر کرتی پھروں گی۔" اماں نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ سب ہی ان کی بات پر ہنس دیے، وہ خود بھی اپنی بات پر مسکرائی تھیں۔

☆☆☆

صبا رسالہ ہاتھ میں پکڑے دھوپ میں مزے سے مونگ پھلی کے دانوں سے انصاف کر رہی تھی۔ جب ہی نیچے سے اماں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''جلدی نیچے اتر دیہ دیکھو کس کا نمبر ہے، مجھ سے نہیں پڑھا جا رہا۔'' موبائل فون کی مسلسل بجتی گھنٹی پر اماں جھنجلا رہی تھیں۔

''ہاں جانتی ہوں، نہ پڑھا جا رہا ہے، نہ بند کیا جا رہا ہے۔ اٹینڈ تو کیا جا سکتا ہے ناں۔ کتنی مرتبہ گھر کا ہر فرد طریقہ سمجھا چکا ہے کہ بس اس سبز دائرے پر انگلی پھیرنی ہے۔'' صبا بولتے ہوئے دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری تھی جب تک فون خاموش ہو چکا تھا۔

''چپ (چ) موبائل کا استعمال آہستہ آہستہ ہی سیکھوں گی ناں۔ ماں کو باتیں سنانے کا تو سب کو ہی شوق ہے۔'' وہ ناگواری سے بولیں۔

''آہا...... '' نمبر دیکھ کر صبا خوشی سے جھوم اٹھی۔

''اماں! بھائی کے سسرال کا نمبر۔''

''سچ......؟ دھیان سے دیکھ۔'' انہوں نے بھی موبائل پر نظریں جما دیں۔

''مجھے تو ازبر ہے یہ نمبر، ضرور آنے کا کہہ رہے ہوں گے۔''

''تم نے نیچے اترنے میں دیر کر دی۔ اب بتاؤ پتا نہیں دوبارہ کریں گے بھی یا نہیں، ہم کرتے بھی اچھے نہیں لگتے۔''

''انتظار کر لیتے ہیں یقیناً دوبارہ کریں گے۔'' صبا نے موبائل پر نظریں گاڑیں۔

اسی اثنا میں فون پھر سے گنگنا اٹھا۔ اس نے پہلی بیل پر ریسیو کر لیا۔ سلام جھاڑا، ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیا کہ ان ہی کا فون ہے۔

''جی...... جی آنٹی! امی میرے قریب ہی ہیں، یہ لیں بات کریں۔'' اس نے جھٹ فون ماں کے کان سے لگایا۔ فون ان کی توقع کے مطابق ہی تھا۔ آج رات انہوں نے ان کے گھر آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ کئی دنوں کی فکرمندی و پریشانی میں جاگتی آنکھوں کو جیسے آج قرار مل گیا تھا۔

''اماں! بس اب تو بری کی تیاری شروع کر دیں، اچھی سی شاپنگ کریں گے۔'' صبا ماں کے گلے لگ کر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

''اچھا اب یہ لاڈ چھوڑو، جلدی سے گھر کی صفائی ستھرائی شروع کرو اور ہاں آصف اور اپنے ابا کو بھی فون پر بتا دو، آتے ہوئے کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں گے۔ اب میں کہاں کچن میں کھڑی ہو کر اپنے پاؤں تھکاؤں گی۔'' ان پر ابھی سے تھکاوٹ کا غلبہ ہونے لگا تھا، صبا اثبات میں سر ہلاتی نمبر ملانے لگی۔

''ایمہا کی میڈم کو بھی فون کر دو، جلدی چھٹی لے کر آ جائے گی۔ تمہارے ساتھ لگ جائے گی تو کام جلدی نمٹ جائے گا۔'' وہ صبا کو کہتی کچن میں گئیں کہ گھر کے مکینوں کے لیے تو دوپہر کا کھانا تیار کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

دونوں بہنیں تندہی سے گھر کو سنوارنے میں لگی تھیں۔ ڈرائنگ روم ان کے ہاتھوں کی محنت سے مسکرا اٹھا۔ نیا کارپٹ آصف نے ابھی پچھلے دنوں ہی اپنی تنخواہ سے ڈلوایا تھا۔ دو چار ڈیکوریشن کی چیزیں ایمہا نے اپنے پیسوں سے لا کر سجا دی تھیں۔ نیا صوفہ خریدنے کی استطاعت تو نہ تھی، ہاں اماں نے نیا کور ضرور چڑھا دیا تھا، سو وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے ایمہا اب اپنے کمرے کا رخ کر رہی تھی کہ تھوڑی بہت اس کی بھی حالت سدھار لی جائے کہ کہیں کمرے میں نہ جھانک لیں گو امید تو نہ تھی مگر پھر بھی اس کی صفائی کو بھی انہوں نے ضروری جانا۔ جب ہی چچی عالیہ ہاتھ میں پیالہ پکڑے آتی نظر آئیں۔

''آئے...... ہائے، یہ کہاں سے ٹپک پڑی۔ پورے خاندان میں گاتی پھرے گی، اگر اسے ذرا سی

بھی بھنک پڑ گئی۔" مریم ــــ کی تیوری چڑھ گئی۔
جب تک چچی عالیہ قریب پہنچیں اماں نے اپنے چہرے کی کرختگی دور کر کے شگفتگی سجائے سلام کا جواب پرتپاک طریقے سے دیا۔
"واہ بھئی، آج تو بڑی صفائیاں ہو رہی ہیں خیر تو ہے، نہ عید نہ بقر عید پھر کیوں بچیاں ہلکان ہو رہی ہیں۔" انہوں نے پورے گھر پر طائرانہ نظر ڈال کر پیالہ لاؤنج میں داخل ہوتی صبا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔
"چچی! ہم تو ہر مہینے کی آخری جمعرات کو اسی طرح گھر کی تفصیلی صفائی کرتے ہیں۔" صبا اتراتے ہوئے بولی۔
"اچھا...... پر آج تو بدھ ہے۔"
"ہاں...... ہاں وہ کل لیہا آپی کے اسکول میں پارٹی ہے ناں، تو وہ کل دیر سے آئے گی۔ ہم نے سوچا آج ہی کام کر لیتے ہیں۔" اس نے جلدی سے بات سنبھالی اور ماں کے اشارے پر چائے بنانے کچن میں گھسی کہ جلدی سے چائے پلا کر رخصت کریں۔
"اور بھابھی! آپ کے گھٹنے کا درد کیسا ہے؟"
"شکر ہے اس مالک کا، اب تو کافی بہتر ہے۔"
"تو کبھی چکر لگالیا کریں، آپ نے تو بالکل ہی آنا چھوڑ دیا۔"
"ہاں، صبا تو کتنے ہی دن سے کہہ رہی ہے کہ چچی کے چلیں بس مجھے ہی گھر کے بکھیڑوں سے فرصت نہیں ملتی۔"
"لیں، اب کون سے گھر کے بکھیڑے ہیں۔ ماشاء اللہ بچیاں گھر کا کام سنبھال لیتی ہیں اب تو فراغت ہی فراغت ہے۔" انہوں نے چائے کا گھونٹ لیا۔
"واقعی بچیوں سے بڑا آرام ہے۔ میں تو بس کچن تک ہی محدود ہو گئی ہوں۔" انہوں نے بھی اعتراف کیا۔

"سنی بتا رہا تھا کچھ دن پہلے آپ لوگ گاڑی میں کہیں جا رہے تھے۔" سرسری انداز میں پوچھا گیا سوال مریم کا موڈ بگاڑ گیا۔
"خود چاہے مری، اسلام آباد کی سڑکیں چھان آئیں، لاہور کے چڑیا گھر کے ہاتھی، شیر دیکھ آئیں۔ ہمارے گھر سے نکلنے کی بھی خبر رکھتی ہیں۔" زبان کہنا تو چاہتی تھی مگر ضبط کر گئیں۔
"تمہیں تو پتا ہے آصف کی جب سے نوکری لگی ہے اس کے تعلقات کافی بڑھ گئے ہیں۔ اس کے دوست کی شادی تھی، بچہ گھر پر کارڈ دینے آیا تھا مسلسل اصرار کرتا رہا، شادی میں شرکت کا، سو پھر ہمیں جانا ہی پڑا۔" مریم بھی بات بنانے میں ماہر تھیں، دو چار ادھر اُدھر کی خاندان کی باتیں کر کے عالیہ جلدی ہی اٹھ گئیں تو مریم نے شکر کا کلمہ پڑھا۔
"صبا بیٹا! باؤل خالی کر کے دو۔"
"کیسی غیروں کی سی باتیں کر رہی ہو تم عالیہ! کبھی آج تک خالی برتن تمہارے گھر گیا ہے جو آج لے جاؤ گی۔" مریم نے مصنوعی غصے سے انہیں گھورا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اماں انہیں باہر گیٹ تک چھوڑنے گئی تھیں جس وقت انہوں نے گھر سے باہر قدم رکھا، آصف کی بائیک نے گھر کے سامنے قدم جمائے تھے۔
انہوں نے آصف کے سلام کا جواب دے کر بڑے غور سے موٹر سائیکل پر لٹکی تھیلیوں کو دیکھا تھا، اماں کا خون جل گیا۔
"اب رات تک باری باری بچوں کی گلی میں ڈیوٹی لگادے گی کہ دیکھو تائی امی کے گھر کون آیا ہے۔ یہ عورت چین نہیں لینے دے گی مجھے، ہر وقت ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بدبدائیں۔
"چھوڑیں اماں! جس کی جو عادت۔ یہ لیں رکھیں، یہ سب چیزیں۔" گیٹ بند کر کے آصف نے شاہزان کے ہاتھوں میں منتقل کیے۔
"کچھ زیادہ ہی نہیں لے آئے۔"
"اوہ اماں! اس دن دیکھا تھا، انہوں نے کیسا

زبردست کھانے کا انتظام کیا تھا، ان کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔"

"واقعی بھائی! اتنی چیزیں تھیں کہ چکھنے چکھنے میں ہی پیٹ دہائی دینے لگا تھا۔" صبا نے بھی اس کی بات کی تائید کی تو مریم خاموش ہوگئیں۔

"لبیبا کے لیے جو میں نے ماربل کا ڈنر سیٹ لے کر رکھا تھا، وہ نکال لینا۔ اب پلاسٹک کے برتنوں میں تو عجیب ہی لگے گا۔"

"واہ میری اماں تو سمجھ دار ہوگئیں۔" آصف نے ماں کے کندھے دبانے شروع کیے تو وہ خفیف سا مسکرا دیں۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا سب مالٹوں کے ساتھ انصاف کر رہے تھے تب ہی ابا مسکراتے ہوئے آئے۔

"مبارک ہو، ہمارے بیٹے کے رشتے کو ایڈووکیٹ زوار کلیم نے منظوری دے دی ہے۔" ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے، جوڑوں کے درد کی وجہ سے نفل نہیں پڑھ سکی، آج تو ضرور سجدۂ شکر ادا کروں گی۔"

"اچھا یہ بتاؤ منگنی کی رسم ادا کرنے کب چلیں۔" مریم نے افتخار کی طرف دیکھا۔

"وہ... کہہ رہے تھے کہ منگنی کا فنکشن کرنے کی ضرورت نہیں، بس شادی کی تیاری شروع کریں۔"

"ارے واہ ایسے کیسے شادی کی تیاری شروع کردیں، آخر ہلکی پھلکی رسم تو ادا کرنی ہی ہے۔ لوگوں کو پتا تو چلے کہ ہم نے اپنے بچے کا رشتہ کیسے اونچے خاندان میں کیا ہے۔"

"کرلیں گے رسم، میں بات کرتا ہوں زوار بھائی سے اور ہاں آصف بیٹا تم اپنے باس کے لیے صبح مٹھائی کا ڈبہ لے جانا نہ بھولنا آخر کو ان ہی کے توسط سے یہ رشتہ طے ہوا ہے۔" افتخار نے آصف کو مادر کرایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

صبح سے گھر زلزلوں کی زد میں تھا۔ ابا، اماں کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ در و دیوار اماں کی پاٹ دار آواز سے گونج رہے تھے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بھی کیا کلیجہ دہلائے گی جو اماں کا دبنگ لہجہ ان سب کو سہائے دے رہا تھا۔

"اسی بات کا خدشہ تھا مجھے، جس کی وجہ سے میں نے سب کو منع کیا تھا کہ کسی کے کان میں بھی یہ بھنک نہ پڑے کہ ہم آصف کا رشتہ دیکھ رہے ہیں پر مجھ دور اندیشن کی یہاں سنتا کون ہے۔"

ابا کا قصور یہ تھا کہ خوشی خوشی اپنے آخری بچے بزرگ حبیب (باپ کے بھائی) یعنی چچا کو بتانے چل دیے تھے کہ آپ کے پوتے کے لیے ہم نے لڑکی پسند کرلی ہے۔ دادا نے پہلے تو ان کی کمر پر لاٹھی برسا کر ان کی کھلتی باچھیں روکیں اور شام کو سارے خاندان کے بڑوں کو لے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ یہ حاضری ان کی خبر لینے کے لیے تھی، جس میں پھوپھا جی پیش پیش تھے، انہیں تو موقع ملنا چاہیے تھا ابا کی کلاس لینے کا۔

"حد ہوگئی افتخار! تم اتنے بڑے کب سے ہوگئے کہ بچوں کے اکیلے ہی رشتے طے کرنے نکل پڑو، کیا جیتے جی سب کو مار دیا۔" پھوپھا کے لہجے اور انداز پر اماں کو تاؤ تو بہت آیا مگر ضبط کیے بیٹھی رہیں۔

"جب خاندان میں بچیاں موجود ہیں تو باہر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے۔" دادا نے لاٹھی کو زمین پر کھڑی کر کے ہاتھ سے دباؤ ایسے ڈالا جیسے ابا کی گردن دبوچ لینا چاہتے ہوں۔ ابا بے چارے گردن جھکائے بیٹھے تھے۔

"یہ گردن جھکانے کا وقت نہیں ہے، سر اٹھا کر ہماری بات کا جواب دو۔ سر جھکا کر بیٹھنا مردوں کی شان نہیں۔" پھوپھا جی نے پھر سے ابا پر طنز کیا تو اماں تلملا گئیں۔ جانتی تھیں کہ در پردہ کس کو سنایا جا رہا ہے۔

"ابا جی! ابھی رشتہ کہاں طے ہوا ہے، فقط بات چیت چل رہی ہے۔" افتخار منمنائے۔

''یہی تو پوچھ رہا ہوں، یہ بات چیت چلنے کی نوبت بھی آئی تو کیوں......؟'' انہوں نے لاٹھی فرش پر ماری۔

''تحمل سے بات سنیں ابا جی! آصف کے باس نے یہ رشتہ کروایا ہے۔ اگر نہ کرتا تو نوکری چھوٹنے کا خدشہ تھا۔ دوسرے آصف تو خاندان کی سب ہی بچیوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہے، پھر میں کیسے کسی کے لیے سوال ڈالتی۔'' اماں نے رسان سے بات کی مگر دادا پھر بھی بھڑک اٹھے۔

''بہنیں سمجھتا ہے تو سمجھا کرے، بہنیں تو نہیں ہیں ناں۔ آج تم لوگ خاندان سے باہر رشتے دیکھو گے تو تمہاری بچیوں کی طرف کون دیکھے گا۔''

''میری بچیوں میں ماشاء اللہ کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں، اچھے سے اچھے رشتے ہو جائیں گے۔''

''یعنی تم اعتراف کرتی ہو کہ تمہاری بچیوں میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں پھر بھی باہر خوار ہونا، چہ معنی دارد۔'' پھوپھا کی بات پر مریم چیں بہ چیں ہو گئیں۔

''بھائی صاحب! آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، خاندان سے باہر رشتے طے ہوں گے تو رشتہ داری بڑھے گی، میل جول بڑھے گا۔ ہماری بچیوں کے اچھے رشتے ہونے میں آسانی پیدا ہوگی۔'' مریم نے اپنے سلجھے الفاظ سے ان کو قائل کرنا چاہا مگر وہاں وہی ڈھاک کے تین پات والی بات۔

''چلیں، چائے تو پئیں آپ لوگ، یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔'' انہوں نے صبا سے چائے کی ٹرے لے کر ان سب کے آگے کپ کیے مگر دادا نے کپ ہاتھ سے پیچھے کر دیے۔

''چائے پلا کر ہمارا پارہ اور نہ چڑھاؤ مریم! کپ سائڈ پر رکھ دو۔ صفدر کی بچی آصف کے لیے بالکل مناسب ہے۔ دونوں میاں بیوی رات کو صلاح مشورہ کر لو پھر ایک دو دن تک رشتے کے لیے صفدر کی طرف چلتے ہیں۔'' دادا اپنی بات اور لاٹھی پر زور ڈالتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، باقی سب نے بھی تقلید کی۔ ابا بھی کھڑے ہو گئے تھے، ہنوز سر جھکائے ہوئے پھوپھا ان کے قریب آئے تھے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

''افتخار تم گھر کے سربراہ ہو، چاروں بھائیوں میں سب سے بڑے، اپنا بڑا پن دکھاؤ اگر اب بھی خاموش رہے تو خاندان سے نہ صرف کٹ کر رہ جاؤ گے بلکہ ہماری نظروں میں بھی تمہارا بڑا پن ختم ہو کر رہ جائے گا۔'' پھوپھا رفیق نے بہت گہری بات کی تھی۔ ابا کے ماتھے پر سخت سردی میں بھی پسینہ چمکا تھا۔

مریم ان کے لفظوں پر بری طرح کھول رہی تھیں، اندر بیٹھے بچے بھی پھوپھا کے لہجے پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

''ہونہہ خود تو جیسے شاہی تخت بچھا کر فرمان جاری کرتے ہیں بیوی بچوں پر، مہینوں اپنے بہن بھائیوں کی شکل نہیں دیکھتے۔ ہمارے ابا کو درس دے رہے ہیں۔'' فہیم غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔

''آہستہ بولو، باہر تک آواز چلی گئی تو ابا کے ساتھ تمہاری بھی کلاس لے لی جائے گی۔'' لبھا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی بڑبڑاہٹ روکی۔

آصف کونے میں صوفے پر بیٹھا سوچوں میں غلطاں تھا، پیشانی پر پڑی لکیریں پریشانی کی غماز تھیں۔

☆☆☆

پانی کی موٹی دھار ٹب میں پڑے کپڑوں کو نکھار رہی تھی۔

اور زینب کی مخروطی انگلیاں پانی میں ڈوبی تھیں اور وہ خود سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

آصف کی گہری آنکھوں کو وہ تصور میں کھوجنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ کیا وہ سب میرا وہم تھا یا آصف کا محض وقتی لگاؤ یا جھکاؤ۔ جتنی دیر بھی وہ ان کے ہاں ٹھہرتا اس کی نگاہیں اس کے چاروں اور گھوما کرتیں۔

''چائے بنانا تو کوئی زینب سے سیکھے۔'' وہ

گھونٹ بھرتے ہوئے اوریبنب کو نگاہوں کے حصار میں لے لیتا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیتی۔

''میری اوریبنب ہرفن مولا ہے، کھانا پکانا، سینا پرونا سب میں ماہر۔ یہ تلوں کا جو تیسرا لڈو تم کھا رہے ہو اوریبنب کے ہاتھوں کا ذائقہ ہے اس میں۔'' چچی خالدہ کی بات پر جہاں چائے پیتے ہوئے آصف کو اچھو لگا تھا، وہیں اوریبنب اور زینب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ آصف نے شرمندہ ہو کر لڈو سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''اچھا...... مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں تین لڈو ڈکار گیا۔'' وہ کھسیانا سا ہوا۔

''کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچا تم نے۔ میرا مقصد تمہیں جتانا ہرگز نہیں تھا محض یہ بتانا تھا کہ اچھی چیز خود بخود دکھانے کو دل چاہتا ہے۔ تم ہی کیا سارے اوریبنب کے کھانوں کے رسیا ہیں۔''

چچی خالدہ کی بات پر اس نے اعتراف کرتے ہوئے سر ہلایا اور نگاہیں اوریبنب پر جما دیں۔

''سچ کہہ رہی ہیں آپ، اوریبنب کے کھانوں کا ذائقہ میں کبھی نہیں بھول پاتا اور نہ بھولنا چاہتا ہوں۔'' اس نے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے سرگوشی کی تھی۔

اوریبنب کے جسم کا سارا خون نچڑ کر چہرے پر آ گیا تھا، وہ دھڑکتے دل کے ساتھ برتن سمیٹنے لگی تھی۔ کتنے ہی موقعوں پر اس کے کہے گئے جملے اس کی نیندوں میں رت جگے گھول دیتے۔ لب مسکراتے اور وہ آئینے میں اپنے آپ کو کتنی ہی بار دیکھ کر مسکرا دیتی۔ شام کو وہ اکثر ہی آ جاتا اور کچھ دنوں سے تو باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔

اس کا شعری ذوق دیکھتے ہوئے اس نے اسے شاعری کی کتاب لا کر دی تھی۔ ندیم بھابھہ کی شاعری اس نے بڑے شوق سے پڑھی اور ایک شعر پر اس کی دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں۔ آنکھوں میں خواب خود بخود آ سجے تھے۔ دل خوش گمانیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ پنسل سے اس شعر کے گرد واضح لائن کھینچی گئی تھی۔

میری پہلی کمائی ہے محبت
محبت جو تمہیں دے چکا ہوں

شعر کے گرد کھینچی لکیر نے اسے جیسے قید کر لیا تھا۔ دل اس کے نام کی گردان کرنے لگا تھا۔

پھر...... پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ یہ کیا سن رہی تھی کہ آصف کا رشتہ کہیں اور طے ہو رہا ہے۔ اس کا پہلے کی طرح تواتر سے نہ آنا اسے بھی کھل رہا تھا مگر وہ اسے اس کی نئی نئی نوکری کی مصروفیت سمجھ رہی تھی مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔

''چل بس کر دے اب، کب تک ٹھنڈے پانی میں بیٹھی رہے گی، باقی کپڑے دھل جائیں گے۔ پتا بھی ہے دھند ہے پھر بھی مشین لگا کر بیٹھ گئی۔'' ماں نے آ کر اس کا ارتکاز توڑا تو وہ گھبرا کر جلدی سے ٹونٹی بند کر کے کپڑے نچوڑنے لگی۔

''بس امی یہ تھوڑے سے رہ گئے ہیں یہ دھو کر آتی ہوں نیچے۔'' ماں سے نظریں ملائے بغیر وہ اپنا ادھورا کام سمیٹنے لگی۔ اس ہرجائی کی سوچ آنکھوں میں نمی لے آئی اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر پلکوں کی باڑھ سے باہر آنے کی کوشش میں بے حال ہوتی رہی۔

☆☆☆

''سارے مطلبی ہیں تمہارے بھائی بھاوج۔ چار سال تک میرا آصف نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا رہا، تب تو کسی کو خیال نہیں آیا کہ بچہ خالی پھر رہا ہے کہیں بات چیت کر کے نوکری لگوا دیں۔ جب سے جاب ملی ہے تو سب کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ پہلے کہاں جا سوئے تھے، کل تک تو خاندان کی بچیاں دودھ پیتی ننھی کاکی تھیں۔ آصف کی نوکری لگتے ہی سب ایک دم بڑی ہو گئیں، یوں کہو میرے بچے کی تنخواہ رال ٹپکا رہی ہے، اپنی بچیوں کا مستقبل محفوظ نظر آ رہا ہے۔'' مریم دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''کل تک آصف آوارہ، نکما اور کام چور تھا، آج کیسے اس سے لپٹا جا رہا ہے۔ یاد ہے چند ہزار کی

رقم لینے بھیجا تھا آصف کو اسی صفدر کے تم نے، کیسے سوتا بن گیا تھا۔ بیوی نے بہانا تراشا کہ ابھی دوائی کھا کر سوئے ہیں۔'' مریم کو گزری بات تڑپا گئی' افتخار کان لپیٹے سنتے رہے۔

''ہم بھی ایسے بچے نہیں تھے جو اس کے بہانے کو نہ سمجھتے، کتنے ہی دن صفدر تم سے کترایا پھرتا رہا کہ پیسوں کا نہ کہہ دو۔ اپنی جھمکیاں بیچ کر پیسوں کا انتظام کر کے دیا۔ ہر موقع پر اس شخص کا ساتھ دیا، جس کے دل میں آج بہن بھائیوں کی محبت امڈی پڑ رہی ہے۔ ہاں میں تو ہوں ہی غیر، جان بھی بیچ کر تمہارے اوپر لگا دوں تو میری کوئی قدر نہ ہو گی۔'' وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر آنکھوں میں آنسو لے آئیں، افتخار تڑپ اٹھے، بچوں نے ماں کو ساتھ لگا کر دلاسا دیا۔

☆☆☆

حسب معمول وہ سب کمرے میں رضائیوں، کمبل میں دبکے مونگ پھلی، چلغوزے پر ہاتھ صاف کر رہے تھے البتہ افتخار اس دن سے چپ چپ سے تھے۔ کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔

''تمہارے ابا پر تو طاری ہو گیا خاندان کا خوف۔'' اماں نے چلغوزے کے کئی چھلکے دانے منہ میں ڈالے۔

''کیا پریشانی ہے تمہیں، جب میں تمہارے ساتھ، بچے ہماری ہاں میں ہاں ملانے والے، پھر خاندان والوں کا کیا ڈر؟ بچہ ہمارا، ہماری مرضی، ہم رشتہ کریں نہ کریں۔ یہ دباؤ ڈالنے والے کون ہوتے ہیں۔'' انہیں خبر مل گئی تھی کہ افتخار کو دکان پر جا کر سمجھایا جا رہا ہے۔

''بات دباؤ کی نہیں، بات احساس کی ہے۔ رفیق بھائی (پھوپھا) ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں اگر ہم اپنی بچیوں کی طرف نہیں دیکھیں گے تو پھر اور کون آئے گا۔'' ابا کے چہرے پر خجالت کے آثار واضح تھے، جیسے خاندان میں رشتہ نہ کرنے کا قلق انہیں بھی ہو۔

''شاباش ہے میاں۔'' وہ چلغوزے چھوڑ کر ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئیں۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے آصف سے رشتہ نہ ہوا تو وہ کنواری بیٹھی رہ جائے گی۔ اللہ نے اس کے نصیب میں کیا پتا آصف سے بھی اچھا رشتہ لکھا ہو۔'' اماں نے ذرا دھیمے لہجے میں ابا کو سمجھایا تو وہ بھی کچھ قائل ہوتے نظر آئے۔

''مگر میں پھر بھی کہتا ہوں ایک بار سوچ لو، گھر کی بچی ہے۔ گھر میں آرام سے گھل مل جائے گی۔ وہ اونچے گھر کی نازوں پلی کیا پتا ہمارے میں ایڈجسٹ ہو بھی پائے یا نہیں۔'' انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''بے کار کی باتیں مت کرو، بیٹی چاہے اونچے خاندان کی ہو یا غریب گھر کی۔ سب والدین کی یہی تربیت ہوتی ہے کہ سسرال میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ گھر روز روز تھوڑی بستے ہیں، اللہ خیر رکھے مجھے تو بچی اور بچی کی ماں دونوں سمجھدار لگی ہیں۔''

''اپنی بچیوں کے بھی تو رشتے کرنے ہیں، ہمیں آخر، ان کا بھی تو سوچنا ہے۔ خاندان سے کٹ گئے تو کہاں سے ہوں گے رشتے۔'' ابا نے ایہا اور صبا پر نظر ڈالی تو ان دونوں نے سر جھکا لیا۔

''تو تمہارا خیال ہے، آصف کے رشتے کے بعد میں ذات، برادری میں اپنی بیٹیوں کو دوں گی۔ ایک مرتبہ آصف کا رشتہ ہو جانے دو پھر دیکھنا کیسے میری بیٹیوں کے اعلیٰ گھرانوں سے رشتے آتے ہیں۔ آصف کے سسرال میں بہت ایسے رشتے ہوں گے جو میری ایہا اور صبا کے لیے جھولی پھیلائے چلے آئیں گے۔ آصف بھی تو ان ہی کے خاندان کا فرد بن جائے گا، اپنی بہنوں کے لیے کچھ اچھا ہی سوچے گا۔''

اماں نے ابا کی یہ فکر بھی جیسے ختم کی۔

''باقی اپنے بچے سے پوچھ لو، جس کے لیے یہ ساری ناراضگیاں مول لے رہے ہیں، کل کو مجھے نہ دوش دینا کہ تم نے خاندان سے چھڑوا دیا۔'' مریم اپنے خیالات کا اظہار کر کے چپ ہو گئیں۔ اب ابا اور باقی بہن بھائیوں کی نظریں آصف پر تھیں کہ دیکھو کیا کہتا ہے۔ امید تو یہی تھی کہ وہ باہر کے رشتے

کو ترجیح دے گا مگر پھر بھی کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، کیا پتا انکار ہی کر دے کیونکہ جب سے سب یہاں سے ہو کر گئے تھے، وہ چپ چپ سا تھا۔

''اب تم تو کچھ بول دو، موقع پر باپ کی طرح گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ جاتے ہو۔ ہر جگہ مجھے ہی بول کر ذلیل ہونا پڑتا ہے۔'' اماں نے آصف کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سوچ میں پڑ گیا۔

''بھائی جو بھی فیصلہ کرنا ہے آج ہی کر لو۔ کل کو پھر پنچایت حاضری دینے آ جائے گی۔'' ایمان نے بھی آصف کو بولنے پر اکسایا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ اگر اماں باہر رشتہ کرنے کے حق میں ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''شاباش ہے بچے! میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاؤ۔ ماں بُری بن جائے اور تم سب اپنے مقصد حاصل کر لو۔'' مریم نے اسے گھورا تو وہ گڑبڑا گیا۔

''میرا یہ مقصد نہیں ہے اماں! دراصل مجھے اس بات کا خوف ہے کہ باہر رشتہ کرنے کی صورت میں انہوں نے ہمیں خاندان سے بے دخل کرنے کی دھمکی دی ہے۔'' آصف نے اپنے دل کی ملامت کو آرام سے سلا دیا اور خاندان سے کٹنے کے خوف کو ظاہر کر دیا۔

''ایسی دھمکیوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ بھائی بھائی بھی کبھی ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں۔ وقتی غصہ ہوگا، وقت گزرنے پر آپ ہی اُتر جائے گا۔ ویسے بھی کون سا ہم روز روز ایک دوسرے کے گھروں میں حاضریاں دیتے ہیں، کبھی دکھ سکھ کے موقع پر ہی اکٹھا ہوا جاتا ہے۔ وقت آنے پر دیکھی جائے گی، بسم اللہ پڑھ کر صبح بچی کے ہاتھ پر پیسے رکھنے چلتے ہیں۔''

''اکیلے ہی چلے جائیں؟'' ابا نے انہیں اچنبھے سے دیکھا۔

''ساری عمر اس آدمی کی بے وقوفی نے مجھے رُلایا ہے۔ اکیلے کیوں ہم سب گھر والے چلیں گے۔ اگر تم اپنے بھائیوں میں سے کسی کو ساتھ چلنے پر آمادہ کر سکتے ہو تو لے چلنا۔'' اماں چبا کر بولیں تو ابا نے پھر چپ سادھ لی۔

بچے ابا کی طرف دیکھ کر رہ گئے، اس لمحے انہیں ابا بڑے تنہا سے لگے تھے جیسے بھائیوں کے جھرمٹ میں سے انہیں کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہو۔

☆☆☆

منگنی کی سادہ سی رسم کی گئی۔ ان کی طرف سے بھی فیملی کے چند افراد تھے، ادھر سے بھی آصف کی فیملی تھی اور اس کی ننھیال سے دو تین لوگوں نے شرکت کی۔

مٹھائی، پھل کے ٹوکرے، سونے کا لاکٹ سیٹ لے کر وہ پہنچے تھے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا تھا۔ لڑکی کی ماں نے مریم کو علیحدگی میں لے جا کر ایک چھوٹی سی ڈبیہ ان کے ہاتھوں میں تھمائی، کھول کر دیکھا تو انگوٹھی میں جڑے ہیرے جگر جگر کر رہے تھے، ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

''مگر بہن! یہ سب آپ مجھے سب کے سامنے دیں گی تو اچھا لگے گا۔''

''سب کے سامنے تو مناسب نہیں لگے گا، اسی لیے الگ سے آپ کو لے کر آئی ہوں، آپ یہ رنگ آصف کو دیجیے گا تاکہ وہ حنینا کے ہاتھ میں پہنا دے۔ اب دیکھیں آپ کی اور ہماری عزت ایک ہی ہے، ہم نے تو آپ کے معمولی نوکری کرتے بچے کو قبول کر لیا مگر کچھ دنیاداری کے تقاضے بھی نبھانے پڑتے ہیں۔'' لڑکی کی ماں کی بات سن کر مریم کا منہ کھل گیا۔

تو یہ انگوٹھی وہ لڑکی کو پہنانے کی بات کر رہی ہیں یعنی سونے کے سیٹ کی ان کی نظر میں کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ ان کے ماتھے پر پڑنے والی سلوٹوں کو لڑکی کی ماں نے بغور دیکھا تھا۔ جب ہی تو ایک دم ان کا ہاتھ پکڑ کر ''سب لوگ ویٹ کر رہے ہیں'' کہہ کر اپنے ساتھ لے کر چل دیں۔ وہ مرے

قدموں سے ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔
حنینا پر نظر پڑی تو وہ ایک دم کھل اٹھیں، انتہائی مناسب جسامت، سروقد اور بالائی سا رنگ لیے وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ نفیس سی نگینوں کی ایمبرائیڈری والا سوٹ اس نے زیب تن کر رکھا تھا۔ لمبی گھنیری پلکیں اس کے چہرے پر سایہ فگن تھیں، ہلکے سے میک اپ میں بھی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔
صبا اور ایبہا تو بھابھی کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اپنا گندمی رنگ بھابھی کے رنگ کے سامنے بالکل ہی سانولا محسوس ہو رہا تھا۔ آصف اس کے برابر میں کچھ کنفیوز سا بیٹھا تھا۔ وہ بھی حنینا کے حسن سے مرعوب ہو رہا تھا، اس پر مستزاد حنینا سب کے سامنے اس پر مسکراہٹ بھری نظر ڈالتی تو وہ خفیف سا ہو جاتا اور جب اماں نے اس کے ہاتھ میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی حنینا کو پہنانے کے لیے پکڑائی تو ایک لمحے کو تو وہ چکرا کر رہ گیا۔
یعنی انگوٹھی اماں کے بجائے وہ لڑکی کو پہنائے گا اس نے گھبرا کر پہلے اماں پھر ابا کی طرف دیکھا۔ ابا نے آنکھ کے اشارے اسے رنگ پہنانے کا سگنل دیا۔ تجل تو وہ بھی ہو گئے تھے مگر بڑے گھر میں رشتہ کیا تھا تو چھوٹی سوچ کو بھی خیر باد کہنا پڑ رہا تھا۔ ماڈرن لوگ تھے سو انہیں بھی کھلے ذہن و دل کا ہونا پڑ رہا تھا۔
آصف نے جھجکتے ہوئے حنینا کا ہاتھ پکڑے بغیر اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی تھی۔ سب نے تالیاں بجا کر مبارک باد دی اور اگلے ہی پل حنینا نے اپنی ماں سے مردانہ انگوٹھی پکڑ کر بڑے اعتماد سے آصف کی طرف رخ کر کے انگوٹھی پہنانے کے لیے اس کا ہاتھ طلب کیا تھا۔ وہ سچ میں گھبرا گیا تھا، پیشانی پر ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے۔ بہن بھائیوں کی موجودگی اسے شرم سار کر رہی تھی، اب کی بار تو وہ اماں ابا کی طرف نظر تک اٹھا کر دیکھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ خفت سے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ حنینا نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنائی تھی، حنینا کے ہاتھ کا گرم لمس اس کے ہاتھ کو اور بھی یخ کر گیا۔ کیمرے میں اس منظر کو محفوظ کیا جا رہا تھا اور آصف کا شرم سے سر جھکا جا رہا تھا۔
اپنے گھر والوں کی موجودگی میں اسے یہ سب ناگوار لگ رہا تھا، تاہم سالی کی چھیڑ چھاڑ میں وہ اپنا اعتماد بحال کرنے میں لگا تھا۔
کھانا کھا کر وہ بہت دیر سے ان کے گھر سے لوٹے تھے، واپسی پر وہ سب خفت زدہ مگر مسرور تھے۔

☆☆☆

صفدر، خاور، طاہر، بہن کے گھر پریشان صورت لیے بیٹھے تھے۔
''افتخار نے بڑی جرات کا مظاہرہ کیا ہے، مجھے اس شخص کی بزدلی کا اندازہ تو تھا مگر اس بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی۔ چلو ہم سب کو تو ایک طرف کرو، اکلوتی سگی بہن کو بھی نہ پوچھا ہے۔ اس بہن کے دل پر کیا گزری ذرا اس کے دل سے پوچھو۔ ساری رات آنسو بہاتی رہی۔ بی پی شوٹ کر گیا، ایمرجنسی میں ہسپتال لے جانا پڑا۔'' سجاد نے دکھ سے بیوی کی طرف نظر ڈالی تو تابندہ نے پھر سے آنسو بہانا شروع کر دیے۔ تینوں بھائی اٹھ کے سرہانے آ بیٹھے۔
''تم کیوں غم کرتی ہوں، ہم ہیں نا، تمہارے ناز اٹھانے والے۔ افتخار کا تو شروع سے ہی یہ رویہ ہے، بیوی کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے۔ جورو کا غلام، سارے خاندان کا نام ڈبو ڈالا'' صفدر بہن کو دلاسا دیتے ہوئے آخر میں افتخار کا ذکر زہر خند لہجے میں کرتے ہوئے بولے۔
''اللہ وہ وقت لائے جب تمہارے بھتیجا بھتیجی کے رشتے ہوں، سب کام تمہاری منشاء کے مطابق ہوں گے۔ سب کچھ تم اپنے ہاتھوں سے کرو گی۔'' خاور نے بھی بہن کے گرد بازو ڈال کر اسے اپنی محبت کا احساس دلا کر بڑے بھائی کے دیے گئے زخم پر مرہم رکھا۔

''اگر اس کے گھر سے مٹھائی آئے تو سب واپس کر دینا، وہ خاندان سے کٹ کر رہنا چاہتا ہے تو پھر اس سے کوئی رابطہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔'' رفیق (بہنوئی) نے ان کو باور کرایا۔

''ہم پہلے ہی یہ سوچ بیٹھے ہیں رفیق بھائی! ہم اس شخص سے کسی بھی قسم کی راہ و رسم نہیں رکھنا چاہتے۔ دیکھتے ہیں، سسرال والوں اور سمدھیانے والوں کے ساتھ کب تک گزارا ہوتا ہے۔ یہ بے غیرت لوگوں کے کام ہوتے ہیں کہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں جا گھسے۔

اگر بھائی بھائی کے کندھے سے کندھا ملا کر نہ چلے تو ایسے شخص کو کسی بھی رشتے سے محبت کی باس نہیں ملے گی، ترسے گا وہ، روئے گا ایک دن ہماری محبت کے لیے۔'' صفدر آنکھوں میں نمی لیے بولتے رہے، سب دل گرفتہ تھے، افتخار نے حقیقتاً ان سب کو تکلیف پہنچائی تھی۔

☆☆☆

صبا اور مریم دونوں لاؤنج میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

''ہاں لاؤ دکھاؤ، کتنے سوٹوں کی لسٹ بنائی تم نے۔'' مریم نے اس کے ہاتھ سے پرچہ لیا اور بغور دیکھنے لگی۔ صبا کو ہنسی آ گئی۔

''اماں! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ کے ابا نے اسکول کی شکل نہیں دکھائی تھی آپ کو۔ لڑکیوں کے لکھنے پڑھنے کے خلاف تھے وہ، پھر کیوں اپنی آنکھیں تھکا رہی ہیں۔ لائیں دیں میں پڑھ کر سناتی ہوں۔'' صبا نے ان کے ہاتھ سے لسٹ لینی چاہی تو انہوں نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور اس کو گھورنے لگیں۔

''کاش، اپنے ابا کی طرح میں بھی لڑکیوں کی پڑھائی کے خلاف ہوتی تاکہ آج دس جماعت پڑھی بیٹی کے منہ سے طنز تو نہ سننے کو ملتا۔'' ماں کی بات صبا کو شرمندہ کر گئی۔

''اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا مگر فہرست دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ آنکھیں تو ہیں میری، ایک نظر تو ڈال لوں کہ کتنی لمبی فہرست بنی ہے۔'' وہ لکھے ہوئے کی لمبائی کا اندازہ کر کے سوٹوں کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

''حسینا کے سوٹ دس سے زیادہ ہرگز نہیں ہونے چاہئیں، چادر، جرسی، گاؤن سمیت پندرہ سولہ ہو جائیں گے۔ جوتی، جیولری الگ ہوگی۔''

''اماں اپنے زمانے کی باتیں نہ کیا کریں، جب چند سوٹ چادر، جرسی، گاؤن سمیت گنتی کیا کرتے تھے لوگ۔ یہ آج کا زمانہ ہے اور آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ نے کس خاندان میں رشتہ طے کیا ہے۔'' مریم نے اس کی بات پر اس کی طرف دیکھا۔

''منگنی کی رسم میں ان کے گھر کی خواتین میں سے کسی کو آپ نے دوپٹا لیتے دیکھا تھا، جن کے پاس تھا وہ بھی کندھے پر پڑا رہا تھا اور آپ گاؤن کی بات کر رہی ہیں۔ ہماری بھابھی گاؤن پہن کر نہیں آئے گی اس گھر میں۔ اپنے ذہن کو ابھی سے آنے والے وقت کے لیے تیار کر لیں۔'' صبا نے بہت سمجھ داری کی بات کی تھی۔

مریم اپنے حساب سے تیاری کا سوچ بیٹھی تھیں، رشتہ اتنے امیر گھرانے میں کیا تھا تو اب بری بھی اسی حساب سے تیار کرنا تھی۔

''پر یہ سب ہوگا کہاں سے، کئی لاکھ کا خرچا آئے گا۔'' وہ فکر مند ہو گئیں۔ رات کو افتخار اور آصف سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑے سہل انداز میں انہیں تسلی دی کہ فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، سب کچھ ان لوگوں کے حساب سے ہوگا۔

''مگر کیسے......؟''

''میں نے لون کے لیے درخواست دی ہے، باس کہہ رہے تھے جلدی مل جائے گا۔'' آصف نے ماں کو پریشانی سے نکالنا چاہا۔

''میں نے بھی کچھ لاکھ بینک میں جمع کر رکھے ہیں، وقت آنے پر نکال لوں گا۔ تم اپنی منشاء اور ان لوگوں کے اسٹینڈرڈ کے مطابق تیار کر لینا، کہیں پر کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہ رہے۔'' افتخار نے بھی اپنی

جمع پونجی ظاہر کردی اور چشمہ اتار کر پھونک مارنے لگے۔

''آج راز کھل رہے ہیں، میں نے جب بھی مانگا ہمیشہ ''کاروبار مندا ہے'' کا جملہ سنا۔کبھی دل کھول کر خرچا نہیں رکھا، اس آدمی نے میرے ہاتھ پر۔''

''مجھے پتا ہے تمہارے ہاتھ میں سوراخ ہے، پیسہ ٹھہرے گا نہیں۔اسی لیے بوقت ضرورت سنبھالتا رہا۔'' افتخار نے قمیص کے دامن کو الٹا کر کے چشمہ صاف کیا۔

''ہمیشہ یہ اصول رکھو کہ روپیہ کماؤ تو پانچ پیسے ضرور بچاؤ تاکہ ضرورت کے وقت کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔'' یہ ابا مرحوم کا قول تھا میں نے اپنے کانوں میں رکھ لیا جب سے اس پر عمل کیا، ہمیشہ آسانی رہی۔دیکھ لو آج ہمیں کسی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، سب کچھ آسانی سے ہو جائے گا۔'' افتخار نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے تفاخر سے کہا تو وہ بھی اس بات کی قائل ہو گئیں۔

''چلو تو پھر بسم اللہ کرو اور پیسے میرے ہاتھ میں تھماؤ تاکہ تیاری شروع کر سکوں۔''

''اماں میں آپ کو اچھے شاپنگ مال میں لے چلوں گا، لیہا اور صبا آج کل کے فیشن کے مطابق شاپنگ کرلیں گی۔'' آصف نے موبائل پر سے نظریں ہٹا کر کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیہا اور صبا بھی بہت پرجوش تھیں، اچھے شاپنگ مال سے خریداری کرنے کے لیے۔

☆☆☆

گاڑی شہر کے معروف شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں رکی تھی، آصف دروازہ کھول کر باہر نکلا۔لیہا اور صبا بھی اپنے دوپٹے اور پرس سنبھالتی گاڑی سے نکلی تھیں۔

''میری طرف کا دروازہ بھی کھول دو، مجھے کیا کار کی حفاظت کے لیے لے کر آئے ہو۔'' مریم نے کار کا دروازہ کھولنے کی اپنی سی ناکام کوشش کی تو جھلا کر بولیں۔آصف نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ غصے میں شیشے پر مکا مار کر شیشہ ہی توڑ ڈالتیں۔دوست کی گاڑی چند گھنٹے کے لیے مانگ کر لایا تھا۔

''اماں یہاں پر بہت پڑھے لکھے لوگ شاپنگ کے لیے آتے ہیں، اس لیے بہت شائستہ لب و لہجے میں بات کرنا۔''

''ارے واہ، شائستہ لودھی سے بھی بات ہو گی یہاں، بڑی پیاری لڑکی ہے۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔کیا کوئی دکان بنا رکھی ہے یہاں۔ یہ سارے اداکار یا تو کپڑوں کی دکان کھول لیتے ہیں یا پھر لیپا پوتی کی۔'' وہ ہمیشہ بیوٹی پارلر کو لیپا پوتی کی دکان کہتی تھیں۔آصف نے غصے سے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔اماں کبھی کبھی ایسے ہی زچ کر دیا کرتی تھیں۔

''خدا کے لیے اماں جگہ اور ماحول دیکھا کریں، بے تکا نہ بولا کریں۔ بس یہی آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' آہستگی سے کہتا ہوا وہ ان کو شاپنگ مال کے اندر لے گیا۔خودکار دروازہ کھلا تو اماں حیران ہوتی اندر داخل ہوئیں۔

چکنے پھسلتے ٹائلز، چکا چوند روشنیاں، ہر طرف شیشوں کے دروازوں سے بنی خوب صورت و دلکش کپڑوں، جوتوں، بیگز سے سجی دکانیں۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

زرق برق لباس پر لگے پرائس ٹیگ لیہا اور صبا جب پڑھ کر ماں کو سناتیں تو ان پر گویا برق ہی آ گرتی۔انہوں نے یہاں سے شاپنگ کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ چند موتی ستارے ٹکے سوٹوں کو وہ ہرگز اتنی قیمت میں نہیں خریدیں گی، اچھرہ یا پرانی انارکلی چلو۔ایک سے ایک خوب صورت، کام دار سوٹ ملیں گے، ایسے تو دس سوٹ آ جائیں جو ہم یہاں دو کی قیمت دیں گے۔

اماں کی اونچی آواز ان تینوں کو پریشان کر گئی' سیلز مین نے ان کی طرف اچنبھے سے دیکھا تو۔ آصف شرم سار ہو گیا، وہ ان تینوں کو لے کر پھرتی

سے دکان سے نکلا تھا۔

''آپ کو اندازہ ہے کہ آپ یہاں کس کی شاپنگ کے لیے نکلی ہیں۔ اچھرہ انارکلی کے سوٹ پہننے والی سے آپ نے رشتہ نہیں کیا ہے، اس طرح کی فیملیز صرف ڈیزائنر سوٹ پہنتی ہیں۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور جب میں اور ابا سارا خرچا کررہے ہیں، رقم آپ کے ہاتھوں میں ہے تو آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

چپ چاپ یہاں سے خریداری کرلیں ورنہ میں اپنے کسی دوست کی مسز کے ذمہ لگاتا ہوں یہ کام۔ آپ اپنے کپڑے اچھرہ سے لے لیجیے گا۔''

آصف انہیں ایک طرف لے گیا اور تپے لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔ ایہا اور صبا نے بھی ماں کو چند جملوں میں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چپ چاپ ان کے ساتھ اگلی دکانوں میں داخل ہوگئیں۔

ہلکے سے کام والے سوٹ کی قیمت جب ہزاروں روپے میں وہ ادا کرتیں تو ان کے چہرے کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی۔ دل تو ایہا اور صبا کا بھی ہل گیا تھا، اتنے مہنگے سوٹ اور بالکل معمولی سا کام۔ انہوں نے اپنے کپڑے یہاں سے لینے کا ارادہ فوراً بدلا تھا۔

''ہم تو خوب صورت کام والے سوٹ پہنیں گے آخر ہمارے بھائی کی شادی ہے۔ بارات والے دن کا جوڑا تو ہم بھاری کام والا لیں گے۔'' صبا نے سرگوشی میں ایہا سے کہا تو وہ بھی اس کی ہم خیال ثابت ہوئی۔

چند سوٹوں پر اتنا پیسہ خرچ ہوگیا تھا، باقی کے خرچے الگ، ان کی تو سانسیں مدھم ہونے لگیں۔

''چلیں آئیں، آپ کو یہاں سے کچھ کھلا پلا دوں۔''

''ہاں بھائی! مجھے زنگر برگر کھانا ہے۔'' صبا فوراً بولی تھی۔

''رہنے دو، چپ کرکے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ دو بن کو ایک دوسرے پر رکھ کر بیچ میں ذرا سی مرغی کی بوٹی، ایک دو سلاد کے پتے سجا کر سینکڑوں روپیہ بٹور لیتے ہیں۔'' مریم نے یہاں سے کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ دونوں بہنیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

''آپ گاڑی میں بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔''

آصف ان کو گاڑی میں بٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھر سے مال میں داخل ہوگیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا شاپر تھا جس پر زنگر برگر کی تصاویر بنی تھیں۔ اماں کا دیکھتے ہی منہ بن گیا جبکہ ایہا اور صبا کھل اٹھی تھیں۔ بھائی بہنوں کا ایسا ہی خیال کیا کرتے ہیں، وہ مزے سے برگر کھا رہی تھیں، آصف انہیں دیکھ کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

اس پر عجیب بےزاری اور قنوطیت طاری تھی۔ خیر بولتی تو وہ پہلے بھی زیادہ نہیں تھی مگر اب تو بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ گھر کے کام کاج کر کے کتاب ہاتھ میں پکڑتی تو کتنی ہی دیر تک ایک صفحے پر نظر جمائے بیٹھی رہتی۔ آصف کا سراپا آنکھوں میں آتا سارے لفظ گڈمڈ ہوجاتے۔

ہم لڑکیاں ایسی خوش فہم ہوتی ہیں اسے اپنے آپ پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ آصف نے ہنس کر، مسکرا کر چند جملے بول دیے تو میں نے اپنی ذات پر ان جملوں کو حاوی کرلیا۔ اس نے سرد آہ بھری اور سر بیڈ کراؤن سے لگالیا۔

لفظ جھوٹے ہوسکتے ہیں، کیا آنکھیں بھی جھوٹ بولتی ہیں۔ میں نے بارہا اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی واضح جھلک دیکھی ہے۔ اس کی لو دیتی نگاہیں محسوس کی ہیں، ان ہی نظروں نے تو میرے دل تک رسائی حاصل کی ہے پھر...... پھر وہ نظریں کیسے بدل گئیں۔

کیا روپیہ پیسہ محبت پر سبقت لے جاتا ہے۔

محبت...... ارے اسے مجھ سے محبت تھی ہی کہاں۔ محبت تو میں پگلی کر بیٹھی تھی اس سے......

ماں کی پکار پر وہ کمرے سے باہر آئی تھی۔

☆☆☆

شائنہ نے مساج کر کے اپنے سفید بے داغ نرم ہاتھوں کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر آئینے میں اپنے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور ایڈووکیٹ زوار کلیم کے پاس بیڈ پر آ بیٹھیں جو ہاتھ میں لسٹ تھامے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''خیریت ہے، کیا ہوا؟ ایسے کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ شوہر کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر فکر مند ہو گئیں۔

''ہمم...... کچھ نہیں بس یہ لسٹ چیک کر رہا تھا، تم بھی دیکھو کہیں کوئی کمی تو نہیں۔'' انہوں نے لسٹ شائنہ کے ہاتھوں میں پکڑائی تو انہوں نے بھی طائرانہ نظر ڈالی۔

''سب کچھ بہترین ہے مگر ایک بات ہے عمیمہ کا رشتہ تو پھر بھی مناسب تھا مگر یہ تو بالکل ہی معمولی خاندان میں رشتہ طے کر دیا آپ نے۔ سروں پر دوپٹے لیے ہلکے لباس پہنے وہ تقریبات میں شرکت کریں گی تو سوچیں ہماری کتنی سبکی ہو گی۔ ہمارا ایک اسٹینڈرڈ ہے اس کو تو مدنظر رکھتے۔'' شائنہ ابھی تک حنینا کے رشتے پر بگڑی ہوئی تھیں۔

''میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اپنے اسٹینڈرڈ کے لوگوں کا تمہیں اندازہ ہی ہے کہ کس قسم کے لڑکے پائے جاتے ہیں۔ بظاہر ایجوکیٹڈ اندر غلاظت سے بھرے۔ ایک چھوڑ دوسری پکڑنے کے چکر میں رہتے ہیں اور پھر تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہاں کرنے کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے۔'' شائنہ نظریں چرا گئیں۔

''معمولی خاندان کے لڑکے شریف ہوتے ہیں اور آصف انتہائی محنتی اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ بہت ترقی کرے گا، لڑکے کے گھر والوں سے تو بس شادی ہونے تک ہی تعلقات ہوتے ہیں، اس کے بعد تو لڑکے سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔'' سگار سلگاتے ہوئے انہوں نے شائنہ کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے ان کی بات سن رہی تھیں۔

''ایک بیٹی کی شادی اپنے سے کم خاندان میں کرنے کا تجربہ ہمارا اچھا رہا۔ لڑکا باہر سیٹل ہو گیا ہے، ہماری عمیمہ خوش ہے۔ دونوں اپنی زندگی اچھی گزار رہے ہیں، اسی طرح مجھے آصف سے بھی یہی امید ہے کہ حنینا کو خوش رکھے گا اور پھر ہم بھی تو ان کو خوش رکھنے کا سامان کر رہے ہیں۔ اس کے والدین کو اور کیا چاہیے، چھوٹے گھروں کے لوگ بڑے گھروں میں صرف لالچ کے لیے ہی رشتہ کرتے ہیں اور ہم ان کا در پردہ لالچ پورا کر رہے ہیں، ان کا بھی مقصد پورا اور ہم بھی بیٹیوں کی طرف سے مطمئن۔

آصف کی تنخواہ میں نے صدیقی سے کہہ کر ڈبل کروادی ہے۔ بہت خوش تھا آصف اور میرا احسان مند بھی۔ ایسی احسان مندیاں اسے مجھ سے نظریں ملا کر بات کرنے نہیں دیں گی۔ حنینا کا پلڑا بھاری رہے گا، وہ اپنی مرضی کی زندگی جی سکے گی اور پھر یہ روپیہ، پیسہ، دولت، جائداد ان بیٹیوں کی ہی تو ہے سو ان کو مناسب وقت پر استعمال کرو۔'' وہ تکیے سے ٹیک لگائے، سگار پیتے ہوئے بول رہے تھے۔

شائنہ اب دھیرے دھیرے اپنے بالوں میں برش پھیر رہی تھیں ان کے چہرے پر ایک اطمینان تھا۔ ''لڑکے کی ماں کی بھاری جھمکیاں، بہنوں کے لیے لاکٹ سیٹ، والد اور چھوٹے بھائی کے لیے قیمتی گھڑیاں۔ وہ تو اسی میں خوش ہو جائیں گے، سب کے بہت نفیس اور قیمتی سوٹ خریدے ہیں میں نے اور آصف کی شادی کے ڈریس کا مکمل انتظام ہماری طرف سے ہو گا۔'' برش سائیڈ پر رکھ کر انہوں نے بالوں کو چھوٹے سے کیچر میں جکڑا اور پاؤں پھیلا کر کمبل اپنے اوپر ڈالا۔

''ولیمے کا انتظام..میں نے پی سی میں کر دیا ہے، آصف کے والد کو آگاہ کر دیا ہے۔ منع کر رہے تھے کہ ہم لوگ خود ارینج کر لیں گے۔ میں نے رسان

سے سمجھادیا تو بڑے ممنون ہوئے۔"

"بہت اچھا کیا یہ تو آپ نے، وہ تو نجانے کون سے سستے میرج ہال میں ولیمہ کرتے۔"

"شادی ہونے تک لڑکے کے گھر والوں سے بہت عزت سے پیش آنا، مٹھائی، فروٹ کی ٹوکریاں لے کر ایک دو بار چکر لگالینا۔ خوش ہوجائیں گے وہ لوگ۔" زوار نے کہہ کر ٹیبل لیمپ بند کیا اور کمبل اوڑھ کر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ شائنہ نے بھی سر ہلا کر ان کی بات کی تائید کی اور تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

مریم سارے کپڑے نکال کر بیٹھی تھیں۔ ایہا اور صبا کی سہیلیوں کو آج آنا تھا سوٹوں کی پیکنگ کے لیے۔

"کب آئیں گی وہ تمہاری سہیلیاں، کپڑوں پر دھول مٹی جم جائے گی اور یہ فہیم بھی ابھی تک ڈبے لے کر نہیں پہنچا۔" وہ متفکر تھیں۔

"اماں اب کپڑوں کو ڈبوں میں پیک کرنے کا زمانہ ختم ہوگیا۔ فہیم بس ابھی آتا ہی ہوگا ڈمی لے کر۔" صبا نے ان کو بتایا تو وہ حیران رہ گئیں۔

"ماں گھر میں بیٹھی ہے وہ کون سی ممی لینے چلا گیا۔ دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تمہارا۔ بیٹے کی شادی کی تیاری دیکھ کر کیا تمہارے ابا کے بھی ارمان جاگ اٹھے۔ چپکے چپکے ہی کلمے تو نہیں پڑھ لیے، جوانی میں تو یاد نہیں تھے اب تو چھ کے چھ کلمے منہ زبانی یاد ہیں، جھٹ سے پڑھ لیے ہوں گے۔" مریم بے تکان بولتی جارہی تھیں اور وہ دونوں بہنیں ہنس ہنس کر پاگل ہورہی تھیں۔

"اپنی بتیسی اندر کرو ورنہ توڑ دوں گی۔ بھائی کی شادی میں منہ چھپاتی پھرو گی۔" وہ ان کی ہنسی سے تلملا رہی تھیں۔

"ہائے اماں! ایسا ظلم نہ کرنا۔" صبا ماں کے گال کو پیار سے چھو کر بولی۔ اسی دم رکشہ رکنے کی آواز آئی، فہیم ڈمی اٹھا اٹھا کر اندر لا رہا تھا۔

"اس ڈمی کی بات کررہی تھی میں، جس پر آپ نے اتنی بڑی کہانی تیار کرلی۔ اب ان ڈمی پر سوٹوں کو سیٹ کیا جاتا ہے، میری فرینڈز بھی بس آہی رہی ہیں، گھر سے نکل چکی ہیں۔" ایہا نے ان کو بتایا تو وہ ان ننگی ڈمیوں کو بغور دیکھنے لگیں۔

"حد ہوگئی بے غیرتی کی، عورت کو بالکل ہی عریاں کر کے رکھ دیا۔ اب ان پر کپڑے سجیں گے۔" وہ بھناتی وہاں سے اٹھ گئیں۔

فہیم بھی شرم سار سا وہاں سے اٹھ گیا تھا، کتنی شرم آرہی تھی اس کو ان ڈمی کو لانے میں۔ سارا راستہ رکشہ والا لڑکا ان کی ہیئت پر شریر گفتگو کرتا رہا اور وہ شرم سے پانی پانی ہوتا رہا۔ ان شادی بیاہ کے موقعوں پر کیسے کیسے فضول کام کرنے پڑجاتے ہیں۔ وہ جھلاتا رہا۔

☆☆☆

موسم کافی حد تک بدل چکا تھا، صبح وشام ہلکی ہلکی سی خنکی جسم کو گدگدانے لگی تھی اور افتخار کے گھر کا تو موسم ویسے بھی آج کل کچھ زیادہ ہی خوش گوار تھا۔ سب ہی بڑے اچھے موڈ میں رہتے۔ اماں بھی بات بے بات مسکراتی رہتیں۔ بہت سے انگریزی کے الفاظ ایہا سے سیکھ کر بولنے لگی تھیں۔ پچ موبائل پر کال اٹینڈ کرنا آ گیا تھا۔ بہو کے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے وہ اپنے آپ میں کافی تبدیلی لے آئی تھیں۔ منہ بند کر کے چھوٹے نوالے کھانے کی پریکٹس بھی خوب جاری تھی۔ ابا نے بھی چائے پیتے ہوئے منہ سے سڑ سڑ کی آوازیں نکالنا بند کردی تھیں۔

آصف وقتاً فوقتاً اماں کو پڑھی لکھی اور اپنی سے اونچے اسٹینڈرڈ کی بہو کے بارے میں انہیں کرتا رہتا کہ اس سے کیسا برتاؤ کرنا ہے۔ ہر بات میں مین میکھ، نکتہ چینی، بڑے گھروں کی بہوئیں ہرگز برداشت نہیں کرتیں۔ وہ دیر سے سو کر اٹھے یا دیر سے سوئے، اسے ٹوکنے کی ضرورت نہیں۔

"واہ میرے بچے، جتنی ہدایات تُو مجھے دے

رہا ہے اتنی ہدایات اپنی اس پڑھی لکھی مسز کو بھی دے دینا کہ اب میری ماں کے آرام کے دن ہیں، ان سے کام ہرگز نہیں لینا۔ جس طرح اماں کہیں ان کی مرضی کے مطابق رہنا۔ اگر اس نے تیری ہدایات پر عمل کرلیا تو پھر میں بھی ضرور عمل کروں گی ورنہ تو چپ کر کے تماشا دیکھنا، بہو کو رکھنا آتا ہے مجھے۔

چل اب زن مریدی کی باتیں چھوڑ، اپنے ابا کو سمجھا کہ کسی طرح بھائیوں کو منانے چلیں۔ روٹھوں کو منایا تو جاتا ہی ہے، بس ایک بار شادی پر آجائیں اس کے بعد کون پوچھے گا انہیں۔'' مریم آصف کی جھاڑ کے بعد اصل موضوع کی طرف آئیں تو آصف جز بز ہوگیا۔

فہیم ابا کو زبردستی ان کے کمرے سے نکال کر سب کے درمیان لے آیا تھا۔

''ابا! اماں صحیح کہہ رہی ہیں، ہمیں سارے چچاؤں اور پھوپھیوں کو شادی پر منالینا چاہیے۔ بے شک شادی پر آج کل یار دوست، محلہ ہمسائے، خاندان کی کمی کو پورا کردیتے ہیں مگر پھر بھی اپنوں کا ہونا ضروری ہے۔'' آصف نے ابا سے رسان سے بات کی۔

''تو اور کیا، آخر وہ بھی تو دیکھیں کہ کیسے اونچے خاندان میں آصف کی شادی ہورہی ہے۔ سسر ڈوگ کیٹ (ایڈووکیٹ) ہے۔'' مریم نے فخر سے کہا تو آصف جھلا گیا۔

''اماں درست لفظ بولا کریں، اللہ کے لیے فہیم! تم ہی اماں کو یہ لفظ رٹوادو ورنہ بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا مجھے۔'' فہیم نے اثبات میں سر ہلا کر اماں کو اصل لفظ آدھا آدھا کر کے یاد کروانے لگا تو وہ بار بار لفظ دہرانے لگیں۔ سب ان کے اس انداز پر مسکرادیے۔ ایسا لگ رہا تھا کلاس میں بچہ سبق کے رٹے لگا رہا ہے۔

''چلو یہ تو بعد میں یاد کرلوں گی، اپنے ابا سے کہو کہ کل ہی صفدر اور طاہر کی طرف چلتے ہیں، اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔''

''کس منہ سے جاؤں میں ان کے گھر، سب کچھ تو ہم نے ان کے بغیر کرلیا۔ اب کیا نام کرنے کو چلا جاؤں۔'' افتخار بھڑک اٹھے۔

''اے میاں! زیادہ بھڑکنے کی ضرورت نہیں ہے، اسی منہ کے ساتھ جاؤ گے تم اپنے بھائیوں کے ہاں۔ میں اور آصف بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ چاہے پاؤں پکڑو یا پگڑی پیروں میں رکھو، منانا تو پڑے گا تمہیں۔ ابا کو منالو سب سے پہلے، وہ مان گئے تو سمجھو سب ہی شادی میں شرکت کے لیے تیار ہوجائیں گے۔''

''ہاں ابا! اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں، ان سب کے بغیر شادی بالکل ہی پھیکی لگے گی۔ خوشیاں اپنوں سے ہی اچھی لگتی ہیں۔'' لبیبا نے بھی اپنی رائے دی تو افتخار کچھ کچھ راضی ہوتے دکھائی دیے۔

اندر سے شرم سار تھے کہ انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ منانا تو انہیں ہر حال میں تھا اگر اب بھی نہ منایا تو پھر تو وہ ہمیشہ کے لیے سب سے کٹ کر رہ جائیں گے۔

''صبح جمعہ ہے، جمعہ کی نماز کے بعد سب سے پہلے ابا کی طرف چلیں گے۔ وہ ہمیں جوتے ماریں یا دھتکاریں، چپ چاپ سنتی رہنا۔ میں قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں گا، اللہ سے بس دعا کرو کہ وہ کسی طرح راضی ہوجائیں۔''

اگلے دن جب وہ ابا کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر خوب گرجے برسے، دروازے سے ہی دھتکارا مگر وہ بھی ٹس سے مس نہ ہوئے، کان لپیٹے سنتے رہے۔ افتخار گھٹنوں سے لپٹ گئے، بھیگی پلکوں سے ہاتھ ان کے سامنے باندھ دیے۔ مریم بھی رُندھی آواز سے ان سے معافی طلب کرنے لگیں، آصف الگ گلے سے لپٹ گیا۔

آخر بہت کچھ سننے کے بعد افتخار کی پیٹھ پر لاٹھی برسا کر انہیں گھٹنوں سے جدا کر کے اپنے ساتھ بٹھایا، آصف کو گلے لگا کر پیار کیا اور مریم کو بھی ہاتھ اٹھا کر مزید بولنے سے روکا۔

افتخار کا چہرہ کھل اٹھا، مریم اور آصف نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ بس اب باقیوں کو منانا ایسا مشکل مرحلہ نہیں، ابا خود ہی سب کو راضی کر لیں گے اور یہی ہوا، سب جو ایک دم افتخار اور مریم کو دیکھ کر بھڑک گئے تھے۔ ابا کی گرج دار آواز نے سب کو یکدم ٹھنڈا کر دیا البتہ بہن اور بہنوئی ابھی بھی اکڑے ہوئے تھے۔

بہن اگلی پچھلی ساری زیادتیاں گنوانے بیٹھ گئیں۔ مریم دل میں پیچ و تاب کھاتی خاموشی سے سنتی رہیں۔ مصمم ارادہ کر لیا تھا "ایک دفعہ یہ کام نکل جانے دو، پھر کون سا بہنوئی اور کیسی بہن۔ آنے والے وقتوں میں تو بھائی کی شکل کو بھی ترسو گی۔" وہ منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں تاہم ابھی بڑی سمجھ داری سے کام لیتا تھا سونند کے گلے لگ کر تمام زیادتیوں کی معافی مانگی تو تابندہ بھی کچھ نرم پڑ گئیں۔

افتخار نے بھی محبت سے بہن کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ بالکل ہی پگھل گئیں۔ یہ بہنیں ہوتی ہی ایسی ہیں بھائیوں کی تھوڑی سی محبت اور پیار کے دو بول دل سے ساری رنجش و کدورت کو دھو دیتے ہیں۔

"چلو بھئی سب بچوں تیاری کرو، شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، سب ہماری طرف چل کر رہو۔" افتخار نے محبت سے بھانجا بھانجیوں سے کہا تو وہ کھل اٹھے۔ ماموں کے بچوں میں پہلی شادی تھی سب ہی پُرجوش ہو گئے۔ تابندہ بھی روتے سے مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

مہندی بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ آصف اور فہیم کے دوستوں نے بڑے پلان بنائے تھے۔ ایبا اور صبا کی فرینڈز، کزنز سب تیاریوں میں مگن تھیں۔ سب ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے چکروں میں تھیں۔

"مریم جہیز کا سامان نہیں بھیجا بہو کے گھر والوں نے ابھی تک، کیا نقد دینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" تابندہ کو تشویش ہوئی۔ مریم ابھی بتانا تو نہیں چاہتی تھیں مگر اب پوچھ ہی لیا تھا تو بتانا تو لازمی تھا۔

"آصف کی سسرال والوں نے لڑکی کو ڈیفنس میں کوٹھی مکمل سامان سمیت جہیز میں دی ہے۔ ہر چیز موجود ہے۔ بس جاؤ اور رہنے لگ جاؤ، مکینوں کے انتظار میں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بڑے تفاخر سے بتا رہی تھیں۔

"تو کیا بیٹا بہو کو ابھی سے الگ کر دو گی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، نئی نویلی دلہن کو میں تنہا کیسے رہنے دوں گی۔ ہم سب جائیں گے، سب مل کر رہیں گے، یہ مکان کرائے پر چڑھا دیں گے۔" ان کی بات سن کر تابندہ اور باقی خواتین منہ لٹکا کر بیٹھ گئیں۔

بڑا اونچا ہاتھ مارا تھا اس مریم نے۔ وارے نیارے ہو گئے تھے ان کے تو، بیٹا تو ان کے لیے لاٹری ثابت ہوا تھا۔

"اس محلے میں رکھا ہی کیا ہے، گندی مندی گلیاں، بدبو سے بھری نالیاں۔ کوئی صاحب حیثیت مہمان آ جائے تو کار اتنی دور سڑک پر کھڑی کرنا پڑتی ہے، بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ شکر ہے اس مالک کا کہ اس گندگی سے تو جان چھوٹے گی۔" ان کے لہجے میں بڑی کاٹ اور غرور تھا، جو وہاں پر موجود لوگوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا مگر سب ان کی خوشی کے خیال سے چپ ہی رہیں۔ رشک آ رہا تھا ان کی قسمت پر، کیسے ایک دم بدلی تھی اور اصل تو آنکھیں ان کی اس وقت پھٹی تھیں جب سسر نے نئے ماڈل کی کار کی چابی آصف کو سلامی میں دی۔

اسٹیج پر مریم بڑے کروفر سے کام والا نفیس سوٹ پہنے ہاتھ میں چھوٹا سا پرس تھامے بیٹھی تھیں۔ ایبا اور صبا بھی بالوں میں ہاتھ پھیرتی بڑی ادا سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھیں جیسے بھائی کی فتح کا جشن منایا جا رہا ہو۔ سمدھن شائنہ نے مریم کے ہاتھوں میں بھاری جھمکیوں کی ڈبیا پکڑائی اور چھوٹی بہالی نے ایبا اور صبا کے گلے میں گولڈ کے لاکٹ پہنائے تو ان کی گردنیں اکڑ سی گئیں۔ افتخار اور فہیم کے ہاتھوں میں بھی قیمتی گھڑیاں سج رہی تھیں، ان

سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ سب کو ان کی خوش نصیبی پر رشک آرہا تھا۔

سب محلے والے بھی مدعو تھے، رنگ ونور کی اس محفل کو دیکھ کر جیسے نظریں خیرہ ہوئی جارہی تھیں اور اصل نظریں تو اس وقت چندھیائیں جب نازک و نفیس ڈارک اسکن کام دار لہنگے میں نازک سی مورت آصف کے پہلو میں آکر بیٹھی۔ کتنی ہی دیر تک تو لوگ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ ہر ایک آنکھ میں ان کے لیے ستائش تھی یا حسد تھا۔ معمولی سے نین نقش والے آصف پر بھی آج تو خوب نکھار آیا تھا، پارلر والے نے اس کے نقش خوب ابھارے تھے اور رنگ بھی خوب چمک رہا تھا۔ دونوں انتہائی حسین لگ رہے تھے۔

اورینب نے دل کو سنبھالتے ہوئے ان پر ایک نظر ڈالی اور پھر ایک طرف کو ہوگئی۔ مجھ جیسی واجبی رنگت و نقش و نگار کی اس پری پیکر کے سامنے کیا اوقات، تم نے تو سب کچھ پالیا آصف۔ اللہ کرے کہ خوشیاں تمہارا مقدر بنی رہیں۔

تصویریں اور مووی کیمرے ان کے ایک ایک انداز کو قید کررہے تھے۔ دلہن کے ہمراہ اسٹیج سے اترتے ہوئے آصف کی نظر اچانک ہی اورینب پر پڑی تھی، دونوں کی نگاہ آپس میں ٹکرائی تھی، آصف نے فوراً ہی اپنی نظریں اپنے ساتھ چلتی حسینہ پر مرکوز کردیں۔

اورینب کا دل چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آصف کچھ کنفیوژ تھا۔ ایک تو حتینا کا حسن اسے مرعوب کیے جارہا تھا تو دوسری طرف وہ اس کی امارت کے زیراثر تھا، اس کا اعتماد کمزور پڑ رہا تھا۔

حتینا رخصت ہوکر سیدھی اپنی ڈیفنس والی کوٹھی میں گئی تھی۔ آصف نے چند دن پہلے ہی اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تھا۔ حتینا کا منتخب کردہ کمرہ اس نے حجلۂ عروسی کی آرائش کے لیے آرڈر کردیا تھا، کمرہ پھولوں کی مہک میں بسا تھا۔

اسے کوئی بھی تحفہ حتینا کے شایان شان نہیں لگ رہا تھا، بڑی دقت کے بعد اس نے ایک بریسلیٹ منتخب کیا تھا مگر اب دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ پتا نہیں اسے پسند آئے گا یا نہیں۔ اس نے ہمت کرکے اس کی نازک کلائی میں بریسلیٹ پہنایا تو وہ مسکرادی۔ اس کے گداز لبوں کی مسکراہٹ سے آصف کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی فوراً اسے اماں اور گھر والوں کا خیال آیا تھا کیونکہ نئے گھر میں ابھی صرف وہی آئے تھے باقی سب پرانے والے گھر گئے تھے۔ اس نے فہیم کو فون کرکے سب کو وہیں لانے کو کہا تھا، تھوڑی دیر بعد فہیم سب کو لے آیا تھا۔ مریم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بہو کی چٹاچٹ بلائیں لینی شروع کی تھیں۔ جس پر اس کے ماتھے پر ناگواری کا تاثر ابھرا تھا مگر وہ سنبھل گئی۔ آصف نے بغور حتینا کا جائزہ لیا تھا۔ اماں کی گرم جوشی کے مظاہرے پر اس کے تاثرات بالکل سرد تھے۔

ایبا اور صبا بھی بھابھی کو بس دیکھتی رہیں، حتینا کا انداز بےتکلفی سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اس کے گھر والے ناشتا لے کر آئے تو وہ دونوں بہنیں میز پر لگانے لگیں۔ دل ایک دم بجھ سا گیا تھا، فہیم بھی کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ ابا تو پہلے ہی باہر صوفے پر بیٹھے تھے، اماں البتہ کمرے میں گھسی بیٹھی رہیں، تھوڑی دیر بعد وہ گال پیٹتی باہر نکلی تھیں۔

''توبہ، کس بےشرمی سے اس کے سارے کزن اس سے چھیڑ چھاڑ کررہے ہیں اور اس آصف کو بھی حیا نہیں آرہی کہ ٹوک دے سب کو۔ آخر اس کی بیوی اب اس کی عزت ہے، کوئی لڑکا بےتکلفی سے کیوں اس کی بیوی سے بات کرے پر وہ تو گونگے کا گڑ کھائے، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بیوی کے ساتھ چپک کر بیٹھا تصویریں بنوا رہا ہے۔''

لیہا اور صبا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

گیلے بال اس کی پشت پر لہرا رہے تھے، دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ وہ اپنے مرمریں ہاتھوں میں ڈرائر سنبھالے اب بال خشک کرتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے آصف گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیتا اور پھر سے موبائل پر انگلیاں چلانے لگتا۔ حسینا کو وہ نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا، اس کے حسن کو آنکھوں میں بسا لینا چاہتا تھا مگر ان کے درمیان ابھی ایسی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے سوچتا، اس کا موڈ جانچتا اور بول کر وسوسوں کا شکار ہو جاتا کہ پتا نہیں اب کیا ردعمل ہو۔

چند دن پہلے ہی وہ ہنی مون سے لوٹے تھے۔ اس دوران جہاں حسینا کا ہنسنے کا دل چاہتا دل کھول کر ہنستی، بولنے کا جی چاہتا تو بولتی چلی جاتی اور جب آصف کا اس سے ہم کلام ہونے کا جی چاہتا، وہ بے تکلفی کی راہیں پاٹنا چاہتا تو وہ ایک دم سے اجنبی بن جاتی۔ ناگواری سے اس کی طرف ایسی نگاہ ڈالتی کہ وہ شرمندہ ہو جاتا۔ اس کا مزاج ایسا ہی تھا پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ وہ خاموشی و صبر سے اس کے مزاج کو سمجھنے میں لگا تھا۔

''آصف! آج مما نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے ہمیں۔'' اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کے قریب آ بیٹھی۔ آصف کی سانسیں جیسے تھم سی گئی تھیں، اس کا انداز بہت لگاوٹ اور محبت والا تھا۔ وہ اپنے نصیب پر رشک کرنے لگا تھا، اتنی حسین بیوی کہ بندہ اپنے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو جائے۔ موبائل ایک طرف رکھ کر آصف نے اس کا ہاتھ تھام لیا وہ اس کے ہاتھ کو پکڑے دھیرے دھیرے اس پر اپنا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''چلے چلیں گے۔'' آصف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ حسینا کی پلکوں پر لرزش ہوئی۔

''آپ کو برا تو نہیں لگے گا آصف! میں نے آپ کی مرضی جانے کے بغیر ہی مما کو یس کہہ دیا۔'' وہ اس کی بات سن کر آنکھوں میں ساری محبت سمیٹ لے آیا تھا۔ اس کی طرف دیکھتی، اس کی ذات کا احساس کرتی، آصف کو اس دم وہ بڑی اپنی اپنی لگی تھی۔

''بالکل بھی نہیں میری جان! تمہاری مرضی میری مرضی، تمہاری خوشی میری خوشی۔'' وہ خوش دلی سے بولا تو وہ اپنے بال جھٹکتی، ہاتھ چھڑاتی اس کے پاس سے اٹھی تھی۔

''تھینک یو آصف! بابا کا انتخاب کچھ غلط نہیں تھا۔ ان کی زیرک نگاہوں نے پل میں جانچ لیا تھا کہ آپ ان کی بیٹی کا بہت خیال رکھیں گے۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی اسے شیشے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آصف اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''آپ کے بابا کے انتخاب کا تو مجھے پتا نہیں البتہ میں اپنے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔'' آصف نے کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔ حسینا کے لبوں پر بڑی فخریہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

''ارے ہاں یاد آیا آصف! آنٹی کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔ اب تو ہم ہنی مون سے بھی واپس لوٹ آئے ہیں۔ ان لوگوں کو کیا مزید ڈسٹرب کرنا۔ اب وہ اپنے گھر جا سکتے ہیں۔''

وہ لپ اسٹک لگا کر دونوں ہونٹوں کو آپس میں مس کرتی لاپروائی سے بولی۔ اس کی بات سن کر آصف کا دماغ گھوم گیا سارا رومانس اڑن چھو ہو گیا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب تو سمپل ہے ہم دونوں کی اپنی لائف ہے۔ میں چاہتی ہوں اب ہم اپنی روٹین لائف اسٹارٹ کریں۔ میری اپنی ایکٹوٹیز ہیں۔ کسی کی موجودگی مجھے ڈسٹرب کرے گی۔''

''کیا اس گھر میں صرف ہم دونوں رہیں گے اماں...... ابا، میرے بہن بھائی اس گھر میں نہیں رہیں گے۔'' وہ ہکلا گیا تھا۔

"آف کورس"۔ اس نے نظریں اور گردن خم کی تھی
"مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے، میں اپنے گھر والوں سے کیسے الگ رہ سکتا ہوں۔"
"جیسے میں رہ رہی ہوں۔" اس نے پھر سے آنکھیں گھمائی تھیں اور آصف گھوم کر رہ گیا تھا۔
"نہیں حنینا! میں اپنے گھر والوں کو یہاں سے جانے کا ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ یہاں سے جائیں گے تو پھر ہم بھی ان کے ساتھ ہی اسی گھر میں چلیں گے۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہیں گے۔"
"یہ کیا بچپنا ہے آصف! میرے بابا نے مجھے یہ گھر اسی لیے لے کر دیا ہے کہ میں سکون سے اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزار سکوں اور تم چاہتے ہو کہ میں اس غلیظ محلے میں جا کر رہوں جہاں پر چلتے ہوئے اپنے کپڑے بھی سنبھالنے پڑتے ہیں۔"
"ہنہ......اس نے اس کا مذاق اُڑایا تو آصف کا رنگ اُڑ گیا تھا۔
"تم نے ابھی وہ محلہ دیکھا ہی کہاں ہے ڈیئر! ایسا بھی گیا گزرا محلہ نہیں ہے ہمارا۔"
"بس رہنے دو آصف! اچھا ہے کہ میں نے نہیں دیکھا۔ مما نے تمہارے گھر کی بھرپور منظر کشی ہے میرے سامنے۔ میں ایسے گھر میں جانا پسند نہیں کرتی اور تم رہنے کی بات کرتے ہو۔" وہ استہزائیہ مسکرائی۔
"اوکے، اگر تم وہاں جانا نہیں چاہتیں تو نو پرابلم پھر میرے گھر والے بھی یہاں سے نہیں جائیں گے۔" وہ ڈٹا رہا۔ حنینا نے لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھا تھا۔
"اٹس اوکے۔ میں انیکسی سیٹ کروا دیتی ہوں۔ وہ لوگ وہاں رہ لیں گے۔ میں اپنی پرائیویسی ختم نہیں کرنا چاہتی۔"
دو ٹوک بات کہہ کر وہ کمرے سے نکل چکی تھی۔
آصف جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ڈنر سے رات گئے واپسی ہوئی، آصف کو اس کے سسرال والے بہت پروٹوکول دیتے تھے۔ سسر بہت اپنائیت سے ملتے اور چھوٹی سالی بھی اس سے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی۔ پہلے وہ لیا دیا سا رہتا تھا، اب وہ بھی بے تکلف ہونے لگا تھا ان سے۔
اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے اماں کے کمرے کی طرف نظر ڈالی تھی۔ وہ یقیناً سو چکی ہوں گی صبح بات کرلوں گا۔
"صبح لازمی بات کرلینا آصف! اپنی اماں سے۔" حنینا نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی، اس نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔
"صبح ہی صبح گھر میں بے ہنگم آوازیں اور شور مجھے ڈسٹرب کرتا ہے۔ میری نیند خراب ہو جائے تو پھر سارا دن میرا موڈ آف رہتا ہے۔" اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ صوفے پر اچھالتے ہوئے اپنی عادت سے آگاہ کیا۔ آصف خاموش ہی رہا۔
صبح آفس جانے کے لیے وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ حنینا پر اس نے نظر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی اس کے چہرے پر کرنیں بکھری تھیں۔ آصف نے ایک نظر آئینے میں اپنے سراپے اور ایک نظر حنینا کے چہرے پر ڈالی۔ وہ اس سے کہیں کم تر تھا۔ مالی لحاظ سے بھی اور خوب صورتی کے لحاظ سے بھی اور یہی بات آصف کو اس کے سامنے کمزور کر دیتی تھی۔
پرفیوم اسپرے کر کے اس نے احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اتنی ہی آہستگی سے بند کر کے وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔
اماں حسب معمول کچن میں گھسی سب کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ ابا شاید ناشتا کر کے دکان پر جا چکے تھے۔ وہ ان کے پاس کچن میں ہی چلا آیا۔ پراٹھوں کا دھواں پورے کچن میں پھیل کر لاؤنج میں بھی اپنا ڈیرہ جما چکا تھا۔ اس نے جلدی سے کچن میں لگے بلور کا بٹن دبایا سارا دھواں منظر سے غائب ہونے لگا۔

”واہ یہ تو بڑی اچھی مشین ہے۔ سارا دھواں لمحوں میں غائب ہوگیا۔ کل سے یہی بٹن دبا دیا کروں گی۔“ وہ اپنی دھن میں بولتی میز پر اس کے لیے رات کا سالن اور آملیٹ رکھنے لگیں۔

”چلو اب جلدی سے ناشتا کرلو، گرم گرم پراٹھا ہے، مزا آجائے گا کھا کر۔“ وہ بھی اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں اور پراٹھے کے بڑے بڑے نوالے حلق سے اتارنے لگیں۔

”نہیں اماں! اب پراٹھے کھانے کو دل نہیں کرتا۔“

”اچھا.....؟“ انہوں نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ہاں بھئی اب میرا بیٹا بڑا افسر جو بن چکا ہے۔ اتنے بڑے بنگلے میں رہتا ہے۔ گاڑی میں گھومتا ہے، پراٹھے کھاتا اچھا لگے گا۔ یہ لو یہ توس کھالو۔ ایبہا بھی ڈائٹنگ کررہی ہے۔ صبح ناشتے میں صرف چائے کے ساتھ یہ توس لیتی ہے۔“

انہوں نے دوسرا ہاٹ پاٹ کھول کر اس کے سامنے رکھا۔ آصف توس دانتوں سے کترنے لگا۔ مریم اب اس کے لیے کپ میں چائے انڈیل رہی تھیں۔

”حینا نہیں جاگی ابھی تک۔“

”نہیں۔“

”ابھی سے بیوی کو اتنی آزادی دینے کی ضرورت نہیں۔ شوہر کام پر جارہا ہے اور بیگم مزے سے خراٹے لے رہی ہے اور ہاں اب تو تم سیر سپاٹے کرکے بھی آگئے، بیوی سے کہو گھر کے کام سنبھالے۔ کل ہی کھیر پکائی کی رسم کرلیتے ہیں۔ تمہارے ددھیال اور ننھیال والوں سب کو کھانے پر بلالیتی ہوں۔ تمہارے خاندان والے کوٹھی بھی اچھی طرح دیکھ لیں گے۔ وہ لوگ تو میرج ہال میں ہی آئے اور وہیں سے رخصت ہوئے۔ اب ایک بار یہ کوٹھی تو دکھانی ہے انہیں تاکہ ہماری حیثیت کا اندازہ ہو انہیں۔“ اماں کا بولنا اسے تکلیف میں مبتلا کررہا تھا۔

”اماں وہ.....“ ان پر خفیف نظر ڈال کر وہ چائے کے مگ پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

”کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے۔“ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”اماں بات دراصل یہ ہے کہ حینا کو اکیلے رہنے کی عادت ہے۔“ وہ کہہ کر چپ ہوگیا ماں کا ردعمل دیکھنے کو نظر اٹھائی۔

”اکیلے رہنے کی عادت ہے تو تم سے پھر شادی کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ حیرت زدہ تھیں۔

”میں اس اکیلی کی بات نہیں کررہا۔ الگ گھر میں رہنے کی عادت ہے۔ آپ کو تو پتا ہے ان کا بڑا سا بنگلہ ہے، چند افراد ہیں۔ سب کی اپنی اپنی ایکٹوٹیز ہیں، کوئی کسی کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ سب ایک مزاج کے ہیں۔“

”پھر.....“ اماں کے ماتھے پر تیوریاں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ ”وہ اس کا گھر تھا۔ وہاں کی عادتیں اسے وہیں چھوڑ کر آنا تھیں۔ یہ سسرال ہے یہاں پر اس کا مزاج نہیں دیکھا جائے گا، جس طرح سب رہتے ہیں، اسے بھی اسی طرح رہنا پڑے گا۔“ وہ لاپروائی سے کہتی ہوئی چائے کے گھونٹ لینے لگیں۔

”یہ سسرال کا گھر نہیں ہے اماں! یہ اس کا گھر ہے۔ دوسروں کی موجودگی اسے ڈسٹرب کرتی ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں اس کے اور آپ سب کے درمیان کوئی رنجش جنم نہ لے۔ آپ لوگوں کے لیے میں انیکسی سیٹ کروادیتا ہوں۔ ہر ضرورت اور ہر سہولت میسر ہوگی آپ کو وہاں، بہت آرام سے رہیں گے آپ سب لوگ۔“ وہ اپنی بات کہہ کر چور بن گیا تھا۔ اماں کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی سو اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل میز پر سے اٹھا کر وہ کچن سے جلدی سے نکلا تھا۔

”وہ گیارہ، بارہ سے پہلے ہرگز نہیں اٹھے گی، فہیم سے کہنا ذرا اپنا والیوم کم رکھے، اس کی نیند نہ ٹوٹے۔“ نکلتے ہوئے اس کی ہدایت مریم کا خون کھولا گئی۔

یہاں پر رہنے کے تو انہوں نے بہت خواب بنے تھے۔ سب کی مرادیں بر آئی تھیں۔ انہوں نے تو اس گھر میں بڑے دھڑلے سے رہنے کا سوچا تھا ابھی تو خاندان والوں کو جلانا تھا، مگر یہاں تو ان کا خود کا دل ہی جل کر رہ گیا تھا۔

''آنے دو شام کو، ابھی سے ہم سے نظریں پھیر رہا ہے۔'' مگر شام آنے سے پہلے ہی ان کے سب ارادے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔

جب تک حنینا سو کر اٹھی وہ تینوں ماں بیٹیاں گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو چکی تھیں۔

حنینا اپنے کمرے سے نکلی تو وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

ابیہا ایل ای ڈی پر بڑے انہماک سے کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی، مریم پیاز کاٹ رہی تھیں۔ قریب ہی لہسن باؤل میں چھلے رکھے تھے۔

''السلام علیکم!'' اس کی آواز پر تینوں نے ہی چونک کر دیکھا تھا۔

ابیہا نے فوراً ہی ریموٹ سے آواز کم کی تھی۔

''وعلیکم السلام! اٹھ گئیں بیٹا! صبا جاؤ بھابھی سے پوچھ کر ناشتا بنا کر لاؤ۔'' صبا فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

''ہاف فرائی انڈا، ایک بریڈ کا سلائس اور ایک کپ چائے یہیں لے آؤ۔'' اس نے آرڈر دے کر اشارے سے ابیہا سے ریموٹ مانگا اور اپنی پسند کا چینل لگا لیا۔

''آنٹی پلیز، پیاز کاٹنا بند کر دیں، میری آنکھوں میں جلن ہو رہی ہے۔''

مریم کے چھری چلاتے ہاتھ یک دم ہی رکے تھے۔

''پلیز یہ کام آپ کچن میں ہی کر لیا کریں۔'' کہہ کر وہ پھر سے ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ابیہا سب چیزیں اٹھا کر کچن میں رکھ آئی تھی۔ صبا بھی ناشتا بنا کر اس کے سامنے رکھ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے ناشتا کرتی رہی۔

''بیٹا! میں چاہ رہی تھی کہ ایک دو دن میں تم سے کچھ میٹھا بنوانے کی رسم کر لیں۔'' مریم نے دھیرے سے اس سے بات کرنی شروع کی۔

''وہ کیوں؟''

''یہ ایک رسم ہے، نئی نویلی دلہن کوئی میٹھی چیز بنا کر ہی گھر کے کام کاج شروع کرتی ہے۔'' بڑے پیار سے میٹھے لہجے میں بولی تھیں۔

''سوری آنٹی! نہ تو میں کچن میں گھسوں گی اور نہ ہی گھر کے کام کاج کروں گی۔ میرے گھر میں شروع سے ملازمین یہ کام کرتے ہیں۔'' اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھا۔

مریم اس کے کورے جواب پر چیں بہ چیں ہو گئیں۔ ابیہا اور صبا، حنینا کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ اس کا انداز بہت لیا دیا سا تھا۔

''ملازمین کہاں گھر کی صحیح دیکھ بھال کرتے ہیں جب تک خود توجہ نہ دو۔'' حنینا نے اس بار ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے بالوں میں دھیرے سے انگلیاں پھیرتی رہی۔

''لائیں بھابھی! میں آپ کے بالوں میں آئل لگا دوں۔'' صبا نے جھٹ اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں وہ بھابھی سے بے تکلفی کی راہیں تلاش کر رہی تھیں۔ ابھی تک ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار قائم تھی، سرسری سی گفتگو ان کے درمیان ہوتی تھی۔

''نو تھینکس۔''

''تیل لگوا لو بیٹا! بال مضبوط ہوتے ہیں آئل لگانے سے۔''

''بازار میں آج کل ان کی مضبوطی کے لیے اور بھی بہت کچھ دستیاب ہے۔ آئل لگانا مجھے پسند نہیں۔'' کتنا دوٹوک جواب دیا تھا اس نے۔

''آنٹی! آپ لوگوں کے لیے انیکسی سیٹ ہو جائے گی ایک دو دن تک۔ آپ لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں۔ یہاں کا کچن بھی آپ سنبھال لیں گی تو

مجھے خوشی ہوگی۔ ایہا اور صبا آپ دونوں تو فری ہی ہوتی ہیں ناں۔ ادھر کی ڈسٹنگ بھی کرلیا کریں۔ اگر کوئی مصروفیت ہے تو میں ارینج کرلوں گی۔''

حسینا نے اپنی بات کہہ کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں ،ہم سب کام سنبھال لیں گے۔ تم فکر نہ کرو اور انیکسی میں ہم کیوں شفٹ ہوں، سب مل جل کر ہی رہتے اچھے لگتے ہیں۔ تم ہمارے گھر کا فرد بن چکی ہو، اکیلی رہتی اچھی تو نہیں لگو گی۔ لوگ کیا کہیں گے بہو کو اکیلا چھوڑ دیا۔''

''آنٹی! ہماری فیملی میں اکیلے رہنا کوئی معیوب بات نہیں۔ دراصل میں نہیں چاہتی کہ میری روٹین سے آپ لوگوں کو ڈسٹربنس ہو یا آپ لوگوں کے لائف اسٹائل سے مجھے پریشانی ہو۔ آپ لوگوں کا خاندان کافی بڑا ہے اور اسی شہر میں ہے۔ آنا جانا لگا رہا کرے گا۔ میرا اپنا سرکل ہے یہ تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہم دونوں کی فیملیز میں بہت تضاد ہے۔ میری فرینڈز بہت ہائی فائی فیملی سے بی لونگ کرتی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ انہیں پتا چلے کہ میری شادی اتنی لو فیملی میں ہوئی ہے۔''

کتنا تضحیک بھرا لہجہ تھا اس کا وہ تینوں تپ گئیں مگر ضبط سے کام لے رہی تھیں۔

''اور پھر آپ لوگ ہم سے زیادہ دور تو نہیں ہیں، ملنا جلنا تو رہے گا۔ آصف آپ کی تمام ضرورتوں کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ اس لیے آپ کو سوچنے اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مریم بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر ساری باتیں ہونٹوں میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔

''دوپہر میں میں تو کچھ لوں گی نہیں، آپ لوگ اپنے لیے جو بنانا چاہیں بنالیں۔ رات کو ہم دونوں باہر ڈنر کریں گے۔''

وہ بہت مزے سے ان پر بجلیاں گرا کر اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مریم صوفے پر سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ایہا اور صبا کے چہرے بھی دھواں دھواں ہو رہے تھے۔

☆☆☆

آصف پر انہیں بے طرح غصہ آرہا تھا۔ کتنی جلدی بیوی کی باتوں میں آگیا تھا۔ ایسا تو وہ ہرگز نہیں ہونے دیں گی۔ یہیں پر رہیں گی اور مکمل استحقاق سے رہیں گی۔ انہوں نے تہیہ کرلیا تھا۔

صبح وہ جلدی ناشتا تیار کر کے لاؤنج میں آبیٹھیں۔ ذرا دیر بعد ہی آصف کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کرنے کی بجائے خارجی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ ماں کو دیکھ کر بھی وہ انجان بن گیا تھا۔

''یہاں آؤ آصف!'' ماں کی پکار پر اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

''اماں! میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔ آج ناشتا نہیں کروں گا۔'' وہیں سے دھیمے لہجے میں کہا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔

''میں تمہیں ناشتے کے لیے نہیں روک رہی۔ میرے کمرے میں آکر میری بات سن کر جاؤ۔ آفس سے دیر ہو رہی ہے تو چھٹی کرلو۔ تمہارا باس تو تم پر مہربان ہے ناں۔ تمہارے سسر کا گہرا دوست جو ہے۔''

طنزیہ لہجے میں کہتی وہ اسے گھورتی اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ آصف نے بھی بالوں میں ہاتھ پھنسائے ان کی پیروی کی۔ ماں کے جارحانہ رویے سے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔

مریم بیڈ پر بیٹھیں تو اسے بھی اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

''کل تم نے جو فرمان جاری کیا تھا۔ بہوئے بھی ہو بہو ان ہی لفظوں میں ہمیں اس گھر سے نکلنے کا

حکم دیا ہے بلکہ اضافے کے ساتھ مجھے خانساماں کے فرائض انجام دینے ہوں گے اور میری بیٹیاں ملازمہ بن کر گھر کی صفائی ستھرائی کریں گی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولیں تو آصف خفیف سا ہو گیا۔

"ایسا تو میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ ہم سب یہیں رہیں گے اور اس نازک کبوتری کو اپنے لفظوں میں سمجھا دو کہ ساس سے ذرا زبان سنبھال کر بات کیا کرے، ایک بار تو برداشت کر لی، بار بار بالکل نہیں کروں گی اور میری بیٹیاں اس کی خدمت گار نہیں ہیں، آئندہ سے اپنی چائے پانی کا خود انتظام کرے۔ میٹھے کی رسم نہیں کرتی تو نہ کرے لیکن گھر کی ذمہ داریاں سنبھالے۔ شادی کے بعد لڑکی کے یہ نخرے قابل برداشت نہیں ہوتے۔"

"اماں! میں کیسے اس سے یہ سب کہوں اگر یہ فرمان میں نے اس پر تھوپا تو روٹھ کر میکے جا بیٹھے گی۔ جس گھر کی بیٹی آپ بیاہ کر لائی ہیں ناں وہ ایسے ہی نخرے دکھاتی ہیں۔ گھر کے کاموں کو تو آپ بھول جائیں کہ وہ کرے گی، اگر میں نے ذرا سا بھی سخت لہجہ اپنایا تو مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ غصے میں سسر اپنے دوست سے کہہ کر نوکری سے فارغ کروا دیں گے۔ یہ گھر ان کا ہے پھر ہم کہاں جائیں گے۔ وہیں اپنے پرانے گھر اور اسی پرانے محلے میں۔ سوچیں ذرا، لوگ کتنی باتیں بنائیں گے۔ جن لوگوں کے سامنے آپ نے اتنی بڑی بڑی باتیں کی ہیں، وہ لوگ ہمارا کیسا مذاق اُڑائیں گے۔ اندازہ ہے آپ کو۔" آصف نے ماں کو یاد دلایا۔

"تجھ سے یہ بڑے گھر کی لڑکی نہیں سنبھالی جا رہی۔ بے وقوف نہ بن ابھی سے بیوی کی ماننے لگا تو ساری عمر سر پکڑ کر روئے گا۔ اسے اپنے اوپر حاوی نہ کر۔ تُو شوہر ہے، شوہر بن کر رہ۔ اپنے رعب میں رکھ اسے۔ جب تیرے بہن بھائیوں اور ماں کے بارے میں کوئی فضول بات کرے تو بے نقط سنا۔ ایسی جھاڑ پلا کہ آئندہ جراُت نہ کر سکے۔ روٹھ کر جانے کی غلطی وہ کبھی نہیں کرے گی اور اگر میڈم چلی بھی گئی تو ماں باپ تو خیال کریں گے اس بات کا نہ، بیاہتا لڑکی میکے میں روٹھ کر بیٹھ جائے تو رشتہ دار سو سو باتیں بناتے ہیں۔ انہیں بھی تو اس بات کا ڈر ہو گا تو پھر کیسے وہ اپنی بیٹی کو اپنے گھر میں روکیں گے۔ سمجھا بجھا کر اپنے گھر واپس بھیج دیں گے۔" مریم نے اسے سمجھایا۔

"اماں! میں کیسے آپ کو سمجھاؤں۔ ان کی فیملی میں بیٹی کا روٹھ کر آنا کوئی معیوب بات نہیں ہوتی۔ اِدھر وہ روٹھی، اُدھر ساس سسر میری کلاس لینا شروع کر دیں گے۔ بتائیں میں کیا کروں گا۔ میں آپ کو پہلے ہی سمجھا چکا ہوں کہ فی الحال حالات سے سمجھوتا کریں، آپ لوگ یہیں رہیں گے میرے پاس۔ میں آپ کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ ہمارے درمیان ذرا سا یہ فاصلہ کوئی فاصلہ پیدا نہیں کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ میں حنا کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں پھر ہم سب ایک ہی جگہ مل کر رہیں گے، بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔" اس نے ماں کے گھٹنے تھام لیے۔

مریم نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"اپنا سکہ ہی جب کھوٹا ہو تو کسی دوسرے سے کیا گلہ۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔ آصف نظریں جھکا گیا۔

"میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں اماں! مجھے مزید شرمندہ نہ کریں، اپنے بہن بھائیوں اور ابا کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی مجھ میں۔ آپ تو بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، میرا ساتھ دیں۔ انہیں بھی رسان سے سمجھائیں۔ یہ رشتہ آپ کی ایما پر ہوا ہے، آپ کو ہی بڑے گھر سے بیٹی لانے کی چاہ تھی، لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانی تھی۔ اب کچھ تو برداشت کرنا پڑے گا آپ کو، میں تو خود پریشان ہوں۔ میں نے کب ایسا سوچا تھا۔ ابھی تک تو مجھے بھی اس کے سامنے سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا ہے۔" آصف کے لہجے میں رنجیدگی تھی۔ پشیمانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مریم نے بھی اس کی بات سن کر ہتھیار ڈال

دیے۔

''یاد رکھنا! مرد اڑیل سے اڑیل عورت کو بھی لگام ڈال سکتا ہے اگر اس میں غیرت اور مردانگی کا احساس ہو تو۔ تمہارے ابا اور باقی سب کو میں سمجھالوں گی۔ اگر تم نے ہم سے آنکھیں بدلیں تو اچھا نہیں ہوگا۔ اپنی بیوی سے کہو خانساماں کا انتظام کرلے اپنے لیے۔ ایہا اور صبا بھی یہاں کی صفائی نہیں کریں گی۔''

''اماں! وہ آپ کے ہاتھ کا کھانا پسند کرتی ہے اور آپ سوچیں، خانساماں کا انتظام تو وہ کرلے گی مگر تنخواہ تو میری جیب سے ہی جائے گی ناں۔ اگر آپ کچن سنبھالیں گی تو یہی رقم آپ لوگوں کے کام آجائے گی۔''

مریم نے اس کی بات پر غور کیا۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہا تھا۔

''ٹھیک ہے لیکن ایہا اور صبا ہرگز اس کی ملازمہ نہیں بنیں گی۔''

''چلیں صفائی کے لیے میں میڈ رکھ لیتا ہوں بس وہ دونوں اپنی نگرانی میں کام کروالیا کریں گی۔ آپ لوگوں کا ادھر آنا جانا ہوگا تو ایک دوسرے سے بات چیت رہے گی۔ اسے بھی رشتے کا احساس ہوگا کچھ تو وہ بھی آپ لوگوں کا خیال کرے گی۔''

آصف کی بات میں وزن تھا۔ انیکسی میں شفٹ ہونے پر وہ اگر وہاں کے کچن کی ذمہ داری نہ سنبھالیں تو پھر تو ان کا یہاں سے رابطہ ہی کٹ جائے۔ بہو بالکل ہی آزاد ہوجائے گی اور ایسا تو وہ بالکل بھی نہیں چاہتی تھیں اس پر نظر تو رکھنی تھی ان کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا تھا اس کو۔

''ہم کل ہی ادھر شفٹ ہوجائیں گے، کل تک سارا انتظام ہوجائے۔ وہاں میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی بالکل برداشت نہیں کروں گی۔ میرے بچوں کے لیے ہر سہولت موجود ہو وہاں۔'' مریم کی بات پر آصف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چل اب جا، بہت ٹائم دے دیا تو نے ماں کو۔'' ان کا طنزیہ لہجہ۔ پھر آصف کو شرمندہ کر گیا۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتا، چوم کر باہر نکل گیا۔

مریم دل گرفتی سے آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگیں۔

☆☆☆

کتنا شوق تھا انہیں بڑے گھر کی بیٹی لانے کا، وہ اپنے دن بدلنا چاہتی تھیں اور ان کے دن واقعی بدل گئے تھے۔ اپنے گھر میں مکمل استحقاق سے رہتی تھیں۔ دوسرے کے گھر میں ملازمہ بن کر رہنا پڑ رہا تھا۔ بیٹے کی نظریں بھی بدل چکی تھیں۔

پہلے پہل دن میں ایک دو بار ملاقات ہوجاتی تھی پھر وقفے آنے لگے اور اب تو کئی کئی ہفتے ایک دوسرے کی شکل دیکھے بغیر گزر جاتے تھے۔

فہیم بی اے کر رہا تھا، اس کی فیس ادا کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہوگیا تھا۔ بھائی نے بی اے کروانے کی حامی تو بھرلی تھی اور اب جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ ایہا بی اے کرکے پرانے محلے میں پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی تھی، یہاں شفٹ ہونے پر اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ صبا نت نئے ڈیزائن کے کپڑے سی کر پہنتی تو محلے کی کئی خواتین اس سے کپڑے سلوالیتی تھیں، وہ اپنی بہت سی ضرورتیں ایسے پوری کرلیا کرتی تھی۔ اب تنہا افتخار کی کمائی میں گزارا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ آصف مہینے کا راشن ڈلوا کر اور چند ہزار روپے ماں کو پکڑا کر جیسے ان پر احسان کرنے لگا تھا۔ افتخار چپ چپ سے رہنے لگے تھے، باقی بھی جھنجلائے رہتے۔

حنینا کا جب دل چاہتا دونوں بہنوں کو اپنے کام کے لیے بلالیتی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے کام کرنے پر مجبور تھیں۔

انیکسی میں پڑے پڑے مریم کا دل جیسے اکتا گیا تھا، کسی سے کوئی راہ و رسم نہیں تھی۔ ان کے سسرال کا کوئی فرد ان سے ملنے یہاں نہیں آیا تھا نہ انہوں نے کبھی پرانے محلے میں جانے کا سوچا۔ وہ

جاتیں تو کوئی ان سے بھی ملنے آتا اور یہ وہ چاہتی نہیں تھیں کہ ان کا بھرم ٹوٹے اور رشتہ دار تماشا دیکھیں کہ وہ بہو بیٹے سے الگ ایک کونے پر پڑی ہیں کتنی سبکی کا سامنا کرنا پڑتا انہیں۔

بہو کے گھر والے تو بہت ہی دھوکے باز نکلے۔ کہاں شادی سے پہلے ان کے ___ آگے بچھے جاتے تھے اور اب جیسے داماد کے علاوہ ان کا کسی سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ اس دن وہ انیکسی سے کچن میں جانے کے لیے نکلی تھیں کہ لاؤنج میں داخل ہوتی شائنہ سے ملاقات ہوئی۔ مریم بہت گرم جوشی سے ان کی طرف سلام کر کے بڑھی تھیں مگر شائنہ سلام کا جواب دے کر سرسری سا حال پوچھ کر بیٹی کے کمرے میں داخل ہوگئی تھیں۔ وہ سرتاپا سلگ اٹھیں اور وہیں سے اپنے قدم اپنے آشیانے کی طرف موڑ لیے۔

☆☆☆

آصف آج آفس سے جلدی چلا آیا تھا، آج حنینا کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ سیدھا اندر جانے کے بجائے انیکسی کی طرف چلا آیا۔ مریم صوفے پر پاؤں پھیلائے چائے پی رہی تھیں۔ ایہا کچن میں اور صبا کپڑے پریس کر رہی تھی۔ آصف کو آتے دیکھ کر جلدی سے سوئچ بند کر کے ماں کے پاس کمرے میں آبیٹھی۔ آج کتنے دنوں بعد بھائی کی شکل دیکھنا نصیب ہوئی تھی، ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔

''بھائی! چائے لے کر آؤں۔''

''نہیں رہنے دو۔'' خشک لہجے میں جواب دیتا وہ ماں کے سامنے صوفے پر ہی بیٹھ گیا۔

''اماں! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اس کا لہجہ خشک تھا۔

مریم نے کپ صبا کے ہاتھ میں پکڑایا اور اس کی طرف بغور دیکھا۔ کہیں سے بھی اب یہ پہلے والا آصف نہ لگتا تھا جسے ماں کو دیکھے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ سارے بہن بھائیوں کا احساس کرنے والا ہمدرد، نرم دل اور اب کیسے اس کے لہجے اور انداز سے سرد مہری چھلکتی تھی۔ بہن بھائیوں اور اس کے درمیان حد فاصل قائم ہو چکی تھی۔ سرسری سی گفتگو ہونے لگی تھی ان سب کے درمیان۔

''بس ضروری بات ہی تمہیں یہاں آنے پر مجبور کرتی ہے۔'' مریم کا لہجہ تلخ اور کاٹ دار تھا۔

آصف کا چہرہ یک دم تپا تھا۔

''آپ کے یہی کاٹ دار اور طنزیہ جملے مجھے ادھر آنے سے روکتے ہیں، یہاں آکر ملتا ہی کیا ہے سوائے آپ کی طنزیہ گفتگو اور بے جا فرمائشی لسٹوں کے۔''

مریم اس کی بات سن کر سلگ اٹھیں، کچن سے کمرے میں آتے بھائی کے کہے گئے لفظ سن کر ایہا کے قدم وہیں جم گئے تھے۔ ان کی ضرورتوں کو وہ فرمائشی لسٹ کہہ رہا تھا۔ تو کیا بھائی اس حد تک ہم سے بے زار ہو چکے ہیں۔ اس کی پلکیں ایک دم ہی نم ہوئی تھیں۔

''جو کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈالو۔'' مریم نے بھی سرد لہجہ اپنایا۔

''صاف بات یہ ہے کہ اماں کہ حنینا ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اسے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں پسند نہیں ہیں۔ اس کے سامنے اپنا موڈ ٹھیک رکھا کریں۔ ماتھے پر تیوری چڑھا کر آپ بات کرتی ہیں، اسے بہت ناگوار گزرتا ہے۔

آپ اس کے گھر میں رہ رہی ہیں کچھ تو خیال کرلیا کریں اور اس دن اگر اس نے آپ سے بریانی کی فرمائش کر ہی دی تھی تو بنانے میں کیا حرج تھا۔ معمولی سا سر درد تھا چائے پی کر ٹھیک ہوجاتا۔ زیادہ ہی تھا تو ایک ٹیبلٹ لے لیتیں مگر آپ نے بیٹے کا کب سوچنا ہے آپ کو تو اپنی مرضی کرنی ہے۔ کتنے جتنوں سے میں نے حنینا کا آف موڈ بحال کیا۔'' آصف بگڑے موڈ میں بول رہا تھا۔

''شاباش ہے میرے زن مرید بیٹے۔ بھولائی ہوں میں اپنے گھر میں اور بہوؤں کے یہ انداز نہیں

ہوتے۔"

"بہو آپ اپنے گھر میں نہیں لائی ہیں۔ بہو آپ کو اس بڑے گھر میں لائی ہے۔ ہر بار آپ کو یہ بات بتانی پڑتی ہے۔" آصف نے ماں کی بات کاٹ کر لفظ گھر پر زور دیا۔

لیہا اور صبا کو بھائی کا یہ انداز بہت برا لگا تھا مگر چپ رہیں، اپنی عزت اپنے ہی ہاتھ ہے۔ اس پر بیوی کی محبت اور دولت نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ اپنی عقل اور گھر والوں سے محبت وہ اس کے سامنے گروی رکھ چکا تھا۔

مریم اس رات بہت دیر تک جاگتی رہی تھیں۔ فہیم بھی آصف کے رویّے پر غصے سے بھڑک رہا تھا۔ البتہ ابا خاموش سے تھے جیسے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے ہوں۔ صبح کو اپنے کام پر نکلتے تو شام کو ہی گھر کی راہ دیکھتے۔ انہوں نے گھر کے معاملات میں دخل اندازی بالکل ہی ختم کر دی تھی۔ مریم ان کے سامنے بیٹے کے شکووں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتیں اور وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے ان کی سنتے رہتے۔

وہ خود ہی بول بول کر خاموش ہو جاتیں۔

لیہا اور صبا کی بھی پہلی جیسے شوخی، شرارتیں ختم ہو گئی تھیں۔ گھر کے ہر فرد نے جیسے خاموشی سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ اپنے گھر کا احساس ہی سب کے لیے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے جیسے کسی سرائے میں رہ رہے ہوں۔ آصف کی شادی ان سب کے لیے تنہائی لے آئی تھی، سب ساتھ رہتے ہوئے بھی جیسے تنہا ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"پورا سال ہونے کو آیا ہے بچوں اور بھابھی کی شکل دیکھے، نہ کبھی ہمارے ہاں جھانکا اور نہ ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ سچ کہتے ہیں، دولت ایسے ہی رشتوں سے محبت کھینچ کر لے جاتی ہے۔" عالیہ جیٹھ جٹھانی کے رویے پر افسردہ تھیں۔

"یہاں پر رہتے ہوئے کون سا ان کے دل میں ہماری محبت اُمڈتی تھی، مہینوں گزر جاتے تھے ہمارے گھر قدم رکھے۔ آتیں بھی تو غیروں کی طرح گھڑی دو گھڑی، کبھی ہم نے ان میں اپنائیت نہیں دیکھی۔ کبھی مل بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹتے نہیں دیکھا۔" خالدہ نے سوئی میں دھاگا ڈالا اور پھر سے رضائی میں ڈورے ڈالنے لگیں وہ سب افتخار سے چھوٹے صفدر کے گھر میں جمع تھیں۔ اور زینب سے چھوٹی زینب کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

"کچھ دن پہلے ابا سلیم سے رہا نہ گیا اور افتخار بھائی کو دیکھنے دکان پر پہنچ گئے۔ کہہ رہے تھے افتخار بھائی بہت دیر تک گلے لگے رہے، سب کا حال احوال لیا۔ ایک ایک کو پوچھ رہے تھے۔" عالیہ نے دانتوں سے دھاگا توڑا۔

"افتخار بھائی تو شروع سے ہی محبت کرنے والے ہیں۔ بھابھی کی وجہ سے ہم سے ملنے سے کتراتے ہیں، وہ بھی کیا کریں، بچوں اور بیوی کے ساتھ گزارا تو کرنا ہے ناں۔" خالدہ افتخار کی حمایت کر رہی تھیں۔

"سارا قصور تو ان ہی کا ہے، شروع سے بھابھی کو کھینچ کر رکھتے تو یہ نوبت نہ آتی پر وہ تو ہمیشہ سے بیوی کے سامنے بھیگی بلی بنے رہے۔" بہن کو افتخار پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔

"شادی کے دن قریب آ رہے ہیں، کارڈ چھپ کر آ جائیں تو دکان پر ہی بھجوا دینا۔ آنا ہے تو آئیں ورنہ ہمیں بھی ایسے اوچھے نو دولتیوں سے ملنے کی کوئی تمنا نہیں۔" تابندہ نے کہا تو خالدہ نے گردن ہلا دی۔

"ویسے بھابھی آپ نے بھی فضول میں جھنجٹ پالا۔ اب کون گھروں میں رضائیوں میں دھاگے ڈالتا ہے، سب کچھ بازار سے ہو جاتا ہے۔"

"وہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے تابندہ! بے شک آج کل بازار میں سب کچھ دستیاب ہے۔ اصل میں یہ تو سب کو اکٹھا کرنے کا بہانہ تھا۔ جب تک اپنے پرائے گھر میں مل کر شادی کی تیاری نہ کریں تو شادی کا کیا خاک مزا۔ یہی تو موقع ہوتا ہے اپنوں کے

ساتھ مل بیٹھنے کا، دکھ سکھ میں ساتھا ہونا اسی کو تو کہتے ہیں۔'' خالدہ کی بات سولہ آنے سچ تھی۔ سب ہی اس بات سے متفق نظر آئیں۔ اور سب نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب کام چھوڑ چھاڑ کھانا کھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

یہ سچ ہے کہ دولت جب بولتی ہے تو سچائی بھی بعض دفعہ خاموش ہو جاتی ہے اور یہی سب آصف کر رہا تھا۔ بیوی کی دولت نے اس کی زبان گنگ کر رکھی تھی۔ ماں کی باتیں کڑوی اور حینا کا رویہ بالکل ٹھیک لگتا تھا۔ اس دن کی تلخ کلامی کے بعد سے اس نے انیکسی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

مریم کو آصف پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ بھی ناشتا بنا کر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی انیکسی میں واپس آجاتیں اور رات کا کھانا بھی وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بنا کر رکھ دیتیں۔ حینا یا تو اپنے کمرے میں ہوتی یا پھر گھر سے باہر۔ وہ گھر میں ہو یا گھر سے باہر دونوں صورتوں میں ان دونوں کا سامنا بہت ہی کم ہوتا اور اب تو مریم کو اس کی اجلی شکل زہر لگتی تھی وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ اس کی وجہ سے ہی تو ان کا اتنا فرماں بردار بیٹا ان سے دور ہو گیا تھا۔

مریم کے اس رویے سے ان دونوں کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ پکا ہوا مل جاتا تو کھا لیتے ورنہ کھلکھلاتے ہوئے باہر کی راہ لیتے۔

وہ تو سوچ رہی تھیں شاید اسے ماں کا یہ رویہ چبھے۔ وہ اپنے رویے پر نادم ہو کر ان کے پاس آجائے مگر وہاں تو ہنوز لاپروائی تھی۔

مریم نے اس دن ایہا کو آصف کو بلانے بھیجا کہ جا کر کہو ''اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ذرا دیر بعد ہی وہ ان کے سامنے کھڑا تھا اسی لیے دیے انداز میں۔

''بیٹھ جاؤ آصف بیٹا! کتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا تو وہ پھولے منہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''مجھے دیکھ کر آپ کو کون سا سکون ملتا ہے جو میں روز آکر دیدار کرواؤں۔'' کتنے روکھے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ مریم کا دل کٹ گیا، آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''تو ایسا تو نہیں تھا میرے بچے! ماں باپ کا احساس کرنے والا، یاد ہے جب تم نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے تو اپنے ابا کا کتنا احساس کرتے تھے کہ اکیلے سارے گھر کا خرچ اٹھا رکھا ہے۔ ہر دم یہی خیال دامن گیر رہتا تھا کہ جلدی سے نوکری لگے تو ان کا سہارا بن سکوں۔

میرا وہ والا آصف کہاں چلا گیا۔ کیوں اتنا لاپروا ہو گیا ہم سے، ہماری محبت کہاں چلی گئی تیرے دل سے۔ ہمارے درمیان اتنی اجنبیت اور سرد مہری کا رشتہ کیسے قائم ہو گیا۔ مجھے وہی اپنا پہلے والا آصف چاہیے، ہر دم ماں کا احساس کرنے والا۔ ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا۔'' وہ آنکھوں میں نمی لیے محبت سے اس کے ماتھے پر آئے بال سمیٹ رہی تھیں۔

''اماں! خدا کے لیے یہ ایموشنل بلیک میلنگ ختم کریں۔ کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ دیے میں نے یا میری بیوی نے۔ آپ نے بھی تو یہی کیا تھا دادا ابا اور دادو کے ساتھ۔ شادی کے دو سال بعد ہی ابا کو لے کر الگ ہو گئی تھیں۔ یہ بھی نہیں سوچا باقی بہن بھائیوں کا کیا بنے گا، گھر کے خرچے کیسے پورے ہوں گے۔ بے چارے دادا ابا نے اپنی محدود آمدنی میں ہی سب کچھ پورا کیا۔ آپ ابا کو دادو کے پاس جانے تک تو نہیں دیتی تھیں کہ ان کو کوئی رقم نہ تھما آئیں۔ ہمیشہ ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کو ساتھ بھیجتی تھیں کہ دھیان رکھنا تمہارے ابا نے دادو کو کچھ دیا تو نہیں اور اگر وہ کچھ دے دیتے تو گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھیں آپ۔

پھپھو کی شادی پر بھی ابا کو کوئی ذمہ داری نہیں نبھانے دی۔ سارے چاچا اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر کاموں میں لگ گئے اور صرف یہی نہیں، دادا،

دادی کی بیماری میں ان کے علاج معالجے کے لیے بھی رقم خرچ نہیں کرنے دی، آپ نے کبھی کچھ اچھا پکا کر نہیں بھیجا۔ دادو کو کبھی اپنے پاس لا کر نہیں رکھا کہ ان کی خدمت کر سکیں۔ بس شکوؤں کی پٹاری کھولے رکھی۔ ہمارے دلوں کو بھی ہمیشہ ان سے متنفر رکھا۔ اپنی خود ساختہ مظلومیت کے قصے سنا کر، ہم سب کو بھی ان سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو ان لوگوں کی محبت تھی کہ کبھی آپ سے لڑائی جھگڑا اور شکوہ نہیں کیا۔ ہمیں بھی پیار کی نظر سے دیکھا تو کبھی کبھار ہم بھی ان کے گھر چلے جایا کرتے تھے ورنہ آپ کی تو یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے گھر کے سامنے تک سے ہمارا گزر نہ ہو۔''

آصف بولے چلے جا رہا تھا اور مریم کی سانس ٹکتی جا رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے سے دیکھے جا رہی تھیں۔

''سن رہی ہو ایہا! بھائی کی الزام تراشیاں، کیسے لمحوں میں مجھے مجرم بنا دیا۔ ماں کی قربانیاں بھول کر مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا دیا۔ کبھی یہ بھی سوچا تم نے کہ یہ سب میں نے کس کی خاطر کیا۔ ناہنجار! تم لوگوں کی خاطر یہ سب کچھ کیا میں نے۔ اگر تمہارے ابا کو لے کر الگ نہ ہوتی تو بنا لیتے تمہارے ابا اپنی کمائی سے وہ دس مرلے کا گھر۔ ساری کمائی بھائیوں کو پڑھانے، گھر کا خرچا اٹھانے اور بہن کی شادی پر خرچ ہوتی۔ یہ جو آج تمہیں اتنا پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا کہ اس کوٹھی میں لا بسایا۔ یہ یوں ہی حاصل نہ ہو جاتی تمہیں۔'' مریم طیش سے بولی تھیں۔

''بس رہنے دیں قسمت میں ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔'' وہ تڑخا۔

مریم نے اب زاروزار رونا شروع کر دیا تھا۔ انہیں اس کے لفظوں نے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ صبا نے آگے بڑھ کر ماں کو سنبھالا۔ آصف نے نخوت سے منہ بنایا۔

''بلاوجہ کی ٹینشن۔ شکر کریں میں نے آپ لوگوں کو اپنے سے الگ تو نہیں کیا۔ قریب ہی رکھا ہوا ہے اپنے پاس۔ ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں، آپ کو کیا پتا کتنی مشکلوں سے یہ سارے اخراجات پورے کرتا ہوں میں۔'' وہ اب بھی بول رہا تھا۔

''بھائی! پلیز چپ کر جائیں، اماں کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' صبا نے تلخی سے اس کی طرف دیکھا۔

''بولنے دو اس کو، سنانے دو ماں کو باتیں۔ اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ جانے دو۔ بیوی کی غلامی کرانے کے لیے رکھا ہوا ہے ماں بہنوں کو اور عیش کہتا ہے۔ نہ بہنوں کی ذمہ داری نبھی اس نے۔ رشتے دیکھو کیسے لا رہا ہے بہن کے لیے۔ ڈرائیور کا رشتہ......'' مریم نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''کیوں ڈرائیور کیا انسان نہیں ہوتے، اچھی بھلی تنخواہ ہے، پڑھا لکھا ہے۔''

''تو پھر اپنی سالی کا رشتہ کیوں نہیں کر دیتا اس سے۔ تیرے سسر کو تو ویسے بھی بندے خریدنے کی عادت ہے۔'' مریم نے سلگ کر جواب دیا تھا، آصف کی بھنویں تن گئیں۔

''یہاں تو اچھا مشورہ دینا، کوئی بات کرنا ہی بے کار ہے۔ جب بھی یہاں آتا ہوں دل پر بوجھ ہی لے کر جانا پڑتا ہے۔'' وہ ٹھوکر مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

فہیم گھر میں داخل ہوا تو غیر معمولی خاموشی کا راج تھا۔ مریم کی پیشانی پر سوچ کی واضح لکیریں تھیں۔ ایہا اور صبا بھی چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ فہیم نے سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالی، اپنی فائل سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور کرسی پر بیٹھ کر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

''کیا بات ہے، آج پھر تو بھائی کا نزول نہیں ہو گیا یہاں۔'' اس نے فوراً خاموشی کا نتیجہ اخذ کیا تھا۔ مریم کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے اور پھر لڑھک کر باہر کی راہ لینے لگے۔

فہیم اٹھ کر ماں کے پاس چلا آیا۔

''پلیز امی روئیں مت۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے، بھائی نے کیا کہا ہے؟''

''وہی جو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور آج تو انہوں نے حد کر دی، امی کو بہت کچھ سنا کر گئے ہیں، ایسی باتیں جن کی تم امید بھی نہیں کر سکتے۔'' صبا نے اپنے لب کھولے۔

لیہا کی آنکھیں بھی بھائی کے الفاظ یاد کر کے بھیگ اٹھیں۔

''مت روئیں امی! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بی پی شوٹ کر گیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔''

''میری پوری زندگی میرے بیٹے نے خراب کر دی، میرا مان بھروسا سب کچھ ختم کر ڈالا۔ کیا بیٹے ایسے ہوتے ہیں کہ ماں کا کلیجہ اپنے نوکیلے لفظوں سے چیر ڈالیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

فہیم نے غصے سے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔ اسے آصف پر شدید تاؤ آنے لگا جس کی وجہ سے ماں دکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ساون برس رہا تھا۔

''بس اماں بہت ہو گیا۔ ہم یہاں رہ کر مزید اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتے۔ آج آپ کو فیصلہ کرنا ہو گا، ہم اب یہاں مزید نہیں رہیں گے۔ ہم واپس اپنے گھر چلیں گے۔ بھول جائیں کہ آپ کا کوئی فرماں بردار بیٹا بھی تھا۔ اسے ایک دولت مند بیوی مل چکی ہے۔ ساس سسر کے احسانات انہیں اپنی بیوی کے سامنے زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیں گے اور ہم اب ان کی کوئی بات بالکل نہیں سنیں گے۔ بیوی کی غلامی انہیں مبارک ہو۔

میں ہوں ناں آپ کا بیٹا آپ کے ساتھ۔ اپنی بہنوں کا احساس کرنے والا۔ بس یہ آخری سال ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی کوئی اچھی جاب مل جائے گی۔ لیہا اور صبا کے بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ سے اچھی امید رکھیں۔'' مریم نے بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے انہیں ساتھ لگا کر دلاسا اور تسلی دی تھی۔

''بس اس زنداں سے نکلنے کی تیاری کریں۔ چلو لیہا سامان پیک کرنا شروع کرو۔''

''شکر ہے ہم نے اپنا مکان کرائے پر نہیں دیا تھا۔ ابا کا فیصلہ درست تھا۔'' صبا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

رات تک دونوں بہنیں اپنا سارا سامان پیک کر چکی تھیں۔ افتخار کو بھی مختصر لفظوں میں آگاہ کر دیا گیا۔ وہ تو خود یہی چاہتے تھے۔ اپنا گھر چاہے جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو، سکون وہیں آتا ہے۔ غیر کا محل بھی کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ ان کی تو آنکھوں سے نیند ہی رخصت ہو گئی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں سے بے شک روز ملاقات نہیں ہوتی تھی مگر قریب رہنے کا ایک خوش کن احساس تو ان کے پاس ہوتا تھا۔ مریم نے کبھی انہیں اپنے بہن بھائیوں سے بے تکلف ہو کر ملنے جلنے نہیں دیا مگر یہ تو تھا کہ وہ اسی محلے میں ان کے حالات سے باخبر تو رہتے تھے۔

وہ تو یہاں سے جانے کی خبر سن کر خوشی سے کھل اٹھے۔ پورا محلہ اپنا تھا۔ دکھ سکھ میں ساتھ کھڑا ہونے والا۔ گھر سے نکلتے تو پوری گلی میں شناسا چہرے نظر آتے۔ سلام دعا، خیر و عافیت کے تبادلے ہوتے۔ یہاں تو احساس اور جذبوں سے عاری لوگ تھے۔ اپنی دنیا میں مگن، دیکھ کر بھی لاتعلق۔ پھر کسی سے کیا گلہ، اپنا ہی بیٹا جس کی خاطر اس ویرانے میں آپڑے تھے، اسی نے نظریں پھیر لی تھیں تو اب ان کے یہاں رہنے کا کیا جواز تھا۔ سو سب ہی اپنا سامان باندھے صبح ہونے کے منتظر تھے۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی وہ چپ چاپ ہمیشہ کے لیے اس زنداں سے نکل کر اپنے آشیانے کی طرف چل پڑے جو ان کا اپنا تھا۔ جو اپنے مکینوں کی بڑی چاہ سے راہ تک رہا تھا۔

شام کو جب آصف آفس سے لوٹا تو گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے انیکسی کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر وہ اندر کی طرف آہستگی سے بڑھ رہا تھا کہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چوکیدار اس کے نزدیک آ کر پکارا۔

''صاحب......'' اس نے ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ آصف کی نظروں میں استعجاب تھا، اس نے چابی ہاتھ میں لیے بغیر اس سے پوچھا۔

''یہ کس کی چابی ہے حکیم دین۔''

''صاحب! آپ کے گھر والے صبح انیکسی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ یہ انیکسی کی چابی ہے۔''

''کیا...... میرے گھر والے انیکسی چھوڑ کر چلے گئے مگر کہاں......؟''

''پتا نہیں صاحب جی! جاتے ہوئے بس اتنا کہہ گئے کہ آپ کو بتا دیں کہ ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، آپ کو اس گھر میں رہنا نصیب ہو۔''

آصف کی آنکھوں میں تاسف ابھرا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر چابی ہاتھ میں پکڑی اور ایک بار پھر انیکسی کی طرف نگاہ ڈالی۔

''اچھی بات ہے، میرے گھر والے یہاں رہنے کے لائق بھی نہیں تھے، انہیں ان ہی سڑاند بسی گلیوں میں رہنا راس ہے۔'' تلخی سے سوچتا ہوا وہ اندر داخل ہو گیا تھا۔

حنینا گھر پر نہیں تھی۔ جوتے اتار کر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا وہ بیڈ پر دراز ہو گیا تھا۔ اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی اور چائے بنا کر دینے والے یہاں سے جا چکے تھے، وہ اسی طرح کسلمندی سے پڑا رہا۔

☆☆☆

بعض اوقات کبھی کے کہے گئے الفاظ منہ پر طمانچے کی صورت پڑتے ہیں۔ جن بدبودار اور تنگ گلیوں پر طنز و نفرت کا اظہار کرتی وہ یہاں سے نکلی تھیں۔ آج ان ہی گلیوں سے انہیں اپنائیت کی خوشبو آ رہی تھی۔ نالیوں کی ناگوار بدبو، رکشے کی کھڑ کھڑ میں ہلتی پسلیاں، کچھ بھی تو انہیں برا نہیں لگ رہا تھا۔

کتنی مسرت اور کانپتے ہوئے انہوں نے گیٹ پر لگا تالا اپنے ہاتھوں سے کھولا تھا۔

گھر کی گرد آلود فضا میں انہوں نے بھرپور سانس لیا تھا۔ اس گرد میں ان کی زندگی کی خوشیاں تھیں۔ یہ اکھڑتے سیمنٹ اور بدرنگ ہوتے پینٹ سے انہیں کیسی مہک آ رہی تھی۔ وہ وہیں برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ کیسا سکون ملا تھا اپنی ملکیت کی زمیں پر بیٹھنے کا۔ اس کی ٹھنڈک اندر تک اتر گئی تھی۔

بچے گھر کا اندرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے۔ افتخار مریم کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ وہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھتی تھیں اس پر ہاتھ پھیرتی تھیں اور نم آنکھوں سے مسکرا دیتی تھیں۔ بچے ماں کی حالت پر مسکرا دیے۔

''سچ کہتے ہیں اماں! اپنے گھر کی خوشبو ہی الگ ہوتی ہے۔ آج لگا ہے کہ ہم اپنے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ تو ایک قید خانہ تھا ہمارے لیے، سرائے تھی جس سے نہ محبت کی مہک آئی نہ اپنائیت کا احساس ہوا۔'' ایہا اور صبا بھی پورے گھر پر طائرانہ نظر ڈالتی ہوئی بولیں۔

''فہیم! تم ایسا کرنا بازار سے دوپہر کا کھانا لے آنا کیونکہ میں اور ایہا تو آج سارا دن گھر کی صفائی کریں گی اور ماں آپ بس آرام کریں گی۔''

''ارے اب تو اپنے گھر میں آرام ہی آرام ہے۔ بازار سے کھانا لانے کی ضرورت بالکل نہیں۔ اپنے اسی کچن میں تم لوگوں کے لیے کھانا اپنے ہاتھوں سے بناؤں گی میں اور تم آج ہی سارے گھر کی صفائی کر کے اپنے آپ کو تھکا نہ لینا۔ اب تو یہیں رہنا ہے، آہستہ آہستہ کر لینا سب۔''

''اپنے گھر کا کام کر کے کون تھکتا ہے۔ یہاں آ کر تو ساری تھکاوٹ، ذہنی کوفت سب اڑنچھو ہو گئی۔'' صبا نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

''اچھا میں تو دکان پر چلتا ہوں، فہیم! تم آج چھٹی کر لو، گھر پر رہو، گھر کا سودا سلف لے آنا۔''

افتخار نے جیب سے والٹ نکال کر کچھ نوٹ فہیم کو پکڑائے تو اس نے سر ہلا دیا۔ افتخار مسرور سے گھر سے نکل گئے اور وہ ماں بیٹیاں پورے گھر میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھیں۔

☆☆☆

رات کو افتخار ایک فرحت بھرا احساس لیے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ گھر کا کونہ کونہ چمک رہا تھا۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ اطمینان نہ صرف چہروں سے جھلکتا تھا بلکہ دلوں میں بھی سکون اتر آیا تھا۔ کتنے خوش گوار ماحول میں ان سب نے مل کر کھانا کھایا تھا۔ سب کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جیل سے رہائی کے بعد اپنوں سے ملنا نصیب ہوا ہو۔

محلے میں داخل ہوتے ہی ہر چہرہ شناسا سا ملا تھا۔ افتخار کو دیکھ کر محلے کے ہر فرد نے خوشی کا اظہار کر کے گلے لگایا تھا۔

فہیم نے دیکھا، ابا کے چہرے کی رونق ہی الگ تھی ورنہ وہاں تو چپ چاپ کھانا کھا کر بستر کی راہ لیتے۔ صبح ناشتہ کر کے دکان میں جا گھستے۔ ان کے چہرے کی پژمردگی ایک دم ہی بشاشت میں بدل گئی۔

عشاء کی نماز میں مسجد میں ابا حبیب (دادا) اور بھائیوں سے ملاقات ہوئی تو وہ جھینپے ہوئے ان سے ملے تھے۔ بھائیوں نے بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صرف مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ افتخار کے بھائیوں کے گلے لگنے کے لیے بڑھتے قدم رک سے گئے تھے۔ ان کے لہجوں میں نہ پہلی سی گرم جوشی تھی نہ محبت کی رمق۔ افتخار کی خاموشی سے مریم سب سمجھ گئی تھیں۔

''فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہارے بھائیوں کو۔ وقتی ناراضی ہے۔ دلوں میں تو تمہاری محبت جوں کی توں موجود ہے تمہاری ذرا سی وارفتگی محبت پر پڑی گرد کو جھاڑ دے گی۔

اب مجھ سے مزید بے وقوفی کی امید نہ کرنا۔ میں تمہارے بہن بھائیوں اور خاندان سے تمہیں جوڑ کر رکھوں گی۔ مجھ ناعاقبت اندیش کو میرے بیٹے نے بہت بڑا اسبق سکھا دیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ گزرا وقت تو میں تمہیں لوٹا نہیں سکتی مگر۔ ان شاء اللہ آنے والے وقت میں تمہیں اپنوں میں ہی خوشیوں کے پل میں جیتا دیکھنا چاہوں گی۔'' مریم نے نم آنکھوں سے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو افتخار نے بھی گیلی آنکھوں سے ان کے جڑے ہاتھ کھول کر تھپتھپائے۔

مریم کی آنکھوں میں آج انہوں نے واضح شرم ساری دیکھی تھی۔ اس نے بھی بہت کچھ اپنے کیے ہی ہاتھوں سہا تھا۔ اگر افتخار نے اپنوں کی دوری سہی تھی تو مریم نے بھی۔ قدرت نے دنیا میں ہی انصاف کر دیا تھا۔

☆☆☆

زینب کی شادی کے ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور یہ پہلی شادی تھی جس میں سب نفرتیں و کدورتیں نکال، دھلے و شفاف دلوں سے شرکت کر رہے تھے۔ مریم نے ایک ایک فرد سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ اپنی غلطیوں پر نادم ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے بھی انہیں دل سے معاف کر دیا تھا کہ وقت نے انہیں بہت بڑا اسبق سکھا دیا تھا۔

''مریم بھابھی! اگر برا نہ مانیں تو ایک خیال ظاہر کروں۔'' تابندہ نے جھجکتے ہوئے مریم سے کہا تو انہوں نے آنکھوں میں تحیر لیے ان کی طرف دیکھا۔

''کیسی بات کر رہی ہو تابندہ! جو کہنا ہے کھل کر کہو۔''

''وہ دراصل مجھے ایہا شروع سے ہی پسند ہے۔'' انہوں نے سب کزنز کے درمیان بیٹھی گندمی رنگت، تیکھے نین نقوش والی ایہا کی طرف محبت سے دیکھا۔

''تو......'' مریم نے بھنویں اچکائیں۔

''ایہا کو میں اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتی

ہوں۔ بس آپ انکار نہ کرنا۔ میری یہ خوشی پوری کر دیں۔ میں نے بھائی جان سے بات کرلی ہے انہوں نے فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔'' تابندہ کی بات سن کر مریم شش و پنج میں پڑ گئیں۔

''مگر تابندہ! ایہا تو شاذل سے پورے ایک سال بڑی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ شاذل اونچا لمبا چوڑا ہے، اس کے سامنے تو ایہا چار پانچ سال چھوٹی لگتی ہے اور پھر اپنوں میں یہ فرق کون دیکھتا ہے۔'' انہوں نے بھابھی کو مطمئن کرنا چاہا تو مریم ان کی کہی بات پر شرمندہ ہو گئیں۔

وہ ایک سال بڑی لڑکی کو اپنے بیٹے سے بیاہنا چاہ رہی تھیں اور مریم نے خاندان کی سب ہی لڑکیوں کو مسترد کر کے باہر کی راہ دیکھی تھی جس کا نتیجہ وہ بیٹے کو کھو کر بھگت رہی تھیں۔

''یہ تو تمہارا بڑا پن ہے تابندہ کہ تم میری پریشانی دیکھتے ہوئے ایہا کو اپنی بہو بنانے پر تیار ہو مگر لڑکے کہاں مانتے ہیں انہیں تو اپنے سے کم عمر لڑکی ہی اچھی لگتی ہے۔'' مریم نے بجھے دل سے کہا۔ ایہا کی طرف سے وہ واقعی فکر مند تھیں۔

مریم کی بات سن کر خالدہ (دیورانی) زور سے ہنسی تھیں۔ تابندہ بھی دبے ہونٹوں سے مسکرائی تھیں۔ مریم نے ان دونوں کو اچنبھے سے دیکھا تھا۔

''اسی کی خواہش پر تو تابندہ تمہارے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہے۔'' خالدہ نے بتایا تو مریم نے بے یقینی سے تابندہ کی طرف دیکھا۔

''کیا واقعی......؟''

تابندہ نے مسکرا کر پلکوں کی جنبش سے اقرار کیا تو مریم بھی مسکرا دیں۔

دھیمے لہجے میں گفتگو کرتا، بردبار سا شاذل انہیں بھی اچھا لگتا تھا مگر اس نظریے سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایہا کے ساتھ اس کا جوڑ تصور کرنے لگیں تو ایک دم ہی اس کی صورت پر پیار آ گیا۔

جب سب راضی ہیں تو پھر میرے انکار کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ میری بیٹی اپنی پھپھو کے گھر بیٹی بن کر بڑی چاہ سے جائے گی۔'' مریم کی بات سنتے ہی سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ سب مبارک باد دینے لگے اور اسی رات مہندی کے فنکشن میں تابندہ نے ایہا کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کر اسے اپنے شاذل کے نام کرلیا۔

ذرا فاصلے پر کھڑا شاذل ایہا کے چمکتے چہرے کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کئی دن سے مریم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ فہیم اور ایہا نے زور لگالیا کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں مگر وہ نہ مانیں۔

''میری بیماری کا علاج ڈاکٹر کے پاس ہوتا تو دس بار چلی جاتی مگر تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دوائیں میرے اندر کے زخم کو کبھی نہیں بھر سکتیں۔ جس بیٹے کو ہمیشہ اپنے منہ کا نوالہ کھلایا وہی ہمارے نوالے گننے لگا تھا۔ کبھی نہ سوچا تھا کہ بیٹا اس طرح سے آنکھیں پھیرے گا۔

کیا ماں کی محبت بیوی کی محبت میں اتنی جلدی رخصت ہو جاتی ہے۔ بہن بھائیوں کے خون کے رشتے کی محبت بیوی کی محبت ایسی غالب آ جاتی ہے کہ وہ سب سے منہ موڑ لے۔ کبھی ماں کی محبت نے جوش نہیں مارا؟ باپ کا چہرہ دیکھنے کو دل نہیں کیا۔ بہن بھائیوں کی یاد نے دل نہیں تڑپایا اس کا۔

اس نے کبھی نہ سوچا کہ ہم کس حال میں جیتے ہیں۔ ارے بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ ان کی ہر خوشی کا خیال رکھنے والے۔ پر وہ تو ہر رشتے کو ہی بھول بیٹھا ہے۔''

مریم دل گرفتہ سی آصف کو یاد کیے جارہی تھیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس کو دیکھے ہوئے اسے سینے سے لگائے ہوئے۔

وہ رو رہی تھیں اور ایہا اور فہیم ماں کے دکھ پر دکھی ہو رہے تھے۔ بہن بھائیوں نے تو اس کا ذکر کرنا

بھی چھوڑ دیا تھا مگر وہ تو ماں تھیں، ماں کا دل تو بیٹے کے لیے ہمک رہا تھا فہیم مریم کو زبردستی سہارا دے کر اندر لے گیا تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے آصف بوجھل پن کا شکار تھا۔ سر درد تھا کہ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا اور آج تو حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آفس سے اس نے چھٹی کر لی تھی۔ حینا بھی گھر پر ہی تھی۔ بیڈ پر لیپ ٹاپ گود میں رکھے وہ پتا نہیں کیا کر رہی تھی ایک دوبار آصف نے اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی پھر منہمک دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی، حینا نے آواز دے کر صغراں کو چائے اور ٹیبلٹ لانے کو کہا تو آصف نے چپ چاپ ٹیبلیٹ لی اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی تھی کچھ دیر بعد وہ سو کر اٹھا تو فریش تھا۔ سر درد بھی ختم ہو گیا تھا مگر منہ کا ذائقہ تلخ تھا۔ حینا کمرے میں ہی تھی اور کسی گہری سوچ میں تھی۔ آصف نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سے قریب کر لیا۔

''آج پتا ہے میرا دل کیا کر رہا ہے۔'' اس کی بات کے جواب میں حینا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج اپنی بیگم کے ہاتھ کی بنی کوئی مزے دار سی ڈش کھاؤں۔'' وہ اس کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکرایا تھا۔

''مگر مجھے تو کچھ بنانا نہیں آتا۔''

''تو کوئی بات نہیں میں تمہیں سمجھاتا ہوں، آؤ آج دونوں مل کر کوکنگ کرتے ہیں۔ پتا ہے جب میں پڑھائی کے سلسلے میں ہاسٹل میں رہتا تھا تو اکثر کوئی نہ کوئی ڈش بنا لیتا تھا۔ میرے روم میٹس میرے ہاتھ کے بنے کھانوں کے دیوانے تھے۔'' وہ شگفتگی سے اسے بتا رہا تھا جواباً وہ خاموش رہی تھی۔

''چلو آؤ کچن میں چلتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے اور کوکنگ بھی۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے کچن کی طرف لے جانے لگا۔

''تم رہنے دو صغراں! آج کھانا تمہاری میڈم بنائیں گی۔'' آصف نے صغراں کو کچن سے نکلنے کو کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی کچن سے نکل گئی اسی اثناء میں حینا نے جھٹکے سے آصف سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ تم ہوش میں ہو۔ اپنے ذہن سے اس خوش کن خیال کو نکال دو کہ میں تمہارے لیے کچن میں کھڑی ہو کر کھانے تیار کروں گی۔'' وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ صغراں کے سامنے اس بے عزتی پر آصف کا رنگ اڑ گیا۔

''تم جیسے مڈل کلاس مردوں کو اپنی ہی کلاس کی بیوی تلاش کرنا چاہیے جو چند تعریفی جملے سننے کے لیے گھنٹوں کچن میں کھڑی اپنی اسکن خراب اور وقت برباد کرتی ہیں۔ جب تمہیں ایسی ہی بیوی چاہیے تھی تو ادھر کا رخ کرنے کیا ضرورت تھی۔ تم گلی محلے میں رہنے والوں کو اگر بڑے گھروں سے بیویاں لانے کا شوق اور جہیز میں ملے گھر میں رہنے کی تمنا ہوتی ہے تو پھر غلامی کرنا بھی آنا چاہیے۔ حکم چلانے نہیں، حکم سننے کی عادت پختہ کرنی چاہیے۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے انگارے برسا رہی تھی۔

''اتنی ذلت......اتنی توہین۔''

''آئندہ مجھ سے اس قسم کی فرمائش کرنے کی جرأت نہ کرنا۔ نہ تو مجھے تمہارے دل تک رسائی چاہیے اور نہ ہی مجھے مشرقی بیوی بننے کا شوق ہے۔'' وہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں جا گھسی تھی اور آصف اپنی جگہ جیسے پتھر کا ہو گیا تھا، حینا سے ملازموں کے سامنے ایسے رویے کی ہرگز امید نہ تھی۔ اس کی عزت ملازمہ کے سامنے دو کوڑی کی کر کے رکھ دی تھی۔ وہ من من کے قدم اٹھاتا گھر سے ہی نکل گیا تھا۔

☆☆☆

وہ آج صبح سے چپ چپ سا تھا۔ خاموشی سے اپنے کام میں منہمک رہا۔ تین گھنٹوں میں وہ چار بار

چائے طلب کر چکا تھا۔ یقیناً وہ کسی ذہنی خلفشار کا شکار تھا۔

یوسف اسے بہت دیر سے نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ بہت دنوں سے وہ اس کی خاموشی محسوس تو کر رہا تھا مگر آج تو بالکل ہی چپ کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اپنے اطراف سے بے گانہ، بریک میں لنچ کرنے کے لیے بھی نہیں اٹھا۔ باس نے بلایا تو فائل تھامے جس سنجیدگی سے اندر گیا تھا اسی سنجیدگی کو چہرے پر سجائے واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

آفس ٹائم ختم ہونے کا بھی اسے احساس نہ ہوا تو یوسف اس کی میز کے قریب آ کر کھنکھارا مگر ادھر ہنوز لاپروائی یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز۔ اس نے ٹیبل پر اپنی انگلیاں سجائیں تو اس نے سر اٹھا کر تحیر سے اسے دیکھا۔ یوسف نے آنکھوں کے اشارے سے سامنے لگے کلاک کی طرف اشارہ کیا تو وقت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں واضح حیرت در آئی تھی۔

''پانچ بج گئے؟''

جی جناب...... جلدی سے کلوز کر کے نیچے پارکنگ میں پہنچو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔

جب آصف نیچے آیا تو وہ اس کی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ جب اس کی بائیک خراب ہوتی وہ اس کی گاڑی کے پاس اسی انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ آصف نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔

''آج پھر بائیک دغا دے گئی۔'' آصف کے پوچھنے پر وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر مسکرا کر رہ گیا۔

''ویسے آج کی تمہاری حد درجہ خاموشی کا سبب جان سکتا ہوں۔''

''کچھ نہیں یار! کچھ دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے بس اسی وجہ سے۔'' وہ مسکرا کر بات ٹال گیا تو یوسف نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی وہ اپنے گھریلو معاملات بہت کم اس سے شیئر کرتا تھا۔ گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔ وہ بہت سست روی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''یار تھوڑی اسپیڈ تیز کر لو، احسان مند ہوں گا۔ کیوں میری مسز کو انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتے ہو۔''

''کیا مطلب......''

''مطلب یہ کہ شام کی چائے اور اپنے آپ کو سجائے وہ میری شدت سے منتظر ہو گی۔'' یوسف کی بات پر اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

''اچھا جناب۔'' آصف نے مسکرا کر رفتار تھوڑی بڑھا دی۔

''روز ملاقات ہوتی ہے پھر بھی اتنی بے چینی......''

''یہ بے چینی تو صبح آفس آنے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ ٹائم گزرے اور میں اپنی بیگم کی مسکراہٹ سے دن بھر کی تھکن دور کروں۔''

''یار کچھ زیادہ ہی نہیں چھوڑ رہے تم۔ مسکراہٹ سے تھکن بڑھ جاتی ہے۔ بیوی مسکرا کر دیکھے تو شوہر پر شاپنگ کی تھکاوٹ غلبہ پانے لگتی ہے اور تم ہو کہ مسکراہٹ سے تھکن دور کرتے ہو۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔

''یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے میرے دوست۔ یہاں محبت سے پیٹ بھرا جاتا ہے۔ محبت کو اوڑھا جاتا ہے اور محبت کے لمحوں کو محسوس کر کے اپنی زندگی میں بہار کی رنگینی کا سا لطف لیا جاتا ہے۔''

یوسف بہت جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ آصف نے حسرت سے اس کی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔

ذرا دیر بعد اس کے گھر کے سامنے آصف نے کار روکی تو وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ آصف نے ایکسلیٹر پر پاؤں رکھا تو یوسف نے اس کی طرف آ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''ایسے کیسے جا رہے ہو...... سیدھی طرح گاڑی لاک کر کے میرے ساتھ اندر چلو۔'' اس نے انکار کرنا چاہا مگر یوسف کے اصرار پر اس کے ساتھ اندر چل پڑا۔ چھوٹا سا گھر صاف ستھرا کسی کے سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

یوسف کا تین سالہ بیٹا دوڑتا ہوا باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ اس نے اس کو چومتے ہوئے گود میں اٹھایا تھا یوسف کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ آصف بہت دلچسپی سے ارمان کی باتیں سن رہا تھا جو اب اس کی گود میں بیٹھا اس سے خوب باتیں بگھار رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں یوسف کی بیوی نے چائے کے لوازمات باہر برآمدے میں میز پر سجا دیے تھے۔ گھر کی ـــ بنی لذیذ اشیاء نے آصف کو کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کتنا مکمل گھرانہ تھا۔ ایک دوسرے کی چاہت میں لپٹا ہوا، احساس کی چادر تانے اسے یہ گھر خوش قسمت لگا تھا۔ جہاں گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی کی مسکراہٹ سے استقبال ہوتا ہو۔ بچے کی ہنسی کی جھنکار دل لبھاتی ہو۔ شوہر کی فرمائش پر گھنٹوں کچن میں تھک کر اس کی خوشی کا دھیان رکھا جاتا ہو۔ چھوٹے سے گھر میں بھی خوشیوں کا مکمل سامان موجود تھا۔ رنگینی تھی۔

وہ اس گھر سے خوش مگر دل پر ایک بوجھ ایک حسرت لیے نکلا تھا۔ حنینا بچوں کے جھنجھٹ میں فی الحال پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ کچن میں جانا اسے پسند نہیں تھا، شوہر کے آگے پیچھے پھرنا، اس کی پسند نا پسند کا خیال رکھنا اسے بہت آؤٹ ڈیٹڈ اور دقیانوسی لگتا تھا۔ کتنی بے رنگ، بوجھل زندگی تھی اس کی۔

وہ کک اور بازار کے کھانے کھا کھا کر اوب گیا تھا۔ کتنی چاہ سے اس نے حنینا سے کچھ پکانے کی فرمائش کی تھی اور بدلے میں اس نے اس کی کیسی عزت افزائی کی تھی۔ اس روز کے بعد اس کا دل حنینا کی طرف سے کھنچ سا گیا تھا۔ اچھی چائے کا تصور کر کے چھم سے اورنیب کا سراپا اس کے سامنے آ گیا تھا۔ سرد آہ بھرتے ہوئے وہ آنکھوں پر تکیہ رکھے بہت دیر تک اپنی اور یوسف کی زندگی کا موازنہ کرتا رہا۔

☆☆☆

حنینا بہت اطمینان سے صوفے میں دھنسی مووی دیکھنے میں مگن تھی۔ شائنہ بھی اس کے سامنے بیٹھی کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھیں، ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جب ہی میز پر پڑا اس کا موبائل بجا۔ اس نے نمبر دیکھ کر ناگواری سے فون اٹینڈ کیا۔

''ہیلو۔'' کتنا روکھا لہجہ تھا اس کا۔

''میں مما کی طرف ہوں۔ تم فریش ہو کر ادھر ہی آ جانا۔ رات کا کھانا کھا کر اکٹھے ہی گھر چلیں گے۔'' اس نے چند لفظوں میں بات کر کے رابطہ منقطع کر دیا اور موبائل پھر سے میز پر رکھ دیا اور نگاہیں سکرین پر مرکوز کر دیں۔

''آصف کا آفس سے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے اپنے گھر جاؤ حنینا! بیوی کو شوہر کے آنے سے پہلے گھر پر موجود ہونا چاہیے۔'' شائنہ نے اس کی لاپروائی دیکھتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''چھوڑیں مما! یہ پرانی باتیں۔ صغراں (ملازمہ) ہے گھر پر۔ وہ دیکھ لے گی اسے، ویسے بھی میں نے اسے یہیں آنے کا کہا ہے۔''

''تم بہت لاپروا ہوتی جا رہی ہو اپنے گھر اور ہزبینڈ سے خیال رکھو آصف کا۔ سسرال والے تمہارے گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں اب تمہیں کیا مسئلہ ہے۔ آرام سے ہزبینڈ کے ساتھ لائف انجوائے کرو۔''

''ہونہہ...... لائف انجوائے۔'' اسکرین سے نظریں ہٹا کر وہ استہزائیہ ہنسی۔ ''اس نمونے کے ساتھ لائف انجوائے نہیں کی جا سکتی مما! صرف گزاری جا سکتی ہے جو میں جیسے تیسے گزار رہی ہوں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ اٹھو اپنے گھر جاؤ۔'' شائنہ نے اسے گھورا۔

اسی وقت حنینا سے چھوٹی صبغہ نک سک سے تیار ہو کر بیگ کندھے پر ڈال کر اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو اتنی تیار ہو کے۔'' حنینا نے اس کے کھلیبے چہرے پر نظر ڈالی۔

''لائم لائٹ'' کی آؤٹ لیٹ پر ففٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ ہے۔ تم چل رہی ہو تو آ جاؤ، بڑی کلاسک ورائٹی ہے۔ فرسٹ ڈے ہے آج ڈسکاؤنٹ کا۔''

''میں کیا کروں گی جا کر۔ وہ کنگلا مجھے شاپنگ کے لیے رقم ہی کتنی دیتا ہے۔ وہ تو شکر ہے پاپا میرے اکاؤنٹ میں ہر ماہ کچھ رقم جمع کروا دیتے ہیں ورنہ میں تو ان جگہوں پر سے شاپنگ کے لیے ترس ہی جاتی۔''

''ناشکری مت کرو۔ اب تو سب کچھ تمہاری ضروریات پر ہی خرچ کر رہا ہے وہ پھر اس سے یہ شکوہ بے معنی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں تمہارا آصف کے ساتھ رویہ بالکل نامناسب ہے۔'' شائستہ نے صبغہ کو آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا اور ایل ای ڈی آف کر کے اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''میں اور تمہارے پاپا اب تمہاری کسی بھی قسم کی بے وقوفیاں برداشت نہیں کریں گے۔ اپنا لاابالی پن ختم کرو۔ گھر سنبھالو، شوہر سنبھالو، اپنے گھر پر وقت گزارو، میں نے اس دن تمہیں پھر اس لفنگے کے ساتھ دیکھا تھا۔'' شائستہ درشتی سے بولیں تو وہ چور سی بن گئی۔

''وہ لفنگا نہیں ہے مما! پلیز اسے ایسے مت بولیں۔''

''تمہاری نظر میں نہیں ہوگا مگر میری نظر میں وہ ایک مطلب پرست اور بگڑا ہوا لڑکا ہے سو اس سے ملنے سے احتراز کرو۔ ویسے بھی تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم ایک ایسے شخص سے مل رہی ہو۔ جس نے تمہیں دھوکا دیا، تمہیں اذیت دی۔''

''وہ نادم ہے مما اپنے رویے پر۔''

''ہونہہ نادم۔ ایسے لوگوں کی ڈکشنری میں ندامت کا لفظ نہیں ہوتا۔ وہ پھر سے تمہیں اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ بچو اس دھوکے باز شخص سے۔''

''میں اس کے جال سے نکلی ہی کب تھی۔ میں اس کی محبت کے سحر میں آج بھی گرفتار ہوں مما! وہ میری زندگی، میرے ذہن سے میرے دل سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا۔''

شائستہ اس کی ڈھٹائی پر متعجب تھیں۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ شادی شدہ عورت ہو کر تم ایک غیر مرد کے لیے اپنی چاہت کا اظہار کر رہی ہو۔ تم اپنے دماغ سے اس خبیث کا خنّاس نکال دو۔''

''نہیں مما۔ وہ میرے دل سے کسی طور نکل ہی نہیں سکتا۔ آپ نے میری شادی ایک معمولی شکل و صورت اور معمولی خاندان میں کی۔ میں خاموش رہی۔ آپ کی عزت رکھی۔ مگر اب نہیں۔ وہ شخص میرے لائق نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ نہ اس شخص میں اعتماد ہے اور نہ ایک خوب صورت، ایجوکیٹڈ بیوی کو رکھنے کا ڈھنگ۔ میں اکتا چکی ہوں اس کے ساتھ رہتے ہوئے۔'' وہ واقعی اکتائے لہجے میں بول رہی تھی اور شائستہ کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔

''پلیز مما! میری بات پر غور کریں۔ روحان نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے وہ بھی کنزرویٹو فیملی سے تھی سو اس کی اس کے ساتھ نبھ نہیں سکی۔ ماں کے دباؤ میں آ کر اس نے شادی تو کر لی تھی مگر خوش نہیں تھا وہ۔ سو آزاد کر دیا اس نے اسے۔ ہم دونوں ایک ہونا چاہتے ہیں۔ میں روحان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ اس لجاجت سے بول رہی تھی کہ جیسے اپنا من پسند کھلونا مانگ رہی ہو اور اندر داخل ہوتے آصف پر اس کے الفاظ بم بن کر گرے تھے۔

''تم انتہائی بے وقوف اور پاگل لڑکی ہو۔ اچھے برے کی تمیز نہ رکھنے والی۔ آصف جیسا شوہر قدرت کا تحفہ ہے تمہارے لیے اور تم اس عذاب کو

اپنے اوپر مسلط کرنے کا سوچ رہی ہو۔" شائنہ نے غصے سے اس کے گلے میں پڑے ہاتھ جھٹکے تھے۔
"بھول گئی ہو وہ ذلت کے دن۔ جب اس نے ہمارا تماشا بنایا تھا پورے سرکل میں، ہماری کیسی جگ ہنسائی ہوئی تھی۔ شادی کے کارڈ تک تقسیم ہو چکے تھے۔ ہال بک ہو چکا تھا اور اس نے کتنے آرام سے فون پر تمہیں انفارم کر دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی بھانجی سے گاؤں میں شادی کر چکا ہے۔"
"وہ مجبور ہو گیا تھا مما! اس کی ماں اپنی مرتی بہن کو پرسکون کرنا چاہتی تھیں۔ وہ تو شادی کا کارڈ دینے گئے تھے گاؤں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجبوری میں اس کی شادی ہوئی تھی۔"
"ہونہہ مجبوری۔" شائنہ نے تنفر سے کہا۔ "مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ خود غرض ہوتا ہے۔"
"وہ خود غرض نہیں ہے۔ اس نے تو اصرار کیا تھا کہ یہ رشتہ مت ختم کریں، وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار تھا مگر ہم نے غصہ میں یہ رشتہ ختم کیا تھا۔ اس نے کب یہ چاہا تھا۔" حنینا اب بھی روحان کی وکالت کر رہی تھی۔
"جب ہم نے اس کو بیوی کو طلاق دینے کی بات کی تھی تب تو اس نے نہیں مانی تھی اب کیسے طلاق دے کر آزاد ہو گیا۔" شائنہ بھنویں تان کر بولیں۔
"یہ ایک لمبی کہانی ہے، اس کو چھوڑ دیں آپ۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب آصف کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔ میں نے روحان سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی، اپنی قمیص ہاتھ سے سیدھی کی اور میز پر سے موبائل اٹھا کر مڑی تو پیچھے کھڑے آصف کو دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔
شائنہ نے بھی یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا اور جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ آصف کو دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ آصف نے ان دونوں پر نظر ڈال کر اپنے قدم موڑ لیے تھے۔
"آصف بیٹا! رکو....." شائنہ نے گھبرائی آواز میں پکارا مگر وہ جا چکا تھا۔ شائنہ کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے مگر حنینا کے چہرے کا اطمینان قابل دید تھا۔
"یہاں پر کھڑی اب کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر صورت حال سنبھالو۔ میں بھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاپا کے ساتھ پہنچتی ہوں۔" شائنہ نے اسے شدید غصے سے گھورتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔
"اب کیا فائدہ مما! جو کچھ اسے کچھ دن بعد پتا چلنا تھا اب چل گیا۔ اچھا ہے جلد جان چھوٹ جائے گی میری۔ اگر اس شخص میں ذرہ بھر بھی غیرت ہو گی تو مجھے آزاد کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔" وہ پھر سے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ چکی تھی۔ اس کی بات پر شائنہ اسے گھورتی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔ انہیں ہر حال میں آصف کو ایسا کوئی قدم اٹھانے سے روکنا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اس کے فون پر شائنہ کی کالز مسلسل آ رہی تھیں۔ اس نے اپنا فون آف کر دیا۔ اب ان کے ہاتھوں مزید کٹھ پتلی نہیں بننا تھا اسے۔
گاڑی قدرے پرسکون گوشے میں روک کر اس نے گہرے سانس لیے۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ، اس کی بیوی اس کے ساتھ ناگواری کی زندگی گزار رہی تھی۔ شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی بیوی کا دل کسی اور کے ساتھ کا متمنی تھا۔ شدت ضبط سے اس نے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔
"کیا ملا تھا اس کو حنینا سے شادی کر کے۔ اس کی حیثیت بیوی کے سامنے ایک غلام کی سی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی غلامی کرتے کرتے اس نے اپنے والدین کو ناراض کر دیا۔ اپنے بہن بھائیوں سے لاتعلق ہو

گیا۔ حنینا نے کبھی اس کے اپنوں سے ملنے تک نہیں دیا اور نہ اس نے کبھی ان سے ملنے کی ضرورت سمجھی۔ فقط اپنی دولت مند بیوی کو راضی رکھنے کے لیے۔"

حنینا کے ساتھ وہ ذلت و خواری کی ہی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی اپنی عزت نفس تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اپنے دل میں پلنے والی محبت کا گلا گھونٹ کر اس نے اسے اپنایا تھا۔ "کسی کا دل توڑ کر، آنکھوں میں نمی دے کر محبت کی قدر نہ کرنے والوں کو ایسی ہی تضحیک اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" کرب اور اذیت نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا وہ بھاری رات اس نے باہر گزاری تھی۔

علی الصباح وہ حنینا کی جہیز میں لائی گئی کوٹھی میں گیا تھا۔ ایک مضبوط اور حتمی فیصلہ کر کے اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ جس طرح ایک صبح اس کے ماں باپ ایکسی کی چابی دے کر اپنے گھر گئے تھے بالکل اسی طرح اس نے گاڑی کی چابی چوکیدار کے سپرد کی کہ اس گھر کی مالکن کو دے دینا۔ اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ مین گیٹ عبور کر گیا۔

اس آہنی زنجیر سے وہ آزاد ہو گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں حنینا کے لیے لکھا طلاق نامہ تھا تو دوسرے ہاتھ میں استعفیٰ۔ کتنے ہی مہینوں سے ایک دوسری کمپنی سے اسے پرکشش نوکری کی پیش کش ہو رہی تھی مگر وہ معذرت کیے جا رہا تھا کہ باس اس کے سسر کا دوست تھا سو اب رشتہ ختم ہوا تو سب لحاظ بھی ختم ہو گئے۔ وہ جلد ہی دوسری کمپنی جوائن کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ سڑک پر پیدل چلتے ہوئے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ جس وقت اس نے اپنی قدرے تنگ گلی میں قدم رکھا سکون کی ایک لہر اسے چھو کر گزری۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھر کے گیٹ تک پہنچا۔ بیل بجانے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی، اپنے گھر میں دستک دے کر تھوڑی جاتے ہیں، اس نے دروازہ پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا، وہ اندر داخل ہو گیا۔ نادم سا، دل پر بوجھ اور ذہن پر تھکن لیے۔ اماں سامنے ہی تخت پر ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھیں، غالباً مغرب کی نماز ادا کر کے فارغ ہوئی تھیں۔ لاؤنج بالکل خالی تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ماں کے قریب پہنچ گیا اور گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ مریم کو کرنٹ لگا۔ جس کی یاد نے دل تڑپا رکھا تھا۔ اسے اپنے سامنے پا کر جیسے سانس لینا بھی بھول گئی تھیں۔ وہ تڑپ کر اسے گلے لگانا چاہتی تھیں مگر اس کی زیادتیاں یاد آئیں تو اسے پرے دھکیل کر اپنے گھٹنے پیچھے کر لیے۔

"اب کیا لینے آئے ہو یہاں پر۔" وہ چیخ اٹھی تھیں۔ تینوں بچے ماں کے چیخنے پر کمرے سے فوراً باہر نکلے اور ماں کے سامنے جھکے آصف کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"اس سے کہہ دو فہیم! یہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ نکل جائے یہاں سے اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کا نہ اس گھر کے مکینوں سے۔" ان کی آواز اور لہجہ پاٹ دار مگر نم تھا۔ آصف تڑپ اٹھا۔

"بس کر دیں اماں! بس کر دیں۔ مجھے لفظوں کی مار مت ماریں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح رو پڑا۔ فہیم نے لب بھینچ لیے۔

"ہم یہاں پر اپنوں کے درمیان بہت پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر ہمارا ہے۔ اپنا رزق حلال کماتے ہیں اور روکھی سوکھی کھا کر قناعت کی زندگی بسر کر کے اطمینان سے رہ رہے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری زندگیوں میں کوئی زہر گھولنے سے پہلے نکل جائیں۔" فہیم نے بہت تلخ لہجے میں اس سے کہا۔ چھوٹا بھائی اس سے کتنے سرد لہجے میں گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے بڑا پن، عزت وقار سب کچھ اپنی وجہ سے کھویا تھا۔

"بھائی! یہ آپ کی بیگم کا گھر نہیں ہے جہاں پر جب دل چاہتا، آ کر ہمیں بے عزت کر دیتے تھے۔

یہاں پر اماں کو اگر آپ نے ذرا سے بھی سخت الفاظ کہے تو ہم بالکل بھی برداشت نہیں کریں گے۔ یہ گھر ہمارے باپ کا ہے آپ کو اپنے سسر کے دیے گھر میں رہنا نصیب ہو۔ بس آپ ہمیں اس گھر میں سکون سے رہنے دیں۔'' لیہا نے بھی آگے بڑھ کر اپنے لفظوں سے اس کی طبیعت صاف کی۔

''خدا کے لیے مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں گناہ گار ہوں اماں آپ کا۔ معافی طلب کرنے آیا ہوں، آپ سے نادان تھا، بھٹک گیا تھا۔ اللہ کا واسطہ مجھے معاف کر دیں اور مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیں اماں۔''

اس نے اپنا سر اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا۔ ان کا ہاتھ اٹھا کر اپنے گال پر رکھ دیا۔ اس کے سارے آنسو ان کے ہاتھ میں جذب ہو گئے، ماں کا دل پسیجا۔ بے اختیار ہو کر انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے سر کے بالوں پر بوسے دیتی، وہ زار و زار روئی تھیں۔ بہنوں بھائی کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ لاکھ اس نے ان کا دل دکھایا تھا مگر تھا تو ان کا ماں جایا۔ جب ماں نے معاف کر دیا تو پھر وہ کیسے اس سے ناراض رہ سکتے تھے۔ خون کا رشتہ تھا اور خون کے رشتے بھلا کب ایک دوسرے سے دور رہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

گھر میں ایک دم ہی رونق ہو گئی تھی۔ گھر مکمل ہو گیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی سنگت میں مسرور ایک دوجے سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ آصف تو جب سے آیا تھا ماں کے گلے کا ہار بنا ہوا تھا۔

''جتنے تم نے مجھے دکھ دیے ہیں۔ اس حساب سے مجھے تم سے اتنی ہی نفرت ہونی چاہیے مگر نہیں ہوئی۔ اللہ نے ماں کا دل ہی ایسا بنایا ہے کہ اولاد لاکھ غلطیاں کرے، ستائے، دل پر خنجر پھیر دے مگر ماں ایک ہی آنسو سے پگھل جاتی ہے۔ اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔'' مریم آصف کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیر رہی تھیں اور وہ شرمندہ ہوئے جا رہا تھا۔

''سارا الزام تم اس کو ہی نہ دو اصل قصوروار تو تم ہو مریم! بڑے گھر میں شادی ہماری بنیادی غلطی تھی۔ کاش ہم وہاں شادی نہ کرتے تو اس سب کی نوبت ہی نہ آتی۔ رشتہ ہمیشہ اپنے جوڑ کا ہی اچھا لگتا ہے آسانی سے نباہ ہوتا ہے۔'' افتخار نے بھی اپنی زبان کھولی۔

''سن لی اپنے ابا کی بات۔ ہمیشہ مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں، خود صاف بچ نکلتے ہیں۔'' مریم نے مصنوعی خفگی سے کہا تو بچے مسکرا دیے۔

''میں کب اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے رہا ہوں۔ اصل مجرم تو میں ہی ہوں۔ اپنے ہر فیصلے کا اختیار تمہیں سونپ کر بڑی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ کاش مرد شادی کے بعد ہر رشتے میں توازن رکھے تو کہیں بھی بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔'' افتخار نے برملا اپنی کمزوری کا اظہار کیا تو مریم اور آصف خجل ہو گئے کہ بات تو ان کی سولہ آنے سچ تھی۔ آصف کے چہرے پر خجالت کے آثار دیکھ کر مریم نے اسے گلے لگایا تھا۔

''آصف بیٹا! وہ تعلق سمجھو ایک کھلونا تھا، ٹوٹ گیا۔ شکر ہے جلدی ٹوٹ گیا مگر بہت تکلیف دے کر ٹوٹا۔'' مریم کی پلکوں کے گوشے نم ہوئے۔

''اور زینب کو جب جب دیکھتی ہوں، دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ ندامت کے گڑھے میں جا کر گرتی ہوں۔ چھوٹی اپنے گھر کی ہو گئی اور وہ ابھی تک باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہے۔'' وہ سچ میں شرمندہ لگ رہی تھیں۔

''کیا زینب کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔''

اس کا دل دھڑک اٹھا۔

''اس بے چاری کا نصیب......'' وہ سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔ آصف کے ذہن میں گزرے لمحے بہت تیزی سے دوڑ رہے تھے، ایک ہجوم ملامت تھا جس نے اسے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

وہ چھت پر بالکنی میں کھڑی تھی شام بیت رہی تھی۔ گھونٹ گھونٹ کر کے اندھیرا سینے کی وسعتوں میں اتار رہی تھی۔ ایسا ہی اندھیرا اسے اس وقت اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا۔ قدموں کی ہلکی چاپ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ آصف اس کے پیچھے کھڑا تھا، اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

''بہت دنوں کے بعد تمہارے ہاتھ کی بنی چائے کے ذائقے نے مسرور کر دیا۔'' وہ اس کی تعریف ایسے کر رہا تھا کہ جیسے درمیان میں کوئی دوری، کوئی فاصلہ نہ آیا۔ ہو اور زینب خاموش کھڑی تھی۔ وہ چلتا ہوا دھیرے سے اس کے قریب آیا۔

''کتنے دنوں بعد تمہیں ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ سچ پوچھو تو تمہارے اس پیچ چہرے نے مجھے ہر پل بہت بے چین رکھا ہے اور مجھے یقین واثق ہے اورنیب کہ آج بھی تمہارے آئینہ دل پر میرا عکس روشن ہے۔'' سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی اس مسکراہٹ اور اعتماد نے اورنیب کے دل میں چنگاریاں بھر دیں۔

''بعض یقین ٹوٹنے کے لیے ہوتے ہیں اور آپ کا یقین محض خام خیالی اور ذہن کا فتور ہے مسٹر آصف۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جن کی محبت مادیت پرستی کے نیچے دفن ہو جاتی ہے۔ مفاد کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور جب ٹھوکر لگتی ہے۔ منہ کے بل گرتے ہیں تو پھر ان کے دل میں سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھتی ہے وہ پھر سے اس کی طرف لپکتے ہیں مگر وہ شاید بھول جاتے ہیں کہ محبت مر جانا پسند کرتی ہے مگر کسی فریب زدہ دل میں ہرگز قیام کرنا نہیں چاہتی۔

سو اگر آپ نے محسوس کیا کہ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جذبہ تھا تو مائنڈ اٹ آصف صاحب۔ وہ جذبے اب مر چکے ہیں۔ قصہ پارینہ بن چکے ہیں اب کیا ان کی ڈھول چاٹنے آئے ہیں۔'' اورنیب نے اس کے دھواں دھواں چہرے پر نظر ڈالی۔

ماہنامہ کرن

جولائی 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

''کرن کا دسترخوان''

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- فنکارہ ''رمشا خان'' سے شاہین رشید کی ملاقات،
- فنکار ''وہاج علی'' کہتے ہیں ''میری بھی سنیے''،
- اس ماہ ''سعد یہ حمید سعدی'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- آواز کی دنیا سے ''آر جے کومل خان'' اس ماہ مہمان ہیں،
- ''شب غم کی سحر'' رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ''لذت غم عشق'' صائمہ قریشی کا مکمل ناول،
- ''اباجی میں اور تم'' اُم ایمان قاضی کا مکمل ناول،
- ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- ''سورما'' نظیر فاطمہ کا ناولٹ،
- فرح بھٹو، عمارہ خان، کشف بلوچ، عمارہ امداد اور رضوانہ اسحاق کے افسانے اور مستقل سلسلے،

"میں شرمندہ ہوں اورینب! تمہاری محبت کی قدر نہ کرنے کی سزا میں نے بہت کاٹی ہے۔ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر کے ہر شکوہ، ہر گلہ مٹادوں گا۔ اپنی زندگی کی بنیاد اب محبت اور بھروسے پر قائم ہوگی۔" وہ آس کے جگنو اس کے ہاتھوں میں تھما رہا تھا۔

"کتنے خوش فہم ہو تم آصف!" اس کے لب استہزائیہ پھیلے تھے۔

"مرد اپنی عورت کے ذہن پر کسی غیر مرد کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کرتا اور عورت سے امید رکھتا ہے کہ وہ دس عورتوں سے تعلقات رکھ کر اپنی ازدواجی زندگی کی خوشیاں کشید کر کے بھی جب اس کے پاس پہنچے تو وہ اس کا ساتھ خوش دلی کے ساتھ قبول کرے۔

سوری مسٹر آصف! میرے دل میں ایسے مرد کی کوئی گنجائش نہیں، سو کسی اور امیر زادی کا در دل کھٹکھٹائیے۔"

آصف نے سکتے کی کیفیت میں اورینب کی آنکھوں میں جھانکا تھا، اس کے لفظوں پر غور کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ وہی اورینب ہے جس کی پلکیں اسے دیکھ کر اٹھتی گرتی تھیں۔ آج وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کتنی پُراعتماد ہو کر اسے ٹھکرا رہی تھی۔ کہنے کے لیے کچھ باقی نہ بچا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ نہ اورینب نے اسے روکا تھا اور نہ آصف نے پلٹ کر دیکھنے کی جرأت کی تھی۔ دونوں دل ایک دوسرے کے لیے دھڑک ضرور رہے تھے مگر ایک کے دل میں ٹوٹی محبت کی کرچیاں تھیں تو دوسرے کے دل میں شکست خوردگی کا صدمہ۔

اورینب نے اس تاریک رات اور حبس زدہ موسم میں کھل کر سانس لیا۔ ساری گھٹن، محبت، شکستگی فضا میں تحلیل ہوگئی۔ اس نے آصف کے ساتھ رہنے کے خوابوں کو صحرا میں بہت زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ بہت مضبوط قدموں سے سیڑھیوں کی طرف چلی تھی، ماں کو اپنا فیصلہ سنانے کے لیے کہ اس کے لیے آئے رشتوں میں سے جس کے لیے بھی ہاں کر دیں وہ شادی کے لیے رضامند ہے مگر آصف سے کسی طور نہیں۔

☆☆☆

پگھلتی چاندنی میں اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ آج اس کی نیند نہیں روٹھی تھی بلکہ اپنی بے چینی اس نے اس شخص میں منتقل کر دی تھی جو اس کی آنکھوں میں رتجگے گھول دیتا تھا۔ آج سکون اس شخص کا درہم برہم ہوا تھا۔

"تم کیا سمجھ رہے تھے آصف کہ عورت صرف مرد کی محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔ ایک بار دل میں بسا لے تو ساری عمر اس کی پرستش کرتی رہتی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عورت واقعی مرد کی محبت کی بھوکی ہوتی ہے مگر سچی وکھری محبت کی طلب گار۔

محبت کے بیچ خود غرضی آجائے تو پھر وہیں دم توڑ دیتی ہے۔ تم نے میری محبت کو جان بوجھ کر ٹھکرایا۔ اور پھر بھی تم مجھ سے یہی امید رکھ کر مجھ سے ملنے چلے آئے کہ میں آج بھی تمہاری محبت کی اسیر ہوں گی، تمہیں پالینے کی خواہش میرے دل میں مچلتی ہوگی۔

"میری محبت تمہارے دل میں ایک کسک بن کر رہے گی تو مجھے بڑا سکون ملے گا۔ پتا نہیں سکون ملے گا یا میری بے چینی مزید بڑھ جائے گی۔" وہ مندی آنکھوں سے سوچ رہی تھی اور پھر اگلے پل نیند کی آغوش میں چلی گئی اور تارے گنتا آصف اپنی ناکامی اور پچھتاوے کی آگ میں خوب جھلس رہا تھا۔

محبت کی قدر نہ کرنے والوں کا انجام کچھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

WITH
COLORLOCK
TECHNOLOGY TM
BLACK ROSE
ColorSupreme
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS
AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES
BLACK ROSE
BLACK ROSE ColorSupreme
COLOR EXPERTS!
www.blackrosecosmetics.com

عفت سحر طاہر

خواب شیشے کا

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگاہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگاہ کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تائی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگاہ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی اور تکبر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاحہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرا لیے ہیں۔

نمیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان و شوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ ملاحہ شدید پریشان ہے۔

کبیر کے گھر میں ملاحہ کا شاندار استقبال ہوا۔ کبیر کی بہنوں نے کبیر کے منع کرنے کے باوجود اس سے مختلف نیگ کی رقم بٹوری۔

صدیقہ بیگم کا صدمہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا اگلی صبح مہر ماہ حیران رہ جاتی ہے جب موحد، ملاحہ کے گھر لے جانے کے لیے ناشتہ کا بہت سا سامان لے کر آتا ہے۔ صدیقہ بیگم کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ بہت ناراض ہوتی ہیں اور ناشتے کا منع کرتے ہوئے ـــــ ولیمے میں بھی شرکت کا منع کر دیتی ہیں جس پر موحد انہیں بتاتا ہے کہ پورا خاندان ولیمے میں مدعو ہے۔

مہر ماہ موحد کے ساتھ ناشتہ لے کر جب ملاحہ کے گھر پہنچتی تو ملاحہ کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔خاندان کے خوف سے سب ولیمے میں شرکت کرتے ہیں۔

طلال اور تزئین میں صلح ہو جاتی ہے۔مہر ماہ کے پاس نمیر آفندی کا خون آتا ہے۔

آغا جان صدیقہ بیگم سے کہتے ہیں کہ ملاحہ کو بلاؤ وہ کئی دن سے میری خیریت پوچھنے نہیں آئی۔

موحد، ملاحہ کو آغا جان سے ملنے کے لیے بلالیتا ہے اور آغا جان کو ڈرائنگ روم میں لے آتا ہے۔

چھبیسویں قسط

تائی جان کا دل جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا ہو۔آغا جان کے چہرے پر کبیر کو دیکھ کر زلزلے کے سے تاثرات اتر آئے اور سب سے بڑھ کر ملاحہ کے ساتھ کبیر کا اتنی بے تکلفی سے ایک ہی جگہ بیٹھنا۔

"یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے حد درجہ بے یقینی سے پوچھا تو آواز سے رعب مفقود تھا۔

شدید صدمے کی پہلی سیڑھی بے یقینی ہی ہوا کرتی ہے' وہ بھی اسی سیڑھی پر تھے۔تائی جان نے سراسیمگی کی کیفیت میں گھر کر موحد کو دیکھا' شاید وہ بات سنبھال لے۔ مگر اس نے دائیں ابرو کو ہلکی سی جنبش سے کھینچ کر جیسے حیرت سے پوچھا ہو۔اب میں انہیں کیا بتاؤں؟ وہ اس سے کسی بھی کمینگی کی امید رکھ سکتی تھیں، ان کا دل آنے والی ساعتوں کے بارے میں سوچ کر ڈوبا۔

"السلام علیکم آغا جان! میں آپ کی عیادت کے لیے ہی حاضر ہوا تھا۔" کبیر نے شائستگی اور روایتی مسکراہٹ کے ساتھ وضع داری نبھائی۔آغا جان نے تپتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر ملاحہ کو۔

"السلام علیکم آغا جان!" ملاحہ کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔مدھم لہجے میں کہا تو آغا جان نے ہنکارا بھرتے ہوئے محض تیز نظروں سے اسے دیکھا۔اور پھر بطور خاص تائی جان کو گرج دار آواز میں مخاطب کیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے صدیقہ! یہاں یہ کیا چل رہا ہے؟"

تائی جان کا خون ایک پل میں خشک ہوا۔انہیں لگا وہ قیامت تک ایک لفظ بھی نہ بول پائیں گی۔

"یہ کیا بتائیں گی آغا جان! ان میں اتنی ہمت کہاں' میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آپ کی ناک تلے کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔" سائرہ چچی نے جس طرح ڈنکے کی چوٹ پر اونچی آواز میں کہا اس پر صدیقہ بیگم نے جھٹکا کھا کر بے یقینی سے ان کو دیکھا' شاطرانہ انداز میں اپنے مہرے آگے لانے والی یہ ساری عمر کی دبّو سی عورت۔ جنہیں صدیقہ بیگم نے کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا' آج کیسے پینترا بدل کر سامنے آئی تھی۔

"نکاح پڑھوا دیا ہے انہوں نے ملاحہ کا کبیر کے ساتھ۔" چچی جان نے لطف لیتی نظروں سے باری باری ملاحہ اور صدیقہ بیگم کے اڑی رنگت والے چہروں کو دیکھتے ہوئے دھماکہ کیا تو وہ دنگ سے صدیقہ بیگم کو دیکھنے لگے۔

"وہ...... آغا جان! مردوں نے طے کی ساری بات...... بچے راضی تھے تو......" ان سے لڑکھڑاتی زبان سے کوئی بہانہ نہ بن پایا تھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ یہ سب کیا ہے صدیقہ؟"

"جی آغا جان! چچی جان سچ کہہ رہی ہیں۔" مہر ماہ نے ہمت کی تھی۔

"نکاح کر دیا ہے؟ دماغ تو ٹھیک ہے تم سب کا۔یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے آغا ذوالفقار کی نسل، ہمارا خون اتنا سستا تھا کہ اس میں تم لوگوں نے کمیوں کے خون کی ملاوٹ کر ڈالی۔" آغا جان گرج رہے تھے۔

''نکالو...... میں کہتا ہوں۔ نکالو اسے یہاں سے۔ دفع ہو جائے یہ میری نظروں کے سامنے سے۔'' وہ کبیر کی طرف اشارہ کر کے اتنی زور سے چلائے کہ حلق میں خراشیں پڑ گئیں اور کھانسی آ گئی۔ ملاحہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر کبیر نے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ آغا جان پھر سے کف اڑاتے ملاحہ کی طرف اشارہ کرتے صدیقہ بیگم سے کہہ رہے تھے۔

''اور تم باندھ کر اندر ڈالو اپنی بیٹی کو۔ شام سے پہلے طلاق لو اس شخص سے۔'' ملاحہ نے بے اختیار حلق سے اٹھتی چیخ پر قابو پاتے ہوئے لبوں پر ہاتھ رکھا اور بے اختیار دوسرے ہاتھ سے کبیر کا بازو گرفت میں جکڑ لیا۔ اتنی پریشانی کے عالم میں بھی کبیر خان کے دل میں سکون کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ اس کے ساتھ تھی اور اسی کی رہنے والی تھی۔

''ملاحہ کی شادی کبیر کے ساتھ ہو چکی ہے آغا جان! جو ہونا تھا سو ہو چکا، اس لیے آپ ان دونوں پر کسی صورت زبردستی نہیں کر سکتے۔'' موحد نے سرد مہری سے موقف پیش کیا۔

''تم اس معاملے میں مت پڑو موحد!'' آغا جان نے اس کو تنبیہہ کی۔

''کبیر اب اس گھر کا داماد ہے آغا جان! اگر آپ اس کو یہاں سے نکالیں گے تو میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گی۔'' ملاحہ نے بڑی جرأت کی تھی۔ لہجہ باادب مگر دھیما اور بے خوف تھا۔

کبیر، موحد اور ثمرہ چچی کے ساتھ نے اسے بہت ہمت دی تھی۔ آغا جان اپنے بال نوچنے کو ہو گئے۔ انہیں آج اپنی معذوری کا صحیح معنوں میں احساس ہو رہا تھا۔

''تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی دوبارہ اس دہلیز پر قدم رکھنے کی۔ نکل جاؤ میرے گھر سے اور آئندہ کے لیے اس گھر کے دروازے بند ہیں تم پر۔ سمجھیں۔'' وہ ملاحہ پر غرائے۔ ''اور صدیقہ! تم بھی سمجھ لو کہ تمہاری ایک ہی بیٹی تھی۔''

ان کی بات سن کر جہاں سائرہ چچی کے دل میں سکون کی لہر اٹھی، وہیں بہت سے دل بے سکون ہو گئے۔ ملاحہ نم آنکھوں سے سب کو دیکھتی کبیر کا ہاتھ تھامے جیسے آج اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ تائی جان آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

"میں تو کسی بھی طور اس شادی پر راضی نہیں تھی آغا جان! آپ اس موحد اور اس کی ماں سے کیوں نہیں پوچھتے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے ثمیر کا ساتھ دیا اور اب کبیر کا دے رہے ہیں تباہی ہوئی تو صرف ہمارے گھر کی۔"

آغا جان نے لال ہوتی آنکھیں موحد کی طرف اٹھائیں۔

''سن رہے ہو ناتم، تمہاری محبت اور تم پر اندھے اعتماد نے مجھے یہ دن دکھایا ہے کہ میرا گھر بربادی کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے۔''

''میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ کچھ آپ سے چھپایا ہے اور نہ کسی اور سے۔ فیصلے کا اختیار آپ کے پاس ہے جو چاہے کریں۔'' موحد کا اعتماد قابل دید تھا۔

''تم نے ابھی صرف میری محبت دیکھی ہے موحد! نفرت کروں گا تو سہہ نہیں پاؤ گے۔''

''چودہ سال کی عمر میں ایک جھلک دیکھی تھی آغا جان! آج تک داغ داغ سینہ لیے پھر رہا ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا تو انہوں نے سر جھٹکا۔

''اور تم...... ذرا اپنے شوہر کو گھر بلاؤ۔ مجھے پتا تو چلے کیا کیا کھیل شروع کر رکھے ہیں تم لوگوں نے میری

ناک تلے۔" انہوں نے آج پہلی بار تائی جان کو اتنی حقارت سے مخاطب کیا تھا۔
"صرف یہی نہیں یہاں موجود سب ہی لوگ اس سازش میں شریک ہیں آغا جان! آپ سہیل سے پوچھ لیں سب کیا دھرا موحد کا ہی ہے۔" سائرہ چچی نے کڑی نظروں سے سینے پر بازو لپیٹے پرسکون کھڑے موحد کو دیکھا۔ مہرو کی تو زبان ہی تالو سے چپکی ہوئی تھی۔ آغا جان نے بے یقین مگر شاکی نظروں سے موحد کو دیکھا۔ وہ بالکل خاموش تھا نہ کوئی وضاحت نہ صفائی۔
"سہیل اور مبین کو بلاؤ فوراً اور سب میرے کمرے میں آؤ۔" آغا جان نے گرج دار لہجے میں کہا اور بٹن دبا کر وہیل چیئر کا رخ موڑا۔ موحد نے بے اختیار وہیل چیئر کی پشت تھامنا چاہی تو وہ کڑوے لہجے میں اسے ٹوک گئے۔
"ابھی آغا ذوالفقار اتنا کمزور نہیں ہوا کہ تم لوگ اسے اپنے اشاروں پر نچا سکو۔" وہ خود کار وہیل چیئر کا بٹن دباتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ موحد شانے اچکا کر رہ گیا۔
"واہ...... بہت خوب سائرہ! مسکینیت کا چولا اتار کر بہت اچھی طرح شکل دکھائی ہے تم نے اپنی۔" آغا جان کے جاتے ہی تائی جان بل کھا کر سائرہ چچی پر الٹیں۔
"کل کا پتا چلنا آج پتا چل گیا۔ اچھا ہو گیا نا۔" وہ بڑی بہادر بنی ہوئی تھیں۔ تائی جان کا دل چاہا تھپڑوں سے ان کا منہ لال کر دیں۔ مہرو نے آگے بڑھ کر ماں کے کندھوں پر ہاتھ جما کر دھیرے سے دبایا اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر تنبیہی انداز میں بولی۔
"جو ہو چکا وہ کسی کے کہنے یا چپ رہنے سے بدل نہیں سکتا امی! آپ بے فکر رہیں۔ عزت سے رخصت کیا ہے ہم نے ملاحہ کو۔"
"ہاہ ......ایک ڈرائیور کے ساتھ۔" سائرہ نے تنفر سے طنز کیا۔
"جس محبت اور خلوص سے وہ ملاحہ کو لے گئے ہیں، وہ بھی دنیا نے دیکھ لیا ہے سائرہ! اب بس کر دو تم لوگ اور دولت اور منصب کے بے مقصد دائروں سے باہر نکل آؤ۔ یہاں عام انسان بھی بستے ہیں جن کے گھر نہ سہی مگر دل بہت بڑے اور خوب صورت ہیں۔"
ثمرہ چچی نے تادیبی انداز میں کہا مگر ادھر اثر ہی کہاں تھا۔ جب کہ تائی جان مبین صاحب کو فون کرتے ہوئے مسلسل سائرہ اور سہیل آفندی کی متوقع چال کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ سائرہ کی اتنی بہادری بے وجہ نہیں تھی یقیناً ان کی پشت پر سہیل آفندی کھڑے تھے۔

☆☆☆

زور سے دروازہ کھول کر وہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ موحد لیٹے سے بے اختیار چونک کر اٹھ بیٹھا۔
"الٰہی خیر...... میں سمجھا زلزلہ آ گیا ہے۔" وہ بے اختیار بولا پھر گہری سانس بھر کر قدرے توقف سے اضافہ کیا۔ "اور ٹھیک ہی سمجھا تھا۔"
"یہ کیا تماشا شروع کیا ہوا ہے تم نے؟ کیوں تم آغا جان کو وقت سے پہلے مارنا چاہتے ہو؟"
مہر ماہ نے غصے سے کہا تو اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہونے کی اداکاری کی۔
میں......؟ میں نے بھلا کیا کیا ہے، میں تو ان کو کبیر اور ملاحہ سے ملوانے کے لیے لایا تھا۔ تائی جان تو کبھی بھی ان کو ملنے کی اجازت نہ دیتیں۔ اوپر سے جو ڈراما شروع کیا گیا، وہ سائرہ بیگم کا لکھا ہوا تھا۔"
"تم اچھی طرح جانتے تھے کہ آغا جان کبیر اور ملاحہ کی شادی سے بے خبر ہیں۔"

''شاباش...... کتنی عقل مند بیوی ملی ہے مجھے۔'' موحد نے بے اختیار تالی بجائی تو مہرو کی رنگت سرخ پڑ گئی۔
''یعنی کہ وہ ساری عمر طلاحہ اور کبیر کی شادی سے بے خبر ہی رہتے اور کل کو ان کے بچوں کو ہمسایوں کے بچے سمجھتے رہتے' واہ۔'' وہ سر دھن رہا تھا۔
''اگر انہیں اس اچانک خبر سے دھچکا لگ جاتا تو ان کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔'' مہر ماہ کو غصہ اسی بات کا تھا۔
''او جانے دو' یہ سب ڈرامابازی ہے، کچھ نہیں ہوتا ان کی جان کو، تم نے دیکھا نہیں سارا قصہ جان کر بھی وہ کیسے سب کو لائن حاضر کر رہے ہیں، اصل میں وہ اپنی طاقت سے واقف ہیں۔'' موحد نے لاپروائی سے کہا تو مہر ماہ کو اور غصہ آیا۔
''اپنی طاقت سے تو واقف ہی ہیں مگر تمہاری چال بازیوں کے بارے میں تو میں اب ان کو بتاؤں گی۔''
''میں نے کیا ہی کیا ہے؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔
''شرم کرو' ابھی اور کچھ کرنے کی کسر باقی ہے۔'' مہر ماہ نے دکھ اور تاسف سے کہا۔ ''لیکن اتنا یاد رکھنا' اگر تمہارے کسی عمل کی وجہ سے آغا جان کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں ساری زندگی معاف نہیں کروں گی۔''
وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
''ہاں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم ساری زندگی مجھے معاف نہ کرو۔'' وہ بوجھل لہجے میں بولا تو مہر ماہ نے تنک کر کہا۔
''یعنی تم انہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہو؟''
''نہیں...... اس جملے کا دوسرا نکتہ دیکھو۔ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''
وہ برجستہ بولا تو مہر ماہ کے سر پر لگی' تلووں پر جا بجھی۔
''مجھے کیا اتنا ہی بے وقوف سمجھا ہے کہ میں اپنے خاندان کے دشمن کے ساتھ ساری زندگی گزار دوں گی۔''
''مجھے دشمنی ہی تو نبھانی نہیں آئی۔ بیچ میں یہ کمبخت دل آ گیا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔
''بس کرو یہ ڈرامابازی۔ دشمنی ہی تو نبھائی ہے تم نے۔ وہ بھی دل سے۔'' مہر ماہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔
''دشمنی نبھاتا ہوں تو تمہیں غصہ آتا ہے، محبت کی بات کرو تو وہ تمہیں ڈرامابازی لگتی ہے۔'' وہ بڑے افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ''ادھر اپنا وہ حال ہے کہ

ایک شہزادی ہے سرد مزاج کہانی میں!
ایک شہزادہ ہے جو دل سے اس پہ مرتا ہے''

وہ اس قدر برجستگی سے بولا کہ مہر ماہ کی رنگت مزید تپ گئی۔
''شٹ اپ...... میری تمہاری نہ کوئی کہانی تھی اور نہ کبھی ہو گی۔ تم میری زندگی کی کہانی میں آنے والے ایک اتفاقی کردار ہو جس کی نہ کوئی اہمیت ہوتی ہے اور نہ ہی قدر۔''
بمشکل اپنے لہجے پر درشتی کا خول چڑھائی وہ پرتنفر میں بولی تو موحد نے بے اختیار اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
''مگر میں چاہتا ہوں کہ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزاروں۔ بے شک تم کبھی مجھے معاف نہ کرو۔'' وہ بوجھل لہجے میں بولا تو مہر ماہ کی جیسے سانس تک رک گئی۔

''مجھے تم سے زیادہ اپنے گھر والے پیارے ہیں اور میری طرف سے تم کسی خوش فہمی کا شکار مت رہنا۔ میں جب بھی اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ کروں گی' موحد آفندی کا اس میں نام تک نہ ہوگا۔'' اس کے ہاتھوں کی گرفت سے اپنے ہاتھوں کو کھینچ کر نکالتے ہوئے وہ لرزتی پلکوں اور کمزور لہجے کے ساتھ بمشکل بولی۔

''اب یہ مت کہنا کہ تمہیں نمیر آفندی سے محبت ہوگئی ہے۔'' وہ بے یقینی سے بولا تو اس کی بات سن کر مہر ماہ بدک گئی۔

''میری زندگی میں تو دونوں ہی دھوکا بن کر آئے ہیں۔''

''بعض اوقات دھوکے میں لپٹی زندگی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔'' موحد نے اسے یقین دلانا چاہا۔

''نفرت ہے مجھے دھوکے بازوں سے اور تم لوگوں نے اپنے بدلے کے لیے جتنا خراج میری زندگی اور خوشیوں سے وصول کیا ہے۔ اس کا بدلہ اس زندگی میں تو نہیں چکا سکتے تم لوگ اور ذرا حقیقت کھلنے دو۔ آغا جان سے بندوق لے کر ایک گولی میں خود ماروں گی تمہیں۔'' مہر ماہ نے بمشکل اپنی آنکھوں کی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے تلخی سے کہا تو وہ چپ سا ہوگیا۔ مہر ماہ جیسے آئی تھی ویسے ہی کمرے سے نکل گئی۔

★ ★ ★

''عاق کر دوں گا میں تم جیسی ناخلف اولاد کو۔'' وہ مبین آفندی کے ٹکڑے کرنے کو راضی تھے۔ ایک ڈرائیور کو دامادی میں لینا ان کا ناقابل معافی گناہ بن چکا تھا۔

''سہیل سے مشورہ کیا تھا میں نے۔'' وہ ہکلائے تو سہیل آفندی نے سرد مہری سے کہا۔

''اپنی کرنی مجھ پر مت ڈالیں بھائی صاحب! بیٹی آپ کی' فیصلہ آپ کا۔ آپ تو بھابی کی اجازت کے بنا تھوکتے بھی نہیں۔'' مبین آفندی نے تھوک نگلا۔

''موحد کا قصور ہے سارے کھیل میں آغا جان!'' آخر کار انہوں نے راز فاش کر ہی دیا۔ ''اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ شادی ہوگئی تو وہ نمیر کے اکاونٹ سے سارا روپیہ واپس لوٹا دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔'' موحد خاموش بیٹھا رہا۔ صوفے میں دھنسا ٹانگ پر ٹانگ جمائے بے نیاز۔ مہرو نے اس پر سلگتی نگاہ ڈالی اور وہ جیسے اپنا من پسند ڈرامہ دیکھ رہا ہو بیٹھ کر خبیث انسان۔

''اور تم...... روپوں کے لالچ میں ذلالت کے اس گڑھے میں اتر گئے، روپیہ تو ویسے بھی نکلوا لیتے ہم اس ذلیل شخص سے۔'' وہ دھاڑے تھے۔

''بینک میں سارا پیسہ واپس آچکا ہے آغا جان!'' وہ دبے لہجے میں بولے۔

''بیٹی تو چلی گئی نا۔'' آغا جان کا دکھ میں لپٹا لفظوں کا خنجر سیدھا مبین آفندی اور تائی جان کے دل میں گڑ گیا۔

''موحد! کیوں کیا تم نے ایسا؟ تم نمیر کے ساتھ ملے ہوئے ہو یا اس نے کبیر کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے صاف اور سیدھی بات بتاؤ۔'' آغا جان کے لب و لہجے میں خون جماتی سرد مہری تھی۔ ثمرہ چچی نے بے اختیار موحد کو دیکھا وہ گہری سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا، پھر اس نے ہلکے سے مسکرا کر آغا جان کو دیکھا۔

(ایک یہی ''جن'' ہے جو ایسی سچویشن میں بھی آغا جان کے سامنے مسکرا سکتا ہے) مہر ماہ کو جھرجھری آئی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے آغا جان! کبیر کا پروپوزل آیا تھا ملاحہ کے لیے۔ تایا جان کو پسند آیا۔ انہوں نے ہاں کر دی اور جہاں تک بات ہے نمیر کی۔'' وہ روانی سے بولتے ہوئے رکا۔ ایک نظر تائی جان کے پہلو میں بیٹھی مہرو پر ڈالی۔ اس کی عجیب سی مسکراہٹ نے مہرو کا دل دھڑکایا۔

''تو اس سے روپیہ واپس نکلوانے کا سارا کریڈٹ مہرو کو جاتا ہے، اس کی ایک کال پر اس مرد مجاہد نے سارا پیسہ واپس ہمارے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کروا دیا۔'' مہرو اور باقی سب کو چار سو چالیس وولٹ کے کرنٹ سے اتنا شدید جھٹکا نہ لگتا جتنا شدید جھٹکا اس سفید جھوٹ سے لگا۔ مبین آفندی نے بے یقینی سے مہر ماہ کو دیکھا۔

''تمہارا رابطہ ہے اس سے؟''

مہرو کی پیشانی پسینے سے تر ہوئی، سب کی نظریں اس پر تھیں۔

''وہی، کبھی کبھار کی کال۔ آغا جان نے کہا تھا کہ اسے کسی طرح ملنے کے لیے آفندی ہاؤس بلا نا۔'' وہ ہکلائی موحد کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیلی۔

''تم...... مبین آفندی! اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ تم اب ہمارے ساتھ رہنے کے قابل نہیں رہے۔ اچھوت ہو چکے ہو اس ڈرائیور کو فرزندی میں لے کر۔'' آغا جان نے حکم دیا تو مبین آفندی ہل کر رہ گئے۔

''وہ مارا۔'' موحد نے اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ پہلی وکٹ گر گئی تھی۔ مہر ماہ نے دکھ سے آنکھیں میچیں۔

''آغا جان!'' مبین آفندی گنگ ہو گئے۔ آغا جان اس وقت وہی آغا ذوالفقار لگ رہے تھے جن کے رعب اور دبدبے سے آفندی ہاؤس کے در و دیوار بھی کانپا کرتے تھے۔

''اور سہیل! کل صبح ہوتے ہی اس عورت کو بھی گھر سے باہر نکال پھینکو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیسے وہ ذلیل شخص سامنے نہیں آتا۔'' ان کے اگلے حکم نے موحد کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان کا اشارہ یقیناً زرنگار کی طرف تھا۔

''آغا جان! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ اس سارے معاملے میں ان کا کیا قصور ہے۔ ماضی میں کی گئی ناانصافی کا مداوا کرنے کے بجائے آپ پھر سے وہی کہانی دہرا رہے ہیں۔'' وہ سخت لہجے میں گویا تھا۔

''اس بے چاری عورت کا یہ قصور ہے کہ اس نے ایک سنپولیا پیدا کیا ہے جو ہمارے خاندان کی جڑوں میں زہر بھر رہا ہے۔'' آغا جان نے نفرت سے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا۔

''اور تم...... اس گھر کی عزت کو ٹھیس پہنچائی ہے تم نے موحد! تمہاری ہمت کیسے ہوئی کبیر کا ساتھ دینے کی۔''

''کوئی گرا پڑا شخص نہیں ہے وہ آغا جان! اور ملاحہ اپنے والدین کی رضامندی سے رخصت ہوئی ہے اس کے ساتھ۔'' موحد کا لب و لہجہ بھی بے مروتی کی حد کو چھو رہا تھا۔

''اس گھر کی بنیادوں کو ہلانے میں کسر تو تم نے بھی کم نہیں اٹھا رکھی صاحبزادے!'' سہیل آفندی نے موحد پر کڑی نگاہ ڈالی۔ ''اگر وقار کا بیٹا اس گھر کے لیے سنپولیا بنا ہے تو کم نقصان تم نے بھی نہیں پہنچایا۔'' وہ تلخ حقیقت بتا رہے تھے۔

''آغا جان! قصور نمیر آفندی کا ہے تو سزا بھی اسی کو ملنی چاہیے۔ میں اس سے بات کروں گی تو آپ دیکھیے گا' وہ سر کے بل آپ کے پاس آئے گا۔'' مہر ماہ نے موحد کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھتے ہوئے بڑے یقین سے آغا جان سے کہا تو انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''دو دن کا وقت ہے تمہارے پاس۔ اس کے بعد دھکے دے کر نکلوا دوں گا میں اس عورت کو گھر سے...... اور یا پھر یار' بلاؤ اس کمینے کو، ذرا حصہ تو دوں جائیداد میں سے اسے میں۔''

آغا جان نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے ان سب کو وہاں سے جانے کا کہا مگر سہیل آفندی کو وہیں روک لیا۔

☆☆☆

یقیناً شطرنج کی پہلی بساط لپیٹ دی گئی تھی اور نئے کھلاڑی اب نئی بساط بچھا کر نئی چال چلنے کی تیاری میں تھے۔ موحد کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے ہمیں تو ان گناہوں کی سزا مل رہی ہے جو ہم نے کیے ہی نہیں۔'' تائی جان نے کمرے میں آکر رونا شروع کر دیا۔ آغا جان کا حکم سن کر انہیں دھکا لگا تھا۔

''ابھی بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہمارے گھر کا شیرازہ کیوں بکھر رہا ہے اور کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔'' مہرو نے متاسفانہ نظروں سے ماں کو دیکھا تو انہوں نے نگاہ چراتے ہوئے بھرائے لہجے میں کہا۔

''ہر گھر میں سسرالی جھگڑے ہوتے ہیں مگر ایسی تباہی کی آندھی نہیں پھرتی ہوگی کسی گھر میں۔''

''اللہ ہی جانے۔'' مبین صاحب نے آہ بھری۔ وہ بھی سخت ٹینشن میں تھے۔ مہر ماہ نے بمشکل ضبط کیا۔

''اللہ ہی تو جانتا ہے اور بے شک وہ بہتر جاننے والا ہے اور جب وہ انصاف کرنے پر آتا ہے تو اس کے دونوں پلڑے ایک برابر ہوتے ہیں امی! پھر ایسی ہی تباہی پھرا کرتی ہے۔''

''تم کیا طنز کرنے بیٹھ گئی ہو۔ ایسا کون سا گناہ عظیم کر دیا ہے ہم نے۔'' تائی جان سے برداشت نہ ہوا تو وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''اب تم لوگ نئی بحث مت شروع کر دینا۔ پہلے ہی سر درد سے پھٹ رہا ہے۔'' مبین صاحب کو ان کی آوازیں بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں مگر مہر ماہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے ماں کے پاس آبیٹھی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''امی! کیا آپ کو واقعی اپنا کوئی گناہ یاد نہیں؟'' بھرآئے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ دم بخود سی اسے دیکھنے لگیں، پھر بہ مشکل بولیں۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''آپ نے چودہ برس پہلے کسی بے گناہ پر بہتان لگایا تھا...... بدکرداری کا بہتان امی! گناہ عظیم اور پھر ایک یتیم بچے کو دھکے دے کر اس گھر سے نکلوایا۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی پھر مبین صاحب کی طرف نظر اٹھائی جو صدیقہ بیگم کی ہی طرح دم بخود تھے۔

''آپ کو پتا ہے نا کسی پر بہتان باندھنا کس قدر عظیم گناہ ہے۔ اور ابو! آپ نے ہر قدم پر امی کا ساتھ دیا...... کیا یہ سب قدم گناہ نہ تھے؟ میرا نکاح پر نکاح کرنا کیا آج بھی آپ کو گناہ نہیں لگتا؟ اور کیا اب بھی آپ کو اللہ سے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ہم ہی کیوں ان آزمائشوں کے لیے؟''

''ایک طوائف کو طوائف کہنا کوئی گناہ نہیں۔'' صدیقہ بیگم نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''وہ طوائف جو شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن آپ لوگوں نے اس کو اس کی اس خواہش پر شرمندہ کر دیا آپ لوگوں کے نزدیک تو پھر ایک کافر کو بھی مسلمان ہونے کی اجازت ملنا ہی نہیں چاہیے۔'' مہر ماہ نے طنز کیا۔

''اس گھر میں آغا جان کے بنائے ہوئے اصول چلتے ہیں تم۔ یہ بات اچھی طرح جانتی ہو صرف میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔'' صدیقہ بیگم۔ نے کمزور لہجے میں اپنا دفاع کیا۔

''اللہ کا واسطہ ہے امی! اب تو اپنی غلطی مان لیں۔ گناہ کا خود سے اعتراف کرنا بھی توبہ کی پہلی سیڑھی ہے۔''
مہرماہ نے عاجز آ کر کہا۔
''اب ان ساری باتوں کا کیا حاصل؟'' مبین صاحب نے پھیکے لہجے میں کہا تو ان کے لب و لہجے میں در آئی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے مہرماہ نے جلدی سے کہا۔
''اپنی غلطی کو مان لینا اور اسے سدھارنے کی کوشش کرنا کبھی بھی غلط نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کوئی دیر ہوتی ہے توبہ کا در تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے ابو!''
''اچھا اب جاؤ اور دماغ خراب مت کرو۔ تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے غلطی صرف ہماری ہی ہے۔'' صدیقہ بیگم نے اسے ٹالنا چاہا۔
''ہماری ہی ہے۔ اسی لیے تو پکڑ میں بھی ہم ہی آئے ہیں امی!'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا اور گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ برسوں کا لگا زنگ آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔ دلوں کی مہریں ہٹنے میں وقت لگا کرتا ہے۔ مہرماہ مزید کوئی بات کیے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی مگر ان دونوں کے سوچنے کے لیے کئی سوال چھوڑ گئی۔

☆☆☆

ملاحہ گھر آ کر بھی ٹینشن کا شکار تھی۔
اس کے آنسو بے اختیار بہے جا رہے تھے۔ کبیر سے کچھ ہی دیر برداشت ہوا پھر وہ بے بس ہو کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''اب بس بھی کر دو یار! ابھی نئی نئی بات ہے آغا جان کے لیے آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''نہیں...... تم اچھی طرح جانتے ہو آغا جان نے کہہ دیا تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ مجھے کبھی بھی اس گھر میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔'' ملاحہ کو رونا آئے جا رہا تھا۔
''یہ سب تو طے شدہ باتیں ہیں ملاحہ! اس میں ایسی نئی بات کیا ہے جس کا تمہیں صدمہ ہو رہا ہے؟ آغا جان کو جب بھی پتا چلتا یہی سب ہونا تھا۔''
ملاحہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کو دیکھا۔
''صحیح کہہ رہا ہوں میں۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ تم آج پہلی بار گھر گئی ہو ان سب کا رویہ تو اول روز سے یہی تھا۔'' کبیر نے اسے یاد دلایا۔
''ہاں مگر آغا جان نے تو یہ سب آج کہا نا۔ پہلے تو مجھے امید تھی کہ امی ابو کبھی نہ کبھی مجھ سے راضی ہو ہی جائیں گے مگر آغا جان کا کہا تو پتھر پر لکیر ہے۔'' ملاحہ کا صدمہ شدید تھا۔
کبیر کو ہنسی آ گئی اور ملاحہ کو اس کی ہنسی پر غصہ۔
''بڑے افسوس کی بات ہے کبیر خان! میرے دکھ پر تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔'' اس نے منہ پھلایا۔
''نہیں ہنسی تو مجھے تمہاری شکل دیکھ کر آ رہی ہے، بالکل ناراض بچی لگ رہی ہو اس وقت۔'' وہ یقیناً اسے بہلا رہا تھا۔
''آغا جان! مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے کبیر!''
''کس گناہ پر......؟'' کبیر نے برجستہ پوچھا۔
''تم سے شادی کرنے پر۔'' وہ کہتے ہوئے اٹکی پھر بے اختیار کبیر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی

سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ملاحہ نادم سی ہوگئی۔

''میرا مطلب ہے کہ تم سے شادی کرنا ان کے نزدیک تو گناہ ہی ہے نا۔''

''اور تمہارے نزدیک؟'' کبیر نے ترنت پوچھا، اس کے بالکل نزدیک بیٹھا یہ شخص جو سالوں سے اس کے دل میں تو بستا آ ہی رہا تھا، گزرے دنوں میں تو گویا وہ اس کی روح تک اتر گیا تھا۔ شربتی رنگ کی آنکھوں میں ملاحہ کو اپنا آپ دیکھنا کس قدر پسند تھا، یہ کوئی اس وقت ملاحہ کبیر خان کے دل سے پوچھتا، اس نے بے اختیار آگے کھسک کر اپنا سر کبیر کے شانے پر رکھ دیا۔

''ان سب کو کیا پتا، میں نے تو اپنی زندگی پالی ہے۔'' وہ آنکھیں موند کر اطمینان سے بولی۔

''تو بس پھر دل سے یقین رکھو، وہ اللہ ہمیں کبھی مایوس نہیں کرے گا اور ہمارے سب رشتے ہمیں واپس مل جائیں گے۔'' کبیر نے ہونٹوں سے اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے تیقن سے کہا تو ملاحہ نے اس کے یقین پر مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

ذرا دیکھ کے چال ستاروں کی
کوئی زائچہ کھینچ قلندر سا
کوئی ایسا جنتر منتر پڑھ
جو کردے بخت سکندر سا
کوئی چلہ ایسا کاٹ کہ پھر
کوئی اس کی کاٹ نہ کرپائے
کوئی ایسا دے تعویذ مجھے
وہ مجھ پر عاشق ہو جائے
کوئی فال نکال کرشمہ گر
مری راہ میں پھول گلاب آئیں
کوئی پانی پھونک کے دے ایسا
وہ پیے تو میرے خواب آئیں
کوئی ایسا کالا جادو کر
جو جگمگ کردے میرے دن
وہ کہے مبارک جلدی آ
اب جیا نہ جائے تیرے بن
کوئی ایسی رہ پہ ڈال مجھے
جس رہ سے وہ دل دار ملے
کوئی تسبیح دم درود بتا
جسے پڑھوں تو میرا یار ملے

نمیر کا میسج پڑھ کر مہر ماہ چند لمحوں کے لیے سن ہوگئی۔ اس کے الفاظ تھے یا محبت کا فسوں...... جوں جوں پڑھتی گئی اس کا دل ان التجاؤں پر پگھل کر جیسے پانی ہونے لگا اور اگلے ہی لمحے یہ پانی بے بس سی کیفیت میں آنکھوں کے کناروں تک آپہنچا۔ کس قدر خبیث شخص ہے یہ...... تھک کر اس نے نمیر کو کال ملائی۔

''یہ سب کیا بکواس ہے؟'' وہ پھٹ پڑی۔
''اب کیا ہو گیا؟'' دوسری طرف تجاہل عارفانہ تھا یا کیا' مہرماہ سمجھ نہ پائی مگر اسے غصہ آیا۔
''یہ سب فضول میسجز...... خبردار جو آئندہ مجھے بھیجے ہوں تو۔''
''او ہو!

میرے درد کی تھی وہ داستاں
جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

یہ نہیں کہ مجھ سے حیران ہو کر پوچھو، نمیر آفندی کہاں سے لاتے ہو یہ دل چرانے والے الفاظ...... تم الٹا چھتروں پر اتر آتی ہو۔''

وہ بڑی مایوسی سے کہہ رہا تھا، مہرماہ سلگی۔ اس کے لفظوں نے جو فسوں سا اس کی ذات کے گرد باندھ دیا تھا وہ پل بھر میں اڑن چھو ہوا۔

"تم نے ہی سکھایا ہے مجھے کہ درد دل کی داستان کو ہنسی میں کیسے اڑایا جاتا ہے۔'' مہرماہ نے چبھنے والے انداز میں کہا۔

''ابھی مکمل تو سنا ہی نہیں تم نے...... ورنہ شاید میرے حق میں فیصلہ دے دیتیں۔

کوئی ایسا بول سکھا دے نا
وہ سمجھے خوش گفتار ہوں میں
کوئی ایسا عمل کرا مجھ سے
وہ جانے، جاں نثار ہوں میں
کوئی ڈھونڈ کے وہ کستوری لا
اسے لگے میں چاند کے جیسا ہوں
جو مرضی میرے یار کی ہے
اسے لگے میں بالکل ویسا ہوں
کوئی ایسا اسم اعظم پڑھ
جو اشک بہا دے سجدوں میں
اور جیسے تیرا دعوا ہے
محبوب ہو میرے قدموں میں''

وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا۔ مہرماہ کا دل ہاتھوں پیروں میں دھڑکنے لگا تو گڑبڑا کر اسے جھاڑ دیا۔

''یہ فضول کی باتیں چھوڑو اور جو تماشا کھڑا کیا ہے، اسے سمیٹو۔ آغا جان تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کے سامنے آؤ گے تو ساری شاعری ناک کے رستے نکل جائے گی۔''

''اتنا تو ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے مگر افسوس اللہ سے ہم اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس کے بندوں سے ڈرتے ہیں۔'' وہ تاسف سے کہہ رہا تھا پھر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''اور فکر مت کرو، آغا جان سے کہنا۔ تگڑی منہ دکھائی تیار رکھیں۔ ملنے آ رہا ہوں میں ان سے۔'' مہرو کا دل تھم سا گیا۔

''وہ آنٹی کو باہر نکال دیں گے اگر تم ان کے سامنے نہ آئے تو...... اور تم جانتے ہو وہ ایسا کر گزریں گے۔''

''اور تم ایسا ہونے دوگی؟'' وہ اس کا امتحان لے رہا تھا شاید۔
''نہیں ...... کبھی نہیں۔'' مہر ماہ بے اختیار بولی۔ ''ایسا کرنا ہوتا تو میں تم سے نفرت ہونے کے باوجود ان کے ساتھ نہ رہتی۔ وہی تو قابل ہمدردی ہیں اس سارے قصے میں۔''
''اور میں ظالم۔'' نمیر نے گہری سانس بھری۔ پھر لہجے پر زبردستی کی خوش گواری کا خول چڑھاتے ہوئے بولا۔
''ویسے تو میں نے تمہارا کافی نقصان کیا ہے لیکن پتا نہیں کیوں جب تم نفرت کا نام لیتی ہو تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔''
''اچھا ہے نا۔ تمہیں بھی پتا چلے کہ نفرت کی بھینٹ چڑھنا کیسا ہوتا ہے۔'' مہرو نے خفگی سے کہہ کر جیسے اس سے بدلہ لیا۔
''مجھے تو اٹھائیس برسوں سے اس لفظ نے پابند سلاسل کیا ہوا ہے مہر! محبت کا ذائقہ تو کم بخت کبھی چکھنے کو نہیں ملا۔'' وہ ہنسا مگر اتنے ٹوٹے لہجے میں کہ مہر ماہ کا اپنا دل گویا مٹھی میں آ گیا۔
''آغا جان کو منا لو گے تو وہ تم سے بہت محبت کریں گے نمیر! زخم دینے والے ہاتھوں کو تو لوگ جلد یا بدیر بھول جاتے ہیں مگر مرہم رکھنے والے ہاتھ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ وہ بھی تمہاری خامیوں کو بھلا دیں گے۔ تم ان کے سب سے لاڈلے بیٹے کی اولاد ہو۔'' مہر ماہ کا دل سخت نہ ہو پایا، وہ چاہ کر بھی بے درد بن کر اسے بد دعا نہیں دے پائی تھی۔
''ہاں ...... وہ لاڈلا بیٹا جو غربت میں تڑپ تڑپ کر ایک سرکاری ہسپتال میں مر گیا ...... اور میں جو ادھر ادھر رل کر پل گیا۔'' وہ بہت تلخ تھا۔ مہر ماہ کو اندازہ تھا اس بات کا۔ جان بوجھ کر اکتا کر بولی۔
''اب بس بھی کر دو۔ کم بدلہ نہیں لیا تم نے بھی۔''
''اور اگر انہوں نے مجھ سے تمہیں چھیننا چاہا تو یاد رکھنا مہر! میں تمہیں کبھی واپس نہیں لوٹاؤں گا۔ تب تم کس کا ساتھ دو گی مہر؟'' اس نے مہر ماہ کی بات گویا سنی ہی نہ تھی وہ بچوں کی سی ضد کے ساتھ پوچھ رہا تھا مگر اس کا سوال سن کر مہر ماہ کی سانس تو کیا دھڑکن بھی لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی۔ ڈھیروں دل جلانے اور اسے رد کرنے والے جواب مہر ماہ کی نوک زبان تک آئے لیکن اس نے مزید ایک بھی لفظ بولے بنا کال کاٹ دی۔
(میرا بدلہ تم سے وقت لے گا نمیر آفندی! میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا) اسے خواہ مخواہ ہی رونا آنے لگا۔ نمیر آفندی کے میسج میں لکھے الفاظ دل پر بھرپور ضربیں لگا گئے تھے۔
دھوکے باز ...... کیا تھا یہ شخص کمبخت!

☆☆☆

''میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بھائی صاحب یہ سارا چکر چلا کر اپنا کوئی مفاد حاصل کر رہے ہیں یا یہ سارا کھیل موحد کا ہے بہر حال آغا جان! جب سے موحد نے بزنس میں ہاتھ ڈالا ہے تب سے ہی بھائی صاحب کے تیور بھی بدلے ہوئے ہیں آخر کوان کا داماد جو ہوا۔''
سہیل آفندی بہت سوچ سمجھ کر آغا جان کی برین واشنگ کر رہے تھے اور آغا جان کا تو یہ حال تھا کہ جو بھی ان سے ہمدردی کی بات کرتا وہ انہیں اپنا سب سے زیادہ سگا لگتا' گھر میں ہونے والے پے در پے واقعات نے انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔
''آپ برا مت مانیے گا آغا جان! لیکن ثمرہ اور موحد کا یہاں آنا درحقیقت ہماری بربادی کا باعث بنا

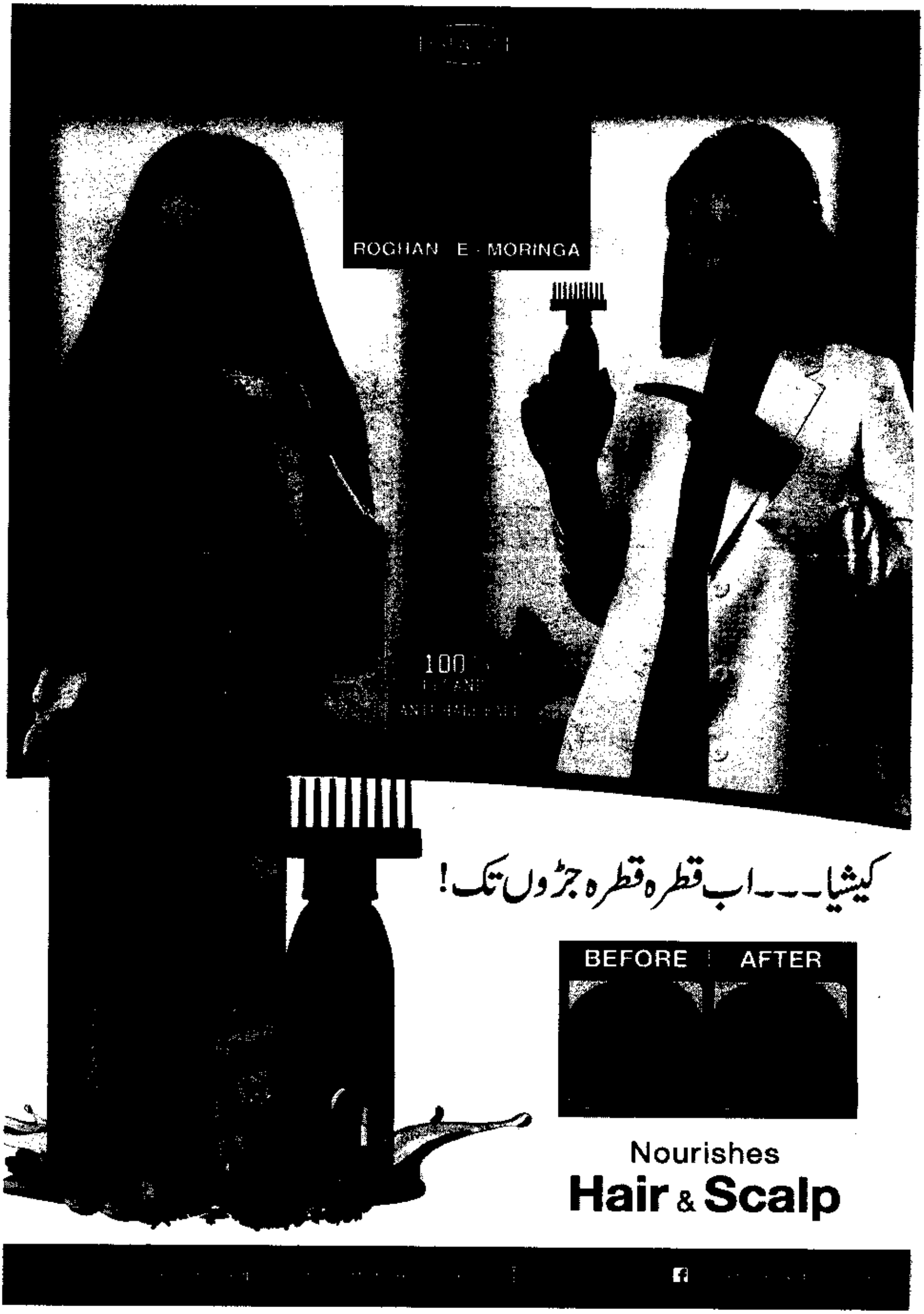
ROGHAN E-MORINGA
کیشیا۔۔۔اب قطرہ قطرہ جڑوں تک!
BEFORE
AFTER
Nourishes
Hair & Scalp

ہے۔'' سہیل آفندی نے دبے لفظوں میں کہا انہیں ڈر تھا کہ کہیں موحد کا نام لینے پر آغا جان بھڑک نہ اٹھیں۔ مگر وہ ماتھے پر تیوریاں لیے سنتے رہے۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں سہیل اور میں کسی کی بھی غلطی معاف نہیں کروں گا۔''

''میری مانیں تو بھائی صاحب کو آفس کے معاملات سے بھی الگ کر دیں' پہلے موحد اور اب بھائی صاحب بزنس کی لٹیا ڈبو رہے ہیں۔ سب کو اپنا اپنا مفاد عزیز ہے۔''

وہ بڑے طریقے سے آغا جان کو اپنی لائن پر لا رہے تھے انہیں علم تھا کہ لوہا گرم ہے اور ابھی کی لگی چوٹ سود مند ثابت ہوگی سو وہ بہت تاک کر وار کر رہے تھے۔

''ہم...... تم پیپرز بنواؤ وکیل سے۔ میں سائن کرتا ہوں کل ہی سب کچھ اپنے ہاتھ میں لو پھر میں دیکھتا ہوں یہ سب کیا کرتے ہیں۔'' آغا جان نے ہنکارا بھرا۔ غصے کی حالت میں انسان ہمیشہ غلط اور جذباتی فیصلے کیا کرتا ہے۔ آغا جان بھی جذباتیت کی اسی سیڑھی پر کھڑے تھے۔ وہ اپنے تئیں کنویں سے دور ہٹ رہے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ کھائی میں گرنے والے تھے۔ سہیل آفندی نے بڑی سنجیدگی اور ادب سے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی' بہت بہتر آغا جان! میں کل ہی وکیل سے پیپرز بنواتا ہوں۔'' آغا جان مطمئن ہو گئے۔

''اور بھائی صاحب کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔ سدا کے غیر جانب دار اور اپنے کام سے کام رکھنے والے سہیل آفندی نے وقت کے ساتھ کروٹ لے کر اپنے سارے رنگ ہی بدل ڈالے تھے اور یہی حال سائرہ چچی کا بھی تھا۔ جہاں انہیں لگا کہ اب ان کی حکومت کے دن ہیں وہیں انہوں نے پر پرزے نکال لیے تھے۔

''کیا کروں سہیل! اب دل میں وہ قوت برداشت نہیں رہی۔ دو بیٹوں کو پہلے ہی کھو چکا ہوں میں۔ اس نے واقعی مجھے مایوس کیا ہے اولاد کے ہاتھوں کھلونا بن کر۔ مگر اب اسے بھی گھر سے نکال دوں گا تو میرے پاس بچے گا کیا؟'' وہ مایوسی سے کہہ رہے تھے۔ سہیل گہری سانس بھرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بات تو بالکل ٹھیک ہے آپ کی۔''

ان کے جانے کے بعد آغا جان نے جلتی ہوئی آنکھیں موند لیں۔ ان کا دل آج عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔

(آغا ذوالفقار...... تم تھک گئے ہو۔ اپنوں سے جدائی کے خوف نے تمہیں کمزور کر دیا ہے ورنہ رحم اور معافی کے الفاظ تمہاری لغت میں تو کبھی بھی نہ رہے تھے) کوئی ان کے اندر کہہ رہا تھا اور وہ سننے پر مجبور تھے۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونک کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''آ جاؤ۔'' اس وقت وہ کسی سے بھی کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے مگر مہر ماہ کو دیکھ کر دانتوں پر دانت جما کر رہ گئے۔

''آغا جان! مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''

''اچھا تمہارے ماں باپ نے کچھ کمی چھوڑی ہے تو وہ تم پوری کر لو۔'' آغا جان نے زہر خند لہجے میں کہا تو مہر ماہ کی ہمت ٹوٹنے لگی مگر وہ جانتی تھی کہ اگر وہ ابھی یہاں سے لوٹ گئی تو پھر کبھی بات نہیں کر پائے گی سو ڈھیٹ بن کر اندر چلی آئی۔ آغا جان کے تاثرات بگڑے۔ مہر ماہ ان کے بستر کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر اسے اپنی ہمت جمع کرتے اور آغا جان کو اس کے بولنے کا انتظار کرتے ہوئے گزر گئی تو وہ چڑ کر بولے۔

''اب بولو گی بھی یا صرف اپنی شکل دکھانے آئی ہو؟''

''میں جانتی ہوں آپ کو پوتیوں کی شکلیں کچھ خاص پسند نہیں' مجھے تو بس آپ سے ایک بہت ضروری بات

کرنا تھی۔" مہر ماہ نے ناراضی سے کہا۔

"نمیر آپ سے ملنے آرہا ہے۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا تو وہ ٹیک چھوڑ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟"

مہر ماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

آغا جان کے چہرے پر تفاخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "دیکھا...... سب پر ٹیڑھی انگلی ہی اثر کرتی ہے۔"

مہر ماہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑی ہمت کر کے بولی۔

"آغا جان! پلوں کے نیچے ہی نہیں اوپر سے بھی بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ کیا اب بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ زرنگار آنٹی کو ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے دیں؟"

آغا جان نے ایک جھٹکا سا کھا کر بے یقینی سے سدا کی باغی پوتی کو دیکھا۔

"تمہارا مطلب ہے، میں اس عورت کو معاف کر دوں جس کی وجہ سے میرا گھر تباہ ہو گیا۔ میرے دو بازو کٹ گئے اس عورت کو معاف کر دوں؟"

ان کی بات سن کر مہر ماہ کو سخت صدمہ پہنچا۔

"معافی......؟ آپ ان کو معاف کریں گے؟ گستاخی معاف آغا جان! مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہیں بلکہ ہم سب ان کے گناہ گار ہیں معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے ان سے۔ ہماری تنگ دلی اور سخت دلی کی وجہ سے ان کا ہنستا بستا گھرانہ اجڑ گیا ہے۔ ان کی خاموش بددعائیں عرش پر جا کر رنگ لے آئیں آغا جان! آپ کے دو بیٹے گئے اور میری زندگی کے تمام رنگ۔" وہ تھک کر رکی تو اس کا تنفس تیز تر ہو رہا تھا۔ اور اس کی باتیں سن کر آغا جان کی آنکھیں پہلے تو حیرت سے پھیلیں پھر ان کا چہرہ غضب سے لال پڑ گیا۔

"تم...... تمہاری یہ جرأت...... تم اس غلیظ عورت اور اس کے ناپاک بیٹے کی حمایت کرنے آئی ہو یہاں...... میں تمہیں...... کھو کھو...... آہ۔" منہ سے کف اڑاتے ہوئے وہ غم و غصے کی تصویر لگ رہے تھے مگر سینے سے اٹھتے درد نے انہیں مزید دھاڑنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ درد کی شدت سے دہرے ہونے لگے تو مہر ماہ کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے اس نے فوراً اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے ان کے میڈیکل باکس میں سے ایک گولی نکال کر ان کی زبان کے نیچے رکھی اور نرم ہاتھوں سے ان کا سینہ مسلنے لگی کئی لمحوں کے بعد ان کی طبیعت سنبھلی۔

وہ ان کے بستر کے پاس کھڑی نادم سی انگلیاں مروڑتی رہی۔

"اب دفع بھی ہو جاؤ یا مار کر ہی جاؤ گی مجھے۔" وہ کمزور مگر چڑے ہوئے سخت لہجے میں بولے۔

"اللہ نہ کرے آغا جان! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا کرے۔" وہ دہل گئی پھر خلوص دل سے ان کو دعا دی۔

"میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ نمیر آفندی آپ کے پاس آئے تو یہ مت سوچیے گا کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ آپ بس اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کیجیے گا کہ وقار آفندی کا بیٹا کیا ڈیزرو کرتا ہے، آپ کی محبت یا نفرت۔"

"وہ نفرت ہی کے قابل ہے مہرو! تم مجھے پٹیاں مت پڑھاؤ۔ اس نے تمہیں نہیں ہمارے خاندان کی عزت کو اغوا کیا تھا۔ اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی رگوں میں کیسی عورت کا خون ہے۔" وہ بے رخی سے بولے۔

"اس کی رگوں میں وقار آفندی کا خون بھی ہے آغا جان! ورنہ وہ مجھے کبھی یہاں چھوڑ کر نہ جاتا اپنا بدلہ پورا کرتا مجھے اپنے پاس رکھ کر۔" مہر ماہ نے نڈر ہو کر کہا تو وہ چپ رہ گئے۔

''سب کہتے ہیں کہ وقار چچا آپ کے سب سے لاڈلے بیٹے تھے۔ آپ کو اور دادو جان کو ان سے بہت محبت تھی..... مگر اب ان کے لاڈلے سے اتنی شدید نفرت.....؟ جیتے جی تو کچھ نہیں دیا ہم نے انہیں مگر اب ان کی روح کو تو سکون دے سکتے ہیں' ان کی فیملی کو اپنا کر۔''

''مہرو۔'' آغا جان نے تھک کر سر تکیے پر ڈالا اور سرخ ہوتی آنکھیں موند لیں۔

''جی آغا جان!'' وہ ان پر جھکی' شاید اس کی منت ترلے کام کر گئے تھے۔

''دفع ہو جاؤ اور اب ایک ہفتے تک مجھے تمہاری شکل بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔'' وہ آنکھیں بند کیے سختی سے بولے تو وہ منہ بناتی فوراً سیدھی ہوئی۔

''ٹھیک ہے آغا جان!'' ناراضی سے کہہ کر وہ ان کے کمرے سے باہر نکل گئی مگر اب دل ہلکا پھلکا تھا کہ سارا غبار نکال ہی لیا آغا جان کے سامنے۔

اس کے جاتے ہی آغا جان نے آنکھیں کھولیں اور چھت پر نظریں جما دیں' ان کی لال پڑتی آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ آج وقار آفندی کا ذکر بہت عرصے بعد کیا تھا کسی نے..... ان کا سب سے وجیہہ اور لاڈلا بیٹا..... ضدی اور ہٹ دھرم۔ مگر یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی' آفندیز کو انا پسندی اور ہٹ دھرمی ورثے میں آغا جان سے ملی تھی۔

''تو اس کا بیٹا کیسا ہوگا؟'' ان کے ذہن میں سوچوں کے تانے بانے بنتے یہ سوچ لہرائی تو سوچ کا سفر رک سا گیا پھر بے اختیار ہی وہ خود کو ٹوک گئے۔

''لاحول ولاقوۃ الاباللہ..... کس فضول سوچ میں پڑ رہا ہوں میں۔'' لاحول پڑھ کر گویا انہوں نے اپنی سوچ پاک کی تھی۔ پھر گہری سانسیں بھرتے ہوئے آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

☆☆☆

اس نے آج اپنی وارڈ روب کا سب سے بہترین لباس پہنا تھا۔ خوشبوؤں میں بسا وہ کلائی پر قیمتی گھڑی باندھے ایک الگ ہی نمیر آفندی نظر آ رہا تھا۔ مہر ماہ نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ریسٹورنٹ کے ہال میں خوش گپیوں میں مصروف لوگوں کو دیکھنے لگی جبکہ موبائل اور گاڑی کی چابی میز کی سطح پر رکھنے کے بعد وہ پوری طرح مہرو کی طرف متوجہ تھا اور جب وہ قصداً اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو نمیر نے انگلی سے میز کی سطح کو کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی کھنکھارا تو مہر ماہ نے نظر اس کی طرف گھما ہی لی۔

''میں تو بڑا رعب ڈالنے کے لیے اتنی ''محنت'' کر کے آیا تھا۔ ادھر دادا کی پوتی ہی متاثر نہیں ہوئی' دادا کیا خاک متاثر ہوں گے۔'' وہ آہ بھر کر بولا لیکن مہر ماہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تک نہ آئی۔

''ہر بات مذاق نہیں ہوتی نمیر! تم یہ سوچو کہ ان کے سامنے اپنی صفائی کس طرح پیش کرنی ہے۔''

''صفائی پیش کرنے کی ضرورت تو جھوٹوں کو پیش آتی ہے۔'' اس نے تیکھے لہجے میں کہا مہر ماہ نے داہنا ابرو کھینچ کر تحیّر سے اسے دیکھا۔

''صفائی تو وہ پیش کریں جنہوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔''

''اوہ..... ریئلی؟'' مہر ماہ کو غصہ آیا۔

''دیکھو! تمہارے ساتھ میرا معاملہ الگ ہے' اس کی سزا تم طے کرو گی۔ آغا جان نہیں۔'' اس کی بات سمجھتے ہوئے وہ جلدی سے بولا۔

''مجھے صرف یہ بتادو کہ تم آغا جان سے کیا بات کرو گے کیا صفائی پیش کرو گے اپنی؟'' مہر ماہ نے عاجز آکر پوچھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم وہاں بھی اپنی فضول باتیں کر کے ان کی جان لینے کی کوشش کرو۔''

''میں صرف ان کے سامنے جاؤں گا ان کو بتانے کہ میں وقار آفندی کا بیٹا ہوں' باتیں تو وہاں جا کر طے ہوں گی۔''

''اور وہ زمین جائیداد کے حصے؟'' مہر ماہ نے اسے یاددلایا تو نمیر نے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ہلایا۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں' جانتا ہوں کہ شریعت میں باپ کے بعد دادا کی جائیداد میں پوتے کا کوئی حصہ نہیں' ایک ایک پائی واپس کر چکا ہوں ان کو حالانکہ چاہتا تو پاکستان کے عدالتی نظام کے تحت اپنا حصہ لے سکتا تھا۔ وہاں تو بہت گنجائش تھی، ان کو عدالتوں میں گھسیٹ کر اپنا حصہ وصول کرتا۔ لیکن تم جانتی ہو کہ مجھے ایک پائی کی بھی ضرورت نہیں۔''

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہماری زندگیوں میں طوفان مچانے کے لیے کیوں آگئے پھر؟'' مہر ماہ نے جیسے ضبط کھو کر کہا۔ ''تمہیں دیکھتی ہوں تو سارے خسارے سر چڑھ کر بولنے لگتے ہیں میرے۔''

چند لمحے وہ خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا۔

''یہ بھی تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔''

کئی لمحے خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے، تب مہر ماہ نے ہار کر کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم آنٹی کو لے کر خاموشی سے واپس چلے جاؤ......کوئی ہلچل مچائے بغیر؟''

''میں اپنی پیدائش پر ہرگز بھی شرمندہ نہیں ہوں مہر!'' نمیر نے تلخی سے کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' مہر و جزبز ہوتی اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''تو تم کیا چاہتی ہو کہ میں بنا کسی جرم کے ان سب کی نظروں میں مجرم بنا رہوں' ان کے کہنے پر مہر ثبت کردوں کہ میں وقار آفندی کا خون نہیں ہوں۔'' وہ آگے کو جھک کر میز پر بازو جمائے سرد مگر کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''اف......اب یہ کب کہا میں نے؟'' وہ خائف ہوئی۔

''تمہارے مشورے کا لب لباب یہی ہے ویسے۔'' وہ تیکھے انداز میں بولا تو تنگ آکر مہر ماہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''یہ دیکھو میرے ہاتھ......اور جو جی میں آئے وہ کرو۔''

''ہمم......دیٹس بیٹر (یہ بہتر ہے)'' وہ جیسے اسی معافی کے انتظار میں تھا' فوراً مطمئن ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

حد درجہ ''کمپوزڈ'' بندہ تھا۔ منٹوں میں موڈ تبدیل کرتا۔ مہر ماہ نے جزبز ہو کر سوچا۔

☆☆☆

اور وہ شام آفندیز کے لیے بہت بڑے دھچکے کی شام تھی۔ آج بہت عرصے بعد موسم کا رنگ دیکھ کر شام کی چائے کا اہتمام لان میں کیا گیا۔ بادلوں سے آسمان تو ڈھکا ہوا تھا ہی......دو پیڈسٹل فین چلا کر ماحول کو اور ٹھنڈا کر کے خوش گپیاں کی جا رہی تھیں۔ چائے سرو کرتی مہر ماہ کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ برتن ہاتھ سے پھسل پھسل

جاتے۔ نہ جانے آج کیا ہونے والا تھا۔ قسمت کون سا کھیل کھیلنے والی تھی۔

چوکیدار نے ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر مہر ماہ کو تھمایا جو اسی غرض سے وہاں بظاہر نگران بنی سب کو سرو کر رہی تھی، سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

مہر ماہ نے ایک نظر وزیٹنگ کارڈ پر ڈالی۔ وہ بیرون ملک کی کسی کمپنی کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ وہ کھنکھاری اور بہت ہمت کر کے کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے آواز کی لرزش پر قابو پا کر اونچے لہجے میں بولی۔

''نمیر وقار آفندی باہر کھڑا ہے آغا جان! آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' اس نے وزیٹنگ کارڈ آغا جان کے ہاتھ میں تھمایا جو ان کے ہاتھ سے ہوتے ہوئے پہلے سہیل اور اب مبین آفندی کے ہاتھ میں گیا تھا۔ ثمرہ کا ہاتھ بے ساختہ دل پر گیا۔

ماحول ایک دم ساکت ہوا اور آغا جان......

ان کو پل بھر کے لیے لگا ان کی پوری ہستی ڈول گئی ہو۔ مہر ماہ کے اشارے پر چوکیدار باہر چلا گیا اور چند لمحوں کے بعد وہ اونچا لمبا بے حد شاندار سا مرد مضبوط قدموں کے ساتھ اندر آیا۔

مبین اور سہیل آفندی بے اختیار ایک بے یقینی کے حصار میں گھرے اٹھ کھڑے ہوئے......تائی جان تو مر بھی جاتیں تو انہیں یقین نہ ہوتا کہ ان کی بربادی کا ذمہ دار یہ شخص ہے اور آغا جان!!

انہیں لگا وقار آفندی کبھی کھویا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ چلا آ رہا تھا......

وہ ان تک پہنچ کر رکا۔ اسے ایک ٹک دیکھتے آغا جان کو احساس ہوا کہ وہ بنا بنایا وقار آفندی تھا......وجیہہ اور پرشکوہ۔

''السلام علیکم! نمیر وقار آفندی ہوں میں۔ نام تو سنا ہی ہوا ہے آپ سب نے مگر آپ سب کے شدید اصرار پر سوچا کہ آج آمنے سامنے ملاقات بھی ہو جائے۔'' سنجیدہ سا لہجہ ان سب کے آس پاس گونجا تو وہاں پل بھر میں سکتہ طاری ہو گیا۔ جبکہ وہ کرسی گھسیٹتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ رہا تھا۔

اور اسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کا دعوا کرنے اور عزم رکھنے والے آغا جان کی آنکھیں ایسے نم ہوئیں کہ نمیر آفندی کے عقب میں موحد آفندی کا عکس دھندلا سا گیا۔

دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں۔ اوجھل سہی نگاہ سے......ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات ہوشیار کہ ہارا نہیں ہوں میں
مجھ کو فرشتہ ہونے کا دعوا نہیں مگر
جتنا برا سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں میں
ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

اور اسے نظر بھر کے دیکھتی ثمرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں......وہ انہیں موحد آفندی جتنا ہی عزیز تھا۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ)

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2018ء

کے شمارے سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

- "دشت جنون" آمنہ ریاض کے ناول کی آخری قسط،
- "یہ کوئی اور ہی کہانی ہے" فاخرہ جبیں کا مکمل ناول،
- "پیپل کے پتوں پر" فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- "نسوہائے وفا" نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- ام ایمان قاضی اور افراح سکندر کے ناولٹ
- شازیہ جمال طارق، فاطمہ حسین، سعدیہ عمیرہ اور طاہرہ فردوس عبداللہ کے افسانے،
- "قیصرہ حیات" معروف ڈرامارائٹر، ناول نگار سے ملاقات،
- "نعمان سمیع" معروف اداکار سے باتیں،
- کرن کرن روشنی احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

بانجھ موسموں کی راگنی

بسنت بھی نہیں کہ حرف رنگ لوں
پیلے پیلے رنگ میں
بہار بھی نہیں کہ پھول ٹانک لوں
کسی نئی اُمنگ میں
خزاں بھی وہ نہیں کہ خشک پتیاں
اوس میں بھگو سکوں
سماں بھی وہ نہیں کہ جس کی تلخیاں
سُرور میں ڈبو سکوں
گنگ اپنے ساز کی
ایک ایک جا بانجھ ہے
کس طرح بشارتوں کا ہو جنم
جب دُلہن ہی موسموں کی بانجھ ہے

قتیل شفائی

خموش ہو گیا ہوں کوئی بات کرتے ہوئے
ہوا سے کچھ نہ کہے جیسے گل بکھرتے ہوئے

میں زینہ زینہ جسے لے گیا بلندی پر
وہ میرے ساتھ نہ تھا سیڑھیاں اُترتے ہوئے

اکیلے پن کا سبب اور ہے کوئی لیکن
ترا خیال بھی آتا ہے آہ بھرتے ہوئے

بکھر رہا ہے گھروندہ کوئی کنارے پر
میں دیکھتا تھا اسے ڈوبتے اُبھرتے ہوئے

نہ رو سکا، نہ گلہ کر سکا نہ روٹھ سکا
ظفر وہ شخص تو پتھرا چکا تھا مرتے ہوئے

صابر ظفر

کیا حقیقت ہے، کیا فسانہ ہے
کس نے پوچھا ہے، کس نے جانا ہے

جانے کیا کیا بدل گیا یارو
نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ زمانہ ہے

عشق ہر حال اک تڑپ ٹھہرا
فرقتِ یار تو بہانا ہے

جانے ہم کانچ کے کھلونوں نے
کس کے ہاتھوں میں ٹوٹ جانا ہے

نازیہ ادا

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
تم یہ کہو خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

اپنا کام ہے صرف محبت باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

کیا کیا روگ لگے ہیں دل کو کیا کیا اس کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے، کون ہمیں سمجھائے

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

جمیل الدین عالی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور رات کو نماز پڑھو جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ (اس طرح) تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے)

فوائد و مسائل:۔

(1) اس میں ان لوگوں کے لیے بشارت ہے جو ذوق و شوق سے مذکورہ کام کرتے ہیں۔

(2) جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ جہنم کی سزا بھگتے بغیر ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل فرمادے گا۔

آزمائش،

کس قدر حیران کن ہوتی ہے نا یہ بات جب آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کسی آزمائش میں ڈالے گئے ہیں اور پھر آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ اللہ کی طرف سے آزمائش میں ڈالے نہیں گئے بلکہ آزمائش سے بچالیے گئے ہیں۔

(بانو قدسیہ)

عظیم لوگوں کی عظیم باتیں،

☆ کیا تم جانتے ہو کہ بدقسمتی سے بھی زیادہ کون سی بات برداشت کرنا مشکل ہے؟ یہ آدمی کی ناشکرگزاری ہے۔

(پنولین)

☆ ناشکرگزار آدمی سے شکرگزار کتا بہتر ہے۔

(سعدیؒ)

☆ جیسے جیسے سونے کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

(جوشنل)

☆ اونچا اڑنے کی خواہش آدمی میں ایک ایسا جذبہ ہے کہ وہ کتنی ہی بلندی پر پہنچ جائے مطمئن نہیں ہوتا۔

(میکیاولی)

☆ ایک آدمی کو قتل کرنے والا غنڈہ اور بدمعاش ہوتا ہے اور ہزاروں کو قتل کرنے والا ہیرو۔

(پورٹنس)

☆ اللہ اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ کوئی بھی آدمی ارتکابِ جرم کے بعد خوشی سے وقت نہ گزار سکے۔

(الغیری)

☆ جب کوئی شخص اپنی بدقسمتی کا شکوہ کرے تو اسے مشورہ دیں کہ وہ محنت کے نسخے کو آزمائے۔

(روز چیٹ)

☆ جو چیز آسانی سے مل جائے، ہم اس کی قدر نہیں کرتے، جو چیز جتنی زیادہ مشکل سے ملتی ہے اس کی قدر و قیمت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

(تھامس پین)

☆ جس طرح برتن کی آواز سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے یا ٹوٹا ہوا ہے، اسی طرح آدمی کی گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عقل مند ہے یا بے وقوف۔

(ڈماس تھیٹر)

کنول شاہین قیصر۔ تلہ گنگ

تین پسندیدہ باتیں،

حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں، تین چیزیں اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہیں۔

1۔ اللہ کے بندوں پر رحم کرنا۔
2۔ بدلہ کی قدرت کے باوجود معاف کرنا۔
3۔ میانہ روی اختیار کرنا۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

حسد کی آگ،

ایک سوداگر کے بچے کو ایک بار تجارت میں کافی گھاٹا ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پاس بُلا کر نصیحت کی۔

"اے پسر! اپنے اس نقصان کا حال اپنے دشمنوں پر ظاہر نہ ہونے دینا۔"

بیٹے نے سوال کیا۔ "اس میں کیا مصلحت ہے؟"

سوداگر نے کہا۔ "مصلحت یہ ہے کہ ہماری مصیبت دُہری نہ ہو جائے۔ ایک تو مال کا نقصان دوسرے مخالفوں کا طنز و استہزاء۔"

اس کی وضاحت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر مدد کرنے والوں کے مقابلے میں خوش ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

(حکایت گلستان سعدی)

ملائکہ کوثر۔ بسم اللہ پور

اسلام،

وہ دین کسی کو کیا نقصان پہنچائے گا جس میں راستے سے پتھر ہٹانے پر بھی ثواب ملتا ہو۔

(اشفاق احمد)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

بیش قیمت،

مقرر نے سو ڈالر کا نیا اور کڑکڑاتا نوٹ جیب سے نکال کر حاضرین کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے جو یہ سو کا نوٹ لینا چاہے گا؟"

حاضرین میں سے لگ بھگ سب ہی لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے نوٹ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

مقرر نے کہا۔ "ٹھیک ہے نوٹ تو ایک ہی ہے اور میں صرف ایک ہی شخص کو دوں گا مگر اپنی اس حرکت کے بعد۔"

اور ساتھ ہی اس نے نوٹ کو مسل کر چرمر کیا، ہتھیلی پر گولا بنایا اور پھر پوچھا۔

"کون ہے جو نوٹ کو اس حال میں بھی لینا پسند کرے گا؟"

لوگوں کی طلب میں کوئی بھی کمی نہیں آئی تھی۔ سب نے یہی کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ نوٹ اس حال میں بھی لینا چاہیں گے۔"

اس بار مقرر نے نوٹ کو زمین پر پھینک کر اپنے جوتوں سے مسل دیا۔ مٹی سے لتھڑے بے حال نوٹ کو واپس اُٹھا کر حاضرین سے پوچھا۔

"کیا وہ نوٹ کو اس حال میں بھی لینا چاہیں گے؟"

اور اس بار بھی نوٹ لینے والوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اور لوگوں کے ہاتھ ویسے ہی اُٹھے ہوئے تھے۔

مقرر نے نوٹ واپس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ نوٹ تو میں تم لوگوں کو نہیں دیتا مگر ایک سبق ضرور دینا چاہتا ہوں۔ جو ابھی ابھی ہم نے اخذ کیا ہے۔ اور وہ سبق یہ ہے کہ پیسوں کے ساتھ چاہے جو بھی سلوک کرو، ان کی قدر میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ان پیسوں کے طلب گار اور لینے والے ویسے ہی رہتے ہیں۔ میرا نوٹ نیا نکورا اور کڑکڑاتا ہوا سو ڈالر کا تھا۔ گرا، جوتوں کے تلوے سے مسلا اور مٹی میں لتھڑا ہوا بھی سو ڈالر کا ہی ہے۔ اس کی قیمت میں کہیں سے کوئی کمی نہیں آئی۔"

ہم انسان بھی تو اسی طرح کئی بار حالات کے منجدھار میں پھنس کر اپنا توازن کھوتے اور گر پڑتے ہیں۔ کئی بار پریشانیوں کے کیچڑ اور غموں کے تعفن میں لتھڑ جاتے ہیں، کئی بار اپنے غلط فیصلوں کے ہاتھوں ناکام ہو کر زمین پر جا گرتے ہیں اور اسباب کی کمی کی بنا

پر ہر عمر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری کوئی قدر نہیں اور نہ ہی ہماری کوئی قیمت ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یاد رکھیے کہ حالات جیسے بھی ہو جائیں آپ کی قدر و قیمت میں کہیں سے بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ آپ اپنے آپ میں یکتا اور انوکھے ہیں۔ مت سوار ہونے دیجیے اپنی لغزشوں کو اپنے حواسوں پر۔ مت دھندلانے دیجیے اپنے خوابوں کو اپنی ناکامیوں کی پرچھائیوں کے نیچے دب کر، بھول جائیے اپنی نامرادیوں کو۔ آپ کی اصل قیمت وہی ہے جو آپ کو خود مقرر کرنی ہے اور یاد رکھیے اپنی قدر کو کبھی کم مت سمجھیے اور نہ ہی اپنی قیمت کبھی کم لگائیے۔

(شانو جاپانا)

نمرود کا غرور،

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نمرود نے پانچ ہزار گز اونچی ایک عمارت بابل میں بنوائی تھی کہ اس پر چڑھ کر اللہ سے مقابلہ کرے۔

آخر سخت آندھی سے وہ عمارت گری اور نمرود کے لشکر کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ نمرود چار سو برس تک زمین میں بڑے ظلم اور ستم کرتا رہا۔ حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا۔ طرح طرح کے جبر کر کے لوگوں کو سنت ابراہیمی سے روکا۔ آخر اس ذلت سے ہلاک ہوا کہ ایک مچھر حکم الٰہی سے اس کی ناک کے نتھنے کے ذریعے دماغ میں گھس گیا۔ ہر وقت وہ مچھر اس کے دماغ میں کاٹتا تھا جس کی وجہ سے اسے دورے پڑتے تھے۔ اسی تکلیف سے وہ ہلاک ہو گیا۔

طاقت ور امین،

حضرت عثمان ؓ کے آزاد کردہ ایک غلام نے بیان کیا۔

ایک دفعہ ہم کہیں جا رہے تھے۔ میں حضرت عثمان ؓ کے پیچھے سوار تھا۔ یہاں تک کہ آپ ؓ صدقات والے باڑے میں آئے۔

اس دن سخت گرمی تھی اور سخت لو چل رہی تھی، ہمیں ایک آدمی نظر آیا جس نے تہمد اور چادر اوڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنے سر کو چادر سے لپیٹ کر اونٹوں کو ہانک کر اس باڑہ میں لا رہا تھا جہاں صدقے کا اونٹ رکھے تھے۔ حضرت عثمان ؓ نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ کون ہے؟"

میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ جب ہم آپ ؓ کے قریب پہنچے تو دیکھا وہ حضرت عمر ؓ تھے۔

حضرت عثمان ؓ نے فرمایا۔

خدا کی قسم! یہ طاقت ور امین ہیں۔

محبت،

زندگی کے جس چاک کو عقل سی نہیں سکتی، محبت اسے کسی تار اور سوئی کے بغیر سی لیتی ہے۔

حضرت عمر ؓ کا عدل و انصاف،

حضرت عمر ؓ کے عدل و انصاف کی یہ حالت تھی کہ جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی سلطنت کا دور دراز کا چرواہا بھاگتا آیا اور چیخ کر بولا۔

"لوگو! حضرت عمر ؓ کا انتقال ہو گیا۔"

لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں اس سانحہ کی اطلاع کس نے دی؟"

چرواہا بولا۔ "جب تک حضرت عمر ؓ زندہ تھے۔ میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں۔ کوئی درندہ انہیں آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آج پہلی مرتبہ ایک بھیڑیا میری بھیڑ کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ میں بھیڑیے کی جرأت سے جان گیا کہ اب حضرت عمر فاروق ؓ آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔"

نادیہ اشرف۔ رائے ونڈ

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---- رانیہ خان

میک اپ --- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی --- موسیٰ رضا

اس ماہ کے ہٹ ساگر

سادہ لوح

ایک صاحب جب بھی احباب کی محفل میں پہنچتے سارے لوگ انہیں دیکھتے ہی اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے۔ کئی بار یہی ہوا تو انہیں تشویش ہوئی۔ ایک دوست سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ''تمہارے موزے بدبودار ہیں، انہیں بدل کر نئے موزے پہننا شروع کردو۔''

اگلے روز وہ صاحب نئے موزے پہن کر دوستوں کی محفل میں گئے اور دوستوں نے حسب معمول ناک پر رومال رکھ لیے۔ ان صاحب کو بہت غصہ آیا۔ تقریر کے انداز میں دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''مجھے معلوم ہے تم لوگ اپنی ناکوں پر رومال کیوں رکھتے ہو، مگر اب میں نے نئے موزے پہن لیے ہیں، پرانے موزے اتار دیے ہیں، اگر یقین نہ ہو تو یہ دیکھو۔''

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور لہراتے ہوئے بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ رہے وہ پرانے موزے۔ خدارا اب تو اپنی ناکوں سے رومال ہٹالو۔''

آٹوگراف

ہائی وے پر ایک تیز رفتار کار دیکھ کر انسپکٹر نے موٹر سائیکل سوار سارجنٹ کو اس کار کو روکنے کا حکم دیا۔ سارجنٹ حکم پاتے ہی کار کے پیچھے لگ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے ریڈیو ٹرانس میٹر پر انسپکٹر کو رپورٹ دی۔

''کار ایک مشہور فلم اسٹار چلا رہی تھی، میں نے اسے روک کر اپنی نوٹ بک نکالی، جسے اس نے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اس پر آٹوگراف دے کر اور نوٹ بک میرے ہاتھ میں تھما کر رواں ہوگئی۔ میں ابھی تک اسی جگہ کھڑا ہوں، میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''کھڑے کھڑے وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی دوسری نوکری تلاش کرنے کی کوشش کرو۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

ممکن ہے

مشہور سائنس دان جان ڈیوی ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ ایک روز ان کے ایک دوست ان کے گھر آئے۔ وہ انہیں لے کے ٹہلنے لگے، تھوڑی دور سے ایک ننھا لڑکا بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا اور ان سے پیسے مانگنے لگا۔ جان ڈیوی نے اسے پیسے دے دیے اور اپنے دوست سے پُرخیال انداز میں بولے۔

''اس شہر کے بچے عجیب ہیں، ہمیشہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے آتے ہیں۔''

''مگر یہ تو آپ کا اپنا بچہ ہے۔'' دوست نے کہا۔

ڈیوی نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔

''ارے ہاں ممکن ہے، وہ میرا ہی بچہ ہو۔''

کمال

رات کے وقت ایک عورت باورچی خانے سے خواب گاہ میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر بچے کے پاس مبہوت کھڑا ہے۔ بچے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طرح طرح کے جذبوں کے رنگ چھلک رہے تھے۔ خوشی، فخر، حیرت، تعریف، رشک سب تاثرات نمایاں تھے۔ شوہر کی پدری محبت دیکھ کر عورت کے دل میں بچے اور شوہر کے لیے پیار اُمڈ آیا۔ محبت کے حصار میں قید اس نے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔

''ڈیئر! کن خیالوں میں گم ہو؟''

شوہر نے جواب دیا۔ ''بھئی کمال ہے، اتنی دیر سے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنا خوب صورت پالنا کوئی بیس روپے میں کیسے فروخت کر سکتا ہے۔''

ستم ظریفی

ٹریفک سارجنٹ نے طویل اور طوفانی تعاقب کے بعد ایک صاحب کو روکا جو سگنل توڑ کر تیز رفتاری سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، ایک خاتون بھی ان کے ساتھ تھیں۔

''آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ نے سگنل توڑا اور پھر اس تیز رفتاری سے گاڑی بھگائی جتنی رفتار سے اس سڑک پر گاڑی چلانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔'' سارجنٹ نے غصے سے کہا۔

''میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی، میری بیگم سے پوچھ لیں۔'' وہ صاحب معصومیت سے بولے۔

''کیوں بیگم صاحبہ! کیا آپ گواہی دیں گی کہ آپ کے شوہر نے نہ تو سگنل توڑا اور نہ ہی گاڑی تیز چلائی۔ میں آپ جیسی معزز خاتون سے جھوٹی گواہی کی توقع نہیں کر سکتا۔''

''میں تو ایک بات جانتی ہوں۔'' خاتون سر جھکائے ہوئے بولیں۔

''جب میرے میاں نشے میں ہوں اور ڈرائیونگ لائسنس گھر بھول آئیں تو ان سے بحث نہیں کرنا چاہیے۔''

افسوس

ایک ٹیسٹ میچ میں ملک کا مایہ ناز کھلاڑی پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو گیا تو وکٹ کیپر کو بہت ہی افسوس ہوا وہ ازراہ ہمدردی بول اٹھا۔

''کوئی بات نہیں دوست! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، اب دیکھو ناں پچھلے میچ میں آپ نے بالروں کی خوب ٹھکائی کر کے ڈبل سنچری مکمل کی تھی۔''

''ہاں، ہاں بھئی پچھلی دفعہ میں خوب جم کر کھیلا تھا اور جب میں آؤٹ ہو کر واپس پویلین پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء اور مشروبات تمام ٹیم ختم کر چکی تھی اور مجھے بھوکا رہنا پڑا تھا۔'' مایہ ناز کھلاڑی نے جواب دیا۔

ڈھٹائی

بارش میں بھیگتے ہوئے ایک صاحب نے دور سے ٹیکسی آتی دیکھی تو لپک کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے روکا لیکن اس وقت ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گئیں۔

''یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے۔'' وہ صاحب بڑے غصے سے بولے۔

''ٹیکسی کو میں نے روکا تھا۔''

''ضرور روکا ہوگا۔'' خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔

''لیکن اس ڈرائیور سے شادی دو سال پہلے میں نے کی تھی۔''

فرمائش

جارج برنارڈ شا ایک ریستوران میں کھانا کھا رہے تھے، بینڈ کے بے ہنگم سُروں سے عاجز آ کر انہوں نے ویٹر کو بلایا اور پوچھا۔

''کیا یہ بینڈ والے کوئی فرمائشی چیزیں بھی بجا سکتے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، ضرور ضرور۔''

برنارڈ شاہ نے کہا۔

''اچھا تو میری طرف سے انہیں عرض کر دیں کہ اب وہ تعطیلیں بجائیں۔''

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

خدیجہ مسکان ہراج ______ داؤد والا تلمبہ

ہم نے دیکھا تھا فقط شوق نظر کی خاطر
یہ نہ سوچا تھا کہ تم دل میں اُتر جاؤ گے

میمونہ رحمت ______ شرق پور شریف

اگر دل ہار بیٹھے ہو میرے ہمدم محبت میں
فنا کیسی، بقا کیسی، سزا کیسی، جزا کیسی

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

یہاں ہر ایک سے ہجر و وصال کرتے ہو
کیوں اپنا شہر میں جینا محال کرتے ہو
یہ آشنائی اسے یاد ہی نہ ہو شاید
وہ جس کے نام سب ہی ماہ و سال کرتے ہو

فریحہ عزیز شیخ ______ کنڈیارو

مشغلہ اس نے عجب سونپ دیا ہے یارو
عمر بھر سوچتے رہیے کہ وہ کیسا ہو گا
جانے کس رنگ سے روٹھے گی طبیعت اس کی
جانے کس ڈھنگ سے اب اس کو منانا ہو گا

شبانہ افضل ______ ٹوبہ ٹیک سنگھ

اسی ایک پل کی تلاش ہے جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری رہگزر میں بکھر گئیں میری عمر بھر کی مسافتیں

ثمرہ، اقراء ______ کراچی

راس آ ہی گیا ترک تعلق اسے آخر
آنکھوں میں وہ پہلی سی ندامت نہیں رہی

فرزانہ انصاری ______ کراچی

میں سمجھا میری گھٹن مٹانے آیا تھا
وہ جھونکا تو دیا بجھانے آیا تھا

سدرہ بتول ______ ملتان

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے میری بساط کیا، اک دیا بجھا ہوا

کنیز فاطمہ ______ جڑانوالہ

جن پر ہوتا ہے دل کو بھروسا تابش
وقت پڑنے پر وہی لوگ دغا دیتے ہیں

سیدہ جویریہ شوکت ______ گاؤں ٹھٹھہ سیداں

یوں ہی تمثا دیا ہے جس کو تو نے
وہ قصہ ایسا مختصر نہیں تھا

انیلا طالب ______ گوجرانوالہ

تو نے تو پھر بھی زمانے کے چلن سیکھ لیے
میں تو کچھ بھی نہیں کر پایا محبت کے سوا

اقراء عزیز ______ گاؤں دریا خان جلبانی

پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا، ہماری زندگی کیا

حمدہ خان ______ کراچی

اب اپنا اختیار ہے چاہے جہاں چلیں
راہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

آنسہ سلیم ______ کمن صادق آباد

بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں
وہ اجنبی بن کے اب ملے بھی تو کیا ہے محسن
یہ ناز کم ہے کہ میں بھی اس کا کبھی رہا ہوں

ہما فاروق ______ گوجرانوالہ

نہ کھول میرے مکان کے اُداس دروازے
ہوا کا شور میری اُلجھنیں بڑھا دے گا
میں خوب واقف ہوں اس کی فطرت سے فراز
درد دے گا تو اتنا کہ بس رُلا دے گا

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اوران کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ رب العزت آپ کو بے حساب رزق خوشیاں اورآسانیاں عطافرمائے۔آمین۔

اقرا امتیاز نے سرگودھا سے لکھا ہے
ٹائٹل ۔۔۔ پر براجمان پیاری سی دوشیزاؤں سے ہیلو ہائے کی اوراندر پہنچے۔
بندھن میں کرن تعبیر سے اتنی دفعہ ملاقات ہو چکی ہے کہ اب ان سے ملاقات کرتے ہوئے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی لیکن اس دفعہ کرن تعبیر کے ساتھ ملک علی حمزہ صفدر سے بھی ملاقات کی۔ شاہین رشید جی ایک آدھ ملاقات تجل علی سے ہی کروادیں۔ دستک میں شائل خان، محسن عباس حیدر سے بھی ملاقات بیسٹ رہی۔
مصباح علی سید کا مکمل ناول "دل، دروازے" ۔۔۔ بہت اچھی اسٹوری تھی۔ شکر ہے یاذف اور عذبہ مل گئے۔ عذبہ کا مطلب کیا ہے؟ سحرش بھٹو کا مکمل ناول بہت پسند آیا زویار اور زریکتا کی نوک جھوک بہت پسند آئی۔
مہوش افتخار کا مکمل ناول "شب تاب" بہت بہت امیزنگ سٹوری تھی۔ ہر طرف سے پرفیکٹ اینڈ کیا آپ نے، بہت اچھاناول تھا۔ افسانے سارے اچھے تھے خاص کر "عیدی"۔

ج: پیاری اقرا! عذب کا مطلب ہے شیریں، خوش گوار۔ ویسے آج کل ایسے نام رکھنے کارواج چل پڑا ہے جو محض بولنے میں اچھے اور منفرد لگتے ہیں مگر وہ خود ساختہ ہوتے ہیں اوران کے کوئی معنی نہیں ہوتے یا قرآن میں سے ایسے الفاظ پر مشتمل نام رکھ لیے جاتے ہیں جن کے معنی اچھے نہیں ہوتے۔ مثلاً قران میں ایک لفظ ارذل استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی ہیں "بہت ذلیل" مگر لوگوں نے اپنے بچوں کا یہ نام رکھا ہوا ہے کیوں کہ یہ سننے میں منفرد ہے۔ ایک بچے کا حق ہے کہ اس کا بامعنی اور بہترین نام رکھا جائے۔

جویریہ مریم نارنگ منڈی سے ۔۔۔ لکھتی ہیں
ماہنامہ شعاع ایک بہترین رسالہ ہے۔ اس میں شائع ہونے والی بعض کہانیاں اتنی پُراثر ہوتی ہیں کہ ایک جملہ سوچوں کا رخ بدل دیتا ہے۔ بہنوں سے میری درخواست ہے کہ کچھ ہلکا پھلکا لکھیں۔ مزاحیہ سا۔ ماضی میں ماہا ملک کی کہانیاں پڑھتے تھے۔ جنہیں پڑھ کر قہقہے پھوٹ پڑتے تھے۔ اب ایسی کہانیاں ڈھونڈنے پر بھی بہت کم ملتی ہیں اور ایک بہن اور لکھا کرتی تھیں مریم ساجد......
مریم ساجد تمہارے سات چاندوں کو ابھی تک ہم یاد کرتے ہیں۔ پلیز کوئی مکمل ناول لکھیں۔ موضوع ہلکا پھلکا سا ہو۔
ج: پیاری جویریہ! آپ کی چاروں کہانیوں کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔ مریم ساجد تو پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی ہیں۔ وہ ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ مریم کوئی اچھا سا مزاحیہ ناول لکھیں ہم اور ہمارے قارئین منتظر ہیں۔
عمیرہ احمد نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

شازیہ الطاف ہاشمی نے شجاع آباد سے لکھا ہے
بچے اسکول جاچکے ہیں ماریہ بھی سوگئی ہے میری بیٹی کی عمر آٹھ ماہ ہے مجھے وقت بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے

بچوں کو ہوم ورک کروانا اور ماہیر کی دیکھ ریکھ میں مجھے اپنے پاس بیٹھے بھی دنوں بیت گئے۔ مگر میں خواتین اور شعاع پڑھنا خریدنا کبھی نہیں بھولتی اور ساتھ ساتھ اپنے افسانے کا انتظار مگر اب آپ کی طرف سے خاموشی چھا گئی ہے۔

آپ دل رکھنا جانتی ہیں۔ دنیا سے ہٹ کر جواب دیتی ہیں۔ سارے لوگ اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتے جیسی آپ کرتی ہیں، یہ میرے دل کی بات ہے اسے کچھ اور نہ سمجھا جائے۔ آموں کے بور کی خوشبو ہر سمت پھیل چکی ہے، صبح ہی صبح ہوائیں پتا نہیں کہاں کہاں سے کچے آموں کی خوشبو خود میں سمیٹے بکھر جاتی ہیں (شاید مینگو ریسرچ سنٹر ہے) وہاں اتنے آم ہیں اور اتنی اقسام کے ہیں کہ انہیں دیکھ کر بے اختیار اللہ رب العزت یاد آجاتے ہیں، سبز، سنہرے، پیلے، سبزی مائل جسامت میں بہت چھوٹے چھوٹے بھی اور بہت بڑے بڑے بھی اور وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں بہت چھوٹی گٹھلی اور گھسے ہوئے صابن کے ریزے جیسے بھی۔ ہر درخت پر بے شمار آم لگے ہیں اور نیچے بڑی بڑی سرسبز گھاس اور درمیان میں کالی سیاہ چوڑی سڑک نہ گند نہ گرد و غبار اور سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی سی صاف ستھری نہر۔ جس کے کنارے پختہ سیمنٹ کے بنے ہیں (آم توڑو اور اس میں دھو کر کھالو اس نہر کا مصرف میرے نزدیک تو یہی ہے) آموں کی مہکار اور میرا دودھ سوڈے کا شغل (یہاں دودھ خالص مل جاتا ہے) خالص دودھ کے دودھ سوڈے کی بہار روز کے روز اور ساتھ اگر ماریہ صاحبہ سو جائیں تو اس سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے پھر شمارہ پکڑ کے ندا فاضلی کی غزل اور ”ٹیولپ“ ”اور..... ٹین کی چھت“ ٹن ٹن بجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بہت اچھا ناولٹ۔ دھنک کے رنگ عفت سحر طاہر جی میرو کو لے آیا کریں ہماری محفل میں ’مائی جھلی کے پاس ہر مسئلے کا حل ایسی بے ساختہ ہنسی کہ بچے مجھے دیکھنے لگے ہوم ورک چھوڑ کے۔

ج: پیاری شازیہ! خط میں آپ نے نہر، آم اور خاموشی کی جو منظر کشی کی ہے، اسے پڑھ کر ہمارا دل بے ساختہ شجاع آباد آنے کو چاہا۔

کہانیاں آپ کی ہمیں ملتی رہی ہیں۔ شائع بھی ہوتی رہی ہیں۔ مگر پچھلے چند ماہ سے آپ کی کوئی کہانی شائع نہ ہو سکی۔ یہ محض اتفاق ہے۔ کچھ کہانیاں ناقابل اشاعت ہیں اور کچھ باری آنے کے انتظار میں ہیں۔ کوشش کریں گے کہ آئندہ شمارے میں آپ کی کہانی ضرور شامل ہو۔

خاموشی کا مطلب کبھی ناقابل اشاعت ہوتا ہے اور کبھی باری آنے کا انتظار...... ہماری کمال کا لکھنے والی رائٹرز بھی کبھی بہت ہلکا لکھ دیں تو ہم ان کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری خاموشی سے اپنے قلم کو نہ توڑیں بلکہ اپنے قلم سے ہماری خاموشی کو توڑیں۔

رومیصہ قمر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ہمارے گوجرانوالہ میں تو اتنی گرمی ہے ایسے لگتا ہے جیسے سورج غروب ہی نہیں ہوتا۔ پھر پانچ تاریخ کو زور و شور کی بارش ہوئی کہ نہا کر مزہ آ گیا۔ سب سے پہلے تو خط پڑھے واقعی ثمرہ اکرم نے بالکل ٹھیک کہا کہ ٹائٹل کی وجہ سے ہی گھر والے نہیں پڑھنے دیتے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو باہر کوئی قدرتی مناظر لگا دیں جیسے جھیل، چشمے، صبح کا خوب صورت وقت اور گاؤں وغیرہ۔ تو شاید ہمیں پڑھنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد کہانیوں پر نگاہ دوڑائی۔ اپنی بیسٹ کہانی شہزاد کو نہ پا کر مجھے زور کا دھچکا لگا۔ اور میرا دل پتا ہے کیا کیا......؟ کہ اس رسالے کو اٹھاؤں اور ابو کو دے آؤں ہاہاہا۔ آپ سمجھ تو گئے ہوں گے۔ بن پاکھی کی اسٹوری تو اتنی تھکی تھکی تھی کہ میں کہانی میں سفر کر کر کے تھک گئی۔ لیکن پڑھ کر تھکنے کا مزہ بھی آیا۔ ”خواب شیشے کا“ بھی ٹھیک جا رہا ہے۔

”چاندی کی چوڑیاں“ تو بہت مزے کی تھی اندر ایک بالکل فلمی سین تھا، ایسے لگا جیسے میں کوئی فلم دیکھ رہی ہوں۔ اور ہاں سحرش خان جی آپ نے رشتے واضح نہیں کیے۔ افسانے بھی سب ہی اچھے تھے۔ جہاں ”یار دلدار“ پڑھ کر ہنسی آئی وہیں ”پریم بوٹی“ پڑھ کر رونے والا منہ بن گیا۔ کرن تعبیر سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ باقی تمام سلسلے بیسٹ تھے۔ آخر میں ایک چھوٹا سا سوال، آپی اگر کسی رائٹر کو تحفہ وغیرہ دینا ہو تو کیا کریں؟

ج: پیاری رومیصہ! ہمارے کراچی میں تو اتنی گرمی ہے کہ ہر بندہ اپنی جگہ خود سورج بنا ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں سب سے اچھا تحفہ نیک نیتی سے کی گئی دعائیں ہیں جو دونوں جہان میں انسان کے لیے پریشانی اور مشکلات سے نجات کا باعث بنتی ہیں۔

صائمہ اکرم چودھری ناسازیٔ طبع کے باعث قسط نہ لکھ سکیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کو قسط نہ پا کر مایوسی ہوئی ہو گی لیکن اتنا غصہ نہ کیا کریں مجبوری تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔

مہناز رانی مانانوالہ ضلع شیخوپورہ

ہر دفعہ کی طرح پہلے حمد اور نعت پڑھی پھر پیارے نبی کی پیاری باتیں اعتکاف کے بارے میں پڑھ کر بہت سی نئی معلومات ملیں پھر شب تاب کی طرف آئے مہوش افتخار نے بہت اچھا ناول لکھا سب سے بڑھ کر یہ کہ مصطفیٰ اور زرتاب کو ملا دیا مہوش جی جلدی سے ایسا ناول بھی لکھ دیں۔ ''چاندی دی چوڑیاں'' سحرش خان کا مکمل ناول بھی زبردست رہا۔ ''دراور دروازے'' مصباح علی کی تحریر ہلکی پھلکی حقیقی رنگ چھلکاتی تھی۔ ''خواب شیشے کا'' عفت سحر سے گزارش ہے کہ نمیر کو بھی منظر عام پر لے آئیں۔ ''بن باکھی'' فرح بخاری کی تحریر اس دفعہ شمارے کی جان رہی۔ اگلی قسط کا سب کو بے صبری سے انتظار ہے (مجھ سمیت میرے چھوٹے بہن بھائیوں اور ماما جی کو بھی)۔

میری ماما کی فرمائش ہے کہ ہمارے بزرگ اداکاروں کے انٹرویو و تصویریں شائع کیا کریں۔ خط آپ کے ہمارا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ بہت مشکل سے خط لکھ رہی ہوں ایک تو خود ٹھیک نہیں ہوں بخار سے نجات نہیں مل رہی، دوسرا ایکم جولائی کو بھائی کی شادی ہے اب عید کے کپڑوں کی سلائی پھر شادی کی تیاری۔

ج: مہناز رانی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ اگر بخار مسلسل ہے تو آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں، اچھا ہوا آپ نے بتا دیا کہ امتحانات میں مصروف تھیں ورنہ ہم تو تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ مہناز رانی کہاں غائب ہو گئیں۔

آپ کی ماما کی فرمائش شاہین رشید تک ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں ویسے ہم نئے فنکاروں کے ساتھ ساتھ پرانے فنکاروں کے انٹرویو بھی دیتے رہتے ہیں۔

امیمہ حیا اور حفصہ اسد لکھتی ہیں

اپنی جان شہزاد کو نہ پا کر میرے اندر تو اک آگ کا شعلہ اٹھا اور یہ آگ کئی دن تک جلتی رہی۔

خواب شیشے کا اس بار فرسٹ کلاس تھی پڑھتے ہوئے بھی بہت مزہ آیا۔ شب تاب کی تو کیا ہی بات تھی امی کی ڈانٹ سننے کے باوجود مکمل کر کے سکون لیا۔ چاندی دی چوڑیاں واہ واہ سحرش بھٹو نے اس دفعہ کمال کر دیا۔

فرح بخاری کا ناول اگلے ماہ ایک ساتھ پڑھوں گی افسانوں میں صرف عیدی پسند آیا۔ کئی دنوں سے ایک سوال میرے ذہن میں منڈلا رہا ہے وہ یہ کہ ہمزاد ٹیٹا ہاؤس میں شہزاد کے کمرے تک جا پہنچا لیکن شہزاد کو پھر بھی خیال نہیں آیا کہ میں باہر لگے سی سی ٹی وی کیمروں میں دیکھ لوں۔ آخر کیوں؟ جبکہ اس کہانی میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دی جاتی ہے۔

اگر انسان کمزور ہوتا جا رہا ہو تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے میری آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے۔

ج: پیاری امیمہ! پہلی تاریخ کو تو نیا شمارہ آ جاتا ہے۔ آپ شمارہ پڑھ کر 14 تاریخ تک خط بھیجا کریں تاکہ وہ اگلے شمارے میں شامل ہو سکے۔

اب رہی بات کیمروں کی تو بھول چوک انسان سے ہوتی ہے اور پھر وہ انسان اگر کوئی خاتون ہو تو...... درگزر کرنا ہی بہتر ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا، ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے خط شامل کر سکیں اس لیے ہم خط ایڈٹ کرتے ہیں۔

کمزوری دور کرنے کے لیے سب سے بہترین نسخہ یہ ہے کہ آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ پھل سبزیاں دودھ دہی زیادہ استعمال کریں۔

پسرور سے یاسمین کنول نے لکھا ہے

بندھن اچھا لگا۔ غزلیں نظمیں پسند آئیں۔ مہندی کے ڈیزائن اچھے لگے۔ ناول ''خواب شیشے کا'' عفت سحر طاہر کی تحریر ایک ورق پڑھا تو پوری تحریر پڑھتی چلی گئی۔ کہانی بڑی دلچسپ ہے اور انداز بیان بھی بہت خوب ہے، عیدی تحریر بھی اچھی ہے۔

باقی گرمی بہت زیادہ ہے۔ روزہ ہے، اوپر سے پانی بھی نہیں آ رہا۔ پسینہ ہے کہ بہے چلا جا رہا ہے باقی شعاع پر تبصرہ ادھار۔

ج: پیاری یاسمین! ہر دفعہ آپ کا خط صرف ایک پیراگراف پہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس دفعہ تین پیراگراف! واقعی گرمی زیادہ ہے۔ رہا پانی تو سنا ہے آئندہ تیسری عالمی جنگ پانی پر ہی ہو گی۔ واللہ اعلم۔ محلے کی حد تک تو ہم نے پانی پر ابھی تک بھائی چارہ ہی دیکھا ہے۔

تبسم شبیر حسین شاہوار ڈنگہ سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع کافی انتظار کے بعد 6 کو ملا ٹائٹل حسین تھا پلو ڈریس والی ماڈل میری جیسی لگی پہلی شعاع ہمیشہ کی طرح عمدہ حمد و نعت سبحان اللہ نبی کی باتیں، اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق دیں۔ بندھن میں کرن تعبیر کو لانے کا بہت بہت شکریہ۔ ایک فرمائش ہے کہ پلیز عائزہ خان اور دانش تیمور کو بندھن میں لائیں۔ دستک اچھا سلسلہ ہے۔ ''ناتا'' ایک باا ثر پر سبق سلسلہ میری ماما نے بھی بہت پریشانی سہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اس میں شرکت کریں۔ ''شہزاد'' غائب؟ ''خواب شیشے کا'' عفت باجی بہت خوب۔ مکمل ناول میں ''شب تاب'' کی آخری قسط ایک دم لاجواب تھی۔ مبارک ہو مہوش باجی۔ ''چاندی چوڑیاں'' سحرش کا اس ماہ کا بیسٹ ناول ایسا لگا کسی پرانی رائٹر کو پڑھ رہے ہیں۔ ویل ڈن۔ ''بن پاکھی'' فرح بخاری کی دو اقساط ساتھ پڑھ کر ہی تبصرہ کر پاؤں گی۔ ''در اور دروازے'' مصباح باجی تو دل ہیں اپنا۔ پر یہ کوئی قسط وار کیوں نہیں لکھتیں؟ افسانے ''یار دل دار'' اَفشین باجی یہ افسانہ نہیں مکمل ناول ہونا چاہیے تھا۔ ہمارا گھر، عیدی، آسودگی، پریم بوٹی بھی لاجواب ایمل ''پیال ساز'' جیسا شاہکار لکھیں پلیز۔

ج: تبسم! آپ کی والدہ ناتا جوڑا ہے کے سلسلے میں شرکت کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ آپ لکھ کر بھجوا دیں۔ ایمل رضا پیال ساز جیسا ناول لکھیں۔ آپ کی فرمائش ان تک پہنچا رہے ہیں، ویسے یہ ہماری بھی خواہش ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سحر تبسم سحری مغل پورہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

آپ کو میری سمجھ نہیں آئی کہ مجھے فرزانہ کا لکھا سمجھ میں نہیں آتا اور پسند بھی ہے تو جناب سمجھ تو مجھے واقعی نہیں آتا ہے پر ان کی تحریر میں ایک کشش ہے۔ لفظوں میں جادو ہے جو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے، اس لیے سر سے تو گزر جاتا ہے پر دل میں اتر جاتا ہے۔ بندھن میں ــــ کرن تعبیر مجھے بہت پسند ہیں ان کے شوہر کچھ خاص نہیں ہیں۔ شکر ہے کہ اس دفعہ ناتا ہے۔ میں نے بہت مس کیا۔ عفت سحر جی اسٹوری کو جلدی سمیٹیں۔ انتظار نہیں ہوتا۔ اور یہ سمیرا احمید یارم کے بعد کہاں غائب ہوئیں؟ خبر دار جو شعاع کو چھوڑا! شب تاب ہیں ختم؟ ابھی تو مزہ آ رہا تھا۔

چوڑیاں سحرش کی تحریر کافی اسٹورنگ تھی بن پاکھی کی پہلی قسط اچھی لگی دوسری کا انتظار ہے۔ ویسے بن پاکھی کا مطلب کیا ہے؟ مصباح کا ناولٹ آسم تھا ان کا ''کارزارِ دُعا'' مجھے بے حد پسند ہے، افسانوں میں عیدی یار دل دار ہارٹ ٹچ افسانے تھے۔ پلیز ماورا کا انٹرویو لیں۔

ج: سحر جی! آپ ہر ماہ شرکت کریں ہمیں بہت اچھا لگے گا۔ آپ سلسلوں میں شامل ہونا چاہتی ہیں تو کس نے روکا ہے ضرور شامل ہوں۔ کہتے ہیں کہ اچھی تحریر وہ ہے جو دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے فرزانہ کھرل کی تحریر دل میں اتر جاتی ہے تو سمجھ میں بھی آ ہی جائے گی ویسے ہم نے ان سے کہا ہے کہ تھوڑا آسان لکھیں۔

سحرش خان کی تحریر اسٹورنگ تھی، بورنگ تو سنا ہے لیکن اسٹورنگ کا مطلب سمجھا دیں۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔

اقصیٰ طیب الرحمان نے گاؤں مونن ضلع ہری پور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اتنے ماہ خط نہیں لکھ سکی آپ کو، بے حد افسوس ہے۔ وجہ یہ ہے حفظ کے لیے مدرسے میں ڈال دیا گیا۔ الحمد اللہ سات پارے ہوگئے ہیں۔

سب سے پہلے تو شعاع تین کو ہی ابو لے آئے تھے۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔

اس کے بعد حمد اور نعت شریف پڑھیں اور پھر (پیارے نبی کی پیاری باتیں) میں اعتکاف کے بارے میں بہت ساری باتوں کا علم نہیں تھا خود بھی پڑھا اور باقی گھر والوں کو بھی پڑھ کر سنایا۔ بندھن بھی اچھا ہی تھا۔

''چاندی چوڑیاں'' سحرش خان بھٹو ویل ڈن بہت خوب صورت لکھا آپ نے اور کمال کی شاعری اور نام لکھے ہیں۔

میں نے پہلے کبھی خط خود پوسٹ نہیں کروایا۔ ہمیشہ بھائی ہی ڈبل پیسے لے کر پوسٹ کرواتا تھا اور میرا ایڈمیشن فارم بھی وہی جمع کرواتا ہے۔ ایم اے اسلامیات پارٹ ٹو کا داخلہ تو ڈاک خانے خود جانا پڑ رہا ہے۔ اچانک ہی خیال آیا کہ کیوں نہ خط بھی پوسٹ کروا ہی دوں۔

آخر میں ایک ہم سوکھے ہوئے لوگوں کی ریکویسٹ ہے آپ سے ''خوب صورت بنیے'' میں جیسے سب کے لیے ٹوٹکے ہوتے ہیں وزن کم کرنے کے۔ ہمارے لیے بھی

کچھ بتائیں کہ ہم کیا کھائیں کہ لوگ ہمیں لمانا غڑہ کہنا چھوڑ دیں۔

ج: پیاری اقصیٰ! سب سے پہلے تو قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت پر دلی مبارک باد۔ قرآن پڑھنا اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے۔ ویسے تو وزن بڑھانے کا نسخہ خوب صورت بلنے والے آپ کو بتائیں گے مگر ایک ٹوٹکا ہم بھی بتا دیں۔ خوش رہیں اپنا دل دوسروں کی طرف سے صاف رکھیں۔ سب سے محبت کریں۔ اگر وزن نہ بھی بڑھا تو آپ صحت مند رہیں گی اور تروتازہ، شگفتہ نظر آئیں گی۔ ویسے بھی وزن کم ہو یا زیادہ، اچھی صحت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

نازیہ سعد نے چکوال سے لکھا ہے

سب سے پہلے تو میری طرف سے بہت سی عید مبارک وصول کریں۔ حالانکہ جس طرح دن بدن ملک کے حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کوئی چیز مبارک نہیں رہی۔ خیر چھوڑیں اداسی کی باتیں۔

شعاع عید نمبر مزے کا لگا۔ بے شک کچھ کہانیاں بہت خشک تھیں مگر اوور آل بہترین تھا۔ شہزادکی کی شدت سے محسوس ہوئی۔

مکمل ناول میں چاندی دی چوڑیاں بس سو سو۔ کوئی نئی بات نہیں لگی۔ فرح بخاری کا بن پاکھی زرا ہٹ کر تھا۔ سانپوں اور شیروں کی بستی کی کہانی شاباش۔ ناولٹ ایک ہی تھا۔ در، دروازے اور وہی چھا گیا سارے رسالے پر۔ افسانے سارے مزے کے تھے۔ عیدی ٹاپ کلاس لگا۔ الفاظ اور کہانی کی بنت میں۔

ج: پیاری نازیہ! ملکی حالات کے بارے میں تو ہر احساس رکھنے والا شخص تشویش میں مبتلا ہے۔ تیزی سے گرتی ہوئی روپے کی قیمت، اسٹاک ایکسچینج کا حال پیٹرول کی قیمت میں اضافہ اور مہنگائی نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔ خرابی کرنے والے اپنا کام کر چکے، ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فضہ پروین (گاؤں بجن) تحصیل پھالیہ ضلع منڈی بہاؤالدین سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

حمد و نعت اور ہمارے پیارے نبی کی باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ پچھلے رسالے میں سارے افسانے بہترین تھے (خواب شیشے کا) عفت سحر طاہر جی کمال لکھ رہی ہیں۔ (شب تاب) بیسٹ ناول رہا۔ بہترین اینڈنگ باقی سلسلوں میں تاریخ کے جھروکوں سے سب سے پسندیدہ سلسلہ ہے۔

ج: فضہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ نے اتنی دور سے شرکت کی، بہت خوشی ہوئی، شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

راہی حمید نے ضلع کوہاٹ کے پی کے سے لکھا ہے

ماڈلز اچھی تھیں۔ حمد و نعت اور مختلف احادیث سے دل کو منور کرتے ہوئے آگے بڑھے تو کرن تعبیر کا بندھن بڑھا اچھا لگا۔ افشین جی کا افسانہ یار دل دار پچھلی دفعہ کی طرح اچھا لگا اور تمام کردار اچھے لگے مزہ آیا عائشہ جی کا افسانہ اپنا گھر بھی اچھے موضوع پر تھا اور اب آتے ہیں اس مہینے کے زبردست مکمل ناول بن پاکھی فرح بخاری جی کی طرف جو کہ بہت بہت بہت ہی اچھا لگا مگر لڑکی یعنی کہ کہانی کی ہیروئین اگر مسلمان ہوتی تو اور بھی مزہ آ جاتا۔ محمد رافع کا کردار اور شخصیت تو بہت ہی زبردست لکھی ہے۔ صبغہ احمد جی کا عیدی بھی اچھا لگا اور اس دفعہ تو میری بہن کی عیدی بھی آئی۔ پہلی عیدی۔ مکمل ناول شب تاب بڑے ہی اچھے طریقے سے اختتام پذیر ہوا۔ سحرش جی کا مکمل ناول تینوں ''چاندی دی چوڑی'' تو مجھے بہت ہی اچھا لگا اور مزہ آیا۔ اچھے موضوع پر تھا۔ ایمل رضا جی کا افسانہ پریم بوٹی بھی اچھے اور حساس موضوع پر تھا فرحی نعیم جی کا افسانہ آسودگی بھی اچھا لگا۔

میری امی اور بہن آپ کو پیار بھرا سلام کہہ رہی ہیں۔

ج: پیاری راہی! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ اور ہاں آپ کی والدہ اور بہن کو ہماری طرف سے پیار بھرا وعلیکم السلام۔

یہ خط بھاگٹانوالہ سرگودھا سے
صائمہ مشتاق کا ہے لکھتی ہیں

اس دفعہ شعاع 2 تاریخ کو ملا۔ نعمان فاروق کی ''حمد'' اور خورشید اقبال حیدر کی ''نعت'' بہت پسند آئی۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' یہ سلسلہ تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ بندھن میں آپی جی کرن تعبیر کے علاوہ بھی کسی کا انٹرویو لیں۔ شاہین رشید کو کرن تعبیر بہت پسند ہیں ہاہاہا۔

"خط آپ کے" میں سب بہنوں نے کیا خوب تبصرہ کیا۔
"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں ف الف کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں جانا۔
سحرش بھٹو کا مکمل ناول بہت اچھی اسٹوری تھی ویسے آفاق کو دریکتا کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سحرش جی ناول میں شاعری نے چار چاند لگا دیے، یہ شعر بہت پسند آیا۔

لے چلا جان میری روٹھ کر جانا تیرا
ایسی چائے بنانے سے بہتر تھا نہ بنا کر لانا تیرا

مہوش افتخار کا چار قسط پر مشتمل ناول "شب تاب"
واہ جی واہ مہوش جی کیا کہنے آپ کے ناول کا اینڈ بہت ہی زبردست کیا۔ جلدی سے ایسا ناول اور لے کر آئیں ہمیں انتظار ہے گا۔

ج: پیاری صائمہ! آپ کو سب کچھ بہت اچھا لگا۔ یہ جان کر ہمیں بھی بہت اچھا لگا۔ لیکن آپ کا تبصرہ کچھ ادھورا ادھورا سا لگا۔ جیسے کچھ کمی سی رہ گئی ہو۔ آئندہ خط لکھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ صرف پسندیدہ تحریروں کے بارے میں ہی نہیں بتائیں، ان تحریروں کا ذکر بھی کریں جو آپ کو اچھی نہیں لگیں۔
شاہین رشید تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔
ویسے کرن تعبیر اس ماہ شامل نہیں ہیں۔
ناہید اسماعیل نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
سچ ہمیں آپ سے بہت شکایت ہے آپ نے کہا کہ جو بہنیں پہلی بار خط لکھتی ہیں ان کا خط شامل کرنے کی آپ ضرور کوشش کرتی ہیں تو پیاری آپی ہم نے تو پہلا خط بھی لکھا دوسرا بھی پھر تیسرا بھی اب یہ ہمارا چوتھا خط ہے۔ سچ میں اس بار تو دل ہی نہیں تھا کہ تبصرہ کریں لیکن یہ ہماری پیاری رائٹرز بھی ناں بس...... اتنی اچھی تحریریں لکھیں کہ ہم چوتھی بار بھی خط لکھنے پر مجبور ہو گئے چاہے آپ پھر سے دل توڑ دیں۔
سب سے پہلے بات اس ناول کی جو شمارے کی جان ہے وہ ہے جناب "خواب شیشے کا"، مہوش افتخار نے "شب تاب" کی آب و تاب آخر تک برقرار رکھی۔ کہانی کا آغاز خوب تھا تو اختتام بھی بہترین ہوا۔ سحرش خان بھٹو کی تحریر "چاندی دی چوڑیاں" بھی کافی اچھی رہی۔
افسانوں میں ایمل رضا کا افسانہ بہترین رہا۔ کیا خوب موضوع چنا ایمل نے "پریم بوٹی" دل میں درد سا بھر گئی۔ "یار دلدار" کچھ خاص نہیں لگا۔ "ہمارا گھر" میں عائشہ تنویر نے سسرال میں بہو کو درپیش ایسے مسائل کی طرف توجہ دلائی جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن دل میں پھانس بن کر چبھے رہتے ہیں۔ فرحی نعیم کی تحریر "آسودگی" نے یقیناً کئی لوگوں کو احساس کا سبق پڑھایا ہے۔
اب ذکر اس تحریر کا جو ہمارے خیال میں اس ماہ کی بہترین تحریر کہلانے کی مستحق ہے وہ ہے جناب فرح بخاری کی "بن پاکھی" کیا عنوان ہے اور کیا خوب منظر کشی، کہانی کے سحر نے کچھ اس طرح سے اپنے حصار میں جکڑا کہ ہم اب تک سندر بن کے جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں۔
انٹرویوز سب ہی اچھے لگے۔ "تجھ سے ناتا" میں بہن "ف، الف" کے باقی حالات تو چلیں ایک طرف لیکن ان کے خواب ٹوٹنے کا افسوس ہوا۔ مستقل سلسلے بھی اچھے لگے خاص طور پر تاریخ کے جھروکوں سے۔
ج: پیاری ناہید! آپ کے پیار بھرے تینوں خطوط ہم نے پڑھ لیے تھے۔ جس طرح آپ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں اس طرح اپنا دل نہ دکھائیں کیونکہ خواتین میں آپ کے خط شامل ہوتے رہتے ہیں بس اسے ہماری کوتاہی ہی سمجھ لیں کہ آپ کے خط شامل نہ ہو سکے۔ آپ کو بھی عید مبارک۔
گوجرانوالہ سے حمنہ زاہد صدیقی شریک محفل ہیں لکھا ہے
بہت دنوں سے آپ سے آدھی ملاقات کرنے کا دل کر رہا تھا۔ پر...... ردی کی ٹوکری سے بہت ڈر لگ رہا ہے...... پلیز...... اس کو ہمارے خط کی خبر نہ ہونے دیجیے گا۔
اب آتے ہیں شعاع کی طرف...... تو جی "بندھن" میں کرن تعبیر سے مل کر خوشی ہوئی اور "دستک" میں "محسن عباس حیدر" سے مل کر خوشی ہوئی اسماء (میری بہن) اس کی بہت بڑی فین ہے۔
"شب تاب" اچھی کہانی تھی۔ "چاندی دی چوڑیاں" بہت مزہ آیا پڑھ کر...... آفان شاہ انتہائی برا لگا...... "بن پاکھی" اختتام کا انتظار۔
"در اور دروازے" بس ٹھیک تھی۔ باقی افسانے بہت پسند آئے خاص طور پر "پریم بوٹی" اور مستقل سلسلے بھی بہت اعلیٰ جا رہے ہیں۔ آپی بندھن میں عاطف اسلم اور اس کی بیوی سے انٹرویو کریں پلیز اور دستک میں عاصم

اظہر سے ملاقات کرا دیں پلیز۔

ج: پیاری حمنہ! آپ نے ہماری اس ردی کی ٹوکری سے ڈر کر ہم سے ملاقات نہیں کی جس کا وجود ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہر ماہ ہمیں جتنی بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں، وہ ٹوکری میں کہاں سا سکتے ہیں۔

آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

اسماء کی فرمائش تو شاہین نے بن کہے ہی پوری کر دی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

حمیرا لطیف حور نے رائے ونڈ سے لکھا ہے

شعاع 5 تاریخ کو ملا اور جلدی جلدی پڑھ کر آپ کو خط بھی لکھ ڈالا۔ آپی پلیز آپ شعاع کے صفحات بڑھا دیں نا پلیز......اچھا بس اب گھوریں تو مت، ہم آ جاتے ہیں شمارے کی طرف۔ ٹائٹل پیارا تھا البتہ ماڈل کے ہاتھوں کی مہندی کچھ خاص نہ لگی (پلیز ڈونٹ مائنڈ)۔ مصباح جی عذبہ اور باذف کا مطلب کیا ہے؟ یار دل دار، ہاہاہا افشین جی تسی گریٹ اوووو...... "ہمارا گھر" اچھی کہانی تھی۔ "بن باکھی" اسٹارٹ سے یوں لگا جیسے فرزانہ کھرل کی کہانی ہو۔ بہرحال اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "شب تاب" زبردست جی سیف علی جنگ کا ایکشن لینا بہت اچھا لگا۔ مگر جناب اسٹوری کی لاسٹ لائنز پڑھیں تو مصطفیٰ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے حنائی ہاتھوں میں تھام کر لبوں سے لگا لیے چلو خیر اسے چھوڑو۔ آپی ویسے آپ کی طبع نازک پہ گراں نہ گزرے تو ایک گزارش ہے کہ دستک میں شوبز وغیرہ سے ریلیٹڈ شخصیات کے بجائے صرف رائٹرز کا انٹرویو دیا کریں۔ تاریخ کے جھروکوں سے ہمیشہ کی طرح بیسٹ۔ اور ہاں! آپی میں نے سنا تھا کہ نمرہ احمد کا رئیل نیم نمیرہ احمد ہے۔ یہ بات واقعی درست ہے یا نہیں؟

ج: پیاری حمیرا! کاغذ کی روز افزوں بڑھتی گرانی اور عدم دستیابی میں اگر موجودہ صفحات برقرار رکھ سکیں تو بڑی بات ہوگی۔ پھر حکومت جانے کے بعد سے ڈالر کی قیمت جس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس نے صورت حال کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

آپ سے کس نے کہا کہ ہم طبع نازک کے مالک ہیں۔ ہم تو بڑی بڑی باتیں سہہ جاتے ہیں اور یہ تو طبع نازک پر گراں گزرنے والی بات بھی نہیں۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا تا ہے۔ باقی وہ جانیں اور ان کا کام۔ رہی نازک حنائی ہاتھوں والی تو بھئی مردفیشل کرا سکتے ہیں تو ہاتھ رنگنے کی نوبت بھی آ ہی جائے گی۔

اور رائے ونڈ والوں پر ہم جوتا اٹھائیں؟ ہمیں رائے ونڈ والے بہت عزیز ہیں۔ دوسرے سلسلوں کے لیے انتخاب آپ کسی بھی تاریخ کو بھجوا سکتی ہیں۔ کوئی پابندی نہیں لیکن خط 18 تاریخ تک ہمیں موصول ہو جانا چاہیے۔

نمرہ احمد کا اصلی نام کیا ہے۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہم انہیں نمرہ کہتے ہیں اور وہ اسی نام سے لکھتی ہیں۔

نگینہ افضل، سعدیہ خان بہاولپور سے لکھتی ہیں

آہ......اوہ......آؤچ۔

اف آپی جی کیا بتاؤں آپ کو کہ کتنا درد ہے اس دل میں۔ آپی جان شعاع سے میرا رشتہ تقریباً آٹھ سال کی عمر سے ہے اور اس رشتے کو نبھاتے ہوئے مجھے بارہ سال ہوگئے ہیں۔ میں نے اپنے اس خوب صورت سے رسالے کو اور خوب صورت بنانے کے لیے کئی بار کوشش کی ہے مگر ہر بار مجھے منہ کی کھانی پڑی۔

آہ......اوہ......آؤچ اف اف ماشاءاللہ آپی آپ کا منانے کے انداز کیا ہی دل ربا ہے۔ آپ نے شعاع نومبر 2015ء میں شائستہ کنول کو کتنے پیار سے اور لاڈ سے منایا ہے۔ بے اختیار ہمارا بھی آپ سے روٹھ جانے کو جی چاہا۔

ترسیاوداہے تاں رسیاوداراہے\
اساں مناوراں کوئی تھیں\
بھادیں ودانخرے دیکھاوے\
ساکوں پرواہئیں جیندے نال باوے

آپی جان روزے دار کی دعا بھی اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتے اور اس وقت میں روزے اور بخار میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں امید ہے کہ آپ بھی مجھ ابلا ناری کو اس بار مایوس نہیں کریں گی۔ آپی جی! ماشاءاللہ اس رسالے میں موجود ہر تحریر بلاشبہ دل کو موہ لینے والی ہوتی ہے۔

آپی جان اسی عید کے بعد میری شادی ہے مجھے امید ہے کہ آپ میری شادی کے تحفہ کے طور پر میرے اس خط کو ضرور شامل کریں گی۔

ج: پیاری نگینہ! شادی کی مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسی "ابلا ناری" کو اچھے لوگوں کا

ساتھ نصیب کرے جو آپ کی محبت، معصومیت اور سادگی کی قدر کر سکیں۔ آپ جیسی محبت کرنے والی پیاری سی بہن جو ہمیں روزے اور بخار کی حالت میں خط لکھے اس کا خط تو ہم ضرور شامل کریں گے، جہاں تک روٹھنے اور منانے کی بات ہے تو سچے موتیوں کی مالا جتنی بار بھی ٹوٹے، موتی چن لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح محبت کرنے والے قدر کرنے والے اگر روٹھ جائیں تو ان سے یہ نہیں کہا جاتا۔ ''ساکوں پروانہیں'' مگر سوال یہ ہے کہ آپ روٹھیں ہی کیوں؟

خدیجہ اسلام نے ہری پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل دیکھ کر دل خوشگوار سا دھڑکا۔ حسب عادت پہلے افسانے پڑھے یقین جانیے پہلے افسانے نے ہی میلا لوٹ لیا۔ افشین نعیم کا یار دل دار ہاہاہا خاص طور پر وہاں سے جہاں احسن کو شرٹ دینے کے بدلے دوانی استری کروائیں۔

باقی افسانے بھی اچھے تھے عیدی بہت اچھا لگا۔

ناولٹ ایک ہی تھا۔ دل دروازے اور بہت ہی جان دار۔

شب تاب مہوش افتخار بہت اچھا لکھنے والی ہیں لیکن آپی صرف اتنا پوچھوں گی کیا ہر کہانی میں اغوا ڈال کر ہی کہانی کو ٹرن دینا ضروری ہے معذرت پسند نہیں آیا۔

ج: پیاری خدیجہ! معذرت کے ساتھ مہوش کی ہر کہانی میں اغوا نہیں ہوتا ہاں کچھ کہانیوں میں آپ کہہ سکتی ہیں اور وہ کہانی کا تقاضا ہوتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء عزیز گاؤں دریا خان جلبانی

ہماری سندھی میں کہتے ہیں جنھن نہ چیو تھنا گھڻو چیو (جس نے کچھ نہ کہا اس نے بہت کچھ کہا) سو آپ سے خط شائع نہ کرنے کا شکوہ نہیں پر کم از کم خالدہ جیلانی سے ریکویسٹ کی تھی وہ تو پوری کرتیں۔

اس دفعہ غلطی سے شعاع تین تاریخ کو ملا شہزاد کی غیر موجودگی نے گرمی کی شدت بڑھادی پھر دوپٹہ ٹھنڈے پانی میں گیلا کر کے اوڑھا اور شعاع پڑھنا شروع کیا سب سے پہلے مصباح علی کو پڑھا، نام اچھا لیکن اندر سے کہانی کا موضوع وہی پرانا شازمہ کو ایک سوتن برداشت نہیں ہوئی جب کہ میں نے اس کے الٹ دیکھا ہے۔ لڑکیاں دو دو تین بچوں کے باپ سے شادی کر لیتی ہیں وہ بھی ہنسی خوشی۔ عذبہ اور بازف کے معنی بتائیں۔ شب تاب شروع سے ہی پتا تھا ہلکے پھلکے ٹوسٹ کے بعد زرتاب مصطفیٰ کے

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

پراسرار سرزمین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت ایک شخص کی آپ بیتی
ضوباریہ ساحر کی ایک منفرد کہانی۔

ایک سائنس دان کا ماجرا جو کوئی انوکھی ایجاد کرنے کا
خواہش مند تھا جرم کی انوکھی کہانیوں میں
جاوید راہی کی ایک منفرد سوغات۔

بھارت اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیاں ہمارے ملک میں
دہشت گردی کو فروغ دے رہی ہیں۔ حساس تحریروں کے خالق
ایم الیاس کی ایک شاہکار تخلیق۔

اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے والے ایک ہوس پرست کا احوال
شریف ارہن کے قلم سے۔

ایک ایسی دنیا کا قصہ جہاں قیدی امن برسانے کا وسیلہ ہے۔
ہندی زبان کے معروف ادیب
راجندر راؤ کی کہانی۔

پاس ہی آئے گی اینڈ اچھا رہا۔ سحرش خان بھٹو اچھی کاوش تھی یہ زاوی واحد ہیرو تھا جو سندھی میں نغمہ گنگنا رہا تھا ورنہ تو اکثر ہیرو انگلش سونگ کی دھن پہ وسل بجاتے نظر آئے ہیں ویسے سحرش بھٹو سے ریکوئسٹ ہے شاہوں پہ بہت لکھا جا چکا ہے اب کسی اور ذات قبیلے پہ لکھیں جیسے جلبانی نظامانی ٹالپر، فرح بخاری آپ کا ناول رات کے بارہ بجے پڑھنا اسٹارٹ کیا تو میڈم بجلی چلی گئی موبائل کی ٹارچ آن کی موبائل سر پہ رکھ کر لیٹ کے آپ کا ناول پڑھا اینڈ میں آئندہ ماہ پڑھ کے جو تپ چڑھی مت پوچھیں اس لیے تبصرہ محفوظ، افسانے سارے اچھے تھے ایمل رضا کے افسانے پریم بوٹی نے تو دہلا دیا سمیرا حمید کے افسانے ڈاج کی یاد دلا دی ویسے میں ایک بات آپ سب کو بتاؤں کہ مجھے نہیں پتا۔ یہ مرض حفصہ کیا ہے پہلی دفعہ نام سنا ہے لیکن ہمارے گاؤں اور آس پاس کے گاؤں میں بھی کسی کو دانہ نکلتا ہے تو اس دانہ پر تین دم کروائے ہیں کہتے ہیں اس دانہ کا علاج ہی دم سے ہے اگر علاج نہ کروائیں تو وہ دانہ بڑھتے بڑھتے ناسور بن جاتا ہے اور اس دانے میں جلن ہوتی ہے جو نہ ٹیبلیٹ سے کم ہوتی ہے نہ کسی انجیکشن سے جب تک دم نہ کروائیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ تین دن دم کروانے سے وہ دانہ جذب ہو کر ختم ہو جاتا ہے اس کے ساتھ جلن درد بھی ختم۔

افشین نعیم نے یار دلدار اچھا سلسلہ شروع کیا ہے موڈ فریش ہو جاتا ہے پڑھ کے۔ باقی بھی سارے سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے تھے شاہین رشید سے درخواست ہے کہ وہ آپ کا بھی انٹرویو لیں اور میں نے آپ سے سلیپ پیرالائیز کے بارے میں پوچھا تھا یہ کیوں ہوتا ہے اور یہ میرے ساتھ بھی کبھی ایسے ہوتا ہے اور مت پوچھیں جو حالت ہوتی ہے آپ لوگ ہمیشہ دبلے ہونے کا بتاتے ہیں کبھی موٹا ہونے کا بھی نسخہ بتائیں ساتھ میں پلین کیک کی بھی ریسپی بتائیں اینڈ میں ہمیشہ کی طرح یہی کہوں گی پلیز کنیز نبوی کو ڈھونڈ لائیں باقی رائٹر تو شوبز کی چکا چوند میں گم ہو گئی ہیں یہ کنیز نبوی کہاں گم ہیں۔ ارے ہاں بن پاکھی کا بھی مطلب بتائیے گا۔

ج: پیاری اقرا! ہماری اردو میں کہتے ہیں۔

کچھ بھی نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے تیرے دل میں اتر جائے

اور یہ ''نکالنے'' اور ''ڈالنے'' کا کام جن کا ہے وہی جانیں۔ ہم تو کہتے ہیں ''ہلکی کریں آپ'' موٹا ہونے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ خوش رہیں اور دنیا والوں کی قطعاً پروا نہ کریں۔ اقرا! آپ کے خط سچ مچ بہت تاخیر سے ملتے ہیں مگر ہم انہیں پڑھتے ضرور ہیں۔ ہر خط میں آپ کنیز نبوی کو ضرور پکارتی ہیں۔ کاش وہ اس صدا پہ کان دھریں کہ وہ ہماری بھی پسندیدہ رائٹر ہیں۔

بن پاکھی۔ کا مطلب ہے جنگل کا پرندہ

سعیدہ رضا نے مانسرہ سے لکھا ہے

تاریخ کے جھروکوں سے میرا بہت ہی فیورٹ سلسلہ ہے۔ بہنوں کے خط بھی بہت پیارے اور ان کے جوابات دینے والی ہستی۔ کیا کہنے، اتنی اچھی تحریریں خواتین اور شعاع میں پڑھیں کہ کیا کہنے۔ خط لیٹ لکھ رہی ہوں ''فرزانہ کھرل کی تحریر'' میں مکین ہوں شہر جمال کا اتنی خوب صورت تحریر مکالمے کردار شروع سے آخر تک سچے موتیوں کی لڑی آسمان کو چھوتی تحریر ایک دفعہ پڑھی دو دفعہ پچاس دفعہ، سو دفعہ، بار بار آنکھیں نم ہوئیں۔ میں نے اپنے فیورٹ لوگوں کو ڈائجسٹ شعاع خرید کے دیے۔ کہ ''میں مکین ہوں شہر جمال'' کا پڑھیں۔

ج: پیاری شہلا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید یہ یقیناً فرزانہ کھرل کے لیے اعزاز ہے کہ ان کی کہانی کو اتنی بار پڑھا جائے۔ ہم آپ کی تعریف ان تک پہنچا رہے ہیں اس بار تو آپ نے صرف ایک کہانی پر تبصرہ کیا ہے آئندہ خط لکھیں تو شعاع کی دوسری تحریروں کے بارے میں بھی لکھیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

میمونہ رحمت...... شرق پور شریف

1- شعاع سے وابستگی کب ہوئی کچھ یاد نہیں۔ بڑی دونوں بہنیں بچپن سے بچوں کے رسائل پڑھتی تھیں۔ پھر ڈائجسٹ انہوں نے ایک کزن سے لے کر پڑھنے شروع کیے۔ میں پڑھنے کو خوب مچلتی پر اجازت نہ تھی۔ میں بھی ڈھیٹ تھی۔ چھپ چھپ کر پڑھ ہی لیتی۔ اکثر اوقات تو بہنوں کو پتا چل جاتا۔ پھر مجھے مار بھی پڑتی۔ آخر پچھلے دو سال سے میں نے پڑھنے شروع کیے۔ (مستقل)

ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ ہمارے گھر میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص رسالے پڑھتا ہے۔ چھوٹا بھائی اور ابو بچوں کے رسائل پڑھتے ہیں اور ہم بہنیں اور امی شعاع، خواتین اور کرن۔

2- دن کا آغاز تقریباً آٹھ بجے ہوتا ہے۔ آج کل میٹرک کے پیپرز کے بعد فارغ ہیں مابدولت اس وجہ سے شعاع کے لیے وقت ہی وقت۔ گھر کا کام میں اور مریم (بہن) مل کر کرتے ہیں۔ کبھی آٹا گوندھنے کا شرف حاصل ہو تو پھر!!! امی کے قصیدے ہوتے ہیں اور میں پھر رات کے برتن دھو کر سو جاتی ہوں نماز پڑھ کے۔

3- خامیاں ہی زیادہ ہیں خوبیاں تو نہیں ہیں۔ اصفیٰ (دوست) سے پوچھا تو حیرت سے کہنے لگی کہ تم میں خوبیاں بھی ہیں؟ پھر کہنے لگی کہ خوبی یہ ہے کہ پڑھتی بہت ہو۔ ہاں اپنے اساتذہ سے تعریفی جملے سننے کو ملتے تھے۔ ایک خامی اور خوبی مشترک ہے کہ منہ پھٹ ہوں۔ سچی بات کہتی ہوں سامنے چاہے کوئی بھی ہو۔

4- ناولوں میں سے ”جنت کے پتے“ سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے بعد نمل۔ پھر آبِ حیات، متاعِ جاں ہے تو، یارم، سانس ساکن تھی، پارس اور شہر دل کے دروازے۔ الغرض اتنے زیادہ پسند ہیں کہ لکھ نہیں سکتی۔ صائمہ اکرم چوہدری کا ”شہر زاد“ (جو کہ جاری ہے) نہایت پسند ہے۔

5- ساون کس کو پسند نہیں۔ تیز بارش میں نہانا اور پکوڑے کھانا پسند ہے۔ اور شعاع کا مطالعہ بھی ہو تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

6- علامہ اقبال میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری بہت پسند ہے۔ پسندیدہ شعر:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

ایک اور شعر:

جل جاؤ خاموشی سے کڑی دھوپ میں لیکن
اپنوں سے کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو

7- پسندیدہ اقتباس: سمیرا حمید کے ناول ”یارم“ سے۔

”یہ ثابت ہو گیا کہ جسم سے جان اس وقت نہیں نکلتی جب اپنی جان نکلتی ہے۔ یہ جان اس وقت نکلتی ہے جب جان سے پیارے کی جان نکلتی ہے۔“

فرحانہ مہناز...... گوجرہ

1- 98ء میں میٹرک کے پیپرز کے بعد شعاع اور خواتین کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس سے پہلے شعاع یا خواتین میں ایک کہانی پڑھی تھی ”ہجر کی رات کا روشن ستارہ“ یہ کہانی ہم سب دوستوں کو اتنی پسند آئی تو طے

ہوا کہ میٹرک کے بعد یہ ڈائجسٹ ضرور پڑھنا ہے۔

تو جناب یہ واقعہ ضرور لکھوں گی جس دن ہمارا شعاع سے ناتا جڑا۔ میٹرک کا آخری پیپر تھا۔ گھر میں عائشہ اور میں نے بتا دیا کہ ''آج لاسٹ پیپر ہے۔ اس لیے کوئی ہمیں لینے نہ آئے۔ ہم دیر سے آئیں گی۔'' خیر پیپر ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہوا' بعد میں ہم سب نے سموسے کھائے' کولڈ ڈرنک پی۔ خوب باتیں کیں اور واپسی پہ میں اور عاشی کباڑیے کی دوکان پر گئیں جو اسکول کے راستے پہ تھی۔ ہم نے کہا۔ ''انکل جتنے بھی شعاع اور خواتین ہیں دے دیں۔''

انکل نے دس بارہ شمارے ہمارے سامنے رکھے۔ آدھے میں نے اور آدھے عاشی نے لیے اور گھر آ گئیں۔

امی نے کہا۔ ''اتنی دیر لگا دی' پیپر کیسا ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''اے ون۔''

امی جان نے کہا۔ ''اچھا کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔''

لیکن نیند کسے آنا تھی۔ جب تک اپنے لائے گئے جواہر کی ریڈنگ نہ کر لیتی۔ جلدی سے ایک ڈائجسٹ نکالا۔ کہانیوں کا اینڈ دیکھا جو اینڈ ہپی لگا وہ کہانی پڑھنا شروع کر دی۔ یہ تھی شعاع سے پہلی ملاقات۔

اس کے بعد مابدولت نے گریجویشن D.H.M.S کمپیوٹر I.T قرآن پاک کا ترجمہ تفسیر کیا لیکن شعاع کے ساتھ ساتھ۔

2- ایک احوال شادی سے پہلے بھی لکھا تھا (جو پوسٹ نہیں کیا) اور اب بارہ سال بعد لکھ رہی ہوں تو سوچا کہ روزمرہ کے معمولات زندگی میں کتنی تبدیلی آ گئی ہے۔ خیر صبح نماز فجر کے لیے اٹھنا' تلاوت کرنا' بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا' ناشتہ بنانا' ارحم، ایہا، مثین اسکول جاتے ہیں ان کو لنچ بکس دینا' بچے اسکول اور امی اٹھ گئی پھر ناشتہ کر کے صفائی کرنا اور اس کے بعد شعاع کی سلسلے وار اقساط کی ریڈنگ کرنا۔ پتا نہیں مہینے میں کتنی بار پڑھ لیتی ہوں۔ دوپہر کو لنچ تیار کرنا۔ نماز ظہر ادا کی۔ بچے اسکول سے آ گئے۔ کھانا کھایا۔ ہوم ورک کروانا اور پھر شام کا کھانا تیار کرنا اور بستر پر جانے سے پہلے میاں صاحب سے بات کرنا جن کی جاب اسلام آباد میں ہے۔ اور شعاع پڑھ کر سو جانا۔

3- شعاع کی بہت سی تحریریں دل پہ نقش ہیں۔ طائر لاہوتی، تیرے نام کی شہرت، شہر دل کے دروازے، بن روئے آنسو، ہمسفر' بھئی فرحت اشتیاق کے سارے ناول، تیری راہ میں رُل گئی وے اور اب ''خواب شیشے کا'' میرے بیسٹ ناول ہیں۔ ''تیری راہ میں رل گئی'' کی زوبار یہ میں اپنی جھلک نظر آئی کیونکہ مابدولت بھی اکلوتے اور ابو جان کے لاڈلے بھی ایسے ہی تھے۔

4- خوبیاں: -نہایت حساس دل ہوں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ سادگی پسند، مخلص' نرم دل ہوں۔ خامی تو ایک ہی سب پہ بھاری ہے کہ غصہ جلدی آ جاتا ہے۔

5- ساون تو بچپن کا تھا۔ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے جب بارش ہوتی 'سب کزنز چھت پر بھاگ جاتیں جس کا موڈ نہ ہوتا اس کو بھی کھینچ لے جاتیں' بارش میں نہانا اور اپنی اپنی چھت پر جھاڑو لگانا۔ اس کے بعد آم کھانا اور گٹھلیاں ایک دوسرے کے اوپر پھینکنا۔ یہ تو بارش کے دوران ہوتا جب بارش رک جاتی تو نیلی پری والا کھیل کھیلنا پھر میں اور عقیلہ بیڈ منٹن کھیلتیں' بارش کے بعد موسم بہت خوش گوار ہو جاتا نیچے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

6- پسندیدہ کتاب ......امہات المومنین ...... صحابہ کرام کے بارے میں کتابیں۔

زارا ڈوگر......گوجرانوالہ

1- شعاع اور خواتین میری باجی پڑھتی تھیں اس سے پہلے میری خالہ بھی باجی کچھ سلسلوں میں شرکت کرتی تھیں (مہوش ڈوگر) تب میں چھوٹی تھی۔

میٹرک کے بعد باقاعدہ شروع کیا پڑھنا۔ باجی کی طرح مجھے بھی شوق ہوا کچھ بھیجوں اب تک کوئی تین خط اور اشعار چھپ چکے ہیں۔ ڈائجسٹ میں اپنا نام دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے میں بتا نہیں سکتی۔

2- ایف اے کے بعد گھر پر ہوں۔ ان شاء اللہ بی۔اے کا ارادہ ہے۔ صبح امی کی آواز سے اٹھتی ہوں۔ ناشتہ کرنے کے بعد ندا صفائی کرتی ہے۔ امی سبزی لینے چلی جاتی ہیں اور میں برتنوں کی طرف۔ برتنوں سے فارغ ہو کر اپنے پسندیدہ ترین مشغلے کی طرف، کارڈز بنانا اور پیپر کے پھول اور بہت سی چیزیں اور اگر شعاع ہو تو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

جب سالن بن جاتا ہے تو میں روٹیاں بنا لیتی ہوں۔ شام کی صفائی اور رات کے برتن دھوتی ہوں۔ شام کی روٹیاں باجی بناتی ہیں۔ کھانا کھا کر کبھی کبھار ڈراما دیکھ لیتی ہوں۔ رات کو چار، پانچ بچے آتے ہیں سپارہ پڑھنے ان کو پڑھا کر دودھ پی کر سو جاتی ہوں۔

3- افسانوں کی دنیا میں مجھے نہیں لگتا کچھ جھوٹ ہوتا ہے۔

پسندیدہ مصنفات میں نمرہ احمد، سمیرا حمید، نمرہ احمد کے جنت کے پتے، مصحف، نمل اور اب حالم سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک۔ سمیرا حمید کا افسانے اور یارم کی تو کیا ہی بات ہے۔ فرزانہ کھرل بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ تھوڑی الجھی ہوئی ہوتی ہیں مگر اچھی ہوتی ہیں۔ سائرہ رضا فیورٹ ترین ہیں۔ ان کی ہر تحریر ہی زبردست ہوتی ہے۔ لیکن خالی آسمان کبھی نہ بھولنے والی تھی۔

4- خوبیاں، خامیاں میرے خیال میں ہمیں اپنا سب سے زیادہ پتا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی باجی سے پوچھا۔ کہنے لگیں تم دوسروں کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں میں آسانیاں پیدا کرتی ہو۔ اور خامی یہ کہ تم کبھی کبھی ضدی ہو جاتی ہو۔ امی کا بھی یہی جواب تھا۔ فرح سے پوچھا تو کہتی ہے تم احساس بہت کرتی ہو، ذمہ دار بہت ہو اور خامی یہ کہ تم بہت ڈبو ہو۔ میری ایک دوست حریم چوہدری نے کہا تھا کہ تم بہت دھیمے مزاج کی ہو زارا! اچھی لگتی ہو اور میری ایک بہت اچھی دوست شائلہ کا کہنا ہے کہ تم بہت نائس ہو۔ اب اس نائس میں کیا کیا آتا ہے یہ پتا نہیں۔ میرے خیال میں میں واقعی ڈبو ہوں، مستقل مزاج بالکل نہیں ہوں، جذباتی بہت ہوں۔ رونا بہت جلدی آتا ہے اور انصاف پسند بہت ہوں۔ ناانصافی برداشت نہیں ہوتی۔ ڈرپوک بہت ہوں۔ تھوڑی سی بے وقوف بھی۔

5- بارش بہت پسند ہے۔ خالی دیکھ کر ہی نہیں نہا کر۔ دن میں ہونے والی اچھی لگتی ہے رات میں ہونے والی کے ساتھ بجلی اور بادل بھی ہوتے ہیں جو کہ گرج گرج کر خوف میں مبتلا کرتے ہیں۔

6- اقتباسات بہت سارے پسند ہیں۔ مگر ایک لکھ رہی ہوں۔ ''جنت کے پتے'' سے۔

''اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کے راستے میں تھکنا پڑتا ہے۔ پھر ہی اجرت ملتی ہے۔''

شعر و شاعری میرے سر سے گزر جاتی ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی تو پسند کیا ہو گی۔ پسندیدہ کتابیں بہت ساری ہیں۔ ہر قسم کی چیز پڑھنے کی رسیا ہوں۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ

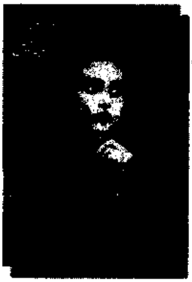

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

واصفہ سہیل

فخر

بعض فنکار ایسی باتیں یا حرکتیں کرتے ہیں کہ آپ کا ذہن لحہ بھر کے لیے سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ گلوکارہ رابی پیرزادہ نے اپنی نئی قوالی ویڈیو کو دہشت گردی کی خلاف جہاد قرار دیا ہے۔ (ویڈیو قوالی...... جہاد......؟؟؟) جس میں ایک لڑکی کا ذہن تبدیل کر کے اسے خودکش بم بار بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ (ویسے ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی ایسا ہو کیونکہ تفتیش سے بچنے کے لیے فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ خودکش دھما کا تھا بعد میں پتا چلتا ہے کہ بم نصب کیا گیا تھا)

لڑکی کا کردار رابی پیرزادہ نے ادا کیا ہے۔

رابی پیرزادہ اس بارے میں کہتی ہیں کہ اس سے پہلے آج تک کسی نے (بھئی کسی گلوکار نے) دہشت گردی کے خلاف بات نہیں کی اور نہ کسی نے ایسی کوئی قوالی یا گانا گایا ہے۔ (قوالی تو یاد نہیں ہاں گانا ضرور گایا ہے پر کس نے یہ ہمیں یاد نہیں......) انہوں نے کہا کہ دہشت گردوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (یہ کوئی نئی بات ہے کیا......؟) بعض لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا کہ میں نے میوزک کے ساتھ قوالی کیوں گائی ہے۔ (اللہ اللہ یہ معصومیت! کیا پہلی مرتبہ موسیقی کی ساتھ قوالی گائی گئی ہے جو آپ؟) ہمیں کسی کے کام پر کوئی فتویٰ نہیں دینا چاہیے (فتویٰ تو علماء دیتے ہیں۔ لوگ تو......؟) میں نے دہشت گردی کے خلاف کام کیا ہے۔ (آہم، آہم۔) مجھے اس پر فخر ہے۔ کچھ لوگوں کو اس پر تکلیف ہے لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔" (کس کی......؟)

حق

اچانک بالکل اچانک ہی نصرت فتح علی خان کی بیٹی ندا نصرت سامنے آئی ہیں اور آتے ہی انہوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ ان سب لوگوں پر جو اب تک ان کے والد کے نام اور کام سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ (پر اتنے عرصے بعد اچانک...... پھر وہی

اچانک......) انہوں نے کہا کہ "راحت فتح علی خان ان کے بھائی ہیں شوہر نہیں" (راحت فتح علی خان کی بیوی کا نام بھی ندا ہی ہے اس لیے غلط فہمی......)

ندا نے کسی گلوکار کا نام لیے بغیر کہا کہ میرے والد کے گانوں کے رائٹس صرف میرے پاس ہیں، میں ان کی اکلوتی وارث ہوں۔ ایک ادارہ میرے والد کے دستخط اور نام کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ میں اپنے والد کے گانوں کی اکلوتی وارث ہوں۔ میری

اجازت کے بغیر میرے والد کے گیت لوگوں نے گائے اور فائدہ اٹھایا، میں ان سب کے خلاف قانونی کارروائی کروں گی۔ جو میرا حق ہے (بالکل حق ہے ندا، لیکن یہ بھی سوچیں اس طرح نصرت فتح علی کے گیت اور ان کا نام زندہ ہے) میرے پاس میرے والد کی گائی غزلیں اور قوالیوں کا ایسا کلیکشن ہے جو ابھی منظر عام پر نہیں آیا۔ (تو لائیں ناں۔ سوچ کیا رہی ہیں) میں اسے لانچ کروں گی اپنی گائیکی کے حوالے سے وقت آنے پر فیصلہ کروں گی۔ مگر میں گا سکتی ہوں اور میں نے اپنے والد کے قریب رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ (لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں صرف سیکھنے سے کام نہیں چلتا، خداداد صلاحیت بھی ضروری ہے) میرے والد خود کہہ چکے تھے اپنے ایک انٹرویو میں کہ اگر میری بیٹی کو میوزک میں کام کرنے کا شوق ہے تو میں اس کو روکوں گا نہیں۔"

اطمینان

انگلینڈ کے خلاف پاکستان کی کارکردگی اتنی اچھی نہیں رہی اور سیریز ایک ایک سے برابر ہوگئی۔ کپتان سرفراز احمد کہتے ہیں کہ "مجھے اپنے نوجوان ٹیم پر فخر ہے۔ ہم جب یہاں آئے تھے تو لوگ سوچ رہے تھے (کون لوگ سرفراز!) کہ ہم ایک بھی میچ نہیں جیت سکیں گے۔ لیکن ہماری لارڈز کی کارکردگی بہت شاندار تھی۔ ہماری فاسٹ بولنگ، فیلڈنگ اور بیٹنگ بہت عمدہ تھی (یہ ہماری فیلڈنگ اور بہترین یا عمدہ، کچھ زیادہ نہیں ہو گیا سرفراز!) مایوس کن بات یہ ہے کہ ہمارے پاس سیریز جیتنے کا نادر موقع تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے اچھا کھیل نہیں کھیلا تو سیریز برابر ہو گئی۔ ہیڈنگلے میچ کی شکست کے باوجود اس سیریز میں پاکستان کے کئی مثبت پہلو سامنے آئے جس میں محمد عباس کی شاندار باؤلنگ سرفہرست ہے (جی، نئے لوگ تو اچھا کھیل ہی لیتے ہیں پہلے پہل پھر......؟) جنہوں نے لارڈز میں چونسٹھ رنز کے عوض آٹھ وکٹیں

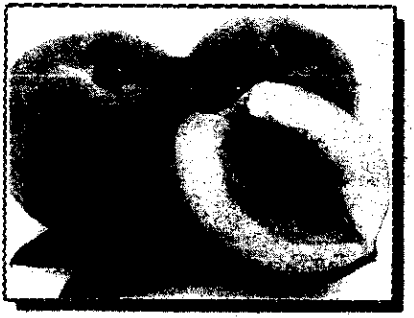

حاصل کیں اور میچ کے بہترین کھلاڑی کا اعزاز اپنے نام کیا اور سیریز کے بہترین کھلاڑی کا بھی۔

سرفراز نے مزید کہا کہ میں سیریز میں خود اپنی کارکردگی سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ میں نے غلطیاں کیں اور چند برے شاٹس کھیلے۔ (جی اور سزا بھی ملی)

آڑو

آڑو گرم مزاج افراد کو بہت فائدہ دیتا ہے۔ صفرا اور خون کی گرمی کو کم، دماغ کو طاقت دیتا اور خون پیدا کرتا ہے۔ جسم فربہ کرتا ہے۔ اسے بغیر چھیلے اور اچھی طرح دھو کر استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے پھل کے ساتھ ساتھ پتے بھی کارآمد ہیں۔ اگر بچوں کی ناک میں کیڑے ہو جائیں تو آڑو کے پتے کوٹ کر ان کا رس نکالیں اور اس میں ہم وزن ایلوویرا ملا کر ناک میں ڈالنے سے ناک کے کیڑے مر جاتے ہیں۔

آڑو کے بیج کا گودا نکال کر اس کا تیل کان میں ڈالنے سے بہرے پن میں کمی آتی ہے۔

اسی طرح آڑو کے تین پتے ایک عدد کالی مرچ کے ساتھ کوٹ کر صبح نہار منہ پلانے سے پرانا موسمی بخار دور ہو جاتا ہے۔

بڑھتی عمر آپ کی بینائی کو کمزور کر سکتی ہے۔ لیکن آڑو آنکھوں کو۔۔۔ غذائی اجزاء فراہم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گاجر کے ساتھ ساتھ آڑو کی افادیت بھی مسلم ہے۔ آڑو۔۔۔ جسم کے تمام

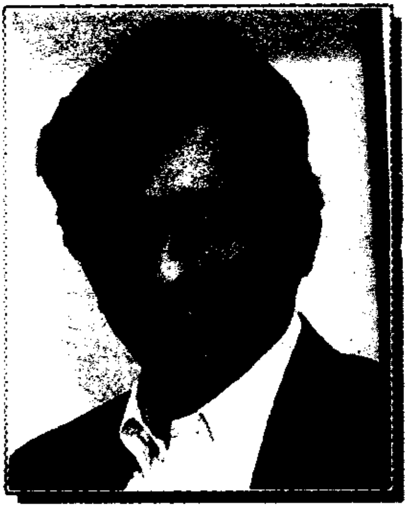

حصوں میں خون کی گردش کو بڑھانے کے علاوہ آنکھوں کے پٹھوں کی فعالیت کو بہتر ـــــــــ بناتا ہے۔

روایت

توقیر ناصر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اپنے ملک کے علاوہ پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے ڈرامے پونا انسٹی ٹیوٹ میں دکھائے جاتے ہیں۔ توقیر ناصر بھارتی ڈرامے کے متعلق کہتے ہیں کہ ''بھارتی ڈرامے مصنوعی اور فضول ہیں۔ جن میں سچائی اور حقیقت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ (اب تو ہمارے ڈرامے بھی؟) جب کہ ہمارے ڈرامے آج بھی حقیقت کے قریب تر ہونے کی وجہ سے بہتر ہیں۔ ہمارے یہاں بھی انڈیا سے متاثر ہو کر کچھ ڈرامے بنائے گئے۔ (''کچھ'' یعنی کے کچھ ...... صرف کچھ......؟) مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے ہمیں اپنا روایتی انداز اپنانا ہوگا۔'' (روایت کے ساتھ اگر جدت بھی ہو تو ڈراما بہتر ہو سکتا ہے......)

☆☆☆

مہم

ارینا خان نہ صرف شوبز سے متعلق بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہیں بلکہ وہ سماجی مسائل کے حل کے لیے بھی ہر وقت سرگرم رہتی ہیں گزشتہ دنوں شام میں جاری خانہ جنگی سے متاثرہ افراد کے لیے امدادی مہم میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ اس بارے میں ارینا خان کا کہنا ہے کہ ''اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے شام میں متاثرین کی امداد کے لیے چندہ جمع کیا ہے۔ ہماری پوری ٹیم (نام تو بتا دیں ٹیم ارکان کے؟) اردن گئی تھی جہاں سے بہت بڑی رقم جمع ہوئی آپ سب کا شکریہ جنہوں نے چندہ دیا۔ آپ سب کے پیسوں سے امدادی کام کیے جائیں گے (پر کب؟)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ ڈاکٹر فاروق ستار کے پاس چھوٹے ایشو کو بڑا بنانے اور بڑے ایشو کو چھوٹا بنانے کا فن بھی ہے۔ وہ اشعار کا بھی بڑا خوب صورت سہارا لیتے ہیں۔ ان کے اندر تمام صلاحیتیں ہیں لیکن سیاسی گراؤنڈ کے حقائق کچھ اور ہیں۔

(خورشید عباس۔ اخبار جہاں)

☆ راؤ انوار کے ساتھ عدالت میں بہت رعایتی قسم کا سلوک تھا۔ اس کی بھی جس طرح کی دبنگ انٹری ہوئی ہے جس گیٹ سے اسے لایا گیا پولیس کی اتنی زیادہ پروٹیکشن بھی وہ بھی غیر معمولی ہے۔ وہ جب عدالت میں آیا تو چیف جسٹس نے کہا کہ شکر الحمدللہ۔''

(عبدالقیوم صدیقی۔ بولتا پاکستان)

امتہ الصبور

ماضی کے جھروکوں سے

کری اپا کے متعلق اتنا تعارف کافی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد ہندوستان کا پہلا کمانڈر انچیف بنا۔ تقسیم ہند کے وقت متحدہ فوج کا حامی تھا۔ بعد میں پاکستان کے خلاف کشمیر آپریشن کا نگران تھا اور 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران بھارتی فوج کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان (مرحوم) اور کئی ایک سینئر پاکستانی آفیسرز سے ذاتی دوستی تھی۔ پانچ دفعہ پاکستان آیا۔ اپنے طور پر مسئلہ کشمیر بھی حل کرنے کی کوشش کی۔

"انڈین آرمی کا باپ" کہلاتا تھا، کیوں کہ آزادی کے فوری بعد جب اس نے کمان سنبھالی تو بھارتی فوج تقسیم کے زخموں سے چور تھی۔ پاکستان کے حصے کی فوج وہاں سے آچکی تھی۔ پاکستان کے حصے کا فوجی ساز و سامان بھی پاکستان بھجوانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فوج کے بہت سے یونٹ فوج کی تقسیم سے متاثر تھے۔

ان حالات میں فوج کی تنظیم نو کی سخت ضرورت تھی اور یہ ہی وہ اہم ذمہ داری تھی جس کا بوجھ کری اپا کو اٹھانا پڑا اور اس نے یہ سب کچھ بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ مختلف قومیتوں، مذاہب پر مشتمل بھارتی فوج کو ایک قومی فوج میں بدل دیا، جس وجہ سے اسے "فوج کے باپ" کا خطاب دیا گیا۔ لیکن داد دینا پڑتی ہے بھارتی حکومت اور بھارتی حکمرانوں کو کہ کری اپا کی خدمات کو پہچاننے میں تینتیس سال لگ گئے۔

وہ یوں کہ وہ ریٹائر تو بطور جنرل ہوا، لیکن ریٹائرمنٹ کے تینتیس سال بعد اسے فیلڈ مارشل کے عہدے سے نوازا گیا جب وہ جسمانی لحاظ سے صحیح طور پر چلنے کے قابل بھی نہ تھا۔ چونکہ وردی اتار چکا تھا۔ اس کے ساتھ کے یا اس کے جونیئر ز حتیٰ کہ اس کے دور میں نئے آنے والے ریکروٹ اور سیکنڈ لیفٹیننٹ تک سروس پوری کر کے ریٹائرڈ ہو چکے تھے — یوں وہ سوائے گھر کے باہر اپنے نام کی تختی بدلنے کے پوری طرح عہدے کی طاقت اور شان و شوکت سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں اسے خوش قسمتی سمجھا جائے یا حالات کی ستم ظریفی؟

کہتے ہیں ویسے تو ہر انسان اپنی جگہ پر دلچسپ ہوتا ہے، لیکن بعض انسان دوسروں سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں اور پھر جب کوئی شخص اونچے مقام پر ہو تو وہ اس لیے دلچسپ لگتا ہے کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں کھل کر نظر آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ ہی کچھ کری اپا کے ساتھ بھی ہوا۔

فوجی سروس اور خدمات کے لحاظ سے تو اسے ایک "لیجنڈ" کا درجہ ملا، لیکن نجی زندگی میں وہ ایک مایوس بلکہ ناکام انسان ثابت ہوا۔

کسی بھی شخص کی نجی زندگی کی کامیابی کا پیمانہ اس کی فیملی ہوتی ہے۔ اس کے بیوی، بچے ہوتے ہیں اور اس محاذ پر کری اپا بالکل ناکام رہا۔

اس نے شادی اس وقت کی جب وہ اپنی بھرپور جوانی کی حدود عبور کر چکا تھا۔ شادی ایک نوجوان لڑکی سے کر لی جو اس سے بہت کم عمر بہت زیادہ ذہین، تیز و طرار اور خوب صورت تھی۔ ایک بیس سالہ نوجوان لڑکی زندگی کو ہر زاویے سے رنگین دیکھنا اور رنگین بنانا چاہتی ہے۔ خصوصاً جب اس میں صلاحیتیں بھی ہوں اور مواقع بھی، جب کہ کری اپا

اس وقت چالیس سالہ فوجی زندگی کے رنگین دور سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

اس عمر میں اس کی زندگی فوجی پریڈ، یونٹ، دفتر اور فائلوں تک محدود ہو چکی تھی۔ حالات نے کری اپا کو فوج اور ملک کے بلند ترین مقام تک پہنچا دیا۔ اس کی نوجوان بیوی ''مٹھو'' اپنے ''سوشل اسٹیٹس'' کو جی بھر کر انجوائے کرنا چاہتی تھی اور کری اپا کی مثال ''بیوپارٹنگ نہ کر'' والی تھی، لہٰذا وہ اکیلی ان راہوں پر چل نکلی جو اخلاق و کردار پر دھبہ ہوتی ہیں۔ کری اپا میں اسے روکنے کی صلاحیت نہ تھی۔ بالآخر مٹھو تنگ آ کر کری اپا کو چھوڑ گئی اور چھوڑنے کے تین سال بعد اسے طلاق ملی، مزید دکھ کی بات یہ ہوئی کہ وہ کری اپا کو چھوڑنے کے بعد تین سال آزاد زندگی گزارتی رہی۔ کری اپا کے ساتھ شادی کا عرصہ اس کے اپنے الفاظ میں مسلسل اذیت تھی۔ اسے کری اپا کو چھوڑنے کا بھی دکھ نہ ہوا، حالانکہ اس کے بچے بھی تھے۔

''مٹھو'' اتنی خوب صورت اور گریس فل خاتون تھی کہ فوج میں اسے (ایوا گارڈنر آف کروگ) کہا جاتا تھا۔ ایوا گارڈنر اس دور میں ہالی ووڈ کی ملکہ حسن تھی۔ (کروگ) اس علاقے کا نام تھا جہاں کی ''مٹھو'' رہنے والی تھی۔ کری اپا کو چھوڑنے کے بعد بھی بہت سے نوجوانوں کے لیے وہ بہت زیادہ پرکشش تھی۔

اس دوران اس کی دوستی کری اپا کے گہرے دوست جنرل تھمیا کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ہوئی۔ کری اپا کی ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل تھمیا بھی بھارتی چیف بنا۔ تھمیا کا بھائی دوستی میں اس حد تک چلا گیا کہ اس نے مٹھو کو شادی کی آفر کی۔ ایک شام دونوں مل کر ایک پرفضا مقام پر بیٹھ کر پیتے رہے۔ واپسی پر نشے میں گاڑی اتنی تیز چلائی کہ وہ ایک گہری کھڈ میں جا گری اور دونوں ہلاک ہو گئے۔

حالات کی عجب ستم ظریفی تھی کہ کری اپا اور مٹھو کی یہ پسند کی شادی تھی، لیکن شادی کے بعد نہ کری اپا خوش رہا اور نہ مٹھو، جو شادی کو ''مسلسل عذاب'' کہتی تھی۔

کری اپا کے دوستوں کی نظر میں شادی کی ناکامی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ اس کے دوستوں خصوصاً جنرل موتی ساگر اور جنرل نہرا کے خیال میں ''مٹھو'' بیوی کے بجائے کری اپا کی کالج جانے والی بیٹی لگتی تھی۔ جونیئر آفیسرز کے خیال میں کری اپا کی شرافت نے اسے خراب کیا۔ اس شادی کی ناکامی کی دوسری وجہ بھی کری اپا کا اپنا کردار ہی تھا۔ بڑا وہمی اور جذباتی قسم کا انسان تھا۔ وہ یونٹ کی زندگی اور نجی زندگی میں فرق نہ سمجھ سکا، بلکہ گھر کو بھی یونٹ کمانڈر کے طور پر چلانے پر مصر رہا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہی ہونا تھا جو ہوا۔

دراصل کری اپا نوعمری میں ہی فوج میں آ گیا تھا۔ انگریز دور تھا۔ وہ ہر کام انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے کرتا رہا۔ جس کا تعلق یونٹ کی تربیت اور یونٹ کے ماحول سے تھا۔ اسی لیے وقت پر شادی بھی نہ کر سکا اور جب شادی کی تو اس کی فوجی زندگی کی عادات اس قدر پختہ ہو چکی تھیں کہ وہ کسی اور بات کو سوچ بھی نہ سکا۔

انگریزوں سے اس قدر ڈرتا تھا کہ ایک دفعہ بطور ایک نوجوان آفیسر کے نینی تال جانے کے لیے چھٹی مانگی۔ نینی تال ایک صحت افزا مقام تھا۔ نوجوان فوجی افسران چھٹیاں گزارنے اور گھومنے پھرنے اکثر وہاں جاتے تھے۔ عیاشی کی سہولتیں بہت تھیں۔ لہٰذا نوجوان آفیسرز وہاں سے اکثر مقروض ہو کر واپس آتے۔ حالانکہ کری اپا ایسے کردار کا مالک نہ تھا، لیکن کمانڈنگ آفیسر کی بات کو اس حد تک دل پر لیا کہ کئی سال شادی ہونے کے بعد تک وہاں نہ گیا۔ اس دور کے کسی بھی نوجوان فوجی آفیسر کے لیے نینی تال نہ جانا ایک غیر معمولی واقعہ تھا جو کری اپا کے بائیوگرافر کی نظروں سے بھی

اوجھل نہ رہ سکا۔

کری اپا کی شخصیت کے اور بھی کئی دل چسپ پہلو تھے۔ کمانڈر انچیف بننے کے بعد کری اپا نے فوجی دفاتر میں کام کی رفتار اور معیار بڑھانے کی مہم شروع کی۔ اس کے مطابق دفاتر غیر ضروری فائلوں سے اٹے پڑے تھے۔ پڑے پڑے ان پر گرد وغبار کی تہیں جم چکی تھیں، لیکن آفیسرز فائلیں نمٹانے میں سست روی یا عدم دلچسپی کا شکار تھے۔ لہٰذا کری اپا نے ہر دفتر میں ''سرپرائز انسپکشن'' کا پروگرام شروع کیا۔

کری اپا دفتری کام کو دفتری اوقات میں ہی ختم کرنے پر زور دیتا۔ دفتری اوقات کے بعد بیٹھ کر کام کرنے کے سخت خلاف تھا۔ بقول اس کے جو افسران یا اہلکار دفتری اوقات کے بعد بیٹھ کر کام کرتے ہیں یا تو وہ نا اہل ہوتے ہیں یا فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں کسی اہم فائل پر ڈسکشن کے لیے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس بریگیڈیئر داس کے دفتر آیا۔ فائل نمٹانے کے بعد انٹیلی جنس برانچ کے مختلف دفاتر کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے کچھ دفاتر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بریگیڈیئر داس اسے لے کر اگلے دفتر گیا۔ وہاں فائلز وغیرہ حسب معمول پھیلی پڑی تھیں۔ ایک بڑی اسٹیل کی الماری سامنے رکھی تھی، جسے دو موٹی موٹی لال لکیروں سے کراس کیا گیا تھا اور پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ (ٹاپ سیکرٹ مواد) آگے لکھا تھا۔

''آگ لگنے کی صورت میں سب سے پہلے مجھے نکالیں۔''

فوج میں عموماً اہم ترین فائلز کے لیے ایسی الماریاں استعمال ہوتی ہیں۔ کری اپا کی نظر پڑی تو وہ اس سے بڑا متاثر ہوا۔ اسے شوق ہوا کہ اسے کھول کر دیکھا جائے کہ یہاں کون سے اہم راز تالا بند ہیں۔ اس نے الماری کھولنے کا حکم دیا۔

جوں ہی الماری کا دروازہ کھلا شراب سے بھرا کریٹ باہر آ گرا۔ کرنل دیوان پریم چند جو بعد میں جنرل بنا، اس موقع پر موجود تھا، اس نے لکھا۔

''سرپرائز وزٹ کا رزلٹ بڑا سرپرائز تھا۔''

اس کے بعد اس طرح کے ''سرپرائز وزٹس'' کا پروگرام ختم ہو گیا۔

جنرل کری اپا کی کچھ عادات بڑی عجیب و غریب تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے کوٹ کے کالر کے نیچے سوئی دھاگا اور ایک رنگین موم بتی چھپا کر رکھتا۔ کچھ دن بعد ایک کنگھی بھی رکھنا شروع کر دی، حالانکہ وہ خود گنجا تھا۔ بقول اس کے اے ڈی سی کے اسے راستے میں جو بکھرے ہوئے بالوں والے بچے ملتے' کنگھے سے ان کے بال درست کرنا شروع کر دیتا۔

اس کے سوئی دھاگا اور موم بتی کے استعمال کے دو دلچسپ واقعات ہیں۔ کری اپا کو اس دور کی مشہور فلمی ہیروئن ''دیویکا رانی'' کی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک شام فرانسیسی سفیر کی بیگم اس کی مہمان تھی اور وہ اسے فلم دکھانے سینما ہاؤس لے گیا۔ ساتھ کری اپا کی بیٹی بھی تھی۔

وہ جب سینما ہال میں پہنچے وہاں فلم شروع ہو چکی تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ لہٰذا ٹارچ کی روشنی میں بڑی مشکل سے انہیں اپنی سیٹوں تک پہنچایا گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے وقت سیٹ کے بازو سے ایک باہر نکلے ہوئے کیل سے سفیر کی بیگم صاحبہ کی ساڑھی پھٹ گئی۔ اس نے واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔

کری آپا نے فوراً اپنا سوئی دھاگا نکالا۔ اے ڈی سی نے ٹارچ کی روشنی کی اور جنرل صاحب نے سینما ہال میں پھٹی ہوئی ساڑھی کی فوری سلائی کر دی۔ ظاہر ہے سفیر کی بیگم متاثر بھی ہوئیں اور خوش بھی۔

اسی طرح ایک دفعہ مدراس میں جموں اور کشمیر میں مرنے والے بھارتی سپاہیوں (جنہیں وہ بھی شہید کہتے ہیں۔) کی ویلفیئر کے لیے ایک میوزک پروگرام ہو رہا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ منتظمین

اور اے ڈی سی باہر ایمرجنسی لائٹ روشن کرنے کے لیے دوڑے تو کری آپا فوری طور پر اپنی موم بتی روشن کر کے اسٹیج پر آ گیا، جس سے ہال میں روشنی ہو گئی۔ پروگرام کے اختتام پر جہاں گانے والیوں کے لیے تالیاں بجیں، ان سے زیادہ تالیاں کری آپا کی موم بتی کے لیے بجیں۔

اس کے عجیب و غریب رویے اور گھر میں یونٹوں والے ماحول کا ایک بہت ہی مشہور قصہ ایک کابلی گرمے کا تھا۔ وہ ایسے کہ کری آپا جب کمانڈر انچیف بنا تو حسبِ روایت بہت سے لوگ اسے مبارک باد دینے آئے۔ ان میں افغانستان کا سفیر بھی تھا۔ یہ سفیر صاحب ایک بہت بڑے سائز کا گرما تحفے کے طور پر ساتھ لائے جو کری آپا کو پیش کیا گیا۔

جنرل صاحب بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے یہ گرما چھپا کر رکھ دیا۔ اپنے تمام بچوں کو سختی سے منع کیا کہ گرمے کے نزدیک نہ جائیں۔ انہیں چکھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ جو بھی مہمان آتا اس گرمے سے ایک قاش کاٹ کر اسے پیش کی جاتی۔ بچے پاس منڈلاتے اور مہمانوں کو کھاتے ہوئے حسرت سے دیکھتے، لیکن انہیں کھانے کی اجازت نہ تھی۔

چند دن تک مہمان ایک ایک قاش سے لطف اندوز ہوتے رہے اور بچے ترستے رہے۔ چند دن بعد جنرل صاحب کو کہیں باہر جانا پڑا۔ اگلے روز جنرل صاحب انڈین ایئر فورس کے جہاز پر سوار ہوئے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

راستے میں جنرل صاحب کو یاد آیا کہ گرمے کا کچھ حصہ تا حال گھر میں بچا پڑا ہے۔ جنرل صاحب نے اپنے اے ڈی سی کو ایک چٹ پر گھر کا فون نمبر لکھ کر حکم دیا کہ پائلٹ کو کہیں کہ کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے میرے گھر کے اس نمبر پر رابطہ کریں۔ کنٹرول ٹاور سے جب رابطہ ہوا، تو جنرل صاحب نے حکم دیا۔

کہ کنٹرول ٹاور کے لوگ اس کے گھر فون کر کے اس کے بچوں سے رابطہ کریں اور انہیں بتا دیں کہ گرمے کا جو حصہ بچا پڑا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے وہ کھا لیں۔

پائلٹ نے جب یہ پیغام سنا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ لیکن جنرل تو جنرل ہی ہوتا ہے، پائلٹ بے چارہ کیا کر سکتا تھا؟

دُرفشِ کاویانی

''کاوہ'' ایک لوہار تھا جس نے ضحاک جیسے ظالم و بے رحم پر چڑھائی کر کے فریدوں کو اس کے باپ کا تخت اس غاصب سے دلوا دیا تھا۔ ''یانی'' صرف نسبت ہے۔

دُرفشِ کاویانی ''وہ جھنڈا جو ''کاوہ'' آہن گر سے نسبت رکھتا ہے۔''

اس کا قصہ یہ ہے کہ ضحاک ابنِ علوان جس نے جمشید کی حکومت پر قبضہ کر کے اسے قتل کرا دیا تھا۔ یہ پانچواں بادشاہ تھا، اس کی عیاشی و بدکرداری کے سبب اس کو سرطان کی بیماری ہو گئی تھی، دونوں شانوں سے رسولی کی طرح دو گوشت کے لوتھڑے لٹک گئے تھے جو دن بہ دن بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے اور بہت بدنما دکھائی دیتے تھے۔ اس نے ان کو کٹوا ڈالا۔

اس بدگوشت کے جسم سے الگ ہوتے ہی ایسا شدید درد اٹھا جو ناقابل برداشت تھا۔ حکیموں اور بڑے بڑے جراحوں نے بہت کوشش کی مگر درد نہ تھما۔

تب ناچار ہو کر حکماء نے دو انسانوں کا بھیجہ (مغز) مرہم کے طور پر تجویز کیا۔ جب تک وہ مرہم موجود رہتا درد میں تخفیف اور ذرا تسکین رہتی۔ جیسے ہی وہ خشک ہو جاتا تکلیف پھر شروع ہو جاتی۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے یہ علاج خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے پہلے تو قیدیوں اور مجرموں کے دماغ نکلوائے اور جب جیل خانہ خالی ہو گیا تو کبھی دو اور کبھی چار آدمی فی محلہ منگواتا اور انہیں ذبح کر کے خود تسکین پاتا۔

جب اس طرح ظلم کرتے اس کو مدت گزر گئی اور خلق خدا کا ناک میں دم آ گیا تو ''کاوہ'' نامی لوہار نے جو اصفہان میں دکان کرتا تھا اور جس کے چار بچے ضحاک کی نذر ہو چکے تھے، اپنی دکان کو تالا لگایا اور ضحاک سے لڑنے مرنے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جس چمڑے پر بیٹھ کر کام کرتا تھا، اسی کا پھریرا بنایا اور ایک لکڑی پر اس کو لٹکایا اور ڈھول بجاتا ضحاک کے ظلم کا راگ گاتا ہوا گلی کوچوں میں چکر لگانے لگا۔ لوگ اس کے ساتھ ملتے چلے گئے حتیٰ کہ سارا اصفہان شہر اس کا ساتھی ہو گیا۔

سب نے یہ جان لیا کہ یہ خدائی علم ہے۔

سب سے پہلے اس نے حاکم اصفہان کو ختم کیا پھر شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر ضحاک کے لشکر کو متواتر کئی شکستیں دیں اور اصفہان سے نکل کر اس کے کئی قلعوں پر قابض ہوا۔

اس چمڑے کے جھنڈے کو لوگوں نے متبرک اور علامت فتح خیال کرتے ہوئے زر و جواہر سے مزین کیا۔ اس وقت سے اس جھنڈے کا نام ''درفش کاویانی'' قرار پایا۔

جب ''کاوہ'' ضحاک کی فوج و حکومت کا خاتمہ کرتا ہوا ملک ''رے'' میں پہنچا اور لوگوں سے مشورہ کیا تو سب نے ضحاک کو قتل کرنے اور ''کاوہ'' کو حکمرانی کا مشورہ دیا مگر ''کاوہ'' نے انکار کر دیا اور کہا کہ فریدوں جو جمشید کا فرزند ہے وہی تخت کا وارث اور مستحق ہے۔ چنانچہ فریدوں کو تلاش کر کے لایا گیا، اسے بادشاہ بنایا گیا اور ضحاک کو قتل کر دیا گیا۔

''کاوہ'' نے بیس سال فریدوں کا ساتھ دیا اور اسے چین، ہند، ترکستان اور روم تک کا بادشاہ بنایا۔ جتنی لڑائیاں ہوئیں ''درفش کاویانی'' اس کے ساتھ رہا۔

تمام فتح مندیوں کو درفش کاویانی کی طرف منسوب کیا جاتا۔ ہر میدان جنگ میں تبرکاً یہی جھنڈا نصب کیا جاتا۔ جو کچھ مال غنیمت حاصل ہوتا، اس میں سے ایک حصہ ''درفش کاویانی'' پر ضرور چڑھایا جاتا۔

جب ''کاوہ'' کا انتقال ہو گیا تو فریدوں نے وہ جھنڈا اپنے قبضہ میں لے لیا اور اپنا عروج اس کے طفیل سمجھ کر اسے نہایت بیش قیمت جواہرات سے اور بھی مرصع و مزین کر دیا بلکہ فریدوں کے بعد اس کی نسل میں جتنے بھی بادشاہ ہوئے سب اس کی زیبائش میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے حتیٰ کہ وہ اتنا قیمتی ہو گیا کہ جوہری ــــ اس کی قیمت لگانے سے عاجز آ گئے۔ اس جھنڈے کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ مخالف لشکر تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود مطیع و فرماں بردار ہو جاتا جب اس کو علم ہوتا کہ ''درفش کاویانی'' اس شاہی لشکر کے ساتھ ہے۔ اس کا اصل چمڑا جواہرات میں چھپ کر اور بوسیدہ ہو کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ جھنڈا کئی ہزار سال قائم رہا پھر آخر کار اس کی بھی قضا آ گئی۔

جب حضرت عمرؓ کے عہد میں لشکر اسلام نے ایران پر فتح حاصل کی تو ''درفش کاویانی'' ان کے قبضے میں آیا۔ حضرت عمرؓ نے تمام جواہرات نکلوا کر سپاہیوں میں تقسیم کرا دیے اور اس چمڑے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور کہا۔

''دیکھو کوئی چیز خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا یہ طاقت نہیں رکھتی کہ انسان کی مدد و حمایت کر سکے۔ آئندہ جو شخص ''کاوہ'' لوہار کے جھنڈے کی معاونت چاہے وہ لوہار کے لوہے سے ہی قتل کر دیا جائے۔''

(یہ قصہ ہے درفش کاویانی کا۔)

(ماخوذ فر، ہنگ آصفیہ......)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

زنگر شوارمہ

اجزاء:۔

ڈو کے لیے

میدہ	چار کپ
خمیر	ایک چائے کا چمچ
چینی	دو چمچے
تیل	چار چمچے
گرم دودھ یا پانی	حسب ضرورت

چکن کے اجزاء:۔

چکن (لمبائی میں کٹا ہوا)	آدھا کلو
سرکہ	ایک چوتھائی کپ
لہسن پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد

چکن کوٹنگ کے لیے

میدہ	ایک کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	آدھا کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

ڈو بنانے کے لیے۔ میدے میں تمام اجزاء شامل کر کے اسے گوندھ لیں اور ایک سے دو گھنٹے کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔

چکن میں سرکہ، نمک، کالی مرچ، لہسن پاؤڈر (پسا ہوا لہسن بھی استعمال کر سکتے ہیں) اور انڈا ڈال کر مکس کر لیں اور اسے تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

ڈو تیار ہو جانے کے بعد اسے ایک بار پھر گوندھ لیں اور پیڑے بنا لیں اور پھر انہیں بیل لیں۔

بیلنے کے بعد اسے پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں اور توا یا پین گرم کر کے دھیمی آنچ پر پکائیں، جب ایک طرف سے سنک جائے تو دوسری طرف سے پکائیں، ساتھ میں ہلکا سا تیل لگائیں۔ اسی طرح ساری روٹیاں تیار کریں (پیٹا بریڈ روٹی کی شکل کی ہوتی ہے)۔

میدے میں کارن فلور، بیکنگ پاؤڈر، نمک، لہسن پاؤڈر اور سرخ مرچ پاؤڈر ملا لیں۔

مسالہ لگے چکن کو میدے میں لگا کر دوسری پلیٹ میں رکھتے جائیں اور تل لیں۔

کاغذ پر تیار کردہ پیٹا بریڈ رکھیں اور اس پر مایونیز لگا دیں۔ فرائی چکن کے دو ٹکڑے رکھ کر اس پر کیچپ اور سلاد کے پتے رکھ کر لپیٹ لیں۔ مزے دار زنگر شوارمہ تیار ہے۔

ٹماٹو کیچپ

اجزاء:۔

ٹماٹر	دو کلو
لہسن	آٹھ جوے
ادرک	تین انچ کا ٹکڑا
پیاز	ایک عدد
لونگ	تین عدد
چینی	ایک کپ
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
مسٹرڈ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
سرکہ	ایک کپ

ترکیب:۔

ایک برتن میں ٹماٹر، لہسن، ادرک، پیاز اور لونگ ڈال